بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

ستمبر 2017





بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

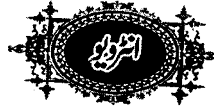
37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز















زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے







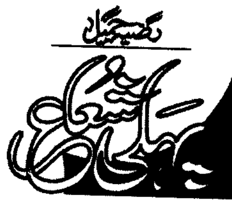
ستمبر 2017
جلد 32 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۱۰، بی۶، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار



ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
جشن آزادی کی خوشیوں کی چمک ابھی ماند نہ ہوئی تھی کہ عیدالاضحیٰ اپنے دامن میں خوشیاں لیے ہمارے آنگنوں تک آگئی۔
عیدالاضحیٰ اس عظیم قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے جس میں۔ ایک باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم کی تعمیل میں قربانی کے لیے پیش ــــ کیا تھا۔ باپ اور بیٹے کی یہ قربانی توکل علی اللہ عبدیت اور تسلیم و رضا کی وہ شاندار مثال تھی جس کا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ اس قربانی نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ مقام پایا کہ قیامت تک کے لیے مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ وہ ہر سال قربانی کرکے اس واقعے کی یاد تازہ کریں۔
اللہ تعالیٰ کی نظر میں قربانی کا درجہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔ قربانی نفس کی ہو، مال و متاع کی ہو یا جذبوں کی دین و دنیا میں فلاح اور کامیابی کا باعث بنتی ہے۔
اسلام میں ہر عمل کا دارومدار اور بنیاد نیت ہے۔ قربانی اسی وقت قبولیت کا درجہ پاتی ہے جب نیت اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اسے دکھاوے، نمائش یا فخر کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔
قربانی کے گوشت کی تقسیم میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدِنظر رکھا جائے اور حق داروں تک ان کا حق پہنچایا جائے تاکہ ہم قربانی کے اجر و ثواب کے مستحق ہو سکیں۔
قارئین کو ہماری جانب سے عیدالاضحیٰ کی دلی مبارک باد۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشی اور خوش حالی عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- صباحت یاسمین کا ناول ۔ وقت سے پہلے،
- سلمیٰ سیف اللہ بٹ ناول ۔ سنہری دھوپ،
- فرزانہ کھرل کا ناول ۔ کبھی ہجر لکھو تو،
- مصباح علی سید کا ناولٹ ۔ میرا راج دلارا،
- ہاجرہ ریحان، قانتہ رابعہ، صبا آصف، عندلیب زہرا، تہمینہ چودھری اور سنبل عمیر کے افسانے،
- صائمہ اکرم اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- قارئین سے عیدالاضحیٰ کا خصوصی سروے ۔ عیدالاضحیٰ اور آپ،
- افسانہ نگار، ڈراما نگار سیما مناف کا بندھن،
- دستک ۔ معروف شخصیات سے گفتگو،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے ۔ قارئین کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ ہمارے لیے خاص شمارہ ہوتا ہے اور ہماری خواہش ہوتی ہے کہ یہ ہماری قارئین کے لیے بھی خاص ہو۔
آپ کو عید نمبر کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔



کعبہ پر پڑی جب پہلی نظر، کیا چیز ہے دُنیا بھول گیا
یوں، ہوش و خرد مفلوج ہوئے، دل ذوقِ تماشا بھول گیا

پھر روح کو اذنِ رقص ملا، خوابیدہ جنوں بیدار ہوا
تلوؤں کا تقاضا یاد رہا، نظروں کا تقاضا بھول گیا

احساس کے پردے لہرائے، ایمان کی حرارت تیز ہوئی
سجدوں کی تڑپ اللہ اللہ، سر اپنا سودا بھول گیا

جس وقتِ دُعا کو ہاتھ اُٹھے، یاد آ نہ سکا جو سوچا تھا
اظہارِ عقیدت کی دُھن میں، اظہارِ تمنّا بھول گیا

پہنچا جو حرم کی چوکھٹ تک، اک ابرِ کرم نے گھیر لیا
باقی نہ رہا یہ ہوش مجھے، کیا مانگ لیا، کیا بھول گیا

ہر وقت برستی ہے رحمت، کعبے میں جمیل اللہ اللہ
خاطی ہوں میں کتنا بھول گیا، عاصی ہوں میں کتنا بھول گیا

جمیل نقوی



شاہِ دُنیا و دیں کہلائے
آپؐ فاتح مبین کہلائے

اپنے کردار کی بلندی سے
آپؐ صادق امین کہلائے

آپؐ کے سائے میں جو لوگ ہوئے
وہ بھی اہلِ یقین کہلائے

حُبِّ محبوب جس کے دل میں ہو
وہ جہاں میں حسین کہلائے

خورشید اقبال حیدر

ادارہ



خشیت الٰہی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اور مجھ ہی سے ڈرو۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔" (البروج۔12)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور اسی طرح ہے تیرے رب کی پکڑ' جب وہ کسی بستی کو پکڑتا ہے جب کہ اس کے باشندے ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ یقیناً" اس کی پکڑ نہایت دردناک ہے۔ بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے نشانی ہے جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ یہ وہ دن ہو گا جس میں لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہی دن سب کی حاضری کا ہے' ہم اسے صرف ایک گنی ہوئی مدت کے لیے (مصلحتاً") مؤخر کر رہے ہیں۔ جب یہ دن آئے گا تو کسی کو اللہ کی اجازت کے بغیر یارائے گفتگو نہیں ہو گا' چنانچہ بعض لوگ بدبخت اور بعض نیک بخت ہوں گے۔ جو بدبخت ہوں گے' ان کا ٹھکانا آگ ہے' ان کے لیے اس میں چیخنا اور پکارنا ہو گا۔" (سورہ ہود 102-106)

اور فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔" (سورہ عمران۔28)

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔

"جس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے' اپنی ماں اور اپنے باپ سے' اپنی بیوی اور بیٹوں سے۔ ہر ایک کے لیے ایسی حالت ہو گی جو اسے (دوسروں سے) بے نیاز اور بے پروا کردے گی۔" (سورہ عبس 34-37)

اور فرمایا۔

"اے لوگو' اپنے رب سے ڈرو' بے شک قیامت کا بھونچال بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ اس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی۔ اور ہر حمل والی کا حمل گر جائے گا۔ اور تم دیکھو گے کہ لوگ مدہوش ہیں اور یہ مدہوشی نہیں ہو گی بلکہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔" (سورہ الحج 1-2)

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔

"اور اس شخص کے لیے دو باغ ہیں جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔" (سورہ الرحمٰن۔36)

اور فرمایا۔

"اور (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ وہ کہیں گے: اس سے پہلے ہم اپنے اہل و عیال میں (دنیا میں اللہ سے) ڈرا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں لُو (جہنم) کے عذاب سے بچالیا۔ بے شک ہم اس سے قبل اسی کو پکارتے تھے' بلاشبہ وہ بہت احسان کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔" (سورہ الطور 25-28)

انسان

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمایا' اور آپ سچے ہیں اور آپ کی بات کو سچ مانا جاتا ہے۔

"بے شک تم میں سے ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں رہتا ہے' پھر اسی کی مثل (یعنی اتنی ہی مدت) منجمد خون بنا رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے' پھر (ایک سو بیس

دن کے بعد) فرشتہ بھیجا جاتا ہے' وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔

اور فرشتے کو چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی روزی' اس کی موت' اس کا عمل اور وہ بدبخت ہے یا نیک ہے۔

چنانچہ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! بے شک تم میں سے ایک شخص جنتیوں والے عمل کرتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے اور وہ جہنمیوں والے کام کرنے لگ جاتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے ایک شخص جہنمیوں والے کام کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں والے کام کرنے لگ جاتا ہے' تو اس میں داخل ہو جاتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ اس میں تقدیر کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کے متعلق پہلے ہی سے علم ہے کہ وہ نیک ہو گا یا بد' جنتی ہو گا یا جہنمی۔ اور اس نے اپنے علم کے مطابق یہ سب کچھ پہلے ہی سے لکھ دیا ہے۔ اس کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان مجبور محض اور ارادہ و اختیار کی قوت سے محروم ہے جیسا کہ بعض گمراہ فرقوں نے ایسا سمجھا ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ کے علم کا ایک اظہار ہے' اس کا کوئی تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے نہیں ہے۔ اللہ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا ہے' بلکہ اسے ارادہ و اختیار کی آزادی سے نوازا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی آزمائش ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان کی آزمائش تب ہی ہو سکتی تھی کہ اسے نیک یا بد دونوں میں سے کسی بھی ایک راستے کے انتخاب اور اس پر عمل کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ نے دونوں راستوں کی واضح طور پر نشاندہی کر کے اسے اختیار دیا ہے کہ جسے چاہے وہ اپنا لے۔ دونوں کا انجام بھی بتلا دیا۔

2۔ امام نووی رحمتہ اللہ نے اس حدیث کو خشیت الٰہی کے باب میں ذکر کر کے تنبیہہ کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس سے حسن خاتمہ کی دعا اور اس سے مدد طلب کرتے رہو' نیز اس کے لیے جو اسباب ہیں انہیں اختیار کرو' یعنی ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ' اس لیے کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق اسباب و وسائل اختیار کرنے کا مکلف ہے گو اس کے انجام سے وہ بے خبر ہے' اس کو وہ اللہ کے سپرد کر دے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ نے جس کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان راستوں کو بھی آسان فرما دیتا ہے' جو نیکی کو اپنائے گا' نیکی کے راستے اس کے لیے کھلتے چلے جائیں گے اور اسی طرح جو بدی کو اپنائے گا' اس کے راستے اس کے لیے ہموار ہو جائیں گے۔ حدیث نبوی ہے۔

3۔ علاوہ ازیں برائی کو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اختیار نہ کرے کہ کہیں اسی پر اس کی زندگی کا اختتام نہ ہو جائے اور یوں زندگی بھر کی نیکیوں پر پانی پھر جائے اور وہ جنتی کے بجائے جہنمی قرار پا جائے۔

جہنم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس دن (قیامت والے دن) جہنم کو اس حالت میں لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی' ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ اس کا تعلق امور غیب سے ہے جن پر ایمان رکھنے کا حکم ہے۔ اس کو تشبیہ و تمثیل قرار دینا صحیح نہیں ہے' یہ حقیقت پر ہی محمول ہے' تاہم اس کی کیفیت ہم نہیں جان سکتے۔

2۔ اس میں اس بات کی تنبیہہ ہے کہ انسان کو

برے اعمال سے باز رہنا چاہیے اور خشیت الٰہی کا دامن ہر وقت تھامے رکھنا چاہیے کیونکہ معصیت کا انجام جہنم ہے اور اس کی ہولناکی حدیث میں واضح کی گئی ہے کہ انسان کو معصیت کرتے وقت اس کے انجام کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ہلکا عذاب

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"قیامت والے دن جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا وہ آدمی ہو گا جس کے پاؤں کے تلوؤں میں دو انگارے رکھے جائیں گے جن سے اس کا دماغ کھولے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ سخت عذاب والا کوئی نہیں، حالانکہ وہ ان جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1- صحیح مسلم کی دوسری روایات میں ہے کہ اس کے جوتے اور تسمے آگ کے ہوں گے جن سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا جیسے چولہے پر رکھی ہوئی ہنڈیا کھولتی ہے۔

جب ادنیٰ ترین عذاب کی یہ کیفیت ہے تو سخت ترین عذاب والوں کی کیا حالت ہو گی۔ یاد رہے! تصویر بنانے والوں اور شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والوں کو عذاب الیم (دردناک عذاب) کی وعید سنائی گئی ہے۔

جس طرح اہل جنت شرف و فضل اور درجات میں کم و بیش ہوں گے، اسی طرح جہنمی بھی عذاب کی شدت اور تخفیف میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

روز قیامت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(روز قیامت) لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے (اور پسینے میں شرابور ہوں گے) حتیٰ کہ ان میں سے کوئی اپنے آدھے کانوں تک اپنے پسینے میں چھپا ہوا ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : یہ اس ہولناکی کا ایک منظر ہے جو میدان محشر میں بپا ہو گی اور لوگ حساب کے لیے بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہوں گے۔ سورج ایک میل کے فاصلے پر ہو گا اور اللہ کے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا۔

اگر جان لو

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (ایک مرتبہ) ایسا خطبہ ارشاد فرمایا کہ اس جیسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم وہ باتیں جان لو جن کا مجھے علم ہے تو تم ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ۔"

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے اور ان کی آہ و زاری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے بارے میں کوئی بات پہنچی تو آپ نے خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا۔

"مجھ پر جنت اور دوزخ پیش کی گئی، تو میں نے آج کے دن کی طرح بھلائی اور برائی نہیں دیکھی۔ اور اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ۔"

چنانچہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سے زیادہ سخت دن کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے سر ڈھانپ لیے اور وہ آہ و بکا کر رہے تھے۔

فوائد و مسائل : 1- اس سے معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ موجود ہیں اور دیگر بعض امور غیبیہ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔

2۔ زیادہ ہنسنا پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ یہ غفلت اور آخرت فراموشی پر دلالت کرتا ہے جب کہ مسلمان کو ہر وقت چوکنا اور فکر آخرت سے مضطرب رہنا چاہیے۔

3۔ اللہ کے خوف، یعنی اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے رونا نہایت پسندیدہ ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا دل بیدار، اللہ کی یاد اور اس کے خوف سے معمور و لرزاں اور فکر آخرت سے پریشان ہے۔

4۔ علماء کو چاہیے کہ گاہے گاہے لوگوں میں فکر آخرت کا شعور بیدار کرتے رہیں تاکہ وہ دنیا کی لذتوں میں ہلکان نہ ہو جائیں۔

قیامت

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"قیامت والے دن سورج کو مخلوق کے (اتنا) قریب کر دیا جائے گا کہ وہ ان سے ایک میل کے فاصلے پر ہوگا۔"

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے (تابعی) سلیم بن عامر فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ میل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کیا تھی؟ کیا زمین کی مسافت یا (سرمہ دانی کی) وہ سلائی جس سے آنکھ میں سرمہ لگایا جاتا ہے؟ (چونکہ عربی میں اسے بھی میل کہا جاتا ہے) "چنانچہ لوگ اپنے (اپنے) اعمال کے مطابق پسینے میں ہوں گے۔ بعض ان میں سے وہ ہوں گے جو اپنے ٹخنوں تک، بعض اپنے گھٹنوں تک، بعض اپنے پہلوؤں (کمر) تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور بعض ایسے ہوں گے کہ انہیں پسینے نے لگام ڈالی ہوگی۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا (یعنی جس طرح جانور کے منہ میں لگام ڈالی جاتی ہے، اس طرح پسینہ ان کے لیے لگام بنا ہوا ہوگا، یعنی ان کے منہ اور کانوں تک پسینہ ہوگا)۔ (مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ حدیث میں میل کی وضاحت نہیں ہے کہ یہ مسافت والا میل ہے یا سرمہ دانی کا میل۔ مسافت والا میل، ہمارے ملک میں ایک میل آٹھ فرلانگ، یعنی 1.609 کلو میٹر ہے۔ شارحین حدیث نے اسے چھ ہزار ذراع اور بعض نے چار ہزار ذراع بتلایا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے اسے بارہ ہزار انسانی قدم کے برابر قرار دیا ہے۔

2۔ اگر یہ میل ارض ہو تب بھی سورج کی شدت حرارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سورج، موجودہ سائنسی تحقیق کے مطابق نو کروڑ میل کے فاصلے پر ہے، تب بھی موسم گرما میں کوئی شخص اس کی حرارت کو برداشت نہیں کر پاتا، تو سورج جب صرف ایک میل کے فاصلے پر ہوگا تو اس کی حرارت واقعی اتنی ہوگی کہ انسان پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔ اعذنا اللہ منہ۔

جہنم کی گہرائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ نے کسی چیز کے گرنے کا دھماکا سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم جانتے ہو، یہ کیا ہے؟"

ہم نے کہا "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ وہ پتھر ہے جو ستر سال پہلے جہنم میں پھینکا گیا تھا، تو وہ اب تک جہنم میں گرتا رہا، یہاں تک کہ اب وہ اس کی گہرائی میں پہنچا (جا لگا) ہے جیسا کہ (ابھی) تم نے اس کے گرنے کا دھماکا سنا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ جہنم کی گہرائی سے اس کے عذاب کی شدت اور ہولناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

2۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی کرامت کا بیان ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس دھماکے کو سنا۔

3۔ حدیث کا مقصود جہنم کی خوفناکی و ہولناکی بتاتا ہے تاکہ ہم اس کے عذاب اور تباہ کاریوں سے بچیں اور ہمیشہ برے افکار و اعمال سے کنارہ کش رہیں۔

رب سے کلام

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عنقریب تم میں سے ہر شخص سے اس کا رب اس حال میں کلام فرمائے گا کہ آدمی اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ تو آدمی اپنی دائیں جانب دیکھے گا تو اسے آگے بھیجے ہوئے عمل ہی نظر آئیں گے' اپنی بائیں جانب دیکھے گا تو ادھر بھی اپنے آگے بھیجے ہوئے عمل ہی دیکھے گا اور اپنے سامنے دیکھے گا تو سامنے اسے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ چنانچہ تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقے کرنے) کے ذریعے ہی سے ہو۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ کچھ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچراتا ہے اور اس کے لائق ہے کہ وہ چرچرائے۔ اس میں چار انگلیوں کی بھی ایسی جگہ نہیں کہ جہاں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی ٹیکے اللہ کے آگے سجدہ ریز نہ ہو۔ اللہ کی قسم! اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ اور تم بستروں پر (اپنی) عورتوں کے ساتھ لطف اندوز ہونا ترک کر دو اور تم اللہ سے پناہ چاہتے ہوئے (جنگلوں کے) راستوں کی طرف نکل جاؤ۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے۔)

فوائد و مسائل : 1۔ اس میں بھی خوف الٰہی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے کیونکہ ایک مومن کے دل میں اللہ کی جتنی عظمت و جلالت ہوگی' اتنا ہی اس کے دل میں اللہ کے عذاب کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہوگی اور وہ طاعات کو بجالائے گا اور معصیات سے اجتناب کرے گا۔

2۔ فرشتوں کی کثرت کا بیان ہے۔ جو ہمہ وقت اللہ کی عبادت میں مصروف اور اس کی بارگاہ نیاز میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ جب فرشتوں کا یہ حال ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے تو انسان کے لیے' جو ہر وقت حدود الٰہی کو پامال کرنے میں لگا رہتا ہے' اللہ کی عبادت کتنی ضروری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ نافرمانیوں سے باز رہے اور اللہ سے مدد اور پناہ طلب کرتا رہے۔

3۔ اس حدیث میں ان لوگوں کی تردید ہے۔ جو آسمان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کو (جو ہمیں آسمان نظر آتا ہے) اپنی نظر کی انتہا سمجھتے ہیں۔ اس میں آسمان کے وجود اور اس کی آواز کا اثبات ہے۔ مزید اس پر فرشتوں کا سجدہ ریز ہونا بھی ثابت ہے جو کسی ٹھوس چیز کے بغیر ممکن نہیں۔

عید گاہ میں جانور ذبح کرنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (قربانی) عید گاہ میں ذبح کیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ مصلیٰ سے مراد وہ میدان ہے جہاں عیدین اور استسقاء وغیرہ کی نمازیں ادا کی جاتی تھیں۔

2۔ عید گاہ میں ذبح کرنے میں یہ حکمت ہے کہ وہاں امیر غریب سب جمع ہوتے ہیں' لہٰذا تقسیم کرنے میں سہولت ہوتی ہے' تاہم عید گاہ میں ذبح کرنا ضروری نہیں' گھر میں بھی ذبح کیا جا سکتا ہے۔





بندھن

سیما مناف ہمراہ جاوید مسعود

شاہین رشید

ڈراما سیریل "خالی ہاتھ"، "بے خودی"، "تشنگی دل کی" اور دیگر معروف ڈراموں کی خالق سیما مناف ہمارے مشہور سلسلے "بندھن" کی مہمان ہیں۔ اپنی بے حد مصروفیات میں سے انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔ اس کے لیے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"کیسی ہیں سیما؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ماشا اللہ ڈراموں کی دنیا میں بہت کامیابی کے ساتھ آپ کا سفر جاری ہے' اس کے لیے مبارک باد۔"

"بہت شکریہ.....!"

"کچھ اپنے بارے میں اور کچھ اپنے میاں صاحب کے بارے میں بتائیں؟"

"جی ..... میرا نام "سیما مناف" ہے اور میاں صاحب کا نام "جاوید مسعود" ہے۔ کراچی میں میرا جنم ہوا 9 مئی کو۔ میری تعلیم بی اے ہے جبکہ یہ 14 اگست کو پیدا ہوئے۔ جاوید نے ایم ایس سی کیا ہے اور اینگرو کیمیکل کا اپنا بزنس ہے۔ ان کے تین بھائی اور ایک بڑی بہن ہیں۔ جو امریکہ میں رہتے ہیں۔ میرا تعلق بھی اردو اسپیکنگ فیملی سے ہے اور ان کا تعلق بھی اردو اسپیکنگ فیملی سے ہے۔ ماشاء اللہ سے ہمارے دو بیٹے ہیں اور دونوں ہی امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔ بڑا بیٹا زوہیب کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کر رہا ہے جبکہ دوسرے بیٹے طٰہٰ نے اسی سال ہائی اسکول پاس کیا

ہے۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوا، اور جاوید صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

"شادی کی ماشاء اللہ سلور جوبلی ہو چکی ہے۔ 26th چل رہا ہے، ایک تقریب میں جاوید نے مجھے دیکھا تھا اور پسند کیا تھا اور پھر رشتہ بھیج دیا۔ بڑوں کی باہم رضامندی اور پھر میری رضامندی اور پسند کی وجہ سے یہ رشتہ طے پایا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور اس دوران ملاقات ہوتی تھی؟"

"سسرال والے اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ پڑھے لکھے اور خوش اخلاق بھی، بہت محبت سے استقبال کیا۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن برا سلوک بھی کسی کی طرف سے نہیں ہوا۔ مجھے بھی احساس تھا کہ شروع شروع میں جب لڑکی کسی نئی جگہ جاتی ہے تو اسے ہی ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری سب چھوٹوں بڑوں کے ساتھ دوستی ہے، مالی پوزیشن یہ تھی کہ جاوید جاب کرتے تھے۔ ہمارا اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اور میں نے بہت محنت کی آج کی پوزیشن کو

"باقاعدہ منگنی چار ماہ رہی اور دوران منگنی دو چار ملاقاتیں ہی ہوئیں، وہ بھی کسی تقریب میں، جس میں ایک تقریب ہمارے ڈائجسٹ "چنری" کی افتتاحی تقریب بھی تھی۔ جاوید سے میری شادی، میری زندگی کا وہ خوب صورت ترین دن تھا جب جاوید میری زندگی میں آئے۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ ساری رسمیں ہوئیں؟ اور آپ رخصت ہو کر کہاں گئیں؟"

"ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ ساری رسمیں ہوئیں۔ جاوید نے شادی سے پہلے ہی گھر لے لیا تھا لیکن ہمارے جیٹھ کا کہنا تھا کہ دلہن رخصت ہو کر خالی گھر میں کیسے جائے گی.... اس لیے چھوٹے جیٹھ اور جٹھانی نے یہ قربانی دی کہ ہمارے لیے اپنا بیڈ روم خالی کر دیا اور پھر ہم پندرہ دن وہاں رہے اور پندرہ دن کے بعد اپنے گھر شفٹ ہوئے۔"

"آپ کے رائٹر ہونے پر سسرال والوں کا کیا رد عمل تھا؟"

"ملا جلا رد عمل تھا۔ کچھ کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہ تھی کہ آنے والی بہو رائٹر ہے اور کچھ تو بہت ہی ایکسائیٹڈ ہو کر ملتے تھے، کچھ نے میری تحریریں پڑھی ہوئی بھی تھیں۔"

"سسرال والے کیسے تھے؟ آؤ بھگت ہوئی؟ ان کا رویہ کیسا تھا اور میاں صاحب کی مالی پوزیشن کیسی تھی؟"

حاصل کرنے میں۔"

"کیا کیا قربانیاں دیں؟"

"کیا کیا قربانیاں دیں اس کا جواب تو جاوید ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔ لیکن میں ایک سگھڑ بیوی تھی، جسے گھر سجانے کا بہت شوق تھا۔ پیسے جمع کر کر کے گھر کی سجاوٹ کی چیزیں لایا کرتی تھی، جاوید نے بھی میری کسی خواہش کو پورا کرنے میں کنجوسی نہیں کی، خرچ کے معاملے میں میرا ہاتھ بہت کھلا ہے، مگر میں نے کبھی چادر سے باہر پاؤں نہیں نکالے۔ میں نے شادی کے شروع دنوں میں جاب بھی کی اور جیسے ہی حالات اچھے ہوئے میں نے جاب چھوڑ دی اور گھر میں بیٹھ کر اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دینے لگی۔"

"اکثر لڑکیاں سسرال آ کر کھانا پکانا اور دیگر کام ساس سے سیکھتی ہیں.... آپ سگھڑ بن کر آئیں یا....؟"

"میری امی دنیا کی سب سے سگھڑ خاتون تھیں۔ میرا یہ دعوا غلط نہیں کیونکہ ہر وہ شخص جو انہیں جانتا ہے وہ اس کی گواہی دے گا۔ امی نے ہم دونوں بہنوں کو پوری گھرداری سکھائی۔ کھانا پکانا، سلائی کڑھائی، موتی اور گوٹا ستارے لگانا، امی سے سب کچھ سیکھا سوائے سوئیٹر بنانے کے۔ وہ اس میں بھی اتنی ماہر تھیں کہ تصویر دیکھ کر نمونہ اتار لیا کرتی تھیں.... امی کو صفائی ستھرائی کا جنون تھا اور مجھے بھی ہے، ایک چیز بھی ادھر سے ادھر پھیلی ہوئی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اسی زمانے

میں ٹیوشنز بھی پڑھائیں۔ جاب بھی کی۔ پڑھائی مکمل کر کے مختلف کورسز بھی کیے... ایک جنون تھا کہ ہر کام سیکھ لوں‘ ساتھ ساتھ قلم سے بھی دوستی کرلی۔ صبح فجر میں اٹھتی تھی تو رات سوتے وقت بستر پر لیٹتی تھی۔ مجھے ان لڑکیوں پہ بہت حیرت ہوتی ہے‘ جو وقت ضائع کرتی ہیں۔ الحمدللہ مجھے سسرال میں کچھ بھی سیکھنا نہیں پڑا۔

”جاوید صاحب مزاج کے کیسے تھے؟“

”بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے جاوید جیسا ساتھی ملا‘ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والے انسان ہیں۔ اتنے کہ شاید کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا‘ میرے اور بچوں کے لیے ہی نہیں‘ کسی کو بھی کوئی پرابلم ہو‘ سب سے پہلے جاوید کے پاس ہی آتے ہیں اور جاوید ان کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں... روٹھتے ہیں تو زیادہ تر میں ہی مناتی ہوں۔ بس ایک یہی خامی ہے جاوید میں اور یہی خامی انہیں نظر بد سے بچائے رکھتی ہے۔ وہ شروع سے ہی بہترین ہیں۔ بہترین بیٹا‘ بہترین بھائی اور پھر بہترین شوہر اور اب بہترین باپ ہیں۔“

”آپ کے رائٹر بننے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے؟“

”ڈائجسٹ وغیرہ میں تو میں شادی سے پہلے سے ہی لکھتی تھی۔ جب ٹی وی پر لکھنا شروع کیا تو انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا اور کہا کہ تم میں ٹیلنٹ ہے‘ تم لکھ سکتی ہو اور ان شاء اللہ کامیاب رہو گی۔ آج اگر میں تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں تو اس میں سب سے پہلے میرے اللہ کی مہربانی‘ میری امی کی دعائیں اور جاوید کا ساتھ ہے۔“

”لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ شادی ہوتے ہی الگ گھر مل جائے جہاں ہم میاں بیوی ہوں اور بس تیسرا کوئی نہ ہو۔ کیا آپ کی بھی ایسی خواہش تھی؟“

”ہرگز نہیں... مجھے لوگوں میں رہنا‘ ان سے ہنسنا بولنا پسند ہے۔ الگ رہنے کا فیصلہ جاوید کا تھا لیکن ہم ہر تہوار‘ چھٹی کا دن اپنے سسرال میں ہی گزارتے تھے۔



میری دوستی بھی سب سے تھی۔ کسی تقریب میں جاوید مجھے آنکھیں دکھاتے کہ بس اٹھ جاؤ میں تب بڑی مشکل سے اٹھتی ہوں کہ مجھے لوگوں میں رہنا پسند ہے۔“

”اتنے سالوں میں محبت میں کمی آئی یا اضافہ ہوا؟“

”یقیناً“ اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایک لڑکا لڑکی جب شادی کے بندھن میں بندھتے ہیں تو انڈر اسٹینڈنگ ہونے میں ٹائم لگتا ہے۔ شروع میں ہمارے بھی کبھی کبھی اختلافات ہو جاتے تھے‘ لیکن میں نے آہستہ آہستہ ان کا مزاج سمجھ لیا اور زندگی کو ویسے ہی گزارا جیسا انہیں پسند تھا... ہم دونوں ایک دوسرے کی اچھائیوں کی قدر کرتے ہیں... اور کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہیں... اور ایک دوسرے کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”میاں صاحب کی ضروریات اور دیگر کاموں کا خیال کس حد تک رکھتی ہیں؟“

”پہلے کافی کام میں خود کیا کرتی تھی‘ لیکن اب مصروفیات کی وجہ سے اتنا کام نہیں کر سکتی۔ اب میڈ

کھانا بناتی ہے۔ وہی ناشتہ اور کھانا وغیرہ بھی دیتی ہے۔ ہاں امریکہ جا کر مجھے بچوں کے اور ان کے سارے کام خود کرنا پڑتے ہیں۔۔۔ خوش ہو کر چھیڑتے ہیں کہ امریکہ کی مہربانی سے تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مل رہا ہے۔ جاوید کو دعوتیں کرنے کا بہت شوق ہے جس کا اہتمام میں خود ہی کیا کرتی تھی۔ لیکن اب میڈ کی مدد سے کرتی ہوں۔ البتہ دعوتوں کا کھانا آج بھی میں خود ہی بناتی ہوں۔"

"سالگرہ اور شادی کی سالگرہ مناتی ہیں۔۔۔ اور کیا اہتمام کرتی ہیں؟"

"بچوں کی سالگرہ بچوں کے دس سال تک تو دھوم دھام سے کی پھر ہم اپنی شادی کی سالگرہ اور دیگر سالگراؤں پہ سب مل کر باہر ڈنر کرنے چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں۔ جاوید "کیک اور کیکے" ضرور لاتے ہیں۔ کارڈ ضرور دیتے ہیں۔ اب بچے باہر ہیں (امریکہ) تو سب چیزوں کا لطف ہی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن بچے بہت خفا ہوتے ہیں اگر انہیں یہ پتا چلے کہ ہم اپنی شادی کی سالگرہ اور برتھ ڈے پر باہر کھانا کھانے نہیں گئے اس لیے جانا پڑتا ہے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون پہ کہاں گئے تھے اور یہ کہ ہنی مون منانا چاہیے؟"

"منہ دکھائی میں ایک۔۔۔ "انگوٹھی" اور "ناک کی پن" ملی تھی، جو وائٹ گولڈ کی تھی، جس میں ڈائمنڈ لگے ہوئے تھے، ہنی مون پہ نہیں گئے، کیونکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی نوکریوں میں مصروف تھے۔ شادی کے پانچویں سال جب ہمارا بیٹا زوہیب چار سال کا تھا، ہم اسلام آباد اور مری گھومنے گئے تھے اور اسے شاید ہنی مون" نہیں کہتے۔ ہنی مون پہ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں، میاں بیوی کو ایک دوسرے کی قربت میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے ورنہ تو بعد میں زندگی کی مصروفیات میں اس کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"پہلی اولاد پہ کیا تاثرات تھے اور سسرال والوں کا کیا ردعمل تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں پہلی اولاد ہونے کے تاثرات کا اظہار نہیں کر سکتی، ہمیں ایسا لگتا تھا کہ دنیا کی ساری خوشیاں اللہ تعالیٰ نے ہماری جھولی میں ڈال دی ہیں۔۔۔ میرے سسرال والے بھی بہت خوش تھے۔ میرا کمرہ گل دستوں سے اور مٹھائی کے ڈبوں سے بھر گیا تھا۔ یہی حال میکے والوں اور دوست احباب کا بھی تھا۔ مہینوں تک زوہیب کو گفٹس ملتے رہے تھے۔"

"لڑائی جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں۔ آپ دونوں کس بات پر جھگڑتے تھے؟"

"شادی کے شروع دنوں میں بنا بات کے بھی ہم لڑ پڑتے تھے لیکن پھر سب کچھ نارمل ہو تا گیا اور ہم میاں بیوی بعد میں، پہلے دوست بن گئے۔"

"آپ مزاج کی کیسی رہیں، کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے میاں سے کہا ہو کہ میں آپ کو چھوڑ کر میکے جا رہی ہوں؟"

"لڑکیاں جب شادی کر کے ایک نئی زندگی شروع کرتی ہیں تو ان کے ذہن میں ہوتا ہے کہ سب کچھ ان کی خواہش کے مطابق ہو گا۔۔۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔۔۔ لڑکی کو ہی ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔ تب ہی گھر بنتا ہے۔۔۔ میں بہت غصے والی نہیں ہوں لیکن بالکل سیدھی بھی نہیں ہوں۔۔۔ لیکن میرے سسرال والے گواہ ہیں کہ میرا کبھی اپنے سسرال میں کسی چھوٹے سے لے کر بڑے تک کسی سے جھگڑا تو دور کی بات رہی، کسی سے کوئی چھوٹی بات پر بھی جھگڑا نہیں ہوا، سب مجھ سے بہت محبت اور عزت کرتے ہیں اور میں بھی سب کی عزت اور محبت کرتی ہوں اور گھر چھوڑنا لڑکیوں کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔ اپنا تخت و تاج چھوڑ دو تو دوسری فوجیں قلعے میں گھس آتی ہیں۔۔۔ یہ میرا سب لڑکیوں کو مشورہ ہے کہ کبھی اپنا گھر نہ چھوڑیں۔"

"گھر چھوڑتے وقت کیا احساسات تھے، نکاح پہلے ہو گیا تھا یا شادی کے دن ہوا تھا؟"

"میں اپنی امی سے بہت اٹیچڈ تھی... اس لیے ان سے بچھڑنے کی اداسی تھی۔ شادی والے دن صبح سے ہی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی تھمی نہیں تھی۔ بیوٹیشن بہت پریشان ہو گئی تھی۔ وہ آئی میک اپ کے لیے آنکھوں کو ہاتھ لگاتی اور آنسو گرنا شروع ہو جاتے تھے اور ایسا شاید ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس گھر میں بچپن سے رہی اسے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ ہمارا نکاح شادی کے دن ہال میں ہی ہوا تھا۔"

"شادی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے' کبھی کسی نے خدانخواستہ اسے توڑنے کی کوشش کی؟ اور یہ رشتے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے اس رشتے پہ سب خوش تھے اور خوش ہیں۔ میرے سسرال والے' میرے میکے والے بھی... اس لیے کسی نے ہمارے رشتے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور ہم دونوں بھی ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے رشتے داروں کی عزت و احترام بھی تو جہاں ایسا ہو وہاں رشتوں کے ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو شادیاں ناکام ہوتی ہیں... ان میں خصوصیات کا فقدان ہوتا ہے۔"

"آپ کے ڈرامے ماشاء اللہ اتنے کامیاب جارہے ہیں۔ کیا آپ کے شوہر' بچوں' میکے والوں اور سسرال والوں کو فخر ہوتا ہے؟ یا گھر کی مرغی دال برابر ہے؟"

"شوہر اور بچے تو واقعی بہت خوش ہوتے ہیں... میاں جی ہر سیریل کی پہلی قسط والے دن "بکے اور کیک" ضرور لاتے ہیں۔ تحفہ بھی دیتے ہیں اور بہت خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے سب بہن بھائی شروع کی پانچ اقساط تک میرے لیے تحفے لے کر آیا کرتے تھے' پہلی قسط سب ساتھ دیکھتے' پھر آہستہ آہستہ سب نارمل ہو گیا... سسرال میں بھی کچھ نے تحائف بھی دیے۔ خوشی کا اظہار تقریباً سب نے ہی کیا۔"

"وقت کافی بدل گیا ہے۔ اپنے بچوں کو ان کی پسند کی شادی کی اجازت دیں گی؟"

"کیوں نہیں... پسند کی شادی میں کوئی عار نہیں۔ دونوں بچے امریکہ میں ہیں... ابھی تو پڑھ رہے ہیں' انہیں میں نے کہا ہے کہ اگر کوئی لڑکی پسند آئے تو اس بات کا ضرور خیال رکھنا کہ لڑکی مسلمان ہو' مادر پدر آزاد نہ ہو۔ خوش اخلاق ہو اور اسے گھر سنبھالنا آتا ہو۔"

"اور آخری سوال کہ جن لڑکے لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟"

"ضرور' شادی کرنا صرف معاشرتی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کا حکم ہمارا مذہب بھی دیتا ہے... نکاح انسان کو بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ پھر شادی کے بعد آپ کو اپنا ساتھی مل جاتا ہے اور اولاد کی صورت میں اللہ کا سب سے بڑا انعام... اس لیے شادی ضرور کریں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے "سیما مناف" سے اجازت چاہی۔

خوشی کا کوئی بھی موقع ہو کھانے پینے کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ عید تو نام ہی خوشیوں کا، محبتوں کا، تمام گلے شکوے بھلا کر مل بیٹھنے کا ہے۔ عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ ہر طرف خوشی کا سماں ہوتا ہے۔ عید الفطر کے دن بناؤ سنگھار، چوڑیاں، مہندی اور خوب صورت ملبوسات پر توجہ ہوتی ہے تو عید الاضحیٰ کے دن کچن میں رونق ہوتی ہے۔ گوشت کی فراوانی کی وجہ سے نت نئے چٹ پٹے، خوش ذائقہ پکوان تیار کیے جاتے ہیں۔ جو سب گھر والے شوق سے کھاتے ہیں اور آنے والے مہمانوں کی تواضع بھی ذوق و شوق سے کی جاتی ہے۔ نمکین کھانے کے بعد میٹھے کی طلب بڑھ جاتی ہے تو سویٹ ڈش بھی لازمی ہوتی ہے۔

عید نمبر میں حسب روایت ہماری قارئین نے بھی شرکت کی ہے۔ ہم نے ان سے عید الاضحیٰ کے حوالے سے سوالات کیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(1) عید الاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیا آپ قربانی کے گوشت کی صفائی، تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔

(2) ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ضرور ہوتی ہے۔ جو خاص مواقع پر بنائی جاتی ہے۔ آپ کے گھر میں عید الاضحیٰ پر کون سی ڈش بنائی جاتی ہے۔

(3) عید الاضحیٰ کے موقع پر مہمانوں کی تواضع کے لیے آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ میٹھے میں کیا بناتی ہیں؟

عید الاضحیٰ اور آپ

ادارہ

ثمینہ اکرم ــــ کراچی

(1) عید الاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیا آپ قربانی کے گوشت کی صفائی، تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں؟

ج ـ عید الفطر کا دن ہو یا عید الاضحیٰ.... خاتون خانہ کے لیے کام، کام اور بس کام ہی ہوتا ہے۔ (مجھے تو لگتا ہے کہ قائداعظم نے یہ قول کہا ہی خواتین کے لیے ہے۔) عید الاضحیٰ جہاں بے شمار خوشیاں لاتی ہے وہیں خواتین کے لیے بے شمار کام بھی لے کر آتی ہے۔ جنہیں ہر صورت نبھانا عورت کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ میرا بھی عید کا دن طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک.... بلکہ رات گئے تک، بے پناہ مصروفیات والا گزرتا ہے۔ رہی بات قربانی کے گوشت کی تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لینے کی تو جناب یہ سارے کام مجھ ہی کو کرنے پڑتے ہیں۔ غنوی گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتی، صرف اوپر کے کام کرتی ہے۔ قربانی عید الاضحیٰ کو عید الفطر سے ممتاز کرتی ہے۔

حسب عادت اذان فجر سے پہلے بیدار ہو جاتی ہوں۔ اکرم بھی سحر خیز ہیں۔ نماز فجر کی ادائی کے بعد اکرم اور بچوں کی تیاری میں مدد کرتی ہوں ساتھ ساتھ کچن کی مصروفیات بھی جاری رہتی ہیں، ان کے عید گاہ روانہ ہونے کے بعد خود غسل کر کے نماز عید ادا کرتی ہوں۔ جب سب لوگ عید گاہ سے نماز پڑھ کر لوٹ آتے ہیں تو درود کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ وہ بکرے پر چھری پھیر سکے۔

ہمارے گھر ہر سال بکرے کی قربانی کی جاتی ہے اور گائے میں حصہ بھی لیا جاتا ہے۔ میں جلدی جلدی چکن بریانی تیار کرتی ہوں، چکن کا قورمہ رات کو بنا لیتی ہوں چونکہ صبح اکرم وغیرہ بغیر کچھ کھائے پیے نماز پڑھنے عید گاہ جاتے ہیں۔ میں بھی روزے سے ہوتی ہوں۔ جب بکرا ذبح ہو جاتا ہے تب اس کی کلیجی فرائی کر لیتی ہوں جس کا مسالہ پہلے سے بھون کر رکھ لیتی ہوں۔ پھر سب مل کر کلیجی سے روزہ افطار کرتے ہیں اور میں چکن بریانی کو دم لگاتی ہوں۔ جتنے بھی لوگ

قربانی کے لیے آتے ہیں سب کا کھانا بناتی ہوں' چائے شربت بھی چلتا رہتا ہے۔ قربانی کے بعد صرف اور صرف خواتین کی مصروفیات رہ جاتی ہیں۔ گوشت کی تقسیم اور حفاظت کے لیے کئی دشوار مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ مگر میں بہت سے کام ترتیب سے اور درست منصوبہ بندی کی بدولت پہلے ہی کرلیتی ہوں۔

گوشت کی تقسیم میں میری فہرست میں اولین ان گھروں کے نام ہوتے ہیں جن کے گھر قربانی نہیں ہوتی۔ پھر محلے' رشتہ داروں میں دینا' دروازے پر آنے والے فقرا' مساکین کے لیے گوشت کے الگ سے پیکٹ بنا کر رکھتی جاتی ہوں۔ ہمارے گھر کے لیے تو امی کے گھر سے آنے والا گوشت ہی بہت ہوتا ہے اور میں تو اپنے گھر آنے والے گوشت کا بھی زیادہ حصہ بانٹ دیتی ہوں۔ نیت اچھی ہو تو برکت بہت ہوتی ہے۔ گوشت کی تقسیم میں عدل سے کام لینا چاہیے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ نہ دینا چاہیے۔ پلاسٹک کی تھیلیاں پہلے سے منگا کر رکھ لیں۔

پیاز براؤن کرکے' ادرک لہسن پیس کر گرم مسالا پیس کر اور سب ضروری مسالا جات کی خریداری بہت پہلے سے کرلیتی ہوں۔ اس طرح عید والے روز اضافی کاموں کا بوجھ نہیں پڑتا۔ گوشت کے پیکٹ بنا کر مارکر سے ان پر نام لکھنا اور فریزر میں محفوظ کرنا... یہ کام رات گئے تک چلتے رہتے ہیں اگر ہم کام صحیح منصوبہ بندی اور ترتیب سے کریں تو بہت آسانی ہوجاتی ہے اور زیادہ پھیلاوا نہیں پھیلتا... درمیان درمیان میں بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ فرمائشی بناتی جاتی ہوں۔ یوں رات کو تھکن سے چور ہو کر بستر پر گر جاتی ہوں.... مگر پھر اٹھ اٹھ کر نمک والا گوشت' شامی کباب کا آمیزہ چولہے پر رکھے ہوتے ہیں انہیں بھی بار بار چیک کرتی رہتی ہوں۔ یوں ایک ہنگامہ خیز مگر خوشگوار مصروفیات والا دن اختتام پذیر ہوتا ہے۔

عیدالاضحیٰ پر قربانی کا اصل مقصد' مذہبی فلسفہ اور دینی فریضے کی ادائیگی کو فراموش نہ کریں بلکہ قربانی کا گوشت ڈیپ فریزر میں بھرنے کے بجائے اصل حق داروں تک پہنچائیں۔ قربانی کو اصل روح کے ساتھ انجام دینا اور اخلاص سے اچھے سے اچھا جانور' خوش دلی سے قربانی کے لیے خریدنے کا بہت زیادہ اجر ثواب ہوتا ہے۔ یہ ہر صاحب نصاب پر واجب ہے۔

(2) ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ضرور ہوتی ہے' جو خاص مواقع پر بنائی جاتی ہے بلکہ فرمائش کرکے بنوائی جاتی ہے۔ ہر سال بقرعید پر ہمارے گھر بھی کچے قیمہ کے کباب بنائے جاتے ہیں جو بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں۔

بقرعید کی خریداری میں' میں سلاد کا سامان اور مختلف فروٹس بہت زیادہ خریدتی ہوں۔

میرے بچے عید پر گوشت بالکل نہیں کھاتے انہیں تازہ گوشت سے ایک عجیب سے اسمیل آتی ہے۔ اس لیے ہر سال ان کے لیے میں کچے قیمہ کے کباب مختلف مسالا جات شامل کرکے مختلف شیپ اور مختلف ناموں سے بنانے لگی۔ میں نے انہیں اسٹک کباب' مٹھی کباب' سیخ کباب' گولہ کباب' چپلی کباب کا نام دیا۔ اور ہر بار انہیں مختلف ترکیبوں کے ساتھ تیار کیا۔ ہر مرتبہ الگ لذت اور مختلف ذائقہ ملا... بچوں کو یہ کباب' بن کباب' برگر' کباب رول اور کباب پراٹھا کی صورت میں دیا جاسکتا ہے۔ مختلف قسم کی چٹنیاں' رائتہ' سلاد اور کیچپ کے ساتھ بہت ہی مزہ دیتے ہیں۔ (بھئی یہ عید آنے میں کتنے دن باقی ہیں بھلا؟)

بقرعید پر میں گوشت سے زیادہ فروٹ کھاتی ہوں.... عام دنوں میں بھی میرا یہی حال ہے۔ بھوک لگی' ایک کیلا کھا لیا' کبھی سیب اور کبھی چند دانے انگور.... چلو جی لنچ ڈنر کی چھٹی.... ناشتا تو ویسے ہی ایک گلاس ملک شیک پر مشتمل ہوتا ہے۔ اپنی آزمودہ ڈشز کی ترکیبیں حاضر خدمت ہیں۔

ملائی سیخ کباب

ضروری اشیاء :

کچا صاف گوشت	ایک کلو
ادرک لہسن	چار ٹیبل اسپون
کٹی مرچ' کٹا زیرہ	حسب ضرورت
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	ایک چمچہ
گرم مسالا (پسا ہوا)	ایک چمچہ
ہری مرچ	چھ عدد
ہرا دھنیا	دو چمچے
نمک	حسب ضرورت

ترکیب :

یہ سب چیزیں گوشت سمیت چوپر (chopper) میں ڈال کر باریک پیس لیں۔ اس آمیزے میں لیموں کا رس ' سویا سوس ' کارن فلور ' چلی ساس ' چاٹ مسالا اور 3 اسپون ملائی ملا کر لمبوتری شیپ بنالیں اور ڈیپ فرائی کرلیں۔ سلاد ' مایونیز ' کیچپ اور املی کی چٹنی کے ساتھ سرو (Serve) کریں اور خوب داد سمیٹیں.... یہ بہت ذائقہ دار بنتے ہیں اور خوب کھائے جاتے ہیں۔

بوٹی مسالہ

صاف گوشت کا پارچہ لے لیں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنالیں۔ پھر اوپر درج.... تمام مسالا جات ملا کر گوشت کی بوٹیاں ایک گھنٹہ کے لیے فرج میں رکھ دیں۔ (علاوہ ہرا دھنیا اور ہری مرچ کے سب مسالے مناسب مقدار میں شامل کر لیں)

پھر ایک دیگچی میں یہ آمیزہ ڈال کر چولھے پر چڑھا دیں۔ آنچ ہلکی کردیں۔ یہ گوشت اپنے ہی پانی میں گل جائے گا۔ جب پانی خشک ہو جائے تب تھوڑا سا آئل ڈال کر بھون لیں اور چپاتی ' سلاد ' رائتہ کے ساتھ نوش کریں۔ کولڈ ڈرنک بھی انجوائے کریں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(3) عیدالاضحیٰ کے موقع پر مہمانوں کی تواضع کے لیے آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ میٹھے میں کیا بناتی ہیں؟

ج ۔ عیدالاضحیٰ پر ہر گھر میں خواتین پر کام کا اضافی بوجھ ہوتا ہے۔ گوشت کی تقسیم ' حفاظت ساتھ ساتھ مہمانوں ' عزیز واقارب کی آمد ورفت بھی جاری رہتی ہے۔ سلیقہ مند ' سمجھ دار خواتین ہر پہلو سے اپنا کام خوش اسلوبی سے نپٹاتی ہیں۔ میں بھی عید کی آمد سے پہلے ہی ضروری مسالہ جات پیس کر رکھ لیتی ہوں۔ پیاز فرائی کرکے ' ادرک لہسن پیس کر رکھنا اور برتنوں کی دھلائی ' دسترخوان وغیرہ نکالنا مختلف قسم کی چٹنیاں بنا کر فرج میں رکھ دیں۔ چاول بھی صاف کر کے رکھ لیتی ہوں یہ سب کام عید سے ایک دن پہلے کرتی ہوں عید والے دن جب قربانی کا گوشت مل جاتا ہے۔ پلاؤ کی یخنی چڑھا دیتی ہوں ۔ گوشت کی بوٹیوں میں مسالہ ملا کر میرنیٹ کر لیتی ہوں ' قیمہ بنا کر سب مسالے ملا کر بھی فرج میں رکھ لیے۔ ایک طرف شامی کباب بنانے کے لیے گوشت اور چنے کی دال مسالہ ڈال کر چولھے پر چڑھا دیے .... سلاد تیار کر کے فرج میں رکھ دیا۔

(اس کام میں غنویٰ کی مدد بھی شامل ہوتی ہے) یوں پہلے سے ہر کام کی منصوبہ بندی کرلی۔ جیسے ہی مہمان گھر پر آئے۔ جھٹ پٹ کباب ' پلاؤ دھواں گوشت تیار .... مہمان بھی حیران کہ کیا جادو کیا ہے۔ مگر یہ سچ ہے۔ میں ہر عید پر اسی طرح اپنے فرج میں ہر چیز ریڈی رکھتی ہوں۔

عید کے تینوں دن مہمانوں کی خوب خاطر مدارت ہوتی ہے۔ گھر آئے مہمان بھی خوش اور اللہ بھی خوش۔ اتنا زیادہ کام کرنے سے میں تھک تو ضرور جاتی ہوں مگر پھر مہمانوں کی آؤ بھگت کی خوشی ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ اور سب کے چہروں پر خوشی اور شکر گزاری دیکھ کر میری سب تھکن اتر جاتی ہے۔ سب کام خوش اسلوبی سے ہونے پر میں رب کریم کا شکر ضرور ادا کرتی ہوں۔ (دو رکعت نفل پڑھ کر) گھر والوں کے لیے اور مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے میٹھے میں میں دودھ دلاری بناتی ہوں۔ چونکہ یہ نمکین عید ہوتی ہے۔ اس لیے میٹھا بہت پسند کیا جاتا ہے ' شوق سے کھایا جاتا ہے۔

دودھ دلاری

(یہ سویٹ ڈش میں اپنی بنائی گئی ریسپی سے تیار کرتی ہوں)۔

2 کلو دودھ ہلکی آنچ پر شکر ڈال کر گرم کرلیں۔ جب خوب گرم ہو کر آدھا رہ جائے تو اس میں تھوڑی سی رنگین سویاں ' بادام پستے کشمش ' پسی سبز الائچی پسا کھوپرا ڈال کر پکائیں۔ پھر کھویا اور کچھ موسمی فروٹ بھی شامل کردیں۔ فریزر میں رکھ کر خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔ بہت ہی ٹیسٹی میٹھی ڈش تیار ہو جائے گی۔

ملائکہ کوثر.... بسم اللہ پور

سب سے پہلے پیاری قارئین بہنوں اور ادارے کے تمام اراکین کو عیدالاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔

(1) جب ہم قربانی دیتے ہیں تو گوشت بیٹے اور شوہر نامدار صاحب تقسیم کرتے ہیں۔ باقی کا سارا کام میرے نازک کندھوں پر ' میری بیٹی ثمرہ صاحبہ تو پاس بھی نہیں پھٹکتیں گوشت کے۔ (پسند جو نہیں) فرماتی ہیں کاش کہ مرغی کی قربانی ہوتی "ہاں! تاکہ گھر والے خود ہی کاٹ کر بھون کر کھا جائیں۔ یہ قربانی تو نہ ہوتی۔ ون ڈش ڈے ایونٹ ہوتا۔" میں گھر کتی ہوں۔ اللہ سوہنے نے جو نظام بنایا ہے وہی احسن ہے۔ گوشت کی تفصیلی صفائی کے بعد (چربی الگ

کرنا) دھو کر پیکٹ بنانا۔ پلاؤ کے لیے ہڈی والا اور کباب کے لیے بغیر ہڈی کا گوشت فریز کرنا۔

ہم اپنے حصے سے بھی کم گوشت رکھتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو اس میں سے بھی کسی حاجت مند کو دے دیتے ہیں۔

عید قربان کی روح بھی یہی ہے یعنی قربانی۔ جب کسی وجہ کی بنا پر قربانی نہ کر پائیں تو پھر بڑا آرام.... نہیں بھئی بڑا کام ہوتا ہے۔ قربانی نہیں ہوتی تو گوشت زیادہ آتا ہے گھر میں۔ ہے نا گنگا الٹی بہنے والا حساب۔

(2) ہم سیدھے سادے سے دیہاتی لوگ ہیں۔ سادہ کھانے ہی پسند کرتے ہیں۔ عید یا کسی تہوار پر مسالے والے بھی چل جاتے ہیں۔ ترکیب دے رہی ہوں اگر کسی بہن کو پسند آجائے تو مہربانی نوازش۔

نمکین گوشت

پکاتے وقت زیادہ پانی نہیں ڈالتے کیونکہ قربانی کا گوشت نرم ہوتا ہے، ہانڈی میں گوشت پانی ڈال کر لکڑیوں کی آگ جلا کر چولھے پر رکھ دی۔ ساتھ ادرک لہسن کا پیسٹ، نمک اور کالی مرچ پسی ہوئی حسب منشاء ڈال دی۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے۔ ٹماٹر یا دہی اور تھوڑا سا گھی ڈال کر (قربانی کے گوشت میں چکنائی زیادہ ہوتی ہے) بھون لیں اتار کر تھوڑا سا گرم مسالا چھڑک دیں۔ بغیر نان، چپاتی کے بھی یہ گوشت کھانے میں مزے کا لگتا ہے۔ یہ پہلے دن کی ڈش ہے دوسرے دن پلاؤ بننا ہے لازمی۔

(3) گاؤں میں ہمارے رشتہ دار نہیں ہیں مگر گاؤں کے باسی رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں، ہر رنج والم، راحت و خوشی میں کام آنے والے۔ عید کا خوب صورت تہوار ہو اور خاطر مدارت نہ ہو آنے والوں کی ناممکن۔ شوہر جی کے دوست اگر کھانے کے وقت آئیں تو سالن، روٹی، سلاد اور میٹھے سے خاطر تواضع کرتے ہیں اگر امی جان مرحومہ (ساس) کی ملنے جلنے والی آئیں یا میری اور ثمو کی دوستیں تو انہیں مٹھائی، نمکو، کولڈ ڈرنک پیش کی جاتی ہے سب سے زیادہ خوشی تو ان دوستوں سے بغلگیر ہو کر ہوتی ہے جو بیاہ کر دور چلی گئی ہیں۔ سال بعد ملنا ہوتا ہے۔ کھانا، پینا، دانہ پانی جو کھاتے یا کھلاتے ہیں وہ تو مقدر کا۔ ملن کی خوشی، مسرت کا جو ملے، ایک دوسرے کو پہناتے ہیں، وہ بڑا انمول ہوتا ہے۔

میٹھے میں ہمارے ہاں بنتی ہے۔ پہلے دن کھیر۔ دوسرے دن کسٹرڈ۔

ہر پل، ہر گھڑی سوہنے رحمان کی اطاعت گزاری میں گزارنی چاہیے بشر کو۔ "پیارے رب کریم تیرا بے حد و حساب شکریہ ہر اوینٹ کے لیے، ہر خوشی کے لیے جو نے ہمیں فراہم کی اور اس زندگی کے لیے جو تو نے ہمیں بخشی۔ اس وطن عزیز کی مٹی کے لیے جو ہمیں میسر آئی۔ تو ہمیشہ سے اپنی آغوش میں چھپائے رکھنا حاسدین سے بچا کر (آمین)

عابدہ مقبول چودھری

(1) پہلا سوال کہ عید کا دن کیسا گزرتا ہے تو جی کچھ خاص نہیں چونکہ یہ عید قربان ہوتی ہے۔ تو اس پہ کچھ زیادہ اہتمام نہیں ہوتا۔

سب سے پہلے تو امی جان سویاں بناتی ہیں، ہم جنہوں نے رات بھر مہندی لگائی ہوتی ہے سب کزنز کو تو بس آنکھوں میں نیند کا خمار پھر گھر کی صفائی اور مردوں کی عید گاہ جانے کی تیاری۔

کسٹرڈ ہم رات کو ہی بنا کر فریز کر دیتے ہیں۔

دودھ والا حلوہ کبھی میں اور کبھی امی بنا لیتی ہیں، دس بجے کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے سو ان کی خدمت وغیرہ۔ پھر بعد میں ہلکا پھلکا تیار ہونا۔ عید کی شام کزنز آجاتی ہے تو باہر کھیتوں میں گھومنا پھرنا عید الاضحیٰ پر عموماً" عیدی دوسرے دن ملتی ہے اس لیے انتظار نہیں ہوتا۔

بچپن میں گوشت کی تقسیم میں حصہ لیتے تھے۔ بہت شوق ہوتا کہ ہم ہمسایوں، رشتہ داروں کو گوشت دے آئیں اور ہم کرتے بھی تھے لیکن اب تو بس دور دور سے نگرانی ہوتی ہے اور عید کے دوسرے دن ہم کزنز وغیرہ سے ملنے جاتے ہیں۔

(2) کڑاہی گوشت عید کے دن ضرور بنایا جاتا ہے اور یہ صرف ہمارے گھر میں ہی نہیں تقریباً" تمام خاندان میں بنائی جاتی ہے۔ دوسرے دن شامی کباب اور پلاؤ ہر دفعہ اکٹھے ڈیسائیڈ کر کے کوئی نہ کوئی ڈش بنائی جاتی ہے۔ اور ڈش کا فیصلہ شعاع یا خواتین میں چھپنے والی ریسیپیز کے بعد ہی ہو گا۔

(3) یہ تو مہمانوں کی آمد پر انحصار ہے کہ وہ کس وقت پر آتے ہیں، رات کو کسٹرڈ بناتے وقت خصوصی طور پر دو ڈونگوں میں فریز کرتی ہوں، ایک فیملی کے لیے اور دوسرا

مہمانوں کے لیے۔ اس لیے اکثر مہمانوں کو کولڈ ڈرنک چائے، سویٹس، حلوہ یا کسٹرڈ پر ٹرخا دیا جاتا ہے اور کچھ مہمانوں کی تواضع دوپہر کا کھانا اگر وقت ہو۔
اور ہمارے وہ مہمان جو قربانی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں ہمارے صحن میں، مثلاً" چاچو اور ان کے بیٹے وغیرہ تو ان کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔

شگفتہ ماہ جبیں.....چیچہ وطنی

(1) عید کا دن عام دنوں سے ہٹ کر ایک الگ قسم کی دلکشی اور سرشاری لیے آتا ہے۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد باقی بچے ہوئے کام مکمل کرتی ہوں۔ میٹھا تو امی ہی بناتی ہیں شروع سے "اس لیے صفائی اور دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ خود کی تیاری بھی بھرپور انداز میں کرتی ہوں۔ قربانی کے گوشت کی صفائی اور تقسیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہوں۔ عید کے دن تو مصروفیات بہت زیادہ ہوتی ہیں اور پھر کزنز آجاتے ہیں عید ملنے اس کے بعد مجھے اپنی پیاری لاڈلی (مانو) کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ وہ جب آتی ہے تو پھر میں اور شائستہ اور اریبہ (مانو) خوب انجوائے کرتے ہیں۔ کھانا وغیرہ بھی عید کے روز کی مناسبت سے تیار کرتی ہوں۔

(2) ہمارے ہاں عید پر ہر بار بڑے گوشت کی کڑاہی بنائی جاتی ہے جو کہ سب کی دل پسند ہے۔ اس کی ترکیب درج ذیل ہے۔

بڑے گوشت کی کڑاہی

ضروری اشیاء :

گوشت	ایک کلو
پیاز باریک کٹی ہوئی	دو عدد
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چمچہ
ٹماٹر (چھلکا اتار کر)	دو عدد
ہرا دھنیا	ایک کپ
دہی	ایک کپ
خشک دھنیا، ہری مرچ کٹی ہوئی	
ہلدی، سرخ مرچ، نمک حسب ضرورت	

ترکیب :

دو بڑے چمچے گھی میں پیاز تل کر سرخ کرلیں، ساتھ گوشت ڈال لیں لہسن ادرک پیسٹ شامل کر کے دو پیالی پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی خشک اور گوشت گل جانے پر سرخ مرچ، دہی، ہلدی، نمک، ہری مرچ، ٹماٹر باریک کاٹ کر شامل کریں 10 منٹ تک پکنے دیں۔ جب گھی کنارے چھوڑ دے سبز کٹا ہوا دھنیا، پسا ہوا گرم مسالا اور سوکھا دھنیا ڈال کر 2 منٹ کے لیے ڈھانپ دیں۔ لیجیے آپ کی مزیدار کڑاہی تیار ہے۔ گرم گرم چپاتی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

(3) زیادہ تر مہمان تو عید کے روز صبح سویرے ہی آتے ہیں تو ان کے لیے میٹھا جو کہ امی بناتی ہیں کھیر یا پھر پھینیاں پر مجھے زیادہ پسند۔ پھینیاں ہیں۔ وہ مہمانوں کو پیش کرتی ہوں۔ کولڈ ڈرنک تو بنیادی ضرورت ہوتی ہے ساتھ میں ادھر ادھر کی باتیں، کوئی قریبی مہمان ہوں جن کی

شازیہ الطاف ہاشمی۔ شجاع آباد

1۔ عیدیں دونوں ہی پیاری ہوتی ہیں میں ہر عید کو یادگار عید کے طور پر مناتی ہوں تو بھئی ہر عید سال میں ایک بار ہی آتی ہے، اور الطاف اس سلسلے میں میرا خوب ساتھ دیتے ہیں کبھی ملتان چلے گئے، کبھی چناب دریا کے کنارے کبھی بہاولپور یا کوئی بھی اچھا سا پکنک اسپاٹ، بہت اچھی جگہ جہاں اچھا کھانا ملتا ہو اور ماحول خوش گوار ہو، کسی نہر کا کنارہ ہو یا کسی دریا کا سائیڈ پارک ہم ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور پُر فضا مقامات کی تلاش میں رہتے ہیں۔
اس دفعہ بہاول پور گئے تھے اور راستے میں، میں نے اتنی یونیک قسم کی سیلفیاں بنائی تھیں کہ خود بھی حیران تھی مگر گھر آکر چیک کیا تو ساری کی ساری نجانے کیسے ڈیلیٹ ہو چکی تھیں ویسے مجھے بڑی عید بکرے کے ساتھ زیادہ پسند ہے کیونکہ گوشت وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ تازہ اور گھر کا اپنے ہاتھ سے ذبح کیے بکرے کی کلیجی کھانے میں جو مزا ہے وہ کہاں ملتا ہے۔ اف میں بہت خوش ہوتی ہوں اور بکرے کے ذبح ہوتے وقت جس طرح بہت سی خواتین ڈرتی ہیں۔ میں ڈرتی بھی نہیں (ویسے مردوں کے ذبح کرتے وقت اندر ہوتی ہوں پھر جب میاں کلیجی گوشت وغیرہ لا دیتے ہیں پھر باہر نکلتی ہوں ورنہ اندر۔)

2۔ بڑی عید پر میں خود بھی مہمان بن کر جاتی ہوں بلکہ دعوتیں چلتی رہتی ہیں اور دوسروں کو بھی مدعو کرتی ہوں میری پیاری دوست فوزی مجھے اپنے گھر بلا لیتی ہے یا میں اس کے گھر چلی جاتی ہوں۔ اس کے علاوہ اور بہت سارے

الطاف صاحب کے دوست ہیں جن کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے اور دوسروں کی دعوتوں کے لیے بھی اہتمام سے حاضر خدمت رہتی ہوں۔

3۔ گھر جب کوئی مہمان آتا ہے تو اس کے لیے مٹن پلاؤ بناتی ہوں میرے ہاتھ کے پلاؤ کی سب تعریف کرتے ہیں چاہے وہ چکن پلاؤ ہو یا مٹن پلاؤ ہر طرف سے تعریف ہی وصول ہوتی ہے اس کے علاوہ رائتہ 'مٹھائی' کوک 'پھل زردہ یا شیر خرما' گلاب جامن 'بسکٹ' چائے وغیرہ چاکلیٹ کیک' اسٹرابیری کیک 'رس گلے اور چاولوں کی کھیر وغیرہ وغیرہ کو آپ مٹن کا سالن اور نمکین گوشت سمجھ لیں۔

4۔ خاندان میں تو گوشت آیا اور سالن بنا لیا اور ساتھ گرم گرم روٹیاں بعد میں پلاؤ' جہاں تک میں سمجھتی ہوں' جانتی ہوں سب بھنا گوشت ہی پکاتے ہیں۔ وہ رج کے کھا لیا پھر بہت سارا گوشت شامل کر کے پلاؤ' نہ کوفتے نہ ٹکیاں نہ چاؤ من نہ ہاؤ من نہ پاؤ من' نہ برجانیاں بروسٹ (بروسٹ بازار سے آتا ہے) نہ دیگی قورمے نہ اچاری ہانڈی (ایہہ کی بجھ لیا جے؟) میں نے اب چکن کڑاہی سیکھی ہے۔ سیکھی کیا خواتین سے ریسپی نوٹ کی اور اب بنا لیتی ہوں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ گوشت میں اچار بھلا کوئی تک ہے۔ گوشت میں ملائی' دودھ میں گوشت کیسے پک سکتا ہے جی؟ سادے سے لوگ ہیں سادے سادے سے کھانے پکاتے ہیں 'محنتوں مشقتوں میں پڑنے کے بجائے صاف ستھرا سادہ کھانا پکا کے پرے ہو گئے۔

4۔ تہوار تو سارے ہی عورتوں کے ہوتے ہیں اور کچن میں ہوتے ہیں انہوں نے ہی پکانا ہے اور مردوں 'بندوں' نے کھانا ہے۔ میرے میاں میرا ہاتھ یوں بٹاتے ہیں کہ گوشت لا کے اندر رکھا اور گند گوبر خون وغیرہ فوراً "غائب" کر دیتے ہیں کیونکہ فاطمہ اور آمنہ ڈر جاتی ہیں اور پھر گوشت کے قریب بھی نہیں پھٹکتیں 'کھاتی وہ پھر بھی نہیں مگر ہم فوراً "گندگی سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد پکانے 'بانٹنے کا مرحلہ آتا ہے۔ باقی گوشت میں خود سنبھالتی ہوں سپائپ لگا کر فرش دھونے کے بعد خود بیٹھ کر گوشت کے حصے بناتی ہوں۔ کلیجی چڑھا کر گوشت تقسیم کرنے نکل جاتی ہوں۔ میرے لوٹنے تک گوشت یعنی کلیجی گل جاتی ہے پھر پھلکے ڈال لیتی ہوں۔ اس کے بعد شام تک گوشت مختلف دوستوں 'ہمسایوں تک پہنچانے کا

سلسلہ جاری رہتا ہے۔

میرے میاں بیٹھے بیٹھے منگواتے رہتے ہیں۔ پلاؤ‘ بھنا گوشت‘ نمکین گوشت‘ بچوں کے لیے چکن آتا ہے جو علیحدہ دیگچیوں میں پکتا ہے مگر اس دن وہ ذرا کم کم کھاتی ہیں۔ کیونکہ انہیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں میں مٹن والا چمچہ چکن والے سالن میں نہ ہلادوں۔ فاطمہ اور آموں مجھے نظروں میں رکھتی ہیں کہ کہیں چکن میں مٹن کا شوربہ تو نہیں ڈال دیا۔ باقی میں شوق سے کھاتی ہوں اور مناسب کھاتی ہوں اور کھلاتی ہوں۔

5۔ عیدالاضحیٰ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ شادی کے شروع میں پہلے چار پانچ سال اکٹھے رہے قربانی مل کے کرتے تھے۔ اس کے بعد اب کوئی پانچواں سال ہے۔ ہم علیحدہ ہیں اور اپنا بکرا لیتے ہیں۔ میرے لیے سب سے یادگار قربانی پہلی قربانی تھی جب ہم نے مناسب سا بکرا خریدا تھا دوپہر کے وقت میری دیورانی نے مجھ سے پوچھا کہ کتنا گوشت باقی ہے تو میں نے اسے دیگچی میں بھنا گوشت (تقریباً ”آدھا کلو ہوگا) وکھایا تھا۔ کھا۔ کہ بس یہی بچا تھا۔ میں نے اپنے حصے سمیت سب بانٹ دیا تھا۔ وہ عید میری یادگار عید تھی۔ سب حیران تھے اور میں خوش تھی (رب راضی تے اسیں راضی) بس وہ عید آج تک نہیں بھولی۔ میں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مجھے بکرا دے گا تو میں سارا گوشت بانٹوں گی۔ اس کے بعد سے آج تک کبھی بریک نہیں آیا بکرا ہوتا ہے اور ہر سال ہوتا ہے‘ اپنا حصہ رکھ کے سارا بانٹ دیتی ہوں اور اللہ مجھے مایوس نہیں کرتا نہ کبھی کرے گا اور اللہ میرا سروے بھی ضرور شامل کروائیں گے کیونکہ مجھے امید ہے اور امید پر دنیا قائم ہے۔

نوال افضل گھمن..... لاہور

(1) جی جناب بڑی عید‘ عید قربان‘ بکرا عید یعنی سنت ابراہیمی کی ادائیگی کا موقع عظیم..... جناب اللہ کریم کے فضل و کرم سے یہ کام یعنی تقسیم گوشت کا سلسلہ والدہ ماجدہ ہی اپنی ڈیوٹی میں نگران اور ہم ایک سعادت مند ملازم کی حیثیت سے نبھاتے ہیں..... گھر کا پالا ہوا بکرا جس کو فیملی ممبر کی حیثیت سے پورا سال اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کی صحت ہی ضامن ہوتی ہے کہ واقعی ہی کسی نے بہت پروا کی ہے بکرے صاحب کی..... مجھے اچھی طرح یاد ہے‘ دلال نہ بھولنے پہ کتنی زیادہ ڈانٹ کا استقبال بہت بڑے صبر سے کرنا پڑتا تھا۔

قربانی اپنے ہی صحن میں کی جاتی ہے۔ مسجد گھر کے قریب ہے لہٰذا..... امام صاحب جلد ہی تکبیر کے لیے ہاتھ آجاتے ہیں..... پھر میرا وہ بکرے کے ذبح ہونے پر اور ہچکیاں زیادہ لے لے کر رونا سب کو ہی مذاق کا مفت موقع نصیب ہوجاتا تھا..... بہت یاد آتا ہے یہ قربانی کا انداز جو والدین کے گھر ہی رہ گیا..... سسرال والے قربان گاہ میں ہی گائے لے کردے آتے ہیں اور پھر سہ پہر کو گوشت کا حصہ بڑے برتن میں آجاتا ہے..... میرے ذمے جتنی ذمہ داری ہوتی ہے‘ ہم نبھا لیتے ہیں۔ ویسے پچھلی عید انگلینڈ کے شہر لندن میں گزاری..... آہ بہت سردی تھی اور کمیونٹی سنٹر کا رش‘ او مائی گاڈ.....

(2) گوشت بہت زیادہ پسند نہیں مگر قربانی کا گوشت بابرکت ہوتا ہے مگر مجھے کالی مرچ میں پکا ہوا مٹن پلاؤ بہت پسند ہے۔ جو ماریہ کے ہاتھ سے بنتا ہے۔ اور پھر سبز مٹن ہانڈی بہت پسند ہے۔

(3) ہمارے خاندان کی روایتی ڈش ہرا مٹن پکوان ہے جس کی ترکیب درج ذیل ہے۔

سبز مٹن ہانڈی..... GREEN MUTTON

اجزاء ترکیبی:

بکرے کا گوشت	1 کلو
پیاز	ایک کپ تلی ہوئی
ہری مرچیں	6 عدد کٹی ہوئی
پودینے کے پتے	آدھا کپ
دہی	ایک کپ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک و لہسن	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھا کپ (کٹا ہوا)
ہری پیاز	آدھا کپ (کٹی ہوئی)
ہری مرچ	چار عدد (ثابت)
ہلدی	آدھا چمچہ
آئل	ایک کپ

ترکیب :

گوشت کو دھو کر صاف کرلیں۔ اب اس میں نمک سرخ مرچ ڈال کر چولہے پر رکھیں۔ پانی نہ ڈالیں ہلکی آنچ پکنے دیں۔ جب گوشت کا اپنا پانی خشک ہوجائے تو اتار لیں۔ اب مٹی کی ہانڈی لے کر اس میں گوشت ڈال دیں۔

تلی ہوئی پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ، ہری پیاز اور دہی بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کرلیں۔

پھر یہ آمیزہ گوشت میں ڈال دیں۔

ساتھ ہی ادرک و لہسن پیسٹ، ہلدی، دھنیا پاؤڈر اور آئل ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔

آدھے گھنٹے کے لیے پڑا رہنے دیں پھر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ جب گوشت گل جائے اور آئل چھوڑ دے تو اچھی طرح بھون لیں۔

پھر ثابت ہری مرچ ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھیں۔

(ج) گوشت کی تقسیم بڑوں کی ذمہ داری ہے ہم صرف گلی گلی اور محلے داروں میں بڑی ٹرے میں حصے کرکے، رکھ کر بانٹ آتے ہیں۔

افشین فاروق

(ا) عید کا دن نماز کے بعد قربانی کی تیاریاں کرتے ہوئے گزرتا ہے پھر جناب اللہ اللہ کرکے قربانی ہوتی ہے اللہ قبول فرمائے۔ (آمین)

پھر جناب سب سے پہلے کلیجی آتی ہے اور میں پکانے کی تیاری کرتی ہوں کیونکہ مرد حضرات تھک کر کلیجی کھاتے ہیں۔ اس میں دل بھی ڈال دیتے ہیں اور سلامی کا گوشت بھی ڈالتے ہیں کافی بڑی مقدار میں بنتی ہے تاکہ تمام کام کرنے والے حضرات کھاسکیں۔ میری نندیں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ ہم سب مل کر کام کرتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہوکر گوشت کے حصے کا کام شروع ہوتا ہے۔ حصے بننے کے بعد اپنی مرضی کا گوشت بنا کر رکھنا میرا کافی لمبا کام ہوتا ہے، اس لیے پہلے گوشت کے تین حصے کرنے کے بعد انہیں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کے بعد چائے اور مٹھائی، نمکو اور کباب جو کہ میں پہلے ہی سے بنا کر رکھتی ہوں مہمانوں کی خاطر ہوتی ہے تاکہ سب تازہ دم ہوجائیں۔

اس کے بعد سب چلے جاتے ہیں تو پھر میں اپنے حصے کی طرف توجہ دیتی ہوں۔ بچے تکے کے حساب سے گوشت کی بوٹیاں بناتے ہیں اور میں روز کے حساب سے گوشت کے پیکٹ بناتی ہوں۔ تھوڑا قیمہ بنا کر پیکٹ میں رکھ دیتے ہیں۔

کچھ پسندے قصائی سے بنوالیتی ہوں، اس طرح گوشت کو ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔ رات کو سیخوں پر گوشت لگا کر انگیٹھی پر باربی کیو ہوتا ہے کافی بڑی انگیٹھی ہے اس میں کوئلے ڈالتے جاتے ہیں، سلاد چٹنی کولڈرنک وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ شام کو میرے بھائی عاصم، بہن نرگس اور ولید، نمرہ میرے بھانجے بھانجی، امی آتی ہیں۔ وہ لوگ باربی کیو کے بہت شوقین ہیں، خاص طور پر میرے بھائی عاصم جنہیں ہم سب اس سال بہت مس کریں گے کیونکہ وہ کینیڈا چلے گئے ہیں وہ بھی عید پر سب کو بہت یاد کریں گے۔ پاکستان کے تہوار پاکستان میں رہ کر ہی بندہ انجوائے کرسکتا ہے۔ میرے بھائی بھابی کو عید مبارک، وہ بھی ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

اس کے ساتھ میں پلاؤ ضرور بناتی ہوں جو میرے فیملی ممبرز فرمائش کرکے بنواتے ہیں۔

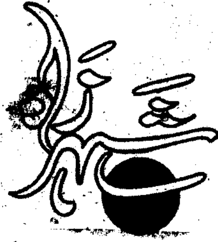
پلاؤ کی ترکیب :

سب سے پہلے گوشت کی ہڈیوں کو دھولیں یاد رکھیں ہڈیاں جال والی لینی ہیں اس میں ادرک لہسن، زیرہ اور دو پیاز ڈال کر پتیلی میں پانی ڈال کر یخنی بنالیں اور دوسری پتیلی میں گوشت آدھا رو کھا اور آدھا چکنائی والا لیں۔ اس کو بھی پتیلی میں پانی ڈال کر زیرہ، لہسن ادرک کا پیسٹ پیاز گرم مسالا ثابت، تیز پتے ڈال کر گلا لیں۔ اب ہڈی والی یخنی اس میں ملالیں یخنی کا سوپ اتنا کرلیں کہ چاول اس میں ٹوٹیں نہیں پھر الگ پتیلی میں ہری مرچ ہرا دھنیا پودینے کا پیسٹ بنا کر تیل تھوڑا سا ڈال کر گوشت کو بھون لیں۔ پسا گرم مسالا اور جائفل جاوتری، چھوٹی الائچی پیس کر شامل کریں ایک کلو گوشت میں 4 عدد ٹماٹر ڈالیں ایک ایک گڈی ہرا دھنیا، پودینہ، 12 ہری مرچ، چوتھائی اسپون کالی مرچ ڈالیں تمام مسالا بھون کر اس میں یخنی اور چاول ڈالیں پانی خشک ہوجائے تو دم دے کر رائتہ کے ساتھ کھائیں۔ یقین کیجیے بہت مزیدار پلاؤ بنے گا سب کو پسند آئے گا ضرور بنایئے گا۔

میٹھا میں زیادہ نہیں بناتی لیکن میری سسٹر نرگس میٹھا بہت اچھا بناتی ہیں اس لیے سب سوجی کا حلوہ فرمائش کرکے عید پر ان سے بنواتے ہیں۔ سویاں میں بنا کر رکھتی ہوں۔ صفائی ستھرائی میری عادت ہے میں ساتھ ساتھ کرتی جاتی ہوں۔



صائمہ اکرم چوہدری



شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔

خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے

رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے، لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

آٹھویں قسط

"مناہل آؤ ناں، بیٹھو ہمارے ساتھ۔" برہان زبردستی مسکرا کر بولے اور ساتھ ہی کن اکھیوں سے درشہوار کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔



وہ ملک شیک کے گلاس میں لاتعلقی کے ساتھ اسٹرا گھما رہی تھی۔ جیسے جان بوجھ کر مناہل کو نظرانداز کر رہی ہو۔ اس کا یہ رویہ برہان کے لیے ناقابل فہم تھا تو مناہل کے لیے بڑا ہی دل دکھانے والا۔

اس کے باوجود مناہل ڈھیٹ بن کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئی جبکہ درشہوار کے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی' زندگی اسے عجیب مقام پر لے آئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی کے روبرو ہوگی جس کی وجہ سے ہادی نے اسے بری طرح سے دھتکارا تھا۔

"کیسی ہو درشہوار! برہان بہت ذکر کرتے ہیں تمہارا؟" مناہل نے ہلکا سا جھجک کر اسے مخاطب کیا۔ جس کے چہرے پر لاتعلقی اور بے زاری کا تاثر بڑا واضح تھا۔ جیسے وہ اس سے بات کرنا تو دور کی بات دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھتی ہو۔

"فائن۔" درشہوار نے پاس رکھا اپنا سیل فون اٹھایا اور بے زاری سے فیس بک کھول کر بیٹھ گئی۔

"تم درشہوار کو چھوڑو' اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' یہ بتاؤ کیا لوگی؟" برہان نے آداب میزبانی نبھانے کی کوشش کی۔

"وہی جو ہمیشہ لیتی ہوں۔" وہ بڑی ادا سے مسکراتی ہوئی درشہوار کو مزید سلگا گئی۔

"سینڈوچ اور کافی۔" وہ مسکرا کر کھڑا ہوا اور کیفے ٹیریا کے سرونگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔

"تم نے برہان کو کہا' تم جانتی ہو مجھے' پوچھ سکتی ہوں' کیسے؟" مناہل نے ایک لمحہ اس کی سکڑی ہوئی گھنی بھنوؤں کو دیکھا اور ہموار لہجے میں گویا ہوئی۔

"شاید بھائی ہی سے ذکر سنا تھا۔" اس نے اپنی طرف سے ٹالنے کی بھرپور کوشش کی۔

"لیکن مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم کسی اور حوالے سے بھی جانتی ہو مجھے؟" درشہوار نے چونک کر مناہل کا چہرہ دیکھا اور فوراً نظریں چرا گئی۔ بلاشبہ وہ واقعی ایک خوب صورت لڑکی تھی اور اگر ہادی اس پر مرتا تھا تو پھر تو واقعی اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" درشہوار صاف مکر گئی۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"آگے کیا ارادے ہیں تمہارے' میرا مطلب ہے برہان بتا رہے تھے رزلٹ آچکا ہے تمہارا۔"

"بھائی کیا ساری ہی باتیں آپ کو بتاتے ہیں؟" اس کے زہر آلود انداز پر مناہل کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہوا۔ اس نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا' اس کے ہر انداز سے ناگواری اور کوفت کا احساس چھلک رہا تھا۔

"آئی ایم سوری' شاید تمہیں اچھا نہیں لگا۔" وہ بری طرح سے خفت کا شکار ہوئی۔

"ناٹ ایٹ آل۔ مجھے کیوں برا لگے گا' ایکچولی' برہان بھائی کو زیادہ بولنے کی عادت نہیں' اس لیے سن کر تھوڑا عجیب لگ رہا ہے۔" درشہوار کو اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوگیا تھا۔ اس لیے دل پر جبر کر کے اس نے اپنے رویے کو ہلکا پھلکا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

"یہ سارے بھائی' اپنی بہنوں کے سامنے یونہی ایکٹنگ کرتے ہیں۔" مناہل زبردستی مسکرا کر گویا ہوئی۔ "لیکن میں تو سر کھالیتی ہوں ہادی کا' زبردستی سارے دن کی روداد سناتی ہوں اسے ....." وہ روانی سے بولتی ہوئی اس کا دل دھڑکا گئی۔

"کون ہادی؟" درشہوار کو لگا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔

"میرا بھائی' آج کل اس کی پوسٹنگ مری میں ہی ہے۔"

"کس ڈیپارٹمنٹ میں۔" درشہوار نے دل کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہوا۔

"فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ میں۔" مناہل کی اگلی بات نے گویا درشہوار کے سلگتے ہوئے اعصاب پر پھوار برسادی۔ دل ودماغ پر چھائی ہوئی ساری کثافتیں ایک لمحے میں دھل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مزاج نے مری کے موسم کی طرح اچانک پلٹا کھایا اور چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

"آپ کیا کر رہی ہیں آج کل؟" درشہوار کو ایک دم ہی اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

"ابھی ایم ایس کا تھیسس جمع کروایا تھا اور آج کل پی ایچ ڈی کا کورس ورک چل رہا ہے۔" مناہل نے تعجب سے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا' جو چند لمحے پہلے اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی لیکن اب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایلفی کی طرح چپک گئی تھی۔

"آپ آئیں ناں کبھی برہان بھائی کے ساتھ ہمارے گھر' مری میں۔" اس کی اگلی آفر پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"ضرور' کیوں نہیں۔" مناہل نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا' وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی تھی۔

"تم بھی آنا' اسلام آباد میں میرے ماموں ممانی کا گھر ہے' میں زیادہ تر وہیں ہوتی ہوں۔" اس نے بھی مسکرا کر اسے دعوت دی۔

"اور آپ کے پیرنٹس کہاں ہوتے ہیں؟" درشہوار کا بس نہیں چل رہا تھا اس کے حلق میں انگلی ڈال کر ساری معلومات ایک ساتھ اگلوا لے۔

"وہ سعودیہ میں ہوتے ہیں۔" مناہل نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اچھا لگا آپ سے مل کر۔" درشہوار کا انداز سراسر خوشامدی تھا' وہ تو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالیتی تھی' یہ تو پھر ہادی کی بہن تھی۔

اسی وقت برہان سیلف سروس کے تحت ایک ٹرے میں سینڈوچ اور کافی لیے وہاں چلے آئے۔ انہوں نے بہت دور سے درشہوار کو مسکراتے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ ورنہ وہ دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ مناہل کے سامنے اس کی بے رخی کو کیسے جسٹی فائی کریں گے۔

"بھئی مناہل تم کون سے لطیفے سنا رہی ہو میری بہن کو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے ٹرے میز پر رکھی۔

"آپ کی بہن تو ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے۔" مناہل کی تعریف پر درشہوار شرمائی جیسے یہ تعریف براہ راست ہادی کی طرف سے آئی ہو۔

"آخر' بہن کس کی ہے۔" برہان کے اترانے پر درشہوار نے چونک کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

برہان کا رویہ اس کے لیے بالکل نیا تھا' وہ مناہل کو جس والہانہ انداز سے دیکھ رہے تھے' اسے اپنے اندر ایک ساتھ کئی خطرے کی گھنٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر انابیہ کا افسردہ چہرہ ابھرا۔

"بھائی؟ آپ نے انابیہ کو ملوایا ان سے؟" درشہوار نے انجان بن کر پوچھا' ان کے چہرے کی رنگت لمحے بھر کو متغیر ہوئی' جسے درشہوار نے سیکنڈوں میں بھانپا تھا۔ برہان کو اس وقت انابیہ کا ذکر کوفت میں مبتلا کر گیا تھا۔

"ہاں' ایک بار۔" انہوں نے مختصراً جواب دیا۔

"وہ جو آپ کے چچا کی بیٹی تھی' میرا خیال ہے فرسٹ سمسٹر ہے اس کا۔" مناہل بڑے مزے سے سینڈوچ کھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، ہاں وہی۔" برہان نے بات کو ختم کرنے کی شعوری کوشش کی۔ "یہ کافی لونا ہے۔"

"بالکل لے رہی ہوں، درشہوار اگر تم یہاں ہو تو کل میریٹ میں ایک کنسرٹ ہے، وہاں ایک ساتھ چلتے ہیں، بہت مزا آئے گا۔" منائل کی آفر پر درشہوار کا دل بے اختیار دھڑکا اور اس نے فوراً امید بھری نگاہوں سے برہان کو دیکھا۔

"بھئی برہان کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" منائل نے فوراً ہی اس کی چوری پکڑی۔

"وہ ایکچولی بھائی کی پرمیشن کے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر اپنی مجبوری بتائی اور ساتھ ہی گیند برہان کے کورٹ میں ڈال دی۔

"ڈونٹ وری، میرے ساتھ جانے سے یہ منع نہیں کریں گے، کیوں برہان۔" منائل کے معنی خیز انداز پر وہ کھل کر مسکرائے۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، اگر درشہوار جانا چاہتی ہے۔" جواب حسب توقع ہی آیا تھا۔

"اب بتاؤ۔" منائل نے مسکراتے ہوئے درشہوار کا کھلتے گلاب جیسا چہرہ دیکھا، چند ہی منٹوں میں اس کے چہرے کی زردی بالکل غائب ہو چکی تھی۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے باہر کے سارے موسم، انسان کے اندر کے موسم کے تابع ہوتے ہیں۔

اس نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بھلا منائل کو کس طرح منع کر سکتی تھی جو ہادی کی بہن تھی اور ہادی وہ بندہ تھا جس کو پانے کے لیے وہ دنیا کا ہر حربہ آزمانے کو تیار تھی۔



شہرزاد نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

سامنے وقار درانی بڑی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ وقت بھی کتنا ظالم ہے۔ بڑے بڑے فاتح لوگوں کو ان ہی لوگوں کے قدموں میں گراتا ہے، جن پر وہ کبھی ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔

یہ وہی بریگیڈیئر وقار درانی تھے، جنہوں نے اپنی بیٹی کو اس قصے میں سے اس قدر صفائی اور مہارت سے نکالا تھا کہ ایک دفعہ تو شہرزاد کا باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہا۔

یہ وہی کنزہ کے والد تھے جنہوں نے راتوں رات اپنی بیٹی کا نام ایف آئی آر سے نکلوا کر سارے سسٹم کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی، جو کچھ عرصہ پہلے تک شہرزاد اور ٹینا بیگم کو کسی گنتی میں بھی رکھنے کے روادار نہیں تھے اور اس وقت وہ پورے آدھے گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

شہرزاد سلام کر کے عین ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ پورے ماحول پر ایک محسوس کی جانے والی تلخی کا راج تھا۔ چائے کی ٹرالی میں ساری چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں، کسی نے ان کو چکھا تک نہیں تھا۔

سامنے والے صوفے پر بریگیڈیئر وقار درانی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بے چین انداز میں اپنا دایاں پاؤں مسلسل ہلا رہے تھے، جو ان کے ذہنی اضطراب کی غمازی کر رہا تھا، دوسری طرف ٹینا بیگم ان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسلسل ان کے اعصاب کا کڑا امتحان لے رہی تھیں۔

"جی وقار صاحب! کیسے آنا ہوا...؟" شہرزاد نے انجان بننے کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

"آپ تو ایسے انجان بن رہی ہیں جیسے جانتی ہی نہیں...." وقار درانی بھی کسی سے کم نہیں تھے۔

"خیر جانتی تو میں سبھی کچھ ہوں، یہ اور بات ہے کہ اگلے بندے پر ظاہر نہ کروں۔" اس کے طنزیہ انداز پر وقار

رانی کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں پڑنے لگیں۔
"ارے نہیں' آپ غلط سمجھ رہی ہیں' ایسا کچھ نہیں ہے۔" انہوں نے گھاگ طریقے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔
"آپ کیا سمجھتے ہیں' اپنی بیٹی کا نام ایف آئی آر سے نکلوانے کے بعد بچالیں گے اسے۔" ٹینا بیگم کے ضبط کا پیمانہ چھلکا۔
"جسٹس محمود نے اس کا نام لیا ہی نہیں تھا۔" انہوں نے پہلو بدل کر اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔
"وقار صاحب وہ بات کریں' جس پر یقین آجائے۔" شہزاد نے بیچ میں لقمہ دیا۔
"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیرسٹر شیری۔" وہ اپنی بات پر ڈٹے ہوئے تھے۔
"لیکن آپ اور آپ کی بیٹی تو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ گاڑی اس وقت رومیصہ نہیں کنزہ چلا رہی تھی۔" ٹینا بیگم نے ناراض لہجے میں انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔
"دیکھیں مسز ہارون! آپ پرانی باتوں کو بھول جائیں تو بہتر ہوگا۔" انہوں نے نپے تلے انداز میں کہا۔
"دیکھیں وقار صاحب! نہ تو یہ معاملہ اتنا سیدھا ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہم لوگ اتنے سادہ ہیں جتنا آپ کا خیال ہے۔" شہزاد کے طنزیہ انداز پر خدشات کسی سنپولیے کی طرح ان کے اندر سرسرانے لگے۔
"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔" انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔
"سیدھی اور صاف بات ہے کہ اگر جسٹس محمود کے بیٹے کے قتل کے جرم میں میری بہن کو سزا ہوگی تو میں ہر اس بندے کو کورٹ میں گھسیٹوں گی جس کا اس کیس سے معمولی سا بھی تعلق ہوگا۔" شہزاد کے دوٹوک انداز پر اب بار گی ان کا دل بیٹھ گیا۔
"اور مجھے تو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ رومیصہ کو کڈنیپ کروانے میں بھی آپ کی بیٹی کا ہاتھ ہے۔" ٹینا بیگم کا اگلا وار خاصا کڑا تھا۔
"یہ آپ الزام لگا رہی ہیں میری بیٹی پر۔" وہ تڑپ کر بولے۔
"یہ الزام نہیں' حقیقت ہے' رومیصہ کے نمبر پر آنے والی آخری کال اسی کی تھی' میرے پاس سارا ریکارڈ موجود ہے۔" شہزاد کا دوٹوک انداز وقار درانی کے دماغ میں خطرے کی کئی گھنٹیاں بجا چکا تھا۔ معاملہ واقعی اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ بیٹھے تھے۔
"ضروری تو نہیں' کنزہ نے اس وجہ سے ہی کال کی ہو....." انہوں نے اپنی بیٹی کا دفاع کرنے کی کمزور سی کوشش کی۔
"اس کے ٹیکسٹ میسجز بھی موجود ہیں....." شہزاد نے ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔
"دیکھیں بیرسٹر شیری! میں آپ سے بار بار کہہ رہا ہوں' آپ پرانی چیزیں بھول جائیں' رومیصہ میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہے اور میں آج اسی معاملے کو سلجھانے کے لیے ہی یہاں موجود ہوں۔" وقار درانی نے دنیا جہان کی نرمی اپنے لہجے میں سمو کر کہا۔
ان کے اس انداز پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ شہزاد کے چہرے پر دوڑی جو وقار درانی کو مزید خفت میں مبتلا کر گئی۔ وہ بھی گھاگ انسان تھے اور جانتے تھے کہ اس وقت شہزاد ان کی اندرونی کیفیت سے محظوظ ہو رہی ہے۔
"معاملہ اسی صورت میں سلجھ سکتا ہے وقار صاحب' اگر آپ کنزہ کو پاکستان بلوائیں اور وہ اصل حقیقت کا اعتراف کرے۔" شہزاد کے بولنے سے پہلے ہی ٹینا بیگم ترخ کر بولیں۔
"کنزہ پاکستان نہیں آسکتی۔" ان کی پیشانی پر ناگواری در آئی۔

"خود غرضی کا عظیم مظاہرہ کرنے سے بھی مسئلے حل نہیں ہوتے' اگر آپ کی بیٹی پاکستان نہیں آسکتی' اصل بات نہیں بتاسکتی تو آپ ہم سے کیا امید لے کر آئے ہیں۔" ٹینا بیگم بگڑا ٹھیں اور چونکہ وہ بالکل ٹھیک بات کررہی تھیں اس لیے شہزاد نے بھی ان کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

"میں چاہتا ہوں' آپ کی مکمل مدد کروں لیکن میری بیٹی کا نام بیچ میں نہ آئے۔" انہوں نے پٹاری سے اصل بات نکالی۔

"بہت خوب۔۔۔" شہزاد ان کی بات پر یوں مسکرائی جیسے سمجھ گئی ہو کہ وہ انہیں بے وقوف بنانے آئے ہیں۔

وقار درانی کی پیشانی عرق آلود ہوئی' وہ ان دونوں خواتین کو سمجھنے سے قاصر تھے' ناں اگر بے حد جذباتی انداز میں بات کررہی تھی تو بیٹی کا ٹھہرا ہوا سپاٹ لہجہ بھی انہیں پریشانی میں مبتلا کررہا تھا۔

"بہت شکریہ وقار صاحب آپ کا۔۔۔" شہزاد ایک دم کھڑی ہوئی' وہ حیران رہ گئے۔

"کہاں جارہی ہیں آپ' میں یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے آیا ہوں۔" انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ مسئلہ آپ کی پسند ناپسند اور شرائط پر حل نہیں ہوسکتا' زندگی کے معاملات کچھ دو اور لو کے اصول پر ہی چلتے ہیں۔"

"اگر جسٹس محمود یہ کیس واپس لے لیں تو۔۔۔؟" انہوں نے اسے پردانہ ڈالنے کی کوشش کی۔

"تو ظاہر سی بات ہے اس میں صرف ہمارا ہی نہیں آپ کا بھی فائدہ ہے۔" شہزاد نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

"اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں فیملیز مختلف طریقوں سے جسٹس محمود کو پریشرائز کرنے کی کوشش کریں۔" انہوں نے مزید کہا۔

"آپ کو جسٹس محمود اتنے جذباتی اور امیچور لگتے ہیں جو لوگوں کی باتوں میں آکر ایک جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے نکال دیں۔" شہزاد نے ان کی تجویز کو ایک لمحے میں رد کیا۔

"جب بات پوری فیملی کی ریپوٹیشن کی آجائے تو انسان کو کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔" وقار درانی کی بات پر ایک لمحے کو چونکی۔

"اس پوائنٹ پر بندہ تبھی کھیل سکتا ہے جب وہ اندر کی بہت سی چیزیں جانتا ہو۔"

"میں جانتا ہوں مجھ سے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں ہے اس خاندان کی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

"تو ٹھیک ہے' آپ اس سلسلے میں تعاون کریں اور میں دیکھوں گی کہ کہاں کہاں پر آپ کی مدد کی جاسکتی ہے' چائے پئیں' مجھے کچھ ضروری کالز کرنی ہیں۔" شہزاد اپنی بات مکمل کرکے رکی نہیں اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس شخص کو کس طرح ڈیل کرنا ہے۔



پورچ سے اوپر جاتی سیڑھیوں کے نیچے بنی جگہ پر دبکے ہوئے انہیں کئی گھنٹے ہوچکے تھے۔ ایک ہی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ان کے جسم شل ہوگئے تھے۔ خدا خدا کرکے یہ رات گزری تھی' لیکن اس نے ان دونوں کو بری طرح تھکا دیا تھا۔

اس لڑکے نے جمائی لیتے ہوئے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھا' صبح کے چھ بج رہے تھے۔ آسمان کی ملگجی سیاہی' اجلی نیلاہٹ میں بدل چکی تھی' اس نے رومیصہ کی طرف دیکھا جو دیوار سے ٹیک لگائے اپنے گھٹنوں میں سردیے بے خبر سو رہی تھی۔

اسے بے ساختہ اس پر رشک آیا' وہ ساری رات ایک لمحے کو بھی اپنی آنکھیں بند نہیں کرپایا تھا۔

وہ باہر ٹین ڈبے بیچنے والے کی آواز سے جاگی اور نیند بھری آنکھوں سے دیکھا' وہ سامنے پورچ میں کھلنے والے دروازے کے قفل کے ساتھ طبع آزمائی کرنے میں مگن تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک تار تھا۔

"یہ کیا کررہے ہو؟" رومیصہ کی آواز پر وہ پلٹا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اٹس ناٹ فیئر..." وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

"بے وقوف لڑکی! پولیس باہر موجود ہے اور ہم کب تک اس پورچ میں چھپے رہیں گے۔" اس کی آواز میں بےزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ اسی وقت ٹک کی آواز سے قفل کھل گیا' اس کے چہرے پر بڑی فطری سی خوشی جھلکی۔

وہ اپنے ٹراؤزر کی جیبیں ٹٹولتا ہوا رومیصہ کے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "اٹھو اندر چلتے ہیں جیسے ہی پولیس یہ علاقہ خالی کرے گی میں تمہیں' تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی اندر۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"احمق لڑکی! تم خود بھی مروگی اور مجھے بھی مرواؤگی۔" اس کی آواز ایک دبی دبی غراہٹ سے مشابہ تھی۔

"میں نے تھوڑی کہا تھا اغوا کرکے لاؤ مجھے۔" وہ بھی اپنی پرانی جون میں واپس آرہی تھی۔

"واہ فارم ہاؤس سے نکلتے ہی چیونٹی کو بھی پر لگ گئے۔" وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"خود اپنی طرف بھی دیکھ لو' کیسے اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا کھڑا ہے۔" اس نے بھی دوبدو جواب دیا جسے سن کر وہ مسکرادیا۔

"اچھا اچھا دیکھ لوں گا' فی الحال اٹھو' ورنہ ہم کسی بڑی مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں اور میں تو ویسے ہی یتیم مسکین بچہ ہوں۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر رومیصہ کا بازو پکڑا تو رومی کو ایک دم جھٹکا لگا' اس کا ہاتھ گویا ایک جلتا ہوا انگارہ تھا۔ وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔

"تمہیں ٹمپریچر ہے..." وہ پریشان انداز میں خود ہی کھڑی ہوگئی۔

"ہاں تو؟" اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑا۔

رومیصہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا' اس کی سوجن زدہ آنکھیں رتجگے کی غماز تھیں' بال الجھے ہوئے اور ہونٹ خاصے خشک تھے۔ تھکن کسی اژدھے کی مانند اس کے سارے وجود کو جکڑے ہوئے تھی۔

"میرا معائنہ اندر جاکر کرلینا' جانتا ہوں' بہت ہینڈسم ہوں میں۔" اس نے اپنی نقاہت زدہ آواز میں اسے چڑایا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔"

وہ تپ کر اس سے آگے چل پڑی' جیسے ہی دونوں لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے' مسلن زدہ باس نے ان کا استقبال کیا' جو شاید زیادہ دیر تک گھر بند رہنے کی وجہ سے در و دیوار میں رچ بس گئی تھی۔ رومیصہ نے غیر شعوری طور پر ساری لائٹس آن کردیں۔

لاؤنج میں رکھے فرنیچر کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانکا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اس گھر کے مکین ایک طویل عرصے کے لیے یہاں سے گئے ہوں' باہر کی نسبت اندر کے حالات خاصے بہتر تھے' ہلکی ہلکی سی گرد ہر چیز پر لگی ہوئی تھی۔

اسی لاؤنج میں دو بیڈ رومز اور کچن کے دروازے کھلتے تھے جو خوش قسمتی سے لاک نہیں کیے گئے تھے' بیڈ رومز کی حالت بھی خاصی بہتر تھی۔ رومیصہ تو بڑے آرام سے بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی' ساری رات فرش پر بیٹھنے سے اس کی کمر تختہ بن چکی تھی اور اس وقت اسے بس دو ہی چیزوں کی طلب تھی ایک کھانے اور دوسری بھرپور نیند کی۔

"کیا ضرورت ہے کسی کی چیزوں کی تلاشی لینے کی۔" وہ ڈریسنگ اور سائیڈ میز کی درازوں کو کھنگال رہا تھا اور اس کی یہ حرکت رومیصہ کو ناگوار گزری۔

”احمق لڑکی! سیل فون کا چارجر ڈھونڈ رہا ہوں۔“
”یہ تم کیا بات بات پر مجھے احمق اور بےوقوف کہہ رہے ہو؟“ وہ ایک دم چڑ گئی۔
”آہستہ بولو آواز باہر تک جائے گی۔“ وہ جھنجلا اٹھا۔
”جاتی رہے‘ میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو وہ تپ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”تم ایک انتہائی احسان فراموش لڑکی ہو‘ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں میرا‘ کتنی مشکل سے نکال کر لایا ہوں تمہیں۔“
”کیوں احساس کروں‘ کیا رشتہ ہے تمہارا میرے ساتھ؟“ اس نے بھی فوراً ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔
”شوہر ہوں تمہارا‘ نکاح ہو چکا ہے ہم دونوں کا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں اسے یاد دلانے لگا۔
”وہ نکاح جو زبردستی کیا تھا تم نے۔“ رومیصہ نے برا سامنہ بنا کر اس کی طرف دیکھا۔
”تمہارے ہی اکسانے پر کیا تھا‘ ورنہ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں تھا تم میں۔“ اس نے نظریں چرا کر دوبارہ چارجر کی تلاش شروع کر دی۔
”جھوٹ اچھا بول لیتے ہو۔“ وہ اب بیڈ کی چادر جھاڑ رہی تھی۔
اس نے پلٹ کر رومیصہ کا چہرہ دیکھا‘ اس کے ملیح چہرے پر یہ مسکراہٹ اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔
”ہم لوگ کب تک رہیں گے یہاں‘ اگر کوئی آ گیا تو؟“ رومیصہ کو اگلی پریشانی نے گھیر لیا۔
”بے فکر رہو‘ اس گھر کے مکین ایک ماہ کے لیے دبئی گئے ہیں‘ یہ ایئر ٹکٹس کی فوٹو کاپیز ملی ہیں مجھے جس پر ان کے آنے اور جانے کی ڈیٹس لکھی ہیں۔“ اس نے کمپیوٹرائزڈ ٹکٹس کی فوٹو اسٹیٹ اس کے سامنے لہرائی‘ جو اسے سائیڈ میز سے ملی تھیں۔
”تو کیا ہم ایک مہینہ یہیں رہیں گے؟“ اس کے طنزیہ انداز پر وہ مڑا۔ ”تمہیں اگر اعتراض نہیں تو رہ لیتے ہیں۔“
رومیصہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا‘ وہاں سے اسے چارجر کے بجائے پاور بینک مل گیا تھا جس کے ساتھ آئی فون کی ڈیٹا کیبل لگی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اپنا سیل فون اس کے ساتھ لگایا اور خود جا کر لاؤنج میں رکھے صوفے پر لیٹ گیا۔ بخار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی‘ دوسری طرف رومیصہ بھی بیڈ کی چادر جھاڑ کر لیٹ گئی‘ رات بھر کی تھکن کی وجہ سے نیند نے منٹوں میں ہی اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔



شہرزاد نے دو دن بعد اپنے آفس میں قدم رکھا تو للی کے سفید پھولوں کا گلدستہ اس کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس پر لگے کارڈ کو پڑھے بغیر بتا سکتی تھی کہ یہ ہم زاد کا ہی کارنامہ تھا۔ اس نے ملازم کو اپنی فائلیں میز پر رکھنے کا اشارہ کیا۔
وہ جیسے ہی اپنی کرسی پر بیٹھی‘ اس کے سیل فون کی مترنم گھنٹی گونج اٹھی‘ اسکرین پر ہم زاد کا نمبر بلنک کر رہا تھا اس نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا اور سیل فون پر آنے والی کال ریسیو کی۔
”ویلکم بیک‘ مجھے یقین تھا تم اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ اپنے کام سے دور نہیں رہ سکتیں۔“ اس کا خوشگوار لہجہ شہرزاد کی سماعت سے ٹکرایا۔
”میں ہوش میں آنے کے بعد سے ہی اپنا کام کر رہی ہوں۔“ اس نے فوراً تصحیح کی۔

"لیکن لوگوں کو ڈیل کرنا تمہیں اب بھی نہیں آیا۔" اس کا انداز سراسر دل جلانے والا تھا۔
"مطلب؟"
"وقار درانی بے وقوف بنا رہا ہے تمہیں' اس کے پاس ایسے کوئی ثبوت نہیں ہیں جو جسٹس محمود کو سمجھوتا کرنے پر مجبور کردیں۔"
"تم نے کیا میرے گھر میں کیمرے فٹ کرر کھے ہیں۔" وہ اس کی بات پر ہلکا سا چڑی۔
"تمہارے معاملے میں سمجھو میرا دل ہی سی سی ٹی وی کیمرہ ہے۔" اس نے بات کو شرارت میں اڑایا۔
"لیکن میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں جو وقار درانی کے ہاتھوں استعمال ہو جاؤں۔" شہرزاد نے دانستہ بات کا رخ بدلا۔
"جس دن کنزہ وقار کا نام اس کیس سے نکل گیا' سمجھو تم نے خود رومیصہ کے گلے میں پھندہ ڈال دیا۔" وہ اسے خدشات میں مبتلا کر گیا۔
"تم دنیا کے واحد انسان ہو جو مجھے اتنا ایزی لیتے ہو' میں نے بھی اتنے سال بیرسٹری پڑھی ہے' جھک نہیں ماری۔" اس کا تلملانا ہم زاد کو خوشگواریت میں مبتلا کر گیا۔ تب ہی تو اس دفعہ اس نے کھل کر قہقہہ لگایا تھا۔
"ویسے تو بڑے جاسوس بنے پھرتے ہو' لیکن میری بہن کا تو پتا نہیں کروا سکے۔" شہرزاد نے اسے طعنہ دیا۔
"بے فکر رہو' ایک دو دن میں پہنچ جائے گی گھر۔" ہم زاد کی بات پر شہرزاد کا دل بری طرح سے دھڑکا لیکن اس نے دانستہ بے تابی کا مظاہرہ نہیں کیا۔
"یہ بات تو میں بہت دنوں سے سن رہی ہوں۔" شہرزاد نے اس پر کھلم کھلا طنز کیا۔
"تم اس بات کو چھوڑو' بہتر ہو گا' ثمر مافیا کیس' میڈم قریشی کو خود ہینڈل کرنے دو۔" اس نے اس بار سنجیدگی سے مشورہ دیا۔
"کیوں' تمہیں کیا لگتا ہے' میں ہار جاؤں گی۔" وہ منہ بنا کر گویا ہوئی۔
"مجھے معلوم ہے تم یہ کیس جیت جاؤ گی شہرزاد! لیکن۔۔۔" وہ اس دفعہ ٹھہر ٹھہر کر بڑی متانت سے بولا۔
"لیکن کیا؟" وہ الجھ گئی۔
"یہ جیت تمہارے حلق کا وہ نوالہ بن جائے گی جسے نہ تم نگل پاؤ گی اور نہ اگل۔" وہ ذو معنی لہجے میں گویا ہوا۔
"میرا ہاضمہ اتنا کمزور نہیں ہے' اس بات کا اندازہ بہت جلد ہو جائے گا تمہیں۔" شہرزاد کا طنزیہ انداز اسے اچھا لگا۔
"لیکن وہ لوگ تمہیں اتنی آسانی سے ہضم کرنے نہیں دیں گے۔" وہ مسکرایا۔
"ڈرا رہے ہو یا سمجھا رہے ہو؟" وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔
"صرف بتا رہا ہوں' کیونکہ میر خاقان آج کل کسی نئے مہرے کی تلاش میں ہے۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔
"مہرہ کوئی بھی ہو' شطرنج ہو یا زندگی کا میدان' وہی جیتتا ہے جو میدان میں اپنے اعصاب پر قابو رکھے اور وقت پر بہترین چال چلے۔" وہ مسکرائی۔
"وہ تو ٹھیک ہے' لیکن بعض دفعہ لوگ بہت خوب صورتی سے آپ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال لیتے ہیں اور آپ کو پتا تک نہیں چلتا۔" ہم زاد نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی جو بے سود رہی۔
"دشمن کی ہوشیاری اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب آپ کے پیروں کے نیچے زمین اپنی نہ ہو۔" وہ بھی پر اعتماد تھی۔

"اوکے' بیسٹ آف لک....." اس نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔
شہزاد نے فوراً "ٹمبر مافیا کیس کی فائل منگوائی' اسے اگلی پیشی پر میر حاکم کی فیملی پر ایک ایسا جان دار وار کرنا تھا جو ان کی کمر توڑ دیتا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کیس پر اپنی ساری صلاحیتیں صَرف کر دیتی اور ایسا کرنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔



شام چھ بجے کے قریب رومیصہ کی آنکھ کھلی تو ساتھ ہی بے تحاشا بھوک کا احساس بھی بیدار ہو گیا۔
اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی' کمرے میں ہلکا ہلکا سا اندھیرا تھا' باہر شاید سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا۔ وہ ایک لمبی جمائی لے کر اٹھی اور سیکنڈوں میں اسے احساس ہوا کہ وہ فارم ہاؤس میں نہیں اور ساتھ ہی اسے گزرے دن کے سارے واقعات یاد آ گئے۔
"کہیں مجھے چھوڑ کر بھاگ تو نہیں گیا وہ؟" اس سوچ نے اس کا دماغ مکمل بے دار کر دیا' وہ گھبرا کر اٹھی اور عجلت بھرے انداز میں باہر نکلی۔
وہ سامنے صوفے پر الٹا سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کا ایک بازو زمین پر جھول رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رومیصہ کو تھوڑا سکون ملا' ورنہ تو وہ ایک لمحے کو ڈر سی گئی تھی۔ پورا گھر تیرگی میں ڈوبا ہوا تھا' کھلی کھڑکی سے بس ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔
"مجھے اٹھانا چاہیے اسے' تاکہ یہاں سے نکلیں' کہیں کسی مصیبت میں ہی نہ پھنس جائیں۔" اس سوچ نے اسے پریشان کیا۔
وہ فوراً" چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ رومیصہ کو اس کے لیٹنے کے انداز میں کسی ——— غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔" اس نے ہلکا سا جھک کر اسے دیکھا' اس کا سارا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا اور نتھنوں میں سے گزرتی ہوئی سانس کھولتی ہوئی بھاپ کی طرح تھی۔
"تم ٹھیک تو ہو ناں؟" رومیصہ نے ہلکا سا اسے جھنجھوڑا' بخار کی ——— نقاہت نے اس سے ہلنے جلنے کی سکت بھی چھین لی تھی۔
رومیصہ کے ہاتھ پیر پھول گئے' وہ بھاگ کر کچن کی طرف گئی' فریج بالکل خالی تھا اور بند تھا اس نے سنک میں لگا نل کھولا' پانی خاصا ٹھنڈا تھا' وہ ایک جگ بھر کر لے آئی اور دائیں بائیں کپڑے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن کچھ نظر نہ آیا تو جلدی سے ایک تکیے کا غلاف اتار لیا۔
"بات سنو' بول کیوں نہیں رہے ہو تم۔" رومیصہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کا سارا جسم بخار کی حدت سے جھلس رہا تھا' وہ جلدی جلدی اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگی۔
"مجھے پیاس لگی ہے....." اس کی نقاہت زدہ آواز ملگجے اندھیرے میں رومیصہ کو خوف میں مبتلا کر گئی۔
وہ دوبارہ سے ایک گلاس پانی کا بھر کر لے آئی اور اسے سہارا دے کر پلانے لگی' وہ شاید بہت دیر سے پیاسا تھا تبھی ایک ہی سانس میں پی گیا' ایک گلاس پانی پی کر وہ اتنا زیادہ ہانپ رہا تھا کہ رومیصہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' آدھے گھنٹے بعد اس کے بخار کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی لیکن تب تک رومیصہ کی آنتیں قل ھواللہ پڑھنے لگیں۔ وہ ایک دفعہ پھر کچن میں گئی اور مختلف کیبنٹ کھول کر دیکھنے لگی۔
ایک ایئر ٹائٹ جار میں اسے بسکٹ اور دو نمکو کے پیکٹ مل گئے تھے' ایک کیبنٹ میں خشک دودھ اور ٹی بیگ بھی رکھے تھے لیکن چینی کا جار خالی تھا۔ اس نے ماچس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن وہ نہیں تھی' ایک

دراز میں سے اسے لائٹر مل گیا' جس کی مدد سے اس نے چولہا جلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ چولہے میں گیس نہیں آرہی۔

اس نے گیس کے مین کنکشن کی تلاش میں اوپر نیچے نظریں دوڑائیں' تھوڑی سی محنت کے بعد اسے گیس کے پائپ کے ساتھ لگا ہینڈل نظر آیا' جسے گھر کے مکین شاید احتیاطی تدابیر کے تحت بند کر گئے تھے۔

اس نے ہینڈل نیچے کیا تو چولہے میں گیس آنے لگی' اس نے فوراً" چولہا جلا کر ایک برتن میں پانی ڈال کر رکھا' اور برتنوں کے ریک سے دو کپ نکالے' جلدی جلدی بغیر چینی کی چائے بنا کر باہر آئی تو وہ آنکھیں کھولے بے بس انداز میں لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ بخار کی شدت سے سرخ اور آنکھیں جل رہی تھیں' رومیصہ کو اس سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا۔

رومیصہ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پشت پر کافی سارے کشن اٹھا کر رکھے' وہ مشکور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا' اس نے پاس بیٹھ کر بسکٹ چائے کے کپ میں بھگو کر اسے کھلانے شروع کیے' وہ اتنی سی مشقت ہی میں نڈھال ہو گیا۔

"بات سنو۔" وہ آہستگی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں کہو۔" رومیصہ نے فوراً" جھک کر اس کی سرخ آنکھوں کی طرف دیکھا اور بے اختیار نظریں چرالیں۔

"پردے آگے کر کے لائٹ جلاؤ اور بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر پیناڈول کا ایک پتہ دیکھا تھا میں نے' وہ پلیز لا دو۔۔۔۔" وہ بمشکل بول رہا تھا۔

رومیصہ نے اٹھ کر پردے برابر کر کے زیرو واٹ کا بلب روشن کیا اور خود اندر جا کر بیڈ کی سائیڈ میز کی درازیں ٹٹولنے لگی' تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے وہ ٹیبلٹس مل گئی تھیں' جسے اس نے پانی کے ساتھ نگل لیا۔

"میرا خیال ہے تم اندر بیڈ پر جا کر لیٹ جاؤ۔۔۔۔" رومیصہ کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

اس نے خود سے اٹھنے کی کوشش کی' لیکن کامیاب نہ ہو سکا' رومیصہ نے فوراً" آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا اور اسے سیدھا کھڑا ہونے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ رومیصہ اسے پکڑ کر بمشکل کمرے تک لائی اور وہ فوراً" بیڈ پر لیٹ گیا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔۔" وہ اپنی ہتھیلی کا مکا سا بنا کر ماتھے پر رگڑ رہا تھا' شاید درد کی شدت بڑھ رہی تھی۔

"میں دبا دوں۔۔۔۔" رومیصہ کو اس کی بے چارگی پر ترس آیا' وہ ہلکا سا جھک کر اس کا سر دبانے لگی۔

میڈیسن لینے سے اسے کافی فرق پڑ گیا تھا' ابھی ایک گھنٹے بعد وہ تکیے کو بھینچے غافل سو رہا تھا' وہ دبے قدموں اٹھ کر کچن میں چلی آئی اور دوبارہ چائے بنا کر وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی' اس کا دل بے شمار اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

نمکو اور بسکٹ کھانے سے اسے تھوڑی توانائی کا احساس ہوا تو وہ دوبارہ بیڈ روم میں چلی آئی' سامنے دیوار پر ایک ینگ کپل کی شادی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلی بار اس سارے گھر کو غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ کسی نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کا گھر تھا' نیا فرنیچر' کراکری اور دیواروں پر لگی تصویریں اس بات کی گواہ تھیں۔

وہ چلتے چلتے ڈریسنگ کے شیشے کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اپنا ملگجا سا عکس شیشے میں دیکھ کر اسے دھچکا لگا' اتنے دن پرانی جینز کے ساتھ پہنی ہوئی میلی شرٹ کو دیکھ کر اسے اپنے آپ سے گھن آئی۔

اس نے دیوار گیر وارڈ روب کھولی تو اس میں کئی کام والے لیڈیز سوٹ لٹک رہے تھے اس نے نسبتاً" ایک سادہ لان کا سوٹ نکالا' اس کے ناپ سے تھوڑا کھلا تھا لیکن وہ اسے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی' ایک گھنٹہ نہا کر وہ باہر نکلی تو وہ ابھی بھی سو رہا تھا لیکن رومیصہ کو اپنا آپ بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے' وہ سونے کی تلاش میں دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج کے صوفے کی طرف بڑھی اس کی نظر دیوار پر رینگتی چھپکلی پر پڑ گئی' اس کا دل دھک سے رہ گیا' اسے چھپکلیوں سے بچپن ہی سے بے تحاشا خوف آتا تھا۔

وہ الٹے قدموں واپس لوٹ آئی' دوسرے کمرے میں بھی جانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے برابر میں لیٹ گئی' شاور لینے کے بعد اسے خاصی سکون کی نیند آرہی تھی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا' جب اس کی آنکھ کھلی' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' وہ جاگ چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا تاثر تھا' وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

"تھینک یو رومیصہ۔" اس کی حالت خاصی سنبھل چکی تھی۔

"ٹمپریچر اتر گیا....."

"ہاں اور تمہارا بہت شکریہ تم نے بہت خیال رکھا میرا۔" وہ کھلے دل سے اسے سراہ رہا تھا۔

رومی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے لیٹی رہی۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا' لاؤنج میں چلنے والے زیرو واٹ بلب کی نیم مردہ سی روشنی اس کمرے میں بھی آ رہی تھی۔

"ایک بات بتاؤ گی سچ سچ؟" اس کے لہجے میں کچھ تھا' رومیصہ نے بے ارادہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں بڑا نرم سا تاثر تھا۔ دونوں کی نیند پوری ہو چکی تھی اس لیے وہ کافی بہتر محسوس کر رہے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم روحیل اور تمہارے درمیان کیا تھا' اور تم نے کیوں مارا اسے۔" وہ رسانیت سے گویا ہوا لیکن رومیصہ نے فوراً" ہی اس کی بات کاٹ ڈالی۔

"میں نے اسے نہیں مارا' اور نہ ہی میری فرینڈ کنزہ کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا تھا اس رات؟" اس کا انداز خاصا دوستانہ تھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ ہلکا سا چونکی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم جیسی لڑکی کسی کو اتنی بے رحمی سے اپنی گاڑی سے ہٹ کر سکتی ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"میرے اندر تو اس رات اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ گاڑی بھی ڈرائیو کر سکتی' کیونکہ تھوڑی دیر پہلے کلب میں میرا روحیل کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا' وہ مجھ سے خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے غصے میں اسے تھپڑ مار دیا تھا۔

رومیصہ پہلی دفعہ اس سے بے تکلفانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔ یہ شاید رات کی تنہائی کا اثر تھا یا پھر ان حالات کا' جوان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے تھے' دور کہیں تقدیر اپنے اس فیصلے پر دوبارہ مسکرائی تھی۔

"تم کیسے جانتی تھیں روحیل کو؟"

"میں اسے نہیں جانتی تھی' وہ شاید کنزہ کا اسکول فیلو رہا تھا۔" رومیصہ کے لہجے کی سچائی گواہ تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔

"تم روحیل کے فرینڈ ہو کیا؟"

"نہیں۔" اس کی بات پر رومیصہ کو دھچکا لگا۔

"پھر۔؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"وہ میرے بیسٹ فرینڈ کا بہت اچھا دوست تھا' اور اس کی موت نے ہم سب کو بری طرح سے ڈسٹرب کیا' اور پھر مجھے پتا چلا تمہارے اور تمہاری مدر کے بارے میں۔" وہ ہلکا سا جھجک کر رکا۔
"کیا؟" رومیصہ نے بے تابی سے اس کی شکل دیکھی' وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ کسی کمزور لمحے کی زد میں تھا اس لیے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔
"یہی کہا ہو گا کہ میری مدر ایک کرپٹ خاتون ہیں اور ان کے آئے دن اسکینڈلز سامنے آتے رہتے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔
"تو کیا یہ غلط ہے؟"
"نہیں' ٹھیک کہتے ہیں وہ' اور یہ میری زندگی کی ایسی تلخ حقیقت ہے جسے میں چاہ کر بھی نہیں جھٹلا سکتی۔" رومیصہ کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ اسے شاید اس بات کی توقع نہیں تھی' وہ بھی ایک لمحے کو گنگ ہو گیا' کمرے میں ایک دل دکھانے والی خاموشی نے بسیرا کر لیا۔
"آئی ایم سوری۔" اس نے بیڈ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو رومیصہ کو یہ خاموش دلاسا اچھا لگا۔
"یہ میری زندگی کا ایک ایسا تلخ حوالہ ہے جس سے میں کبھی بھی اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتی' یہ ایک آسیب کی طرح میرا پیچھا کرتا ہے' اسی ایک بات کے پیچھے میں نے اپنی ساری زندگی تباہ کر لی۔ پتا نہیں اللہ نے کیوں یہ ساری چیزیں میری قسمت میں لکھ رکھی ہیں۔" وہ کسی معصوم بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔
"تم مجھ سے وہ سب شیئر کر سکتی ہو رومیصہ۔" اس نے بلا ارادہ اسے ہلکا سا اپنے ساتھ لگایا۔
رومیصہ بھی کسی کمزور لمحے کی دسترس میں آ چکی تھی' وہ بھیگے لہجے میں آہستہ آہستہ اپنی ساری محرومیاں' خوف اور اندیشے اسے بتانے لگی اور وہ سر جھکائے خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ جیسے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم کام ہو۔



شہزاد شل ہوتے وجود کے ساتھ گھر پہنچی تو ایک نیا ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔
ہارون رضا انتہائی مشتعل انداز میں ٹینا بیگم پر برس رہے تھے اور وہ حسب معمول ان کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھ رہی تھیں۔ شہزاد انتہائی کوفت بھرے انداز میں لاؤنج کے دروازے میں ہی رک گئی۔
"تمہیں کیا تکلیف ہے آخر سیف الرحمٰن سے....؟" ٹینا بیگم نے گویا ان کی طرف انگارے اچھالے۔
"بے وقوف عورت! میں تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوں' لوگ اس اخبار کے تراشے مجھے واٹس ایپ کر رہے ہیں۔" انہوں نے اخبارات کا ایک پلندہ اٹھا کر ٹینا بیگم کے سامنے پھینکا۔
"اخبارات کو تو عادت ہے ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی۔" وہ بھی بلند آواز میں چیخیں۔
"ہاں تم اپنی گھٹیا حرکتیں مت چھوڑنا' دیکھو ذرا تمہارا عاشق کیسے گلے لگا کر تمہیں تسلیاں دے رہا ہے۔ میڈیا کے سامنے ایسے واہیات کام کرو گی تو وہ تو مرچ مسالہ لگا کر ہی لگائیں گے ناں۔" ہارون کی تلخ باتوں نے ٹینا بیگم کے دل و جان کو سلگا کر رکھ دیا۔
"اور وہ جو تم اس اسٹیج ایکٹریس نیناں کے پیچھے دم ہلاتے پھر رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں اندھی ہوں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔" وہ بگڑ کر بولیں اور اس حملے پر ہارون تھوڑا پسپا ہوئے۔

"آپ کو مام کے ساتھ اتنے زیادہ پرابلم ہیں تو ڈائیورس دے دیں انہیں ابھی اور اسی وقت۔" شہزاد کی بات پر انہیں کرنٹ لگا۔

"ڈائیورس تو مر کر بھی نہیں دوں گا۔" وہ متنفر انداز میں گویا ہوئے۔

"پتا ہے ناں ڈائیورس کی صورت میں بھاری بھرکم حق مہر دینا پڑے گا۔" وہ سُلگ کر بولیں۔

"حق مہر لینا یا چھوڑنا کسی ایک بندے کو تو پڑے گا' آپ دونوں ایک گھنٹے میں یہ فیصلہ کرلیں' ورنہ صبح میں کورٹ میں یہ کیس فائل کردوں گی۔" شہزاد کے ہموار لہجے پر دونوں ایک ساتھ ہی ٹھنڈے ہوئے' وہ اپنی بات مکمل کرکے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"اتنی آسانی سے' تو میں بھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔" وہ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں گویا ہوئے۔

"جس دن طلاق لینا ہوگی تو گردن پر انگوٹھا رکھ کر بھی لینی پڑی تو لے لوں گی۔" سامنے بھی ٹینا بیگم ہی تھیں۔ کسی بھی دھمکی کو خاطر میں نہ لانے والی۔

"تو میرا خیال ہے اب انگوٹھا رکھ ہی لو تو بہتر ہے۔" وہ ہلکا سا چڑ کر بولے۔

"پہلے گردن تو مضبوط کرلوانی' پھر منہ کھول کر اتنے بڑے دعوے کرنا۔" وہ طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی سیل فون پر آنے والی سیف الرحمٰن کی کال کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ہاں سیفی کہاں ہو تم' میں بس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر پہنچ رہی ہوں کلب....." ان کا انداز سراسر چڑانے والا تھا' ہارون ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئے انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ٹینا بیگم کے ہاتھوں سے سیل فون چھینا' وہ جو اس حملے کے لیے تیار نہیں تھیں' ہلکا سا لڑکھڑائیں۔

"چٹاخ....." انہوں نے الٹا ہاتھ گھما کر ٹینا بیگم کے حواس معطل کیے۔

"تم جیسی گھٹیا عورت پر میں سو دفعہ لعنت بھیجتا ہوں' تمہیں طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔" سیل فون کے دوسری جانب موجود سیف الرحمٰن سمیت گھر کے سب ہی ملازمین نے یہ الفاظ بقائمی ہوش و حواس سنے تھے۔ گیسٹ روم سے نکلتی شہزاد کی سماعت تک بھی یہ الفاظ پہنچے اور اس نے اپنے اندر طمانیت کا گہرا احساس اترتا ہوا محسوس کیا۔

ہارون رضا نے انتہائی مشتعل ہو کر ٹینا کا سیل فون سامنے دیوار پر مارا اور وہاں لگی بیش قیمت پینٹنگ زمین پر آن گری۔ اس طرح ٹینا بیگم کی تیسری شادی بھی بدصورت انداز میں انجام کو پہنچی۔



میر ہاؤس پر لگتا تھا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ گھر کے در و بام پر عجیب سی بے چینی اور وحشت نے بسیرا کر رکھا تھا۔

اس رات شارقہ بیگم کی طبیعت کچھ خراب تھی کیونکہ وہ اپنا بیہ اور برہان والی بات کو دل پہ لگا بیٹھی تھیں۔ انہوں نے خاقان صاحب کے کانوں میں بھی یہ بات ڈال دی تھی' جسے سننے کے بعد وہ ایک لمحے کو چپ ہوگئے' لیکن جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

"وہ جتنا بھی باہر منہ مارے' خاندانی بیوی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔" خاقان علی نے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"میں نہیں چاہتی' میری بیٹی بھی اسی اذیت سے گزرے' جو میں نے سہی ہے۔"

"تمہیں تو ناشکری کی عادت پڑ گئی ہے۔ اچھا کھاتی ہو' اتنے بڑے گھر میں مہارانیوں کی طرح رہتی ہو۔ ایک عورت کو اور کیا چاہیے۔" انہوں نے تلخ لہجے میں اپنی بیوی کی طبیعت صاف کی۔

"زندگی صرف روٹی' کپڑے اور مکان کے سہارے نہیں گزرتی خاقان صاحب! ذہنی سکون بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔" وہ آج پھٹ پڑیں۔

"جب ان بنیادی چیزوں کے لیے ترسنا پڑے تو ساری ذہنی تسکین دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔" وہ تپ کر کھڑے ہوئے۔ "میرا دماغ مزید خراب مت کرو' خواہ مخواہ فضول سی بات پر بحث کیے جا رہی ہو۔" وہ انہیں کھری کھری سنا کر کمرے سے نکل گئے۔

دونوں بہنیں اسی وقت سے ماں کی پٹی سے لگی بیٹھی تھیں۔ وہ رات ان تینوں کے اعصاب پر خاصی بھاری گزر رہی تھی۔ شارقہ بیگم خاموشی سے چھت سے لگے پنکھے کو گھور رہی تھیں۔ وہ دونوں خاموش و ساکت بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک گئیں۔

"یہ تو صندل کی پازیب کی آواز ہے۔" انابیہ بے چین ہوئی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" طوبیٰ ذرا مضبوط اعصاب کی حامل لڑکی تھی' جبکہ شارقہ بیگم کے ساکت وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے فوراً" ہی باہر جھانک کر دیکھا' رات کے اس پہر کوریڈور سنسان تھا' وہ دبے قدموں باہر نکل آئی' اچانک اس نے سیڑھیوں کی طرف کسی چیز کو بھاگتے دیکھا اور وہ فوراً" اس کے پیچھے لپکی۔

سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ شاہ میر کے ہاتھوں میں درشہوار کی پالتو بلی "پریتی" تھی۔ اس کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے سے گھنگھرو تھے۔ جس سے آنے والی چھن چھن کی آواز نے بہت دنوں سے اس کا سکون برباد کر رکھا تھا۔

درشہوار نے سرونٹ کوارٹر کے برآمدے میں اپنی بلی کے رہنے کے لیے لکڑی کا بڑا سا را گھر بنوایا ہوا تھا اور وہ شاید رات کو کوئی دروازہ کھلا دیکھ کر میر ہاؤس کے اندرونی پورشن کی طرف گھس آتی تھی۔

"کیا آج پھر ڈر گئیں تم؟" شاہ میر پریتی کو اٹھا کر عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ گھنگھرو کس نے باندھے ہیں' اس کے پیروں میں؟" وہ ترشی سے گویا ہوئی۔

"خدا کی قسم میں نے نہیں باندھے' میں تو ڈائریکٹ پٹا ڈالنے کے حق میں ہوں۔" ایک دل جلانے والی مسکراہٹ شاہ میر کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

"شٹ اپ۔" وہ جارحانہ انداز میں مڑی۔

شاہ میر نے ایک دم ہی پریتی کو اس کے پاؤں کے پاس زمین پر چھوڑ دیا اور اس نے بھاگ کر طوبیٰ کے پیروں کو چھوا۔ وہ اچھل کر پیچھے دیوار سے جا لگی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"اب کیا معصوم جانور سے بھی لڑو گی۔" وہ عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ کر اسے بغور دیکھنے لگا۔

"اس گھر میں موجود انسان بھی کون سا درندوں سے کم ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی' لیکن شاہ میر نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹا۔ طوبیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"پرابلم کیا ہے تمہارے ساتھ.....؟"

"بازو چھوڑو میرا۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

"نہیں چھوڑتا" کیا کرلوگی تم؟" شاہ میر کے ضبط کی طنابیں بھی ڈھیلی پڑیں۔ "کس کا غصہ مجھ پر نکالتی ہو؟"
"میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔"
اس کی بات پر وہ تلخی سے مسکرایا۔ "کتنی سنگ دل ہو تم۔"
"اسی لیے تو کہتی ہوں کسی اور دیوار میں جاکر اپنا سر مارو، مجھ سے سوائے تلخیوں کے کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"تم سے جو کچھ مل سکتا ہے مجھے دنیا کی کوئی اور لڑکی نہیں دے سکتی۔" وہ نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر لاؤنج کے صوفے پر لے آیا۔ "یہاں بیٹھو اور سچ سچ بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں مل کر اس کا حل نکال لیں۔"
اس کے لب کانپ رہے تھے اور وہ اپنے اشکوں پر قابو پانے کی بھرپور کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ شاہ میر نے اس کے صبیح چہرے کو غور سے جانچا۔
"ایک دفعہ کھل کر رو لو یقین مانو دل بہت ہلکا ہو جائے گا۔"
اس کا لہجہ دنیا جہاں کی نرمی اپنے دامن میں سموئے ہوئے تھا۔ طوبیٰ جو کہ خود سے لڑتے لڑتے تھک چکی تھی، اچانک ہی ضبط کا دامن کھو بیٹھی۔ وہ شاہ میر کے شانے سے سر ٹکائے رو دی اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن میں آتی ہوئی۔ تاجدار بیگم نے یہ منظر انتہائی ناگواری سے دیکھا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں رات کے دو بجے؟" ان کے ماتھے پر پڑے بل ان کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔
طوبیٰ اور شاہ میر دونوں سٹ پٹا گئے۔ طوبیٰ تو بوکھلا کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جبکہ تاجدار بیگم کے عین سامنے کھڑا شاہ میر بالکل پرسکون تھا۔



ٹینا بیگم اور ہارون رضا کی طلاق کی خبر کو میڈیا نے بریکنگ نیوز کی طرح نشر کیا تھا۔
ہر چینل پر ٹینا بیگم کے خلاف زہر اگلتے ہوئے ہارون رضا کو دیکھنا کم از کم شہزاد کے اعصاب کے لیے ایک بڑا امتحان تھا۔ تب ہی وہ ٹی وی بند کر کے اسپتال چلی آئی اور وہاں اس نے اپنے کندھے کی تازہ بینڈیج کروائی۔
اسپتال سے گھر تک کے راستے میں اس نے کئی بار ہمت کی کہ وہ ٹینا بیگم کو کال کر کے تھوڑی تسلی دے لیکن ہر دفعہ سیل فون اٹھانے کے بعد اس کی ہمت جواب دے دیتی اور تنگ آکر اس نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔
اس کی گاڑی ٹینا ہاؤس کی طویل روش پر بڑے ہموار انداز میں چلتی ہوئی پورچ میں آن رکی۔
اس کا خیال تھا کہ اس طلاق کے بعد ٹینا بیگم زیادہ نہ سہی، چھوٹے موٹے ڈپریشن کا تو ضرور شکار ہوں گی، لیکن لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ ٹینا بیگم سامنے رکھے کاؤچ پر کھیرے کا ماسک سجائے لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے پارلر کی ایک ورکر بڑی دلجمعی سے ان کا مینی کیور کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ورکر نے سلام کیا تو انہیں بھی اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔
"شیری کیا کہا ڈاکٹر نے، کتنے دن بینڈیج ہو گی؟" وہ اس کے لیے فکر مند تھیں لیکن ان کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔
"بس دو چار دن اور۔۔۔۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔
"چلو اچھا ہے اور یہ بتاؤ ارتضیٰ نے کچھ مزید بتایا، رومی والے معاملے کا۔"
"آپ ارتضیٰ کو چھوڑیں، یہ بتائیں ٹی وی دیکھا آپ نے؟" اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"ہاں… ہارون رضا کی بکواس چل رہی ہے ہر چینل پر۔"
"آپ سے تو کسی نے رابطہ نہیں کیا؟"
"بہت سارے جرنلسٹس اور اینکرز نے کیا۔" انہوں نے کھیرے اپنی آنکھوں سے اتار کر اپنی پریشان بیٹی کو دیکھا۔
"تو…؟" وہ فکرمند انداز میں ایک قدم آگے بڑھی۔
"میں نے سوچا یہ خبیث آج اپنی بھڑاس نکال لے' میں کل اس کی بھیانک شکل دنیا والوں کو دکھاؤں گی' لیکن اس سے پہلے اپنی ڈینٹنگ پینٹنگ بھی تو ضروری تھی نا۔ آخر کو لوگ ہمارا چہرا ہی تو دیکھتے ہیں۔" وہ مسکرا رہی تھیں' ایک دفعہ تو شہرزاد کو لگا جیسے ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔
"میرا خیال ہے ماما' اس چیپٹر کو کلوز کردیں تو بہتر ہوگا۔" اس نے صاف گوئی سے مشورہ دیا۔
"ایسے تو نہیں' اب ایک دفعہ تو مزا چکھا کر ہی رہوں گی۔"
ٹینا بیگم کے ارادے اسے خطرناک لگے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی' جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا' اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ ہم زاد کی کال اٹینڈ کرتے ہوئے ہلکی سی ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی' کیونکہ اسے لگا جیسے وہ بھی اس تازہ ترین سانحے پر بات کرے گا اور وہ کم از کم اس کے ساتھ اپنی ماں کی ذاتی زندگی کو زیر بحث نہیں لانا چاہتی تھی' لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے کال ریسیو کرلی۔
"مجھے لگا' تمہیں میری ضرورت ہے۔" اس نے بغیر سلام دعا کے کہا۔
ہم زاد کے اس جملے پر اس نے بمشکل ایک لمبا سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ "ضروری نہیں' جو تمہیں لگے وہ ہر دفعہ ٹھیک ہی ہو۔"
"تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں' تمہارے متعلق میں جب بھی کوئی بات کرتا ہوں' پورے وثوق سے کرتا ہوں۔" وہ بلا کا پُراعتماد تھا۔
"کوئی ضروری بات کرنی ہے تو بتاؤ' میں اس وقت ایک کیس اسٹڈی کررہی تھی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔
"اگر تو میر حاکم فیملی کے ٹمبر مافیا کا کیس ہے تو بہتر ہوگا کہ اس پر اپنا دماغ خرچ مت کرو۔"
"کیا مطلب…" وہ چونکی۔
"وہ کیس صبح شجاع غنی واپس لے لے گا۔" ہم زاد کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔
"کیوں ہم پر کوئی تازہ تازہ وحی اُتری ہے۔" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔
"نہیں' آج شام تمہارے موکل کے گھر میں میر حاکم علی کے بندوں کی بارات اتری ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا۔
"کیا؟" شہرزاد کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"دیکھو شہرزاد! ہر انسان کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے اور شجاع نے اپنا ضمیر ایک کروڑ میں فروخت کردیا۔ کل تم تک بھی اطلاع پہنچ جائے گی۔" ہم زاد کی اس اطلاع پر وہ ششدر رہ گئی۔ شہرزاد کو اپنا وجود کسی طوفان میں آئے ہوئے تنکے کی مانند لگا۔
"او مائی گاڈ' کس نے بتایا آپ کو؟" وہ بوکھلا گئی۔
"اس بات کو چھوڑیں' صبح شجاع غنی' کیس واپس لے لے گا اور ساتھ میں ایک پریس کانفرنس کرکے میر

خاقان سے معافی بھی مانگے گا۔" وہ اس کے کانوں میں صور پھونک رہا تھا۔ شہرزاد کی اپنے سیل فون پر گرفت مضبوط ہوئی۔

"وہ اتنی چیپ حرکت کیسے کر سکتا ہے' میں نے اتنی محنت کی تھی اس کیس پر۔" اسے حقیقتاً دھچکا لگا۔

"ہاں۔۔۔ تم نے اچھی کوشش کی اور اگر شجاع غنی اپنے پیروں پر کھڑا رہتا تو ایک دفعہ تو میر فیملی کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔" وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں کہہ رہا تھا' لیکن اس کے تمام الفاظ اس قیامت کا مداوا کرنے سے قاصر تھے جس سے وہ اس وقت گزر رہی تھی۔

"میں شجاع کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" اس کی زبان پھسلی۔

"جب ضمیر بک جائے تو پھر دنیا کی کوئی بات کسی پر اثر نہیں کرتی۔" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔" شہرزاد کا رنجیدہ لہجہ گواہ تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

"میں فون بند کر رہی ہوں' تھوڑا کام ہے مجھے۔" اسے خود پر قابو پانے میں وقت کا سامنا تھا۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ گیا' اس لیے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ وہ جان سکتا تھا کہ اپنے کیریئر کے آغاز میں یہ دھچکا اس کے لیے کتنا برا ثابت ہو سکتا ہے۔

بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ افسردہ انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ہم زاد کی اطلاع سو فیصد درست ہو گی' اس کے باوجود اس کا دل و دماغ اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا۔ اسی وقت اس کے سیل فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی۔ اس نے بجھے بجھے سے انداز میں اسکرین پر دیکھا۔ ہم زاد کا میسیج تھا۔

"شہرزاد! بہتر ہو گا تم شجاع غنی والے معاملے کو ایسے ہی ہینڈل کرو جیسے تمہاری ماما نے ہارون رضا کو کیا' آئی مین گو ٹو دا ہیل۔" اس کے آگے مسکراہٹ کا نشان بنا ہوا تھا۔

اس ساری صورت حال نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ٹینا سہگل کی بیٹی ضرور تھی' لیکن بعض معاملات میں ان کی طرح بہادر نہیں تھی۔ اسے اب ساری رات اسی ایک بات پر ہزاروں دفعہ کڑھنا تھا۔



اسلام آباد کا موسم کافی بدل چکا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی کا احساس بھر گیا تھا۔ وہ مناہل اور برہان کے ساتھ کنسرٹ میں پہنچی' تو اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ وہ مناہل کے ساتھ اچھی خاصی بے تکلفی اور دوستی گانٹھنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"سریلی اکھیوں والے' سنا ہے تیری اکھیوں سے بہتی ہیں نیندیں اور نیندوں میں سپنے۔"

وہ تینوں اندر داخل ہوئے' اس وقت راحت کی خوب صورت آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ درشہوار کے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ کاش اس وقت ہادی بھی ان کے ساتھ ہوتا۔

اس کنسرٹ کی انتظامیہ میں برہان کا ایک اسٹوڈنٹ بھی شامل تھا' اس لیے ان تینوں کو دوسری قطار میں بڑے آرام سے نشستیں مل گئی تھیں۔ پروگرام بہت زبردست تھا۔ راحت کی سُریلی آواز میں گونجنے والے گانوں پر اس نے بارہا اپنے بھائی کو بڑے والہانہ انداز میں مناہل کے چہرے کو تکتے ہوئے محسوس کیا اور اس کنسرٹ سے واپسی پر اسے یقین ہو گیا تھا کہ برہان کی زندگی میں اتابیہ کی ڈور کٹ چکی ہے۔ اسے کچھ لمحے کے لیے افسوس ضرور ہوا' لیکن اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر ہادی کے سپنے بُننے لگی۔ اسے یقین تھا کہ مناہل اپنے دل کی بستی کو آباد کرنے کی

خاطر اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔
"موسم تو آج بہت غضب کا ہے۔" برہان نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا' جہاں بجلی کی چمک کے ساتھ پانی کی بوندیں زمین پر برسنے کو بے تاب تھیں۔ وہ تینوں جیسے ہی گاڑی کے پاس پہنچے' مناہل کے سیل فون کی مترنم گھنٹی بجی' اس نے مسکراتے ہوئے کال اٹینڈ کی اور بغیر سلام دعا کے شروع ہو گئی۔
"ہادی کے بچے' اتنا خوب صورت پروگرام تم نے مس کردیا' کتنی منتیں کی تھیں میں نے کہ وقت نکال کر آجاؤ۔"
ہادی کا نام سنتے ہی درشہوار کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس کا روم روم مجسم سماعت بن گیا' برہان گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور درشہوار کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بیٹھنے کو کہا۔
"آپ آگے چلی جائیں پلیز۔" درشہوار نے مناہل کو مخاطب کیا۔ وہ جو اپنی کال پر مصروف تھی' اس کی بات پر مسکرائی۔
"تھینک یو۔" اس نے سر خم کرکے اس کا شکریہ ادا کیا اور بڑے بے تکلف انداز میں اگلی سیٹ سنبھال لی۔ جیسے یہ اس کا پیدائشی حق ہو۔
"بکواس بند کرو ہادی' تمہیں اگلے ہفتے ہر صورت آنا ہوگا ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔" وہ بڑے مان بھرے انداز میں اس پر دھونس جما رہی تھی۔
"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم سے بڑا ہے وہ' لیکن کتنی بدتمیزی سے بات کرتی ہو اس سے۔" برہان نے مسکرا کر اسے ٹوکا۔
"اتنا بھی بڑا نہیں ہے' جتنا بننے کی کوشش کرتا ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔
"کبھی ملواؤ نا اس سے؟"
برہان کی بات پر درشہوار بری طرح سے چونکی' اس کا مطلب یہ تھا کہ برہان بھی نہیں جانتے تھے کہ مناہل کا بھائی کون ہے۔
"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔" مناہل نے مسکرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "درشہوار کیسا لگا آج کا کنسرٹ؟ انجوائے کیا؟"
"بہت زیادہ۔۔۔ تھینک یو' یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔" درشہوار نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔
"بس ٹھیک ہے' نیکسٹ ٹائم دوبارہ انوائیٹ کروں گی تمہیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا تو درشہوار بھی مسکرا کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
"انوائیٹ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی' میں اس کا ایڈمیشن کروا رہا ہوں یونی ورسٹی میں۔۔۔" برہان نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"دیٹس گریٹ۔" وہ مسکرائی۔
درشہوار خاموشی سے ان دونوں کی نوک جھونک سننے لگی' اسے دو ملاقاتوں میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ برہان اور مناہل کی بہت زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی لیکن اس کے باوجود برہان نے اسے اتابیہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا' اس بات نے درشہوار کو خاصی الجھن میں مبتلا کیا تھا۔



پچھلے ایک گھنٹے سے محمد ہادی سخت ٹینشن میں لان میں ٹہل رہا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی کا مکا بنا کر دوسری پر برساتا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتا۔ اس کا سارا وجود پچھلے ایک گھنٹے سے زلزلے کی زد میں تھا' جب سے اسے عالیہ قریشی کی کال سے شجاع غنی کی گھٹیا حرکت کا پتا چلا تھا کہ وہ اپنا کیس واپس لے چکا تھا اور یہ بات قریشی ایسوسی ایٹس کے منہ پر طمانچہ تھی۔

"میں تو سخت حیران ہوں' آخر میر خاقان نے ایسا کون سا اسم اعظم پڑھا ہے' اچھا خاصا بندہ مکر گیا ہے۔"
مسز قریشی کے لیے بھی یہ بات خاصے اچنبھے کا باعث بنی تھی۔

"بے غیرت لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" ہادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شجاع غنی کی گردن مروڑ دیتا۔

"شیری بہت زیادہ ڈسٹرب ہے اس بات سے۔"

"ہونا بھی چاہیے' اسے کیا پتا تھا یہ خبیث انسان اس طرح راستے میں خوار کرے گا اسے۔" ہادی نے فوراً اس کی حمایت کی۔

"میں نے تو بہت سمجھایا ہے اسے' پریکٹیکل لائف میں ایسی چیزیں ہوتی رہتی ہیں۔"

"لیکن کیریئر کے آغاز میں کم کم لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے ممی۔" ہادی نے سنجیدگی سے کہا۔

"اٹس اوکے' میں بعد میں بات کرتی ہوں' ابھی ایک آفیشل میٹنگ کے لیے نکلنا ہے۔" مسز عالیہ قریشی نے فون بند کر دیا تھا' لیکن تب سے ہادی سخت ڈسٹرب تھا۔ اسے علم تھا مسز قریشی اور شہزاد نے شجاع غنی کو سمجھانے کی کافی کوشش کی تھی' لیکن وہ اپنی بات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا اور چونکہ اس کیس کا وہی مدعی تھا' اس لیے اسے مزید جاری رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

"بس کرو یار' اور کتنا دل جلاؤ گے اپنا۔" سعد اسٹرونگ سی چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے باہر نکلا۔ وہ دونوں دو گھنٹے پہلے ہی آفس سے آئے تھے اور آتے ہی یہ خبر بم بن کر ان پر گری تھی۔

"میرا بس چلے تو اس شجاع غنی کو جا کر کھڑے کھڑے گولی مار آؤں۔" محمد ہادی چلتے چلتے رکا۔

"کوئی فائدہ نہیں' بے ضمیر بندہ ویسے ہی دوسروں کی نظروں سے گر کر مر جاتا ہے۔" سعد نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"تم اس کا گھٹیا پن دیکھو' اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو بھلا کیس کرنے کا کیا فائدہ؟" ہادی کا غصہ کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"ارے یہ سب ذہنی غلام لوگ ہیں' بس کسی نہ کسی طریقے سے حاکم بالا سے اپنی قیمت بڑھواتے ہیں۔" سعد نے بھی منہ بنا کر تبصرہ کیا۔

"ہاں.... اوقات تو اس کی ایک لاکھ کی بھی نہیں تھی اور کہاں ایک کروڑ۔" ہادی نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"یہ بتاؤ بیرسٹر شیری کو تو خاصا دھچکا لگا ہو گا۔"

"آف کورس یار' اس کی وجہ سے اس بے چاری نے گولیاں تک کھالیں اپنی گاڑی پر۔" ہادی کو میٹھی چائے بھی اس وقت سخت کڑوی لگ رہی تھی۔ "لیکن ایک بات تو اب طے شدہ ہے۔" سعد نے تھوڑا سا وقفہ دیا تو ہادی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میر فیملی اس معاملے میں ہے خوش قسمت' ان کو سیاست کرنا آتی ہے۔"

"بے فکر رہو' کسی دن اونٹ پہاڑ کے نیچے ضرور آئے گا۔" ہادی نے منہ بنا کر کہا۔

"دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" سعد نے اس بات کو مذاق میں اڑایا تو وہ سچ مچ برا مان گیا۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ اس نے باقاعدہ ٹرے میں پٹخا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کے اندرونی پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ سعد حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کیس کے معاملے میں اتنا سیریس بھی

ہو سکتا ہے۔



"یہ کیا چل رہا ہے تم دونوں کے بیچ؟"
تاجدار بیگم اس دن شاہ میر کا بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اپنے بیڈ روم میں لے آئیں' دروازہ لاک کر کے انہوں نے کڑے تیوروں کے ساتھ اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کو دیکھا' جو بڑے پُر سکون انداز میں کھڑا ان کا دل جلا رہا تھا۔
"میں کیا پوچھ رہی ہوں' یہ کیا سلسلہ چل رہا ہے تم دونوں کے درمیان؟" انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔
"وہی جو آپ نے دیکھا۔"
شاہ میر' اس گھر کا سب سے زیادہ پُر اعتماد اور بے باک لڑکا تھا۔ لگی لپٹی رکھنی تو اسے آتی نہیں تھی اور یہ بات گھر کے سب ہی مکین اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس کا جواب سنتے ہی تاجدار بیگم کو ایک جھٹکا لگا' ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی بات سے مکر جائے گا۔
"شادی کرنا چاہتا ہوں میں طوبیٰ سے۔" شاہ میر کی اگلی بات نے ان کا دماغ گھما دیا۔
"یہ ممکن نہیں ہے۔" انہوں نے اس بار اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کی۔
"وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" اس کے چہرے پر موجود استہزائیہ مسکراہٹ نے تاجدار بیگم کے ہوش اُڑا دیے۔
"تمہارے داجی' نمیرہ کے لیے سوچ بیٹھے ہیں۔" تاجدار بیگم کی بات پر وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور ماں کی طرف یوں دیکھا' جیسے انہوں نے اس صدی کی سب سے عجیب بات سنا دی ہو۔
"نمیرہ اور میں...؟" اس نے ہاتھ کی انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا اور تصدیق چاہی۔
"ہاں تم دونوں۔" انہوں نے قدرے خفیف انداز سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' صاف منع کر دیں میری طرف سے۔" اس کے باغیانہ انداز پر تاجدار بیگم جھنجلا گئیں۔
"بے وقوف لڑکے' اس گھر میں وہی ہوتا ہے جو تمہارے داجی چاہتے ہیں۔"
"ہاں تو وہ اس گھر میں جو مرضی چاہے کریں' میں نے کون سا منع کیا ہے انہیں' لیکن...." وہ اپنی بات کرتے کرتے رکا۔
"لیکن کیا؟" تاجدار بیگم کے چہرے پر تفکر کے گہرے سائے ابھرے۔
"اپنی زندگی سے کھیلنے کا حق کسی کو نہیں دوں گا میں' چاہے وہ میرا سگا باپ یا اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔" اس کا زہر خند لہجہ اور دوٹوک انداز اس کی ماں کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا گیا۔ شاہ میر نے اپنی بات مکمل کی اور غصے سے پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تاجدار بیگم پریشانی سے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔



شہزاد نے صبح صبح ارتضیٰ حیدر کے ساتھ اس کے آفس میں چھاپہ مارا۔
وہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے وہاں پہنچی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ہلکی سی خجالت کا شکار ہوئی۔
"آئی ایم سوری' میں آپ کو انفارم نہیں کر سکی۔"

"اٹس او کے۔" ہادی نے ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "چائے لیں گے یا کافی؟"

"کچھ بھی نہیں، ہمیں شجاع غنی کے گھر کا ایڈریس چاہیے۔"

"وہ تو آپ یہاں کے پولیس اسٹیشن میں فون کر کے ایس ایچ او سے بھی لے سکتے تھے۔" ہادی نے مسکرا کر ارتضیٰ کو جواب دیا۔

"میر حاکم علی کے علاقے کے تھانے میں ایسی کوئی بات ہو اور ان تک نہ پہنچے ایسا ممکن نہیں۔" اس دفعہ جواب ارتضیٰ کی طرف سے آیا تھا۔ وہ شاید اسی لیے اس وقت پولیس یونیفارم میں نہیں تھا۔

"میرا آفس بھی ان ہی کے علاقے میں ہے۔" ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔

"آپ اگر میم عالیہ قریشی کے بیٹے نہ ہوتے تو شاید ہم اس آفس سے بھی سو میل کے فاصلے سے گزرتے۔" اس دفعہ جواب شہرزاد کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے مسکرا کر سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا، جس سے اس کی والدہ بہت زیادہ متاثر تھیں۔

"میں ساتھ چلوں یا ڈرائیور کو بھیج دوں....."

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"میرا خیال ہے، آپ لوگ ہی ہو آئیں، کیونکہ ہو سکتا ہے میں اسے دیکھ کر اپنا غصہ کنٹرول نہ کر پاؤں۔"

اس کی صاف گوئی پر شہرزاد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کیوں.....؟"

"اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ شجاع غنی کو مال روڈ پر پھانسی کے پھندے سے لٹکا دے۔" کمپیوٹر پر کام کرتے سعد نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"آپ تو اس کیس کے بارے میں مجھ سے بھی زیادہ جذباتی نکلے۔" شہرزاد مسکرائی۔

"اور میں میم عالیہ قریشی کے بیٹے سے اسی چیز کی توقع کر رہا تھا۔" ارتضیٰ حیدر نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا تو ایک مسکراہٹ نے ہادی کے لبوں کا بھی احاطہ کیا۔

شہرزاد اور ارتضیٰ دونوں، اس کے ڈرائیور کے ساتھ شجاع کے گھر کی طرف نکل گئے تھے لیکن اس کیس کے حوالے سے ان کے ستارے شاید گردش میں تھے اس لیے شجاع غنی کے گھر کے دروازے پر ایک بڑا سا قفل ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

"وہ لوگ تو کل ہی پنڈی شفٹ ہوئے ہیں۔" یہ اطلاع ان کے پڑوسی کی طرف سے ملی۔

"اوہ شٹ....." شہرزاد جھنجلا کر دوبارہ گاڑی میں آن بیٹھی۔

"پنڈی کا ایڈریس ڈھونڈنا بھی کوئی مشکل نہیں، میں اسے پاتال سے بھی نکال لاؤں گا۔" ارتضیٰ نے اسے تسلی دی۔

"لیکن کیا فائدہ؟ آج شام وہ پریس کانفرنس کرنے والا ہے، ہمیں اس سے پہلے ملنا چاہیے تھا اس سے۔" شہرزاد کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"مجھے لگتا ہے وہ میر حاکم کے اسلام آباد والے گھر میں ہو گا۔" ارتضیٰ کی بات پر وہ چونکی۔

"آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے.....؟"

"یہ فیملی بہت شاطر ہے۔ انہیں اندازہ ہو گا کہ ہم لوگ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے، اس لیے انہوں نے اسے انڈر گراؤنڈ کر دیا۔" ارتضیٰ کی بات میں دم تھا تب ہی وہ اس سے متفق ہوئی۔

"چلیں اس کیس میں نہ سہی، کسی اور میں، اس خاندان کو لوہے کے چنے چبواؤں گی ضرور....." شہرزاد کا لہجہ تنفر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پروفیشنل لائف میں اتنا پرسنل ہونا اچھا نہیں ہوتا۔" ارتضیٰ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"شاید نہ ہوتی' اگر انہوں نے میری گاڑی پر فائرنگ کروا کر مجھے دھمکانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔" اس کے پاس بھی اپنی بات کا بہترین جواز موجود تھا۔

"اینی ہاؤ' میں اس کیس میں ہی نہیں' ہر کیس میں آپ کے ساتھ ہوں۔" ارتضیٰ کا لہجہ معنی خیز تھا لیکن وہ اس وقت سوچوں کے اژدھام میں الجھی ہوئی تھی اس لیے نوٹ نہیں کر پائی۔ ان دونوں کی گاڑی اب مری ایکسپریس وے کی جانب دوڑ رہی تھی۔



مونیکا نے سیل فون پر ذوالکفل کا نمبر ملایا' کافی دیر تک گھنٹیاں بجتی رہیں' لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اسے اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہوئے۔ پچھلے تین دن سے وہ یہ نمبر بار ہا ملا چکی تھی لیکن کبھی بند ملتا' اور اگر بیل جاتی تو اٹینڈ نہیں کیا جاتا۔

مونیکا کو لگ رہا تھا جیسے اس کی کشتی کسی منجدھار میں آکر پھنس گئی ہے' اس کی بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ اس کی والدہ تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی تھیں۔ اب تو مونیکا نے دوبارہ ان کے ساتھ چرچ جانا بھی شروع کر دیا تھا اس لیے ان کا دل اس طرف سے بھی مطمئن ہو چکا تھا۔

"اے رب العالمین' مجھے اس مشکل وقت سے نکال دے' مجھ پر میری طاقت سے زیادہ بوجھ مت ڈالنا۔" زیر لب دعا مانگتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر ذوالکفل کا نمبر ملایا' تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ مونیکا کی ڈوبتی ہوئی نبض کو ایک دم ہی سہارا ملا۔

مانوس گمبھیر آواز اس کی سماعت میں پہنچی اور اس کی دھڑکنوں کو قرار آگیا۔ "مونیکا کیسی ہو تم؟"

"میں ٹھیک ہوں' لیکن تم کہاں ہو' ہزار دفعہ تمہارا نمبر ملا چکی ہوں۔"

"سوری یار! میرا سیل فون اس ٹرپ کے دوران ایک ندی میں گر گیا تھا۔ آج ہی لاہور پہنچ کر نیا فون خریدا ہے۔" ذوالکفل نے شرمندگی سے وضاحت دی' وہ اس کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔ وہ شمالی علاقہ جات کی سیر و تفریح سے لوٹا تھا۔

"لیکن تم کسی اور کے فون سے تو بتا سکتے تھے ناں' تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کتنی اذیت میں ہوں میں' ایک ایک پل قیامت بن کر گزر رہا ہے مجھ پر۔" گالوں پر پھیلتی نمی کو محسوس کر کے اسے علم ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔

"آئی ایم سو سوری یار..." دوسری طرف وہ جان چکا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ "پلیز مونیکا' چپ ہو جاؤ میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں۔"

"تم بتاؤ' میں کیا کروں؟ میکائیل پاکستان آرہا ہے۔" آنسوؤں کے قطرے مسلسل مونیکا کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"میری مانو' تم فوراً لاہور آجاؤ' ہم یہاں کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔" ذوالکفل نے اس کی ڈوبتی ہوئی نبض کو زندگی بخشی۔ اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی' مونیکا نے پھرتی سے فون بند کیا اور جلدی سے آنسو صاف کر کے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی چھوٹی بہن کھڑی تھی۔

"دروازہ لاک کر کے تم کیا کر رہی تھیں؟" وہ مشکوک ہوئی۔

"میں کپڑے چینج کر رہی تھی۔" مونیکا خود کو سنبھال چکی تھی' ویسے بھی ذوالکفل سے بات کر کے وہ اب

ذہنی طور پر پُرسکون تھی۔

"باہر آ کر دیکھو' ممی اور پاپا میں سخت جھگڑا ہو رہا ہے۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئی۔

"کیوں؟" مونیکا کو سخت حیرانی ہوئی' کیونکہ مارتھا اور جارج میں بلا کی ہم آہنگی تھی' اس نے ان دونوں کو کبھی لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکل آئی' سامنے لاؤنج میں پاپا چیخ رہے تھے۔

"بے وقوف عورت! تم یہ کیوں نہیں دیکھ رہی ہو کہ وہ گھر کتنا سستا مل رہا ہے' میں ساری زندگی کرائے کے گھروں میں دھکے نہیں کھا سکتا۔"

"اور تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو کہ اس گھر کے برابر میں مسجد ہے۔" ممی جھنجلا کر گویا ہوئیں۔

"تو کیا چرچ کے آس پاس مسلمانوں کے گھر نہیں ہوتے؟" جارج کو بے تحاشا غصہ آ رہا تھا' مونیکا کو دیکھ کر وہ تھوڑا دھیما ہوئے۔

"تم اپنی ماں کو سمجھاؤ' تھوڑا عقل سے کام لے' اتنی مناسب قیمت میں اتنا اچھا گھر مل رہا ہے' جو میں اس کی فضول منطق کے پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔" انہوں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی کو بھی اس معاملے میں شریک کیا۔

"یہ تو طرف داری کرے گی ہی....." مارتھا کے طنز پر مونیکا کا رنگ اُڑا۔

"وہ تمہاری طرح احمق نہیں ہے۔" جارج نے فوراً" اپنی بیٹی کی حمایت کی۔

"ممی' اگر گھر اچھا ہے تو خرید لینے میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

"دیکھا' میں نے کہا تھا ناں' یہ تو باپ کی چہیتی ہے' اس کی ہر بات پر حمایت کرنے والی۔" مارتھا اب اس سے بھی خفا ہو گئی تھیں۔ اس کی چھوٹی بہن بھی کمرے میں آ گئی تھی۔

"ممی' لینے دیں ناں پاپا کو گھر' یہ بھی تو دیکھیں' کتنے سالوں سے ہم رینٹ پر رہ رہے ہیں' اچھا ہے ناں اپنا گھر ہو جائے گا۔"

"لو اس کی کمی تھی' وہ بھی پوری ہو گئی۔" مارتھا نے بے زاری سے اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف دیکھا' جو باپ کے بالکل ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھی۔ جب کہ بیٹیوں کی طرف داری نے جارج کا موڈ خوشگوار کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ' کیا کہتی ہو؟" وہ مسکرا رہے تھے۔

"ظاہر ہے اب تو وہی ہو گا جو باپ بیٹیاں' چاہیں گے۔" مارتھا نے ہتھیار ڈال دیے تھے' مونیکا فوراً" اٹھی اور محبت سے ماں کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"میں ممی کے ساتھ ہوں' جیسا وہ چاہیں گی' وہی ہو گا۔" اس نے ماں کو مسکہ لگایا۔

"میں تو فی الحال یہی چاہتی ہوں' جہاں بھی جاؤں' پہلے تمہارا فرض ادا کر دوں۔ پوچھیں میکائیل سے کب کی فلائیٹ ہے اس کی۔" وہ ہلکا سا منہ بنا کر بولیں' مونیکا کی ان کے گلے میں گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ساتھ ہی اس کا چہرہ بھی تاریک ہو گیا۔

"فی الحال تو تم لوگ' پیکنگ اسٹارٹ کرو' اب جو ہو گا نئے گھر میں جا کر ہو گا۔" جارج اپنی بیوی کے مان جانے پر خوش تھے۔ ان کا بہت سالوں سے اپنا گھر خریدنے کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔



اس نے پردہ سرکا کر کھڑکی کے پٹ وا کیے۔

اس گھر میں انہیں چھتیس گھنٹے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ رات' جو خدشات اور وہموں سے شروع ہوئی تھی اس کا اختتام بہت خوب صورت انداز میں ہوا تھا۔

رومیصہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا شخص کبھی اس کی زندگی میں اتنا اہم ہو جائے گا کہ اس سے الگ ہونے کا احساس ہی اس کی رگوں سے جان نکال دینے کے مترادف ہو گا۔

ایک نا آسودگی کا جال جس میں وہ ہمیشہ سے قید تھی' اسے اس سے آزادی مل گئی تھی۔ ایسی خوشی تھی جس نے اسے نہال کر دیا تھا۔

رومیصہ سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے اس شخص کے سامنے اب کبھی بھی سر اٹھا نہیں سکے گی' لہو گرما دینے والی اس کی نظریں رومیصہ کے چہرے کو سلگانے لگیں۔

"ہمیں اب اس گھر کو چھوڑنا ہو گا رومیصہ....." اس کی نرم آواز رومیصہ کی سماعت تک پہنچی۔ رومیصہ کو اپنا نام اس سے پہلے اتنا معتبر اور پیارا کبھی بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اڈنے والے آنسو اس شخص کو تکلیف دے رہے تھے۔

"میں کوشش کروں گا' تمہارے ساتھ اگر کچھ اچھا نہ کر سکوں تو میرا وعدہ ہے کبھی برا بھی نہیں کروں گا۔"

"تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟" اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔

"اگر اس طرح روؤ گی تو شاید کہیں بھی نہ جا پاؤں۔" وہ رخ موڑ کر ڈریسنگ کے شیشے کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔

"اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

وہ شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کر سکتی ہوں....." وہ ان لمحات میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کئی صدیوں کی مسافت طے کر چکی ہو۔

"اگر حالات کے گرداب میں پھنس گیا تو کیا کرو گی۔" اس لمحے وہ رومیصہ کو خاصا بے رحم لگا۔

"پھر وہ اعتراف محبت کیوں کیا تم نے؟ کیوں میری پرسکون زندگی میں اپنے نام کا پتھر پھینکا' پہلے کیا کم تھیں اذیتیں جو تم بھی حصہ ڈالنے چلے آئے۔" وہ جیسے ہوش میں آ کر ہذیانی انداز میں چیخی۔

"سب لوگ میرے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں' کسی کو بھی مجھ پر ترس نہیں آتا....." وہ دھواں دھار انداز میں رو پڑی۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا' وہ فوراً اس کے پاس آ بیٹھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا' جو اس نے ناراضی سے چھڑا لیا تھا۔

"ایسا مت کرو میرے ساتھ۔" وہ التجائیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے فون اٹینڈ کیا اور عجلت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

"کہاں ہو تم؟ او کے ہم لوگ آ رہے ہیں۔"

وہ فون بند کر کے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا "دیکھو رومیصہ....." اس نے محبت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے اب کچھ نہیں دیکھنا۔" وہ کسی ضدی بچے کے انداز میں بسوری تو وہ مسکرا دیا۔

"دیکھو میرا وعدہ ہے تم سے رابطے میں رہوں گا' میرا سیل نمبر تمہارے پاس بھی تو ہے۔ جیسے ہی حالات کچھ بہتر ہوں گے تو ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔" اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو چنے' رومیصہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہارے اور میرے رشتے میں اب کسی جھوٹ کی گنجائش نہیں نکلتی، تم نے اپنی ساری زندگی کی داستان کھول کر میرے سامنے رکھ دی، میں مانتا ہوں تمہارا ماضی بہت تلخ ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہارے مستقبل کو تمہارے لیے آسان اور خوب صورت بنا سکوں۔" رومیصہ کا دل اس کی بات پر تھوڑا مطمئن ہوا۔ اس کے لہجے کی سچائی رومیصہ کے دل میں خود بخود جگہ بنا چکی تھی تب ہی وہ اس دفعہ نم آنکھوں کے ساتھ پورے دل سے مسکرا دی۔



اس واقعے کے بعد سے طوبیٰ، تاجدار بیگم کی کاٹ دار نگاہوں سے چھپتی پھر رہی تھی، ان کا مزاج سخت برہم تھا اور گھر بھر کے نوکروں کی شامت آئی ہوئی تھی۔ ان کی دونوں دیورانیاں ندرت بیگم اور شارقہ بیگم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے ان کے خراب موڈ کی اصل وجہ پوچھتی پھر رہی تھیں، لیکن میر ہاؤس میں سوائے طوبیٰ اور شاہ میر کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آج کل ہر ایک پر اتنا کیوں بگڑ رہی ہیں۔

"طوبیٰ بی بی! ورشہوار باجی کب آئیں گی....." صندل کی چھوٹی بہن سندس نے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"کیوں، تمہیں اس سے کوئی کام ہے کیا؟" طوبیٰ کا لہجہ بے زاری میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کام تو کوئی نہیں ہے جی، لیکن ان کے جانے کے بعد پورا گھر اداس، اداس لگتا ہے۔" سندس کی بات پر طوبیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ایک خیال نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

"تمہیں اپنی بڑی بہن صندل یاد نہیں آتی سندس؟"

"بہت آتی ہے طوبیٰ بی بی، وہ ہی تو بہنیں تھے ہم" سندس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ڈسٹنگ چھوڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ صندل سے دو سال چھوٹی تھی اور میر ہاؤس میں ذرا کم کم ہی آتی تھی، اپنی ماں اور بہن کی میر ہاؤس میں مصروفیت کی وجہ سے اس نے اپنے گھر اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔

"تمہیں کچھ پتا ہے، اس نے خود کشی کیوں کی؟" طوبیٰ نے نظریں چرا کر اس سے پوچھا۔

"مجھے صرف اتنا پتا ہے بی بی جی، وہ کسی چھوٹی موٹی بات پر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی، اسے تو موت سے بڑا ڈر لگتا تھا۔" سندس افسردگی سے گویا ہوئی۔

"اس نے کبھی تم سے کوئی بات شیئر نہیں کی، میرا مطلب ہے جب وہ نور محل سے واپس آئی تھی۔" طوبیٰ نے آج گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی۔

"کاش کہ کر لی ہوتی۔" وہ دوبارہ سے اٹھ کر ڈسٹنگ کرنے لگی۔

"اگر تمہیں پتا چلے کہ اسے کسی نے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا تو؟"

"کس کام کے لیے؟" سندس نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"مرنے کے لیے۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

"میں منہ نوچ لوں گی اس خبیث بندے کا۔" سندس کے لہجے کی بے ساختگی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ واقعی ایسا کر گزرے گی۔

"کیا آپ کو لگ رہا ہے کہ ایسا کچھ ہوا ہوگا؟" سندس بلا کی ذہین تھی' طوبیٰ ہلکا سا گڑبڑا گئی۔
"لو مجھے کیوں لگنا تھا بھلا؟" وہ صاف مکر گئی۔

"چھوڑو تم ان باتوں کو' یہ ریک میں کتابیں ذرا ترتیب سے لگاؤ۔" طوبیٰ نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ویسے بھی اسے سندس کی کھوجتی ہوئی نظروں سے گھبراہٹ ہو رہی تھی' اس نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"آپ نے مجھے کہا تھا' فرسٹ ایئر کی کتابیں لے جانا' میرا میٹرک کا رزلٹ بس آنے ہی والا ہے۔" اس کا دھیان دوسری طرف لگ گیا۔

"دیکھ لو ان میں سے جو جو چاہئیں' لے جاؤ۔" طوبیٰ نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا اور بیڈ سے ٹیک لگائی۔

سندس بڑے شوق اور دلچسپی سے اپنے مطلب کی کتابیں چھانٹنے لگی' انگلش' اردو' اسلامیات اور پاک اسٹڈیز کی کتابیں ہی اس کے کام کی تھیں باقی سائنس سبجیکٹس اسے نہیں چاہیے تھے۔

"میں یہ سب لے کر جا رہی ہوں طوبیٰ بی بی!" سندس نے کتابوں کو چھانٹ کر ایک طرف کر لیا۔

"ہاں ہاں لے جاؤ' مجھے اب ان کی ضرورت نہیں...." طوبیٰ ہنوز آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی' اس کا دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ درشہوار کے میرہاؤس میں نہ ہونے کی وجہ سے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا' نمیرہ کے ساتھ اس کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ جب کہ انابیہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔

سندس ساری کتابیں اٹھا کر سرونٹ کوارٹر میں لے آئی' رات کو گھر کے کاموں سے فراغت پا کر وہ یونہی کتابیں کھول کھول کر دیکھنے لگی' صندل کی نسبت اسے پڑھائی کا بے حد شوق تھا۔

پاکستان اسٹڈیز کی کتاب کی جلد تھوڑی خراب تھی' وہ اخبار اٹھا کر اس پر کور چڑھانے لگی' اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے' وہ کتاب پر کور چڑھانے میں مگن تھی' جب ایک چھوٹا سا پرچہ کتاب سے نکل کر اس کی گود میں آن گرا۔

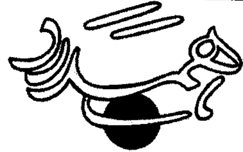
اس نے بے دھیانی میں اٹھایا اور جیسے ہی اس پر نظریں دوڑائیں' اس کا دماغ بھک کر کے اڑا' وہ صندل کی لکھائی ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ سندس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی' جیسے جیسے وہ اس پر نظریں دوڑا رہی تھی' ویسے ویسے اس کے دماغ میں حشر برپا ہو رہا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا' کب رشیدہ بیگم اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟" وہ تھوڑا مشکوک ہوئیں۔

"صندل کا رقعہ!" سندس نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ جب کہ رشیدہ بیگم ہکا بکا انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں' جیسے اس کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔

(باقی آئندہ ماہ)

حاجرہ ریحان



میں تیسری بار گلی میں داخل ہوا تو اسے پہلی بار کی طرح ہی حیرت اور کچھ ڈر سے فٹ پاتھ پر کھڑے اُدھر اُدھر دیکھتے پا کر گاڑی کی رفتار ہلکی کر چکا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ غیر ملکی لگ رہی تھی اور اگر یہاں کی تھی بھی تو بہت سے غیر حاضر دماغ بوڑھوں یا پھر دماغی معذور افراد کی مانند شاید اپنے گھر کا راستہ بھول چکی تھی۔ خیر بوڑھی تو وہ ہرگز نہیں تھی اور اگر دماغی معذور ہوئی تو مجھے واقعی بہت افسوس ہونا تھا۔ کیونکہ اس کی شکل بہت حسین تھی۔ ویسے بھی یہ ایشین جب حسین ہوتے ہیں تو کچھ زیادہ ہی حسین ہو جاتے ہیں کہ ان سے خود اپنا حسن سنبھالا نہیں جاتا۔ مجھے خود پر اپنی سوچ پر حیرت ہونے لگی۔

میں جو اپنی دس سالہ پولیس کی نوکری میں کئی حسین، نشے میں دھت عورتوں کو ان کے گھر تک پہنچا کر آچکا تھا۔ آج ایک معصوم صورت یا شاید دماغی معذور کم عمر عورت کی مدد کرنے کی خاطر اس کے پاس جانے سے پہلے بے اختیار اپنے بال اور شرٹ کالر ٹھیک کرنے لگا تھا۔ پولیس گاڑی کی چھت پر لگے تیز بلب کی لال پیلی نیلی روشنی میں وہ کچھ اور بھی گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی۔ بہرحال میں سکون سے ہلکا سا سائرن دے کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"محترمہ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ کیا میری بات آپ کی سمجھ میں آرہی ہے؟"

اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں تیز مگر نرم آواز میں اس کو مخاطب کر چکا تھا۔ کیونکہ یہ نئے نویلے گھومنے پھرنے کے لیے آنے والے زیادہ تر ایشین پتا نہیں کیوں پولیس وردی میں کسی انسان یا پھر پولیس گاڑی کو دیکھ کر اتنے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ اکثر تو مدد لینے کے بجائے سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں اور میں اسے ابھی فی الحال کسی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں بولتے بولتے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"دراصل میں... اصل میں... میں اپنا گھر بھول گئی ہوں؟ میرا مطلب ہے میرے کزن کا گھر جہاں میں رہ رہی ہوں۔" اس نے گھبرائے ہوئے انداز سے رواں انگریزی میں جواب دیا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔ شکر ہے نہ تو وہ پاگل تھی اور نہ ہی نشے میں تھی۔ اوپر سے آواز بھی پیاری تھی۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے محترمہ... آپ کے پاس ایڈریس ہے؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے میری آنکھوں میں دیکھا پھر میری لال 'پیلی' نیلی روشنی پھیلاتی پولیس کی گاڑی کو اور پھر سر جھٹک کر اپنے کندھے سے لٹکے بڑے سے بیگ میں سے ایک کتھئی لفافہ نکال کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

"آفیسر... میں بالکل صحیح اور قانونی طریقے سے آپ کے ملک میں آئی ہوں' میں بالکل بھی ویزے کے ہیر پھیر میں ملوث نہیں ہوں۔ میرا چھ مہینے کا وزٹ ویزا ہے اور ابھی مجھے یہاں آئے چوتھا دن ہی ہوا ہے۔ آپ چاہیں تو میرے تمام کاغذات دیکھ سکتے ہیں۔"

میں ایک بار پھر زیر لب مسکرایا۔ وہی ازلی ایشائی سوچ۔ پولیس والا کچھ پوچھ رہا ہے تو شک ہی کر رہا ہوگا۔

"محترمہ میں آپ کی بات پر پورا یقین رکھتا ہوں' میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں اور اگر آپ مجھے اپنے کزن کا گھر جہاں آپ ٹھہری ہوئی ہیں' وہاں کا ایڈریس دے دیں تو میں آپ کی رہنمائی کر کے بس اپنا فرض نبھانا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں دوبارہ مجھے آپ کو صفائی دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟" میں نے اب کی بار لہجے میں سختی لاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے اب کی بار جز بز ہو کر بیگ کو چند لمحے کھنگال کر ایک تہہ کیا ہوا پرچا نکال کر مجھے تھما دیا۔ سب سے

اس پہ موٹے مارکر سے بڑے حروف میں گھر کا پتا اور گھر کے مالک کا نام لکھا تھا اور تحریر ختم ہو جانے کے بعد نیچے کسی نے غالباً ”شرارتاً“ بال پوائنٹ سے نوٹ لکھا تھا۔

”اس لڑکی کو اغوا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔۔۔ یہ اتنی ہی غریب ہے۔۔۔ اس لیے جس کو بھی ملے‘ اوپر لکھے پتے پر پہنچا دے۔“

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب تاسف سے سر ہلا رہی تھی۔ شاید اس نے بھی یہ نوٹ ابھی ہی میرے ہاتھ میں پرچا تھمانے کے بعد پڑھا تھا۔ مطلوبہ گھر گلی کے اختتام پر موجود چورنگی کی دوسری طرف پہلی دائیں ہاتھ کی گلی کے آخر میں تھا۔ گلی کے زیادہ تر گھر پاکستانیوں کے تھے جو یہاں صدیوں سے آباد تھے اور اب برطانوی شہریت کے حامل تھے۔ میرے ایک دوست کا گھر بھی اسی گلی میں تھا جو کہ میری ہی طرح پولیس میں تھا اور اتفاق سے اس کی ڈیوٹی کے شروع ہونے اور اپنی ڈیوٹی کے ختم ہونے پر مجھے اسے ہی لینے کے لیے اس گلی میں تھوڑی دیر تک جانا تھا۔ تب ہی میں یہاں اس علاقے میں گھوم کر وقت گزار رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آیا میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ بہ آسانی میرے راستے سمجھانے کو سمجھ بھی سکے گی یا نہیں کیونکہ ایک تو وہ گھبرائی ہوئی تھی اور دو چار باتوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کافی تھکی ہوئی بھی تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے ان ہی گلیوں میں گھوم گھوم کر ہلکان ہو رہی تھی۔ لہٰذا میرے پاس ایک اور بہت آسان حل تھا۔

”آیئے۔“ میں نے پیچھے مڑ کر پولیس گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”جی؟ مگر کیوں؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”اوہ ہو۔۔۔ میں آپ کو آپ کے دیے گئے ایڈریس چھوڑنے جا رہا ہوں بھئی۔“ اب میں باقاعدہ جھنجھلا گیا۔

”نو۔۔۔ نیور۔۔۔ اس گاڑی میں بیٹھ کر میں ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔۔۔ ارد گرد موجود جو بھی دیکھے گا‘ یہ ہی سمجھے گا کہ میں کچھ غلط کرتے پکڑی گئی ہوں تب ہی پولیس مجھے گھر تک چھوڑنے آئی ہے۔“

”عجیب باتیں کر رہی ہیں آپ؟ بھلا لوگ آپ کے بارے میں ایسا کیوں سوچیں گے؟ پھر یہاں تو اکثر ہی ہمارے ملک گھومنے آنے والے نئے مہمان (وزیٹرز) راستہ بھول جانے پر پولیس کی ہی مدد لیتے ہیں۔“

”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ ہمارے ہاں پولیس وین میں یا تو پولیس والے بیٹھتے ہیں یا پھر چور مجرم۔۔۔ اس لیے میں ہرگز ہرگز اس گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے ایڈریس سمجھا دیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ شکریہ‘ آپ کی مہربانی۔“

وہ جیسے ننھے بچوں کی طرح اکڑ کر جم کر کھڑی ہو گئی تھی‘ میں نے دو چار لمحے اپنے حواس بحال کرنے میں لگائے۔ پولیس کی نوکری کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیں لوگوں کا اعتماد جیتنے کے لیے کسی قسم کی کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ بس ہماری وردی۔۔۔ ہمارا اعتماد جیسے سامنے والے کو فوراً ہی ہم پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ہمیں ایک طرح سے اپنی بات



منوانے کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں سکون سے اسے گاڑی میں بٹھا کر اس کے مطلوبہ گھر تک چھوڑ آنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ ایک دل تو ہوا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جیسے تیسے پتا سمجھا کر اپنی راہ لوں، مگر پھر... اندھیرا تقریباً ہو چکا تھا اور پرچے میں دیے گئے نوٹ کے برعکس یہ اغوا ہونے کے بعد ہی کافی کام کی تھی۔

میں نے لمبا سانس کھینچ کر خارج کیا۔ اس کے دیے گئے لفافے سے نکال کر اس کے پاسپورٹ سے اس کا نام اور قومیت دیکھی اور پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ بند کر کے آگے کا دروازہ کھول کر باہر ہی کھڑے کھڑے وائرلیس ریڈیو کے ذریعے اپنے مقامی آفس میں پیغام دینے لگا کہ میں گاڑی چھوڑ کر ایک راہ گیر کو قریب ہی اس کے گھر تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ جواب میں مجھ سے فوراً" پوچھا گیا کہ میں گاڑی کیوں نہیں لے جا رہا جس پر مجھے جھوٹ بولنا پڑا کہ راہ گیر کار فوبیا کا مریض ہے اور پیدل ہی جانا چاہتا ہے۔

وہ سامنے ہی کھڑی میری بات چیت سن رہی تھی اور میری آخری بات پر اس نے پہلے تو غصے سے اپنی دائیں ابرو اٹھائی تھی اور پھر منہ پھیر لیا تھا اور مجھے اس طرح اس سے بدلہ لینا اچھا لگا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسرور ہو کر گاڑی بند کر کے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔

"ویسے یہ میں نے نئی بات سنی ہے کہ آپ کے ملک میں پولیس والوں کے ساتھ بیٹھنے والے کو چور یا مجرم ہی سمجھا جاتا ہے۔ پھر پولیس والے کے گھر والے جیسے کہ اس کی بیوی اگر کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کہیں جاتی ہو گی تو؟ ٹھہریں ٹھہریں، مجھے اندازہ کرنے دیں۔ شاید وہ اپنے گلے میں ایک بڑی سی تختی لٹکا لیتی ہو گی کہ میں چور نہیں، برابر میں بیٹھے پولیس والے کی بیوی ہوں۔ کیوں؟ ہاہاہا...." وہ چار قدم اٹھانے کے بعد میں نے اپنی رفتار ہلکی کرتے ہوئے اس کے قریب آنے پر شرارت سے پوچھا اور اپنی احمقانہ بات پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس نے سر جھٹکا اور اس کی پشت پر بکھرے اس کے لمبے سیاہ بال لہریں کھانے لگے۔

"میں معافی چاہتی ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے پریشانی ہو رہی ہے، میں یہ تو جانتی ہوں کہ ایڈریس نہیں قریب کا ہے۔ آپ سمجھا دیتے تو میں خود ہی چلی جاتی۔"

"ارے آپ کم از کم اتنی خدمت کا موقع تو دیں۔ آخر آپ ہمارے ہاں گھومنے آئی ہوئی ہیں۔ ہمارا فرض ہے آپ کی مدد کرنا۔" میں ایک بار پھر سے محتاط ہو گیا۔

یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ ایشین خاص طور سے نئی آئی ہوئی خواتین مردوں سے اس طرح بے تکلفی سے ہنستی بولتی نہیں جیسا یہاں کا رواج ہے اور ویسے بھی انڈین، بنگلہ دیشی یا ایشیا کے کسی دوسرے ملک سے آئی ہوئی عورتوں کے برعکس ان پاکستانی عورتوں کا مزاج تھوڑا شاہانہ سا ہوتا ہے۔ یہ بدتمیزی اور بدتہذیبی برداشت نہیں کرتیں۔ ہاتھ لگانا تو دور کی بات یہ بات چیت میں بھی فاصلہ رکھتی ہیں۔ میری دس سالہ پولیس نوکری اب تک بے داغ بھی شاید اسی لیے چلی آ رہی ہے کہ میں خود بھی سامنے والے کو حد میں رکھتا ہوں چلو بے تکلف نہ ہو، مگر یہ دوسری عام عورتوں کی طرح پٹر پٹر بولنا ہی شروع ہو جائے تو میں خاموشی سے راستہ طے کر لوں۔ اب دو بندے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو اس قدر خاموشی کیا اچھی لگتی ہے؟

☼ ☼ ☼

خیر اسے نہ بولنا تھا نہ بولی اور ہم پانچ منٹ میں مطلوبہ گھر تک پہنچ گئے۔ اس نے دور سے ہی گھر پہچان کر تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے کھنچی کھنچی سی تھی، اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے یکسر نظرانداز کر چکی ہے۔ میں کندھے اچکا کر اس سے کچھ دور پہلے ہی رک گیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کا دروازہ کھولنے والا اسے میرے ساتھ دیکھے ایک پولیس والے کے ساتھ.... جس کا مطلب کے ملک میں کچھ اور لیا جاتا ہے۔ دروازہ کھولے ج

میری طرف دیکھے بغیر ہی وہ اندر چلی گئی تھی' میں نے ایک بار پھر گہری سانس لی۔ پتا نہیں دل میں کسک سی اٹھی تھی۔ نہیں' مجھے بھوک لگ رہی تھی' میں خود کو بہلاتا واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"ابے اوئے... تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کس کو پکڑ کے لایا ہے... بول؟" اچانک میرے پیچھے کسی کھڑکی میں سے کسی نے اردو میں مجھ سے پوچھا' میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی ان لوگوں کو پولیس والوں سے بس ایسے ہی کسی کام کی امید رہتی ہے' میں اپنی دھن میں پوچھنے والے کی طرف دیکھے بغیر چلتا چلا جا رہا تھا کہ وہ پیچھے سے آکر میرے کندھوں پر تقریباً "لٹک گیا۔

"بول ناں... کون تھی؟" اب کی بار پیار سے پوچھا گیا۔

میں نے منہ گھما کر شاہد کو دیکھا جو اس وقت اپنی ڈیوٹی کے لیے نکل رہا تھا' اسی لیے وردی میں تھا۔ اب کیونکہ شاہد نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تھا تو میں کسی بھی طرح اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا' مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے کھیلتے گاڑی تک آگئے۔ میری شفٹ ختم ہو چکی تھی اور شاہد کی شروع ہوئی تھی۔ اب مجھے آفس جا کر رخصت کی حاضری لینی تھی اور اصول کے مطابق گاڑی شاہد کے حوالے کر کے اپنے گھر کی راہ لینی تھی' مگر زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ میں ڈیوٹی ختم کرنے سے پہلے شاہد کو اس کے گھر سے لے لیا کرتا تھا اور پھر شاہد گاڑی کا چارج لے کر مجھے گھر تک چھوڑ دیا کرتا تھا۔ ویسے بھی ہمارا کام ہی اپنے مقررہ علاقوں میں گھوم پھر کر اسٹریٹ کرائم کی روک تھام تھا۔ جس میں شاذ و نادر ایسا بھی ہو جاتا جیسا آج ہوا تھا۔ ہم مقامی آفس سے فارغ ہو کر گاڑی میں آبیٹھے تھے۔ اب شاہد گاڑی چلا رہا تھا اور میں سکون سے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"ویسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تو لوگوں کو اپنے بارے میں بتاتا کیوں نہیں؟ چل ہر کسی کو نہ بتا' مگر کم از کم بندہ اپنی قومیت کے لوگوں کو تو بتا ہی دیتا ہے؟"

شاہد نے اچانک بات چھیڑی۔ مجھے حیرت ہوئی۔

"تجھے کیسے پتا چلا کہ میں نے اسے اپنے بارے میں نہیں بتایا؟"

"لو' بتایا ہوتا تو وہ اس طرح تجھے دیکھے بغیر یا شکریہ کہے بغیر چلی جاتی؟"

شاہد نے آخر کار مجھے گھیر لیا تھا۔ یہ بات صحیح تھی کہ میرے والدین بھی پاکستانی تھے جب کہ میں نہ صرف یہاں کی پیداوار تھا بلکہ میری شکل و صورت اور انداز گفتگو بھی کچھ اس طرح مغرب زدہ ہو گیا تھا کہ جب تک میں خود اپنا نام اور اپنے والدین کے بارے میں بات نہ کرتا لوگ مجھے انگریز ہی سمجھتے تھے اور مجھے اس نوکری میں اپنا اس طرح نہ سمجھا جانا پسند بھی تھا کیونکہ میں کسی بھی طرح کی جذباتی وابستگی کے بغیر سب کے ساتھ ایک جیسے سلوک کے ساتھ پیش آنا چاہتا تھا' مگر اب مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ شاہد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کم از کم مجھے اس کو تو بتا ہی دینا چاہیے تھا۔ شاید پھر وہ مجھ سے اس طرح اکھڑی ہوئی نہ رہتی۔ شاید ٹیلی فون نمبرز کے تبادلے ہو جاتے۔ دوبارہ ملنے کے وعدے بھی ممکن تھے' مگر اب تو دیر ہو چکی تھی۔ کیا دوبارہ کوئی راہ ملاقات تھی؟

میرے خیال میں تو نہیں تھی کیونکہ وہ صرف چھ مہینے کے لیے آئی تھی' میں نے اس کے کاغذات دیکھ لیے تھے۔ وہ یہاں اپنے ماموں کے ہاں چھ مہینے مہمان کے طور پر آئی تھی جس کے چار دن وہ گزار چکی تھی۔ اگر وہ یہاں کی شہری ہوتی تو میں جھٹ اپنے آفس کے ڈیٹا بیس سے اس کے آباؤ اجداد تک کا کھوج لگا سکتا تھا۔ وہ کہاں کہاں جاتی ہے' کس سے ملتی ہے' کب گھر پر ہوتی ہے اور کب گھومنے نکلتی ہے۔ سب کچھ معلوم کر سکتا تھا' مگر وہ صرف چھ مہینے کی مہمان تھی اور میں نے جان پہچان بڑھانے کا ایک اچھا موقع کھو دیا تھا اور اب... میرے پاس کوئی راہ ملاقات نہیں

تھی۔

"خیر تو فکر نہ کر، میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔" شاہد نے میرے گھر کے باہر گاڑی روکتے ہوئے ہمدردی سے کہا اور میں جو اس وقت سے اپنی سوچوں میں گم تھا' چونک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاہد آخر کیوں اس طرح کہہ رہا ہے' میں نے تو اس سے نہیں کہا کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلومات کر کے مجھے بتائے' مگر میں اسے منع بھی نہیں کر سکا اور خاموشی سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔



آج کل سردیاں عروج پر تھیں لہٰذا چار بجے سے ہی سورج ڈوب جایا کرتا تھا اور اس وقت ساڑھے چھ بجے ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات ہو چلی ہو۔ اوپر سے یہ بے روک ٹوک آوارہ پھرتی دھند۔ امی جان ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ لندن کا موسم بہت اداس کر دیتا ہے۔ یہ یادوں میں رہنے والوں کے لیے ہی بہترین ہے۔ وہ جن کو ماضی کے علاوہ کہیں چین نہیں ملتا۔ بس ایسے ہی خوابوں میں رہنے والے لوگ لندن میں خوش رہ سکتے ہیں۔ شاید اسی لیے امی جان آئے دن پاکستان کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ لندن کا موسم انہیں کچھ بھولنے ہی نہیں دیتا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ ان کو پاکستان کے بارے میں بات کرتے سنا۔ ان کی مجبوری تھی کہ ان کا پاکستان میں کوئی نہیں۔ وہ جائیں بھی تو کس کے پاس جائیں اور بابا جانی اپنے رشتہ داروں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔

اس لیے ایک بار میرے والدین جو یہاں آئے تو پھر دوبارہ پاکستان نہیں گئے۔ پھر بھی ہمارا پورا گھر نیوز چینلز کے ذریعے پاکستان سے ہر دم جڑا رہتا ہے۔ امی جان نت نئے ڈراموں سے اندازہ لگاتی رہتی تھیں کہ اب وہاں کی خواتین کس طرح کے فیشن کر رہی ہیں۔ بابا جانی بھی بے دلی سے ہی سہی' مگر عید بقر عید میں اپنے بچے کھچے رشتہ داروں سے بات چیت کر لیا کرتے تھے۔

میں واپسی کا سارا رستہ خود کو بہلاتا آیا تھا کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور نامعلوم سی اداسی کو بار بار بھوک کا نام دے کر خود کو دھوکا دیتا رہا تھا' مگر گھر آ کر اپنی پسند کا کھانا سامنے دیکھ کر بھی مجھ سے ایک لقمہ — نہیں لیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے میز پر پلیٹ سامنے رکھے پتا نہیں کتنا وقت ضائع کیا تھا۔ حسب معمول امی جان کسی ڈرامے میں ہونے والی ساس بہو کی لڑائی میں اس قدر مشغول تھیں کہ مجھے نظر انداز کر گئی تھیں۔

میں بھی خاموشی سے کھانے کی پلیٹ کو ویسے ہی فریج میں رکھ کر باورچی خانے میں چائے بنا کر اب اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ میرے موبائل پر شاہد کی کال آنے لگی۔ اکثر کہیں کسی جرائم پیشہ افراد کے پیچھے بھاگتے یا پھر کسی کو لاک اپ میں بند کرتے شاہد مجھے فون کر کے بتا دیا کرتا تھا کہ وہ کتنا بڑا کارنامہ انجام دے جا رہا ہے۔ حالانکہ ایسے ہی کئی کام میں بھی اپنی ڈیوٹی کے دوران انجام دیا کرتا تھا' مگر اس طرح اسے تنگ نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک بار تو فون نہیں اٹھایا اور اسی طرح بجتے فون کو پکڑے دوسرے ہاتھ میں چائے کپ لیے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے ایک ڈر بھی تھا کہ وہ مجھ سے بلاوجہ کے سوال جواب کرے اور امی جان کے سامنے اس قسم کی کوئی بات کرنا' خود پھنسوانے جیسا تھا۔ مگر جب اس کی کال بار بار آنے لگی مجھے فون اٹھانا پڑا۔

"ہاں... سو تو نہیں گئے تھے؟" شاہد ٹھہری ہو آواز میں پوچھ رہا تھا میں سنبھل گیا۔

"ایسا کرو آفس چلے آؤ... وردی میں آنا۔"

"کیوں... خیریت کیا ہوا؟" میں نے فوراً اٹھ غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں خیریت ہی ہے۔ بس تم آؤ تو بات کر ہیں۔"

شاہد نے زندگی میں کم ہی مجھ سے اس طر سنجیدگی سے بات کی تھی اور پھر مجھ سے وردی

آنے کا کہا تھا تو یقیناً "کوئی اہم بات تھی۔ میں جلد از جلد تیار ہو کر آفس کے لیے اپنی ہی گاڑی میں نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

امی جان اور بابا جانی کو میری نوکری کا اندازہ تھا لہٰذا ان کے لیے میرا ڈیوٹی سے آکر پھر اچانک چلے جانا کوئی ئی بات نہیں تھی۔ شاہد مجھے آفس کے باہر داخلی سیڑھیوں کے پاس ہی کھڑا نظر آگیا تھا۔ وہ مجھے گاڑی سے اترتا دیکھ کر سیڑھیوں سے اتر کر میری طرف چلا آیا تھا۔

"وہ لڑکی... اندر ہے۔" شاہد نے بلا تمہید مجھے تایا۔

"کیوں؟ کیا پھر گم ہو گئی تھی؟" میرے ذہن میں یک ہی خیال آیا۔

"نہیں... ایک سپر اسٹور میں چوری کرتی پکڑی گئی ہے۔ اس کے بیگ سے سونے کا بریسلیٹ نکلا ہے۔ س کی اس نے قیمت نہیں چکائی تھی اور اس یسلیٹ پر نشانات پڑے ہوئے ہیں جیسے اس کے کڑے کرکے اسٹور سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔ اس نے جس سامان کی قیمت چکائی ہے' وہ نہایت معمولی ت والا سامان تھا اور اس کے پاس بریسلیٹ کی ت کے مطابق پیسے بھی نہیں تھے لہٰذا یہی سمجھا رہا ہے کہ وہ اصل میں سونے کا بریسلیٹ ہی چوری رنے گئی تھی مگر پکڑی گئی۔"

میں گم صم ہو گیا۔ ویسے تو وہ مجھے تھوڑی بے وقوف تھی مگر کیا واقعی وہ اس قدر بے وقوف تھی؟ کیا ے معلوم نہیں کہ یہاں اس طرح کے جا بجا سپر ٹورز میں گو کہ سونا زیور اور ہر قیمتی اشیا یوں ہی کھلے م رکھی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے کسی خفیہ گوشے ایک مقناطیس جیسا ریڈار چھپایا جاتا ہے۔ اگر کوئی یدار سامان کی قیمت چکائے بغیر اسٹور سے قدم باہر تا ہے تو یہ ریڈار اسٹور کے سیکیورٹی عملے کے آفس موجود سائرن کو بجا دیتا ہے اور کیمرے چور کی نہ تصویر لے لیتے ہیں بلکہ گیٹ پر کھڑے سیکیورٹی ڈز ہدایات ملنے پر فوراً "چور کو قابو کر لیتے ہیں مگر پھر... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

میں اپنے دس سالہ تجربے کی بنیاد پر یہ بات وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ وہ چور نہیں تھی۔ وہ بے وقوف ہو سکتی تھی' مگر چور نہیں ہو سکتی تھی۔ شاہد مجھے تمام معلومات دیتا اندر تک لے آیا تھا۔ وہ اپنی ممانی اور کزن کے ساتھ تھی۔ ان دونوں نے بھی کچھ معمولی گھریلو استعمال کا سامان لیا تھا جس کی انہوں نے قیمت چکا دی تھی۔

"اس کی آنٹی اپنی بھانجی کی اس حرکت پر کوئی بھی ذمہ داری نہیں لے رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ برطانیہ کی شہری ہیں اور اس طرح کی کوئی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں جب کہ یہ لڑکی چند ماہ کے لیے گھومنے آئی ہے اور اس سے ان کو ایسی ہی توقع تھی لہٰذا..." شاہد کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اصول کے مطابق اسٹور کی انتظامیہ نے بریسلیٹ کے خراب ہو جانے پر ان لوگوں سے جرمانے کے طور پر بریسلیٹ کی قیمت مانگی ہو گی۔ جس کو چکا کر اسے چوری کے الزام سے نجات مل جاتی۔ اس کے بعد پولیس کے ذریعے کورٹ کے سامنے پیش کر کے اس کی اس حرکت کی پاداش میں یہاں کی حکومت اسے فوراً "ملک بدر کر دیتی۔ یعنی کہ وہ پانچویں دن ہی پاکستان سدھار جاتی' مگر اب کیونکہ اس کے پاس بریسلیٹ کی قیمت نہیں تھی اور اس کی آنٹی بھی اس کے لیے بریسلیٹ کی قیمت دینے پر تیار نہیں تھیں تو یقیناً "اسے ملک بدر ہونے سے پہلے یہاں کسی جیل میں اپنی چوری کی سزا جو چھ ماہ سے ڈیڑھ سال ہو سکتی تھی' وہ پوری کرنی ہو گی۔ پھر اسے پاکستان جانے کی اجازت ملے گی۔

حسب معمول آفس میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ کچھ جو مجرم تھے۔ کچھ جن کو نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے پکڑ کر لایا گیا تھا۔ کوئی اپنے بھائی بہن کی ضمانت کرانے آیا ہوا تھا اور یہ سب ایک بڑے سے ہال میں رکھی بے شمار سیٹوں میں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال میں گھستے ہی میری نظر اس پر چلی گئی تھی۔ مجھے ایک اور دھچکا لگا' میں نے امی جان کو اکثر عید'

بقر عید میں اس طرح چمک دمک والی شلوار قمیص پہنتے دیکھا تھا یا پھر وہ کہیں کسی دعوت میں مدعو ہوتیں تو اسی طرح تیار ہوتی تھیں۔ اس کی تیاری سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ کہیں خاص جگہ مدعو کی گئی تھی' مگر اس کا ٹھکانہ تھانہ بن گیا تھا۔

اس طرح کے ماحول میں اس کی تیاری کچھ زیادہ ہی نظروں میں آرہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی تھی' مگر اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ جب کہ اس سے چند سیٹیں چھوڑ کر ایک ادھیڑ عمر کی خوش شکل خاتون اور ایک لمبا تڑنگا خوبرو سا نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ دونوں بھی اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہی اس کی آنٹی اور شرارتی کزن ہے جس نے پتے کے پرچے پر نوٹ لکھا ہوگا۔ خیر میں خود کو نمایاں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسے کئی مواقع آئے تھے جب کوئی مجرم پاکستانی ہونے یا مجھ سے ذرا سی بھی جان پہچان کے بدلے بلاوجہ قانون میں لچک مانگتا تھا جو کہ میرے لیے ناممکن ہوتا کیونکہ بہر حال یہاں قانون سب کے لیے برابر تھا۔ اس نے بھی مجھے ایک نظر دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں تھا۔

میں اور شاہد ہال سے منسلک شیشے کے بنے اپنے آفس میں آکر بیٹھ گئے تھے جہاں پر اسٹور انتظامیہ کا ایک بندہ پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ماموں کو بلایا جا چکا تھا کیونکہ وہ ان کے ہی بلاوے پر لندن آئی تھی لہٰذا تمام تر ذمہ داری بھی ان کی ہی بنتی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ ایک ادھیڑ عمر کے صاحب بھاگے بھاگے آکر اس سے لپٹ گئے۔ ان سے لپٹ کر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی' میں اپنی جگہ بیٹھا جز بز ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر اسے دلاسہ دے کر وہ صاحب اسے لیے ہمارے پاس آگئے۔

حال احوال جان لینے اور اپنی بھانجی کے اوپر اسٹور انتظامیہ کا الزام اور جرمانے کی تمام تفصیلات سن لینے کے بعد اس کے ماموں نے بڑے اطمینان سے اسٹور والوں کو تمام جرمانے کی ادائیگی کی یقین دہانی کروا دی تھی اور ان سے درخواست بھی کردی تھی کہ وہ ان بھانجی پر لگے الزام کو بھی واپس لے لیں تاکہ وہ ملک بدر ہونے سے بچ سکے اور اپنے ویزے کے چھ مہینے پورے کرکے ہی واپس جائے۔ ابھی اس کے ماموں نے بات کی ہی تھی کہ وہ بیچ میں بول پڑی۔

"نہیں ماموں جان.... آپ اتنا تردد نہ کریں' یہاں ویسے بھی ایک دن بھی مزید رہنا نہیں چاہتی۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ آپ میری ضمانت اور پیسے خرچ کرنے کے بجائے کورٹ میں پیش ہو ملک بدر ہونے کا فیصلہ لینے دیں پلیز اور ہو سکے تو معاف کردیں۔"

ہم سب حیران رہ گئے۔ عموماً" یہاں آنے والے اپنے ویزے کے آخری سیکنڈ تک خرچ کرکے جاتے ہیں اور ایک یہ تھی۔ اب جب کہ اس کے ماموں ذمہ داری لے رہے تھے اور اسٹور والا بھی انکار نہیں تھا تو پھر کیا مسئلہ تھا۔ بہر حال وہ اپنی ضد پر رہی۔ اسٹور والا تھوڑی ہی دیر میں اس کے ماموں سے بریسلیٹ کی قیمت ادا کرنے کا تحریری حلف نامہ لے کر چلا گیا تھا۔ اب کیونکہ وہ اپنے ماموں کی ضمانت پر ہو کر ان کے ساتھ واپس جانے پر تیار نہیں تھی اور کورٹ میں اپنا فیصلہ سننے پر بضد تھی تو اسے کورٹ میں پیش کیے جانے تک کا تمام عرصہ اسی تھانے کے لاک اپ میں گزارنا تھا۔ اس کے ماموں نے کافی دیر تک اس کی منت سماجت کی تھی مگر پھر وہ بھی تھک ہار کر چلے گئے تھے جب کہ اس کی ممانی اور کزن تو ماموں کے آنے پر ہی جا چکے تھے۔ ساتھ میں یہ وعدہ بھی کر گئے تھے کہ وہ اس کا سامان پیک کرکے تھانے میں ملک بدر ہونے پر پہنچا دیں گے۔

ان دونوں کی اس قدر بے حسی پر میں اور شاہد کچھ سمجھ چکے تھے' مگر بہر حال ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پھر وہ بھی اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ اپنے ماموں کو تو مطمئن کر سکی تھی یا نہیں' مگر مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال رہی تھی۔ بھلا میں اپنی نظروں کے سامنے شاہد کو اسے

ک اپ میں بند کرتا' کیسے دیکھ سکتا تھا۔ یہ سب میری داشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر اس کی چپ پتا یں وہ خود کو سزا دینے پر کیوں تلی بیٹھی تھی۔ ماموں ے جانے کے بعد وہ مکمل طور پر ہمارے حوالے تھی ر اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے یا ہاں جانا ہے' میں شاہد کا اشارہ پا کر اسے آفس سے لے کر نکلا۔ سردیوں میں ہر جگہ ہیٹر چل رہے ہوتے ں اس لیے کسی بھی ریسٹورنٹ' اسٹور یا آفس یہاں ت کہ گاڑی میں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ باہر کس ر سردی ہے لہٰذا اب تک میں نے غور نہیں کیا تھا' ر آفس سے باہر آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اس نے ے کپڑے کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

"تمہارے پاس کوئی سوئیٹر وغیرہ نہیں ہے؟ شام کو ب میں نے تمہیں چھوڑا تھا تب تو تم نے ایک اچھا ا اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ کہاں گیا؟"

میں نے اس سے آفس کے دروازے پر پوچھا۔

ی بار اس نے شاید پہلی بار مجھے دیکھا تھا اور وہ ن رہ گئی تھی۔ یعنی وہ واقعی اب تک مجھے پہچان ں سکی تھی۔ اس نے باہر کی سردی محسوس کر کے رادی طور پر اپنے ہاتھوں سے کندھوں کو چھوا۔

"اوہ... میرا کوٹ تو ممانی جان کی گاڑی میں ہی رہ گیا "

میں نے اسے اپنا اوور کوٹ پہننے کے لیے دیا اور ےسے باہر آ گیا۔

وہ اس وقت ایک مجرم تھی جس کو پولیس آزاد نہیں ر سکتی تھی' مگر بہرحال وہ شاہد کی ذمہ داری تھی اور وہ میرے لیے کر سکتا تھا۔ ایک دو بار ہم پہلے بھی دوسرے کے لیے اس طرح کی قانون شکنی کر چکے ایک بار ایک چھوٹے سے بچے کی ماں بس میں ر گئی تھی۔ عورت کو سرد خانے میں رکھوا کر اگلی صبح کورٹ میں پیش ہو کر کسی یتیم خانے یا سی رشتہ دار کے ہاں جانے کی اجازت ملنے تک تھانے میں ہی رہنا تھا' مگر پھر شاہد اس روتے بلکتے اپنے گھر لے گیا تھا جہاں اس کی بیوی نے اس بچے کو کھلا پلا کر سکون سے سُلا دیا تھا۔

جب تک ہم سیڑھیاں اترے' وہ پولیس گاڑی لیے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بغیر کچھ پوچھے پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ مجھے ایک بار پھر تکلیف ہوئی۔ ابھی شام میں وہ کس طرح پولیس گاڑی میں بیٹھنے پر ناراض ہو گئی تھی۔ شاہد کی ڈیوٹی تھی لہٰذا وہ آفس چلا گیا تھا جب کہ میں پولیس گاڑی میں اسے لیے بے مقصد سڑکوں پر گھومتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پیچھے کی سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے خالی دھند بھری سڑکوں میں گزرتے نہ نظر آنے والے سائن بورڈ پڑھتی جا رہی تھی۔

"بریسلیٹ تمہارے کزن نے اُڑایا تھا یا ممانی نے؟" میں نے اچانک اردو میں سوال کیا تو اس نے ایک بار پھر چونک کر میری طرف دیکھا اور سنبھل کر بیٹھی' مگر پھر کچھ سوچ کر بے سدھ سی ہو کر پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

"یہ المیہ ہے... ہمارے معاشرے کا کہ رشتوں کی مضبوطی کو بچوں کی زندگیوں سے مشروط کر دیتے ہیں... اپنے وقت... حالات... اوقات... غربت... کسی پر نظر ثانی نہیں کرنے اس کی تمنا کرتے ہیں جو کبھی خواب میں بھی حاصل نہ ہو سکے... صرف اس لیے کہ وہ رشتہ دار ہے... سگے بھائی کا بیٹا... آصف کا بھی قصور نہیں... مسلط کیے جانے کا یہاں نہ تو رواج ہے اور نہ ہی عادت..." وہ کچھ اور کہتی' مگر چپ ہو گئی۔

"مرد تھا تو آرام سے منع کر سکتا تھا... اس طرح تمہیں تکلیف دے کر... آزار دے کر اسے کیا ملا؟" میں نے ہلکے سے جواب دیا۔

"امید... انکار سے امید نہیں ٹوٹتی... امید صرف اور صرف سنگین قسم کے الزام... نفرت کی انتہا کو پہنچے ہوئے کسی اقدام سے ٹوٹتی ہے... سو آصف کا مجھے وہ زخم دینا ضروری تھا جو صحیح ہو نہ آزار دینا چھوڑے... ایسا داغ جو ماتھے پر ساری عمر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے... ایسے ہی تو... امید ٹوٹتی ہے۔ چلیں اچھا ہوا... اب کم از کم مجھے امی کو دلائل دینے نہیں پڑیں گے... شاید امی

کو اب تو مجھ پر بھی رحم آ ہی جائے گا۔"
وہ خاموشی سے ایک بار پھر آنسو بہانے لگی تھی۔
میرے پاس اسے دلاسہ دینے کو الفاظ نہیں تھے۔
میں پوری رات اسے اسی طرح سڑکوں پہ لیے پھرتا رہا تھا۔ مجھے اپنی دس سالوں میں کی گئی رات کی شفٹ کبھی اتنی بھاری نہیں لگی تھی۔ اس کے قریب ہو جانے کا کس قدر شوق ہوا تھا مجھے۔ آج ہی شام کی تو بات ہے اور میری خواہش کیسی ابتری میں پوری ہوئی تھی... کتنی بے رونقی اور بے ترتیبی کے ساتھ...



صبح سات بجے تک آفس پہنچنے سے پہلے میں نے اسے کافی اور کچھ سینڈوچ دلائے۔ کافی اس نے پی لی تھی مگر سینڈوچ کا ڈبا ویسے ہی گاڑی میں چھوڑ گئی تھی۔ آفس کے ہال میں اس کا ایک چھوٹا سا ہینڈ کیری لیے اس کے ماموں بیٹھے نظر آ گئے۔ وہ ہینڈ کیری میں سے اپنا ایک نارمل سا جوڑا نکال کر واش روم چلی گئی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے ماموں نے میرا اور شاہد کا شکریہ ادا کیا تھا کہ ہم نے ان کی بھانجی کو عام مجرموں کی طرح رات بھر لاک اپ میں نہیں رکھا تھا۔
اس کے آنے پر ہم سب آفس سے ہی منسلک کورٹ کی بلڈنگ میں پیدل ہی چلے گئے۔ جہاں پر چار کیس کے بعد اس کا نام پکارا گیا اور اس سے دو چار سوال جواب کر کے جج نے ہمیں آج ہی اسے پہلی فلائٹ سے واپس پاکستان بھیجنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔
شاہد تو گھر چلا گیا تھا جبکہ ماموں کو اس نے زبردستی واپس کر دیا تھا کہ ایئرپورٹ پر ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ کون سی فلائٹ کب تک اڑے گی... میں اسے اب اپنی گاڑی میں لے کر ایئرپورٹ پہنچا... ہم نے دو چار فلائٹس آفسز میں پوچھا کیونکہ ہمارے پاس کورٹ آرڈر تھا لہٰذا چانس پر ایک سیٹ حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔
آخر کار تین گھنٹے بعد ایک جہاز مصر سے ہوتا ہوا پاکستان جا رہا تھا جس کے چیک ان کے لیے مسافروں کو ایئرپورٹ کے اندر جانے کی ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ہم اب تک خاموش تھے۔ ایک بار بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی میری ہمت ہو رہی تھی کہ میں اس سے کچھ کہوں مگر پھر اب بھی نہ کہتا تو کب کہتا! اسے نہ سہی مگر خود کو تو ایک موہوم سی امید دینے کا حق رکھتا ہی تھا۔ میں نے اسے ایئرپورٹ کے دروازے پر الوداعی انداز میں کھڑے دیکھ کر آخر کار کہنا شروع کیا...
"میں... شاید مجھے پاکستان آنا پڑے... اصل وہاں ایک سیکیورٹی کمپنی نے اسٹاف کی ٹریننگ کے لیے بلایا ہے اور میرے آفس نے میرا نام ٹرینرز کے طور پر آگے بھیجا ہے... تو شاید... کچھ دنوں میں... پاکستان آؤں، میرے پاس تمہارا ایڈریس اور فون ہے۔ میں تم سے رابطہ کروں گا... او کے؟" میں نے اپنے ہر لفظ پر زور دے کر اسے کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ مجھے بغور دیکھنے لگی، مگر خاموش رہی۔
"اور ہاں... یاد آیا... تمہارے ہاں تو پولیس سے ملنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ناں...؟" میں نے اسے کچھ کہنے کے لیے ایک بار پھر اکسایا۔ اس کی نظریں ملیں۔
"مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟" اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔
"ارے نہیں نہیں... یہ خدا ایسی بات نہیں میں تو تمہارے گلے کی تختی بھی بنوانے کا سوچ رہا ہوں۔ پہلے سے بنوالوں تو اچھا ہے ناں؟" میں نے اسی طرح سنجیدگی سے جواب دیا۔
"نہیں... تختی؟ کیسی تختی...؟"
وہ اور بھی کچھ پوچھتی مگر ایک دم شاید کچھ سمجھ آ جانے پر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر میرے سامنے کھڑی زمین کو تکتی رہی... زیر لب مسکرائی اور سر ہلاتی ہوئی خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

ہم سے بڑھ کر کون

صبا آصف

نازیہ بھابھی۔ نازیہ بھابھی۔" رئیسہ گیٹ سے ہی شروع ہو گئیں۔ "علینہ کے ہاں بڑی خوب صورت گائے آئی ہے۔ اس دفعہ پوری گائے کر رہی ہے" (گائے دیکھ کر یہ فیصلہ رئیسہ نے خود کر لیا)۔

"ارے نہیں گائے میں حصہ ڈالا ہو گا بکروں کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کر رہی ہیں نا۔ بچوں کو خوش کرنے اور محلے والوں پر رعب ڈالنے کے لیے گھر میں لا کر باندھ لی ہو گی۔" نازیہ، رئیسہ کو بتانے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ لیکن دل کی دھڑکن کافی تیز تھی۔

"نہیں بھابھی! دو بکرے بھی ہیں اور گائے الگ ہے۔ میں نے پوچھا "گائے آپ کی ہے؟" کہنے لگیں، ہاں۔ قیمت تو انہوں نے نہیں بتائی لیکن دیکھنے میں بہت مہنگی لگ رہی ہے۔ اسی نوے ہزار سے کم نہیں ہو گی، اتنی خوب صورت کہ بس دیکھے جاؤ۔ آس پاس جتنے بھی گھروں میں گائے بیل آئے ہیں۔ ایسی کوئی بھی نہیں۔ اور بکروں کا تو پوچھو ہی نہیں، یہ اونچے اونچے، صحت مند۔" رئیسہ نے مبالغے کی حد تک



ہاتھ کو اونچا کیا۔ "اور ہاں کہہ رہی تھیں اس دفعہ دو دعوتیں کریں گی۔ عید کے اگلے دن باربی کیو اور ایک ہفتے بعد بڑی دعوت کریں گی' جس میں سب رشتے داروں کو بلائیں گی۔ بریانی قورمہ باہر سے بنوائیں گی۔ اور گھر میں دم کا قیمہ' گلاوٹ کے کباب' کوفتے بنائیں گی اور بھی بہت کچھ بتا رہی تھیں' مجھے یاد نہیں رہا۔" رئیسہ بیگم نے اپنے پسندیدہ کھانوں کے نام بتاتے ہوئے کہا۔ تاکہ خیال رکھا جائے کہ یہ ضرور بننے ہیں۔

"علینہ ایسے بتاتی تو نہیں ہے' تمہیں کیسے بتادیا۔"

"ارے وہ کہاں بتارہی تھیں وہ تو میں نے ہی کرید کرید کر پوچھا۔ پھر آپ مجھے دوبارہ بھیجتیں اس لیے ساری معلومات ایک ہی دفعہ لے کر آگئی۔" اس نے انہیں دو کوڑی کا کیا۔ نازیہ کا منہ بن گیا۔

"تو مجھے کیا ضرورت ہے جاننے کی کہ کون کیا کررہا ہے۔"

ضرورت تو اچھی خاصی ہے' رئیسہ نے دل ہی دل میں کہا۔

"سچ پوچھو تو علینہ چاہتی ہی نہیں کہ میں اس کے گھر آؤں' وہ تو میں آپ کی محبت میں بے غیرت بن کر چلی جاتی ہوں۔ یہ محبت ہی ذلیل کرواتی ہے۔" اس نے جھوٹ موٹ کی رقت طاری کی۔ نازیہ فوراً" متاثر ہوگئیں اور رئیسہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ویسے تسلی کی ضرورت تو خود انہیں زیادہ تھی۔

"اب یہ سب آپ کو وقت کے وقت پتہ چلتا تو کیسی سبکی ہوتی۔ میں تو آپ کی طرف سے کہہ آئی۔ اس دفعہ نازیہ بھابھی تین بکرے کررہی ہیں اور گائے الگ ہے۔ بڑی حیران ہوئیں جب میں نے بتایا کہ وہ دعوتیں بھی تو کررہی ہیں تو کہنے لگیں وہ تو ایک دعوت نہیں کرتیں دو کیسے کریں گی۔ میں نے کہا دیکھ لینا جب کریں گی تو۔" اس نے نازیہ کو اکسایا۔

"وہ تو بس یہ چاہتی ہیں کہ ان کی ہی واہ واہ ہو' محلے میں بھی اور خاندان میں بھی۔ جب تک ہم جیسے جانثار زندہ ہیں' آپ ہی سب سے بڑھ کر ہوں گی۔ بے فکر رہیں' آپ کا سب کام اس سے اچھا ہوگا اور سارے میں خوب "واہ واہ" ہوگی۔" رئیسہ کو آخر نازیہ کی زرد پڑتی رنگت پر ترس آہی گیا۔ آخر کے پانچ چھ جملے ان کے لیے ٹانک کا کام کرگئے۔ زرد ہوتی رنگت بحال ہوئی اور علینہ کی "واہ واہ" پر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا دل نہ صرف سنبھلا بلکہ اپنے لیے ہونے والی "واہ واہ" کی تال پر رقص کرنے لگا۔

ہمہ وقت "ہم سے بڑھ کر کون" کی تفسیر بنی نازیہ بیگم اس وقت خاصا سرور محسوس کررہی تھیں۔ واہ واہ کا رقص کچھ مدھم ہوا تو انہیں رئیسہ کی خاطر مدارات کا خیال آیا۔

"رمشا ابھی تک تم نے پھپھو کو چائے پانی بھی نہیں پوچھا۔ جلدی سے جوس بنا کر لاؤ۔" رئیسہ کو کچھ ڈھارس سی ہوئی۔ آج کل نازیہ ان سے کچھ اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔ جوس ختم کرنے کے بعد وہ پھر شروع ہوئیں۔ کھانا بھی تو کھانا تھا اور مزید آمدنی کا ذریعہ بھی بنانا تھا۔ جس کے لیے وہ اتنی دیر سے محنت کررہی تھیں۔

"ارے بھابھی! علینہ نے گھر میں رنگ روغن بھی کروایا ہے فرنیچر بھی پالش کروایا ہے۔ اور تین تین جوڑے بھی بنائے ہیں۔ دعوتوں کے الگ اور بقرعید کے الگ۔" اس نے نازیہ کے سر پر ایک بم اور پھوڑا۔ ان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کے برعکس رمشہ اور حفصہ کے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے' چار سوٹوں کے تصور سے (ایک بڑھا کر)۔ نازیہ بے دم سی ہو کر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد رئیسہ کہنے لگی۔

"اچھا بھابھی۔ میں چلتی ہوں! ضرورت ہو تو بلوا لینا۔ بھابھی پریشان نہ ہوں۔ اگر کچھ پیسے چاہئیں تو بتائیں تاکہ بندوبست کروں۔" نازیہ کے تو مانو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں اور سرگوشی میں بولیں۔

"اور قرضہ مل جائے گا۔"

"پچھلا تو گیا نہیں ابھی تک۔ مل تو جائے گا۔ منافع بڑھا دیا ہے اس نے' پہلے والے پیسوں پر بھی کہہ رہی تھی کہ اگلے ماہ سے بڑھا کر لوں گی۔" رئیسہ نے بھی سرگوشیوں میں جواب دیا۔ کافی دیر راز و نیاز ہوتے رہے۔ سود پر پیسے دینے والی کہانی فرضی تھی۔ رئیسہ اپنی جمع جوڑ اس طرح چلاتی تھی۔ اپنے پاس کمیٹی ڈالتی اور پہلی خود لے کر کسی کے فرضی نام سے منافع پر دے دیتی' منافع سے کمیٹی جاتی رہتی اس طرح رئیسہ چھ سات لاکھ کی مالک ہو گئی تھی۔ اس کا کاروبار گھریلو عورتوں تک محدود تھا۔ نام و نمود کی شوقین خواتین اس کا آسان شکار تھیں۔ نازیہ بیگم کی مقابلہ آرائی کی عادتوں کو پروان چڑھانے میں زیادہ ہاتھ رئیسہ خاتون کا ہی تھا۔ جھوٹی سچی لگا کر مقابلے پر اکسانا اور پھر اپنی خدمات پیش کر دینا۔ پیسہ دلانا اور پھر منافع دینے جانا' اپنی اس کارگزاری کے عوض وہ منافع کے علاوہ بھی کافی کچھ کما لیتی تھی۔ کیونکہ وہ "نادیدہ" خاتون بہت دور رہتی تھیں۔ وقت بے وقت کھانے کا بھی آرام رہتا تھا۔ رئیسہ کو گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ دور کی رشتے داری بھی تھی دونوں طرف سے (قاسم صاحب' نازیہ کے کزن بھی تھے) نازیہ کا مقابلہ صرف علینہ ہی سے نہیں تھا۔ بلکہ پھوپھی زاد' چچا زاد' خالہ زاد تینوں بھائیوں سے اور نندوں سے بھی تھا۔ حتیٰ کہ اپنی دونوں سگی بہنیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ لیکن علینہ سے تو کانٹے کا مقابلہ تھا۔

✵ ✵ ✵

رئیسہ کے جانے کے بعد انہوں نے قاسم صاحب کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔

"رئیسہ کے جانے کے بعد میں آپ کی آمد کا منتظر تھا۔" قاسم صاحب خوش دلی سے مسکرائے۔ "اب کیا کر دیا علینہ نے؟؟"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"اتنے بے خبر تو ہم بھی نہیں۔ بقر عید کی آمد آمد ہے اور آج رئیسہ بھی آئی تھیں۔"

"علینہ نے بکروں کے علاوہ ایک گائے بھی لی ہے۔"

"پتا ہے۔"

"اس نے وائٹ واش بھی کروایا ہے۔"

"یہ بھی پتا ہے۔"

"دو دعوتوں کا۔"

"یہ بھی پتا ہے۔" قاسم صاحب مسکرا کر بولے۔

"بھئی میں اکثر وسیم (علینہ کے شوہر) کی طرف جاتا رہتا ہوں۔ گھر بڑا اچھا سیٹ کیا ہے۔ اس میں علینہ کی محنت زیادہ ہے۔ کالج میں پڑھا بھی رہی ہے اور گھر کو بھی اچھے طریقے سے چلا رہی ہے۔"

"ہاں بس یہیں تو میں مات کھا جاتی ہوں اس سے۔" وہ یاسیت سے بولیں۔ "ورنہ ہر چیز میں اس سے بڑھ کر ہوں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"قاسم صاحب! مجھے بکروں کے علاوہ اس دفعہ گائے کی بھی قربانی کرنی ہے اور وائٹ واش بھی کروانا ہے۔"

"آپ برین واش کروا لیں وہ زیادہ بہتر ہوگا۔"

"اچھا! وہ کتنے میں ہوتا ہے اور کیا وائٹ واش سے اچھا ہوتا ہے۔" قاسم صاحب مسکرا کر رہ گئے۔

"ٹھیک ہے بھئی ہم اس دفعہ گائے کی قربانی کر لیتے ہیں۔۔۔ ان شاء اللہ اب ہم ہر سال۔۔ پانچ بکرے قربان کریں گے یا گائے لیں گے۔"

"اور اس سال بکرے نہیں آئیں گے؟"

"نہیں۔ بکرے یا گائے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

"نہیں گائے اور بکرے دونوں آئیں گے۔" نازیہ تیزی سے بولیں۔

قاسم صاحب نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"اور رہی بات وائٹ واش اور دعوتوں کی' یہ بڑی

فضول خرچی اور غیر ضروری ہے۔" (اوپری دل سے) ورنہ گھر کی مینٹیننس اور وائٹ واش کی ضرورت جتنی قاسم صاحب محسوس کر رہے تھے وہ ان کو پتا تھا۔ پورا گھر ہی توجہ مانگ رہا تھا۔ سال بھر پہلے اوپر کی منزل بنوانے کی وجہ سے نیچے کا گھر بہت خراب ہو رہا تھا۔ اکھڑا ہوا رنگ، بدرنگ پردے، ٹوٹا پھوٹا فرنیچر۔ لیکن بیگم صاحبہ مقابلہ آرائیوں میں گھر کو بالکل بھلائے بیٹھی تھیں۔ جوان ہوتی بچیوں کی وجہ سے یہ ایک سماجی ضرورت بھی تھی وہ دو تین بار ان کی توجہ اس طرف دلا چکے تھے۔ عاشر اور اشعر تو کئی دفعہ کہہ چکے تھے۔ امی گھر ٹھیک کروالیں کوئی دوست آجائے تو بہت شرم آتی ہے لیکن نازیہ بیگم کی ساری توجہ اس طرف تھی کہ شادیوں پر کون کیا دے رہا ہے، ایک دوسرے کے ہاں اور کپڑے کیسے بنوا رہے ہیں۔ ہزاروں روپے وہ آرٹی فیشل جیولری پر خرچ کردیتی تھیں۔ قاسم صاحب کی والدہ کے زمانے میں سال دو سال کے بعد کبھی عید پر کبھی بقرعید پر قریبی رشتہ

داروں کی دعوت کی جاتی تھی۔ برسوں گزر گئے تھے قریبی عزیزوں کو اپنے گھر مدعو کیے ہوئے۔ اس لیے عید کے موقع پر ایک اچھی سی دعوت بچوں کا ہی نہیں ان کا بھی خواب تھی لیکن مخالفت کر کے ان کے شوق کو ہوا دینا تھا۔

"دعوت اور رنگ روغن بہت ضروری ہے۔ چار لوگ آئیں گے گھر میں۔ طریقہ سلیقہ دیکھیں گے تو کل بچیوں کے لیے بات بنے گی۔"

"بچیاں آج ہی بڑی نہیں ہوئیں۔ اور طریقے سلیقے کی ضرورت آج ہی نہیں ہے کل بھی تھی۔ بلکہ ہمیشہ سے ہے۔ آج علینہ نے یہ سب کرلیا تو آپ کو بھی طریقے سلیقے کی فکر ہوئی۔"

"تو بُرا کر رہی ہوں کیا۔ آپ کی ہی عزت بڑھا رہی ہوں۔"

"نہیں، ہمیں آپ سے عزت بڑھوانے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہت عزت ہے۔ آپ اپنی عزت کی بات کریں، جس کے لیے آپ دوسرے کی عزت دو کوڑی کی کردیتی ہیں۔" وہ تلخ ہوئے۔

"مان جائیں نا۔" یہ کہہ کر وہ سسکیوں سے رونے لگیں یہ ان کا آخری حربہ ہوتا تھا اور بڑا کارگر بھی۔

"ٹھیک ہے کل سے کام شروع ہوجائے گا لیکن ایک بات آپ کو میری بھی ماننی ہوگی کہ بیڈ روم سیٹ نئے آئیں گے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج کا پورا فرنیچر اور پردے بدلے جائیں گے اور ساتھ ہی فرش کی پالش بھی ہوگی۔ آخر کچھ بڑھ کر کرنا ہے۔" خوشی سے نازیہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ضرور ضرور ایک کیوں، سو باتیں مانیں گے (کاش آپ کی نہیں مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔" وہ فوراً تابعدار بیوی بن گئیں۔

"ماشاءاللہ اللہ نظر بد سے بچائے۔"

"آپ کو بھی۔" شرما کر بڑے جذب سے بولیں۔



بیس بائیس دن میں گھر لش پش ہوگیا خوب صورت رنگوں سے سجے درودیوار، چمکتا ہوا فرش۔ خوب صورت پردے نیا فرنیچر۔ سب کے کپڑے بھی بن گئے عاشر، اشعر، اتمامہ اور رمشہ، حفصہ بہت خوش تھے۔ بقرعید کے حوالے سے بڑے پروگرام بن رہے تھے۔ لیکن گائے اور بکرے ابھی تک نہیں آئے تھے۔ قاسم صاحب آج کل پر ٹال رہے تھے بقرعید میں ایک دن رہ گیا تھا۔ دوپہر میں قاسم صاحب آئے تو نازیہ نے قربانی کے جانور یاد دلائے۔

"وہ تو میں لے آیا۔ بکرے لایا ہوں پانچ، وسیم کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔"

"گائے کیوں نہیں لائے۔؟"

"دیکھیے نازیہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا ہے کہ میں دو گائیں بھی لا سکتا ہوں۔ لیکن اس سال صرف اس لیے نہیں لاؤں گا کہ آپ علینہ کی ضد میں ایسا کر رہی ہیں اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنود

لے بجائے نام و نمود کی خاطر کی جائے' وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوتی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ بس!" انہوں نے رونے کی تیاری کی۔

"میں بڑی ہوں' میں اس سے پیچھے نہیں رہوں گی۔ اس سے بڑھ کر کروں گی۔"

"کرو' ضرور کرو لیکن پہلے کرو۔ آپ بڑی ہیں بے شک عمر میں بھی اور رشتے میں بھی۔ کبھی آپ نے بڑا پن دکھایا' کبھی در گزر کیا؟ ایک علینہ ہی کیا' آپ کا تو ہر ایک سے مقابلہ ہے۔ میں اس بے جا مسابقت کی دوڑ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا' میں تھک گیا ہوں اگر علینہ کا مقابلہ ہی کرنا ہے تو اس کی اچھائیوں سے کریں۔ کتنے اچھے طریقے سے وہ اپنا گھر چلا رہی ہے۔ وسیم کی کم آمدنی کے باوجود بچوں کو بہترین اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ بچوں کی صحت اور ان کا اٹھنا بیٹھنا دیکھیں۔ سارے خاندان میں وسیم اور علینہ کے بچوں کی قابلیت' اچھی تربیت کی دھوم ہے۔ کبھی آپ نے اس طرف توجہ دی؟ علینہ انگریزی بولتی ہے' آپ نے بھی بولنی شروع کر دی۔ چاہے غلط ہی بچے اور میں کتنے شرمندہ ہوتے ہیں۔ بس! آج آپ اپنی ساری غلطیوں کا جائزہ لیں۔ انہیں درست کریں۔ آپ اپنے آپ کو سدھار لیں' نہیں تو میں سختی سے پیش آؤں گا۔ آج سے گھر کے سارے معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے۔ آپ کو صرف اپنی ضروریات کے لیے خرچہ ملے گا۔ باقی گھر میں کیا آتا ہے' شادی بیاہ میں کسی کو کیا دینا ہے' یہ سب اب میری ذمہ داری ہے۔ یہ سب مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا لیکن میں آپ کو ٹائم دے رہا تھا۔" یہ سب کہہ کر قاسم صاحب باہر چلے گئے۔ رمشہ ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی' انہیں تسلی دینے لگی۔ نازیہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ انہوں نے پہلی دفعہ قاسم صاحب کا یہ روپ دیکھا تھا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد وہ رمشہ سے کہنے لگیں۔

"تمہاری چچی کے ہاں چلتے ہیں۔" انہیں ایک ہی حل نظر آیا کہ اس سلسلے میں علینہ کی مدد لی جائے۔ کیونکہ قاسم صاحب اکثر علینہ کی بات مان لیتے تھے۔ دو گلی چھوڑ کر علینہ کا گھر تھا۔ رمشہ اور حفصہ کے ساتھ علینہ کے یہاں پہنچیں۔ وہ تقریباً ساتھ آٹھ ماہ بعد آئی تھیں' پورچ میں نئی گاڑی دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گئیں۔

"کسی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔" دونوں بچیوں نے نظریں چرا لیں۔

"بابا جان نے منع کیا تھا۔" اندر داخل ہوئیں۔ علینہ حیران بھی تھیں اور خوش بھی' بڑے پیار سے ملیں۔ گھر میں بھی بڑی خوب صورت تبدیلیاں آئی تھیں۔ لیکن بہرحال ان کے گھر کا مقابلہ نہیں تھا۔ دل کے ایک کونے میں راحت سی محسوس ہوئی اور شوہر کے لیے شکر گزاری بھی' ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد علینہ سے اپنا مدعا بیان کیا۔ علینہ نے کہا وہ بھائی جان کو سمجھانے کی کوشش کرے گی۔

"بھابھی' آپ کو بکروں کے ساتھ ساتھ گائے کی قربانی کا خیال کیوں کر آیا۔" نازیہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن پی گئیں۔

"بس کیا بتاؤں۔" وہ بڑی دلسوزی سے بولیں۔

"خالہ' خالو خواب میں آئے تھے کہنے لگے۔ کبھی ہماری قربانی نہیں کی' ہم ہر سال انتظار کرتے ہیں۔ اس سال ہماری قربانی ضرور کرو۔" ان کے اس معصوم سے بہانے پر علینہ نے مسکراہٹ دبائی۔

"یہ بات آپ نے بھائی جان کو نہیں بتائی؟"

"بس وہ۔ بس وہ۔" وہ بات بنا نہ پائیں۔ علینہ کو تو پتا تھا یہ بہانہ ان کے ذہن میں ابھی آیا تھا۔

"خیر چھوڑیں۔ ایسا کریں دو بکرے اور لے آئیں یا ہماری گائے میں حصہ ڈال دیں۔" "بھئی میں خالو جان کے والد' والدہ کی بھی کرنا چاہ رہی ہوں۔" "کیا وہ بھی خواب میں آئے تھے۔"

"نہیں بھئی وہ لوگ تو نہیں آئے۔"

"اچھا تو آپ انہیں زحمت سے بچانا چاہ رہی ہیں۔

تو چار کردیں حصے۔" دراصل اس دفعہ میں یہ سب شرعی طریقے سے کرنا چاہ رہی ہوں۔ دو بکرے ہم دونوں کے۔ گائے میں چار حصے مرحومین کے اور تین حصے تینوں بیٹوں کے۔ اب چھوٹا بھی ماشاء اللہ برسر روزگار ہے۔ بڑے دونوں تو ماشاء اللہ چار اور تین سال سے برسر روزگار ہیں۔"

"کیا یہ بھی خالہ' خالو نے خواب میں بتایا ہے؟" علینہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ تینوں بچیوں کے چہرے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں لال ہو رہے تھے خود علینہ کو ہنسی برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے نازیہ بیگم کی برداشت کی حد ختم ہو گئی۔ علینہ کی جرح سے وہ تنگ آکر بولیں۔

"ہم نے تم سے پوچھا بی بی! بیس پچیس دن سے تم نے بکرے اور گائے گھر کے آگے کیوں باندھ رکھے ہیں پبلسٹی کے لیے۔ اتنے زیادہ حصوں کا تم کیا کرو گی پہلے تو تم دو حصے لیتی تھیں اب پوری گائے کیوں لی؟"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" علینہ کی ہنسی بے قابو ہو کر فضا میں بکھر گئی بچیاں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کو ہنستا دیکھ کر نازیہ بیگم پہلے تو سٹپٹا گئیں اور پھر وہ خود بھی اس ہنسی میں شامل ہو گئیں۔

"پہلی بات تو یہ کہ قربانی کے جانور میں نے گھر کے آگے نہیں پچھواڑے باندھے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بیس پچیس دن پبلسٹی کے لیے نہیں بلکہ اس لیے خریدے کہ قربانی کے جانور کی خدمت کرنے کا بڑا ثواب ہے۔ تیسری بات یہ کہ زیادہ پہلے لینے سے مناسب داموں مل جاتے ہیں۔"

"پبلسٹی نہیں کر رہیں تو ہر ایک کی زبان پر ایسے ہی ہے کہ وسیم کے ہاں اتنی اچھی گائے اور بکرے آئے ہیں اور اس دفعہ علینہ کے ہاں پوری گائے ہو گی۔"

"کس نے کہا میں پوری گائے کی قربانی کر رہی ہوں؟"

"ہائیں! تو تم گائے کی قربانی نہیں کر رہیں۔"

"نہیں۔" "تو کیا مہنگے داموں فروخت کرنے کا ارادہ ہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا کرو گی۔"

"قربانی۔" علینہ خوب مزا لے رہی تھی۔

"امی' ابو اور بھائیوں کی طرف سے۔ اس لیے کہ یہ گائے ان کی ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ امی' ابو اس دفعہ بھائیوں کے پاس لندن میں ہیں۔ پہلے تو بھائیوں کی طرف سے قربانی امی' ابو کی طرف ہی ہو جاتی تھی۔ اب اس وجہ سے میرے ہاں ہو گی۔" نازیہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر بھنگڑا ڈالیں یا علینہ کا منہ چوم لیں لیکن یہ ذرا مشکل کام تھا۔ علینہ سے انہیں بہت سی شکایتیں تھیں۔ ان پر ایک نہ ایک وقت ڈالے ہی رکھتی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو علینہ۔" وہ ابھی بھی بے یقین سی تھیں۔

"بھابھی' بچی بچی!" علینہ آنکھیں زور سے بند کر کے بولی۔

"لیکن محلے والوں کو کیسے پتا چلے گا کہ یہ گائے آپ لوگوں کی نہیں بلکہ لندن والوں کی ہے؟" "ایسا کرتے ہیں ابھی انس (علینہ کے بچے) اویس آجاتے ہیں تو گائے کے گلے میں ایک کاغذ پر لکھ کر لگا دیتے ہیں کہ یہ گائے لندن والوں کی ہے۔ حصے داروں کے نام بمع ولدیت لکھ دیں گے' ہو سکا تو تصویر بھی لگا دیں گے۔ اور ہاں رمشہ! ایک شیٹ پر بڑا بڑا کر کے لکھو کہ "ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک گائے جو کہ پچھلے بیس پچیس دن سے وسیم صاحب کے ہاں بندھی ہے' اس کی قربانی ان کے سسر صاحب' ساس صفیہ اور ان کے دونوں سالوں کی طرف سے ہو گی جو کہ لندن میں مقیم ہیں۔ جو بھی اس تحریر کو پڑھے وہ دوسرے کو بتائے اور ثواب حاصل کرے۔ نہ بتانے کی صورت میں نقص امن کا خدشہ ہے۔ یہی اعلان مسجد سے دو تین بار کروا دیں گے۔ اس شیٹ کی تین چار فوٹو اسٹیٹ کروا کر آس پاس کی گلیوں میں لگوا دیں گے۔ رہی بات رشتے داروں کی تو جہاں ضروری سمجھیں فون پر

ناایں۔" بچوں کی ہنسی ایک بار پھر جلترنگ سی بجاگئی۔
"اور ہاں اگر اس اشتہار میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
"تم میری بے عزتی کررہی ہو۔"
"آپ نے ہی تو کہا ہے کہ محلے والوں اور رشتہ داروں کو کس طرح پتا چلے گا۔ ہم ہی تو بتائیں گے۔ کائے تو گھر گھر جاکر بتانے سے رہی کہ میری قربانی لندن والوں کی طرف سے ہوگی۔" علینہ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ نازیہ کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔
"بھابھی! خدا کے لیے اس مقابلے بازی کو ختم کردیں۔ جٹھانی کے بجائے بڑی بہن بن جائیں۔ جس طرح میں آپ کی خوشیوں میں خوش ہوتی ہوں اسی طرح آپ بھی میری خوشیوں میں خوش ہوں۔ خوش نہیں ہو سکتیں تو مقابلے پر مت اتریں۔ اس عادت کی وجہ سے بھائی جان اور بچے جس ذہنی اذیت کا شکار ہیں، آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔ ہمیں اپنی ضرورتوں کو خود محسوس کرنا ہے، کس چیز کے بغیر ہمارا گزارا ہے اور کس کے بغیر نہیں، بس جو اشد ضرورت ہے اسے پورا کریں۔ میں نے دیکھا کہ بچے بڑے ہوگئے۔ آپ کے گھر میں کمرے کم پڑرہے ہیں۔ اشعر کی شادی سر پر کھڑی ہے تو میں نے شوشا چھوڑا کہ میں بالائی منزل بنوارہی ہوں۔ تو آپ نے بھی لوگوں سے کہنا شروع کردیا اور ایک ماہ بعد کام بھی شروع کروادیا۔ آپ تو دو تین دن میں ہی کام کروانا چاہ رہی تھیں وہ تو بھائی جان کو نقشے اور اچھے مستری کا بندوبست کرنے میں ٹائم لگا۔ پھر بھی آپ کی جلد بازی سے بہت سی غلطیاں ہوگئیں۔ رنگ آپ نے بہت جلدی کروالیا جو کہ خراب ہوگیا۔ پلاستر ٹھیک طرح سے سوکھا نہیں تھا، بننے کے بعد کم سے کم دو ماہ کے بعد کروانا چاہیے۔ اسی طرح ہر چیز کا دھیان رکھتیں کہ کونسی چیز آپ کے گھر میں خراب ہوگئی ہے یا نئی کی ضرورت ہے۔ یا ہے ہی نہیں۔ میں بہت سے کام کرنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کرسکتی جیسے گاڑی چلانا سیکھنا۔ کیوں کہ پھر آپ پر بھی وقت پڑ جائے گا۔" (علینہ بے رحم ہوئی) یہ ضروری تھا۔ اب حد ہوچکی تھی۔ آج قاسم صاحب ان کے ہاں آئے تھے اور بہت بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کا کرب محسوس کرسکتی تھی۔ نازیہ جذبہ خود نمائی میں اتنا آگے نکل گئی تھیں کہ اب ضرورت تھی کہ ان کو واپس لایا جائے۔ نازیہ منہ کھولے علینہ کو سن رہی تھیں۔ اس کی باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور وہ تھوڑی شرمندہ بھی تھیں۔ (زیادہ نہیں)
"اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ رئیسہ مجھے ستارہی ہے میں نے اس سے کچھ قرضہ سود پر لیا تھا وہ میں دے نہیں سکی۔ ضرورت پڑنے پر یا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے جا مقابلے بازی میں اور لیتی گئی اب قرض لاکھوں میں ہوگیا ہے۔ قسط اگر وقت پر نہ دے سکوں تو اس پر الگ پیسے لیتی ہے۔ ابھی بھی مجھے اکسا رہی تھی کہ میں گھر پہ رنگ و روغن کے لیے اور قرضہ لے لوں۔ وہ تو شکر ہے تمہارے بھائی جان نے سب کام خود کروادیا۔ مجھے فکر تو بس یہ ہے کہ قاسم صاحب نے کہا ہے کہ اب خرچ وہ چلائیں گے۔ میں پندرہ ہزار ماہانہ رئیسہ کو کہاں سے دوں گی۔"
"بھابھی قرض کتنا ہے؟"
"ڈھائی لاکھ کے قریب ہے۔ میری ایک لاکھ کی کمیٹی کھلنے والی ہے۔ سوچا تھا کہ نکلے گی تو قرض اتار دوں گی تو اس طرح تھوڑی قسط کے پیسوں میں کمی ہوجائے گی۔ لیکن اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ کمیٹی کس طرح دوں گی اور قسط کیسے دوں گی۔" وہ پریشان ہو کر بولیں۔
"بھابھی! رئیسہ کو تو آپ بھول جائیں اسے میں اور وسیم سنبھال لیں گے۔ آپ کی کمیٹی کب ہے۔"
"تین ماہ بعد۔" "ٹھیک ہے میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ مل ملا کر اس کا قرضہ اتارتے ہیں اور جو اس نے زیادہ لیے ہیں وہ بھی واپس لیں گے یا قرض میں کٹوادیں گے۔"

"نہیں علینہ' وہ عورت بہت خطرناک ہے۔ اس کے پاس بڑے بڑے غنڈے ہیں جو ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"بھابھی! ریئسہ قرض آپ کو خود دیتی ہے کسی اور عورت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جب آپ کا مکان بن رہا تھا' میرے پاس بھی آئی تھیں ریئسہ باجی اور مجھے بھی قرض لینے کی ترغیب دی تھی اور اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں' میں نے کہا باجی سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں تو کہنے لگیں تم اسی چکر میں پڑی رہنا۔ اپنی جٹھانی کو دیکھو کیسے عیش کر رہی ہے۔ ان کے یہ عیش میرے دم سے ہی تو ہیں' تین چار سال سے لے رہی ہیں۔ دے دیتیں پھر لے لیتی ہیں' اسی طرح تم بھی دے دینا۔ مکان بن جائے گا کیسی واہ واہ ہوگی۔"

"ارے اس واہ واہ نے ہی تو میرا بیڑہ غرق کر دیا۔ دینے کی تو نوبت ہی نہیں آئی' الٹا اور لیتی رہی۔ اب کبھی کبھی دھمکیوں پر اتر آتی ہے کہ اگر قسط میں ذرا سی بھی دیر ہوئی تو وہ قاسم صاحب کو فون کر دیں گے بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں نے کہا تو تم نے مجھے ایسے لوگوں میں کیوں پھنسوایا۔ میرا اصل شناختی کارڈ بھی ان کے پاس ہے اور رقم لینے کا اقرار نامہ دستخط کے ساتھ ان لوگوں کے پاس ہے۔ اب ایک ماہ سے منافع کی رقم پندرہ کے بجائے بیس ہزار کرنے کو کہہ رہی ہے یا پھر کہہ رہی ہے کہ پورا پیسہ واپس کرو۔" نازیہ آنسوؤں سے رونے لگیں۔

"مجھے دھمکیاں دیتی رہتی ہے کہ اگر رقم بیس ہزار نہیں کی تو وہ عورت محلے میں بدنام کروا دے گی۔"

"اور اس طرح آپ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔" رمشہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "امی آپ نے یہ سب کیوں کیا؟ آپ سود کی دلدل میں اتر گئیں جہاں سے کسی کسی کی واپسی ہوتی ہے۔"

"بس رمشہ آگے ایک لفظ نہیں' انہوں نے جو کیا گھر کی بھلائی اور بہتری کے لیے کیا بس طریقہ غلط تھا۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ بھابھی کو ریئسہ سے کیسے نجات دلوائی جائے۔ بیس ہزار ماہانہ کی رقم کس طرح سے بچائی جائے۔ بھابھی فی الحال تو آپ ریئسہ کو اور اس نامعلوم عورت کو بھول جائیں۔"

"بھول گئی۔" نازیہ جلدی بولیں۔ رمشہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی' نازیہ بھی ہنس پڑیں۔ آنسوؤں کے درمیان یہ مسکراہٹ کتنی دلکش لگی' یہ تو ایک بیٹی اور ایک بے لوث عورت ہی جان سکتی تھی۔

"چچی! آپ نے دیکھا امی کیسے دل سے ہنسی ہیں ورنہ وہ تو مسکرانا بھول گئی تھیں۔"

"رمشہ' بھابھی کی ہنسی اور مسکراہٹیں تو ریئسہ کے پاس رہن رکھی ہوئی تھیں تو وہ کیسے دل سے مسکرا سکتی تھیں اور دل سے ہنس سکتی تھیں۔ ہاں تو بھابھی آپ کی کمیٹی کب ہے؟"

"تین ماہ بعد۔"

"ٹھیک ہے میں اور وسیم کچھ کرتے ہیں اور سارا قرض واپس کر کے آپ کا شناختی کارڈ اور آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نکلواتے ہیں اور جو زیادہ پیسہ اس نے لیا ہے وہ بھی۔ اب میں اسے بلیک میل کروں گی کہ یہ سود پر پیسہ چلاتی ہے جیسے کو تیسا۔"

"اتنی بے وقوف وہ بھی نہیں ہے جو اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو بند کروائے گی۔" "اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ جتنا ڈرنا تھا ڈر گئیں' جتنا سود دینا تھا دے دیا۔ یہ میری رقم جو میں قرض اتارنے میں دوں گی جب آپ کو سہولت ہوگی دے دینا' میری طرف سے تقاضا نہیں ہوگا۔ رشتے داروں کو ایک دوسرے کی طاقت ہونا چاہیے۔"

"چچی میں آپ کو سلام پیش کرتی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ ہماری اور امی کی بہتری چاہی۔ آج امی کو جس طرح آپ نے سمیٹا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" یہ کہہ کر رمشہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ علینہ کی آنکھ میں بھی نمی در آئی' اس نے بڑھ کر رمشہ کو گلے لگا لیا اور بولی۔

"یہ کیا تمہاری ہی امی ہیں' بھئی! میری بھی بڑی بہنوں کی طرح ہیں اور انہوں نے بھی میرے ساتھ

بہت کچھ اچھا کیا ہے، جو میرے دل پر نقش ہے۔ میں ایسے ہی تو آپ لوگوں سے جڑی نہیں رہی۔ بھابھی دل کی بہت اچھی ہیں ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ حسد نہیں کرتیں۔ مقابلے میں اور حسد کرنے میں بہت فرق ہے۔ حسد یہ ہے کہ دوسرے کے پاس یہ چیز ہو ہی نہ اور ہے تو اس کے پاس نہ رہے۔ مقابلہ یہ ہوتا ہے کہ میرے پاس بھی ایسی چیز ہو بلکہ بہتر ہو تو یہ اتنی بُری سوچ نہیں ہے، بس کسی جذبے کا حد سے بڑھ جانا ہی بُرا ہے۔"

نازیہ کہنے لگیں۔" یہ تمہاری بڑائی ہے جو میری خوبیاں بیان کر رہی ہو۔ میں ہمیشہ تمہیں نیچا دکھانے کی فکر میں رہی، جب مکان بنوا رہی تھی تو ہنس ہنس کر لوگوں کو بتاتی تھی کہ جو گرجتے ہیں برستے نہیں، علینہ کہتی پھرتی تھیں کہ اوپر کا مکان بنواؤں گی' بنا لیا؟ تمہارے سامنے بھی اکثر جتاتی رہتی تھی لیکن تم نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔" وہ بے شمار ایسے واقعات سنا رہی تھیں اور رو رہی تھیں، علینہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کتھارسس ان کے لیے ضروری تھا۔ پندرہ سال کی گھٹن تھی، جواب نکل رہی تھی۔

"علینہ! تم اتنی اچھی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

وہ دونوں ایک سنانے میں اور دوسری سننے میں اتنی محو تھیں کہ انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ کب قاسم صاحب اور وسیم پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے رمشہ کو اشارے سے منع کردیا۔ کافی دیر گزر گئی، علینہ بھی رو رہی تھی کیونکہ تکلیف اسے بھی بہت ہوئی تھی ان کی الٹی سیدھی حرکتوں سے، نازیہ کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی تو علینہ نے انہیں ہاتھ بڑھا کر کندھے سے لگا لیا۔

"بس بھابھی! سب کچھ بھول جائیں، میں بھی بھول جاؤں گی۔ اب ہم ایک دوسرے کی طاقت بنیں گے۔ دیورانی جٹھانی نہیں چھوٹی بڑی بہنیں۔ یہ نہیں کہ ہم میں کبھی اختلاف نہیں ہوگا۔ ہوگا ضرور ہوگا۔ اختلاف تو ماں بیٹی میں ہوجاتا ہے، بہنوں بہنوں میں ہوجاتا ہے لیکن یہ اختلاف عناد کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اسی طرح ہمارے درمیان ہوگا۔ کبھی آپ دل بڑا کرلیجیے گا کبھی میں درگزر کروں گی۔" قاسم صاحب آگے بڑھے علینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی بیگم سے ہنس کر بولے۔ "میری طرف سے بھی دل صاف کرلینا۔" سب بچے کمرے میں آگئے۔ حفصہ اور یمنیٰ (علینہ کی بیٹی) دونوں نے فون کرکے وسیم اور قاسم صاحب کو بھی بلوالیا تھا اور بھائیوں کو بھی، سب بہت خوش تھے۔ عید کے دن کے پروگرام بن رہے تھے، دعوتوں کی باتیں ہو رہی تھیں، بچے بچیوں نے مل کر میز سجائی۔ کچھ گھر میں بنا ہوا تھا اور آتے ہوئے وسیم صاحب اور قاسم صاحب کھانا لیتے ہوئے آئے تھے بمع ایک بڑے سے کیک کے۔ کیونکہ انہیں یمنیٰ نے فون پر بتادیا تھا کہ مذاکرات کامیاب رہے اور کوئی لمحہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ پھر نازیہ اور علینہ نے مل کر کیک کاٹا اور ایک دوسرے کو کھلایا۔ وسیم خوشی سے کہنے لگے۔

"ہماری عید تو ایک ـــــ دن پہلے ہی ہوگئی۔" "اور "قربانی" بھی۔" قاسم صاحب بولے۔

"قربانی! ہائیں وہ کیسے۔"

"بھئی ہماری بیگم کے "سب سے بڑھ کر میں" کے کردار کی ان کی "انا" کی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وسیم شرارت سے بولے۔

"قربانی دے کر ہی انسان کچھ پاتا ہے۔ اپنی بے جا انا اور فضول ضدوں کو قربان کرکے اپنے پیاروں کی محبتیں اور دل کا سکون حاصل کرسکتے ہیں۔" نازیہ بڑی دلسوزی سے بولیں۔

"واہ واہ کیا الفاظ ہیں۔" قاسم صاحب سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ "نازیہ بیگم! آپ نے مجھے جیت لیا۔ ہمیشہ ان الفاظ کی لاج رکھنا۔" ادھر نازیہ کا دل ایک لمحے کو دھڑکا اور شوہر کے منہ سے ہونے والی "واہ واہ" کی تال۔

"اچھا بھئی! اب چلتے ہیں۔" سب باہر تک

چھوڑنے آئے۔ قاسم صاحب پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھے۔
"آئیے بیگم صاحبہ! پہلا قدم گاڑی میں آپ رکھیے۔ میرے بعد 'پہلا قدم تو مجھے رکھنا پڑا گاڑی یہاں تک لانے میں۔"
"یہ وسیم کی گاڑی نہیں ہے۔" وہ بے یقینی سے بولیں۔
"نہیں یہ ہماری گاڑی ہے۔ وسیم کی آج آئی ہے وہ کھڑی ہے۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
"شکریہ قاسم صاحب۔" وہ حیرت بھری خوشی سے بولیں اور وسیم اور علینہ کی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔ گاڑی دیکھ کر وسیم کے سر پر ہاتھ رکھا اور علینہ کو گلے لگا کر دونوں کو مبارکباد دی۔ سب خوشی اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔
"بھابھی! آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔"
"آمین ثمہ آمین۔" بیک وقت سب کی زبان سے نکلا۔ گاڑی میں بیٹھ کر قاسم صاحب کہنے لگے۔
"نازیہ! آپ نے آج مجھے بڑی خوشی سے ہمکنار کیا، میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ گاڑی میں نے بہت خوشی سے لی تھی اس لیے وسیم کے گھر کھڑی کردی تھی کہ عید پر آپ کو سرپرائز دوں گا۔ آپ کی بے جا ضد کی وجہ سے میں نے آج اسے بیچنے کا سوچ لیا تھا کہ وسیم کی صاحبزادی کا فون آگیا کہ پاپا! تائی امی ہمارے گھر ہیں، آپ بازار سے اچھا سا کھانا پیک کروا کر لے آئیں اور ساتھ بہت سی مٹھائی بھی، تائی امی اور ماما کی پکی دوستی ہوگئی ہے۔ ہم وسیم کی گاڑی لے کر نکل ہی رہے تھے۔ ہاں بھئی! آپ جیت گئیں۔ پہلے آپ کی گاڑی آئی۔"
"قاسم صاحب!" انہوں نے مصنوعی خفگی سے شوہر کو دیکھا۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیے۔



مل جل کر ایک اچھی سی باربی کیو پارٹی ہوئی۔ ایک ہفتے کے بعد ایک شاندار دعوت قاسم صاحب کے یہاں ہوئی جس میں قریبی محلے دار اور عزیز و اقارب شامل تھے۔ آنے والے مہمانوں کی پہلے مشروبات سے تواضع کی گئی۔ قربانی کے گوشت سے بنی ڈشز کے علاوہ مرغ بریانی اور مرغ کڑھائی سے سجے دستر خوان سے مہمانوں نے پورا پورا انصاف کیا۔ کھانے کے بعد سب خوش گپیوں میں مصروف تھے، قہوے کا دور چل رہا تھا۔ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے مہمان خوش رنگ اور خوش ذائقہ قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن رئیسہ بے چین تھیں۔ انہیں نازیہ بیگم دستیاب نہ ہو رہی تھیں۔ شر پھیلانے کا موقع ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ خاصی تگ و دو کے بعد وہ نازیہ کے قریب آبیٹھیں اور سرگوشی میں بولیں۔
"بھابھی! ذرا علینہ کو تو دیکھیں، کیسے خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے ہے نئے فیشن کے آپ نے ایسا لباس کیوں نہیں بنوایا؟" نازیہ بیگم اپنے خوب صورت پرنٹ کے نفیس سے سوٹ پر طائرانہ نظر ڈال کر بولیں۔
"اے لو، میں کیوں علینہ جیسے کپڑے بنواتی۔ میرا اس کا کیا مقابلہ، میری اور اس کی عمر میں خاصا فرق ہے، وہ میری چھوٹی بہنوں بلکہ بیٹیوں جیسی ہے۔" رئیسہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"میں تو آپ کی بھلائی کے لیے کہہ رہی تھی۔"
"رہنے دو میری بھلائی، بہت کر چکیں بھلائیاں۔ اب اپنی بھلائی سوچو۔"
قاسم صاحب جو قریب ہی بیٹھے تھے۔ خاصے توصیفی انداز میں بیگم کو دیکھ کر بولے "آج میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "سب سے بڑھ کر آپ۔" نازیہ بے اختیار ہنس دیں۔
سامنے سے آتے وسیم اور علینہ بھی نازیہ کو ہنستا دیکھ کر مسکرا دیے۔

صباحت یاسمین



ڈاکٹر صاحبہ کچھ بتا رہی تھیں' اس کی امی بھی کچھ بول رہی تھیں مگر اس وقت وہ ان دونوں کو سننے سے قاصر تھا اس کی سماعت میں ایک شور برپا تھا۔

"Truth and dare کھیلیں گے میرے ساتھ.....؟"

اس ننھی سی لڑکی نے ایک دفعہ کمبل میں دبکے' مونگ پھلیاں کھاتے اس سے سچ اگلوانے کی خاطر..... اپنے تئیں ایک چال چلی تھی۔ پھر وہ اسے اپنے بازو پہ سوتی دکھائی دی۔

وہ اذیت پسندی سے ہنسا اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ وہ گردن تلے سے تکیہ کھینچے جانے پہ اس روز کس قدر ہرٹ ہوئی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

ایک نئی' ایک مختلف' ایک خوب صورت رات وہ چکن منچورین اور چکن کوفتہ رائس کے انتظار میں ٹیبل پہ کانٹا بجاتے بجاتے اچانک اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

"آپ شاید رات سو نہیں سکے۔" فکر ہی فکر' پروا ہی پروا تھی۔ پھر اسے اپنا نانی کے گھر میں کھڑا ہونا یاد آیا۔ اسے یاد ۔ تھا کہ اس نے پوچھا۔

"آپ روئی ہیں؟"

اور اس کے آنسو جہاں تھے' وہیں تھم گئے تھے۔ آنسو تو آج بھی کسی کی آنکھوں میں تھمے تھے ۔۔ جمے تھے۔

مکمل ناول



یہاں اس وقت اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو جمے ہوئے تھے کیونکہ وہ آنسو بھی نادم تھے۔ اچانک اسے ایک بوریت زدہ.... تھکا دینے والا ٹریفک جام یاد آیا اور اسے یاد آیا کہ وہ تب بھی کتنی مطمئن کتنی مگن تھی۔

اس نے کرب سے اپنا لب دانتوں کے درمیان دبایا۔

وہ اس کے ساتھ ہمیشہ یونہی تو مطمئن رہتی تھی، چاہے جگہ یا مقام کتنا بھی غیر آرام دہ کیوں نہ ہو۔ اسے یاد پڑتا تھا۔ وہ تب اس وقت بھی رومینٹک ہو رہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"پتا ہے، مجھے تو یہ ایک پرفیکٹ میچ لگتا ہے۔" اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کے خود کو چیخنے سے روکا۔ اس کا دل درد سے پھٹنے کو تھا۔

وہ اسے اپنے بینک لان میں ٹہلتی، بازاروں میں گھومتی، ہوٹلوں میں چلتی دکھائی دیتی تھی۔

وہ جو اس کے لیے ہمیشہ ڈیم کیئر والا رویہ اپنائے رکھتا، آج گنگ تھا کہ اسے تو اس کی باتیں ازبر تھیں۔ اس کے بولے گئے جملے حرف بہ حرف یاد تھے۔ کبھی وہ اسے غصے سے آملیٹ پٹختی دکھائی دیتی کبھی وہ اسے ضد کرتے تپاتا۔

"نہیں شجی! آج آپ مجھے بتائیں گے، ہر صورت، لازمی طور پر۔" اور اس کے ساتھ ہی ایک احساس خنجر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوا کہ وہ تو اسے بے حد بے حساب چاہتی تھی، اس کی تو ضد میں بھی چاہ ہوتی تھی۔ پیار ہوتا تھا، مان ہوتا تھا۔

"آپ کی وجہ سے صرف اور صرف آپ کی وجہ سے میری زندگی کا سب سے خوب صورت ٹائم پیریڈ ڈر اور خوف کی نذر ہو گیا۔" اب کی بار اسے اس کا اسٹڈی روم میں کھڑے ہو کر خود پہ برسنا یاد آیا۔ اس کا دل بے آواز کراہا۔

وہ اس کے نصیب کا ستارہ تھی۔ وقت نے اسے بڑی شان سے اس کی زندگی میں داخل کیا تھا مگر وہ.... اس کو خود پہ افسوس ہوا اور بے حد ہوا۔

وہ.... جو اس کی قسمت تھی.... وہ جو اس کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی، وہ کہ جس سے زیادہ وہ کچھ پا نہ سکتا تھا۔

ہاں وہ.... کہ جس کی محبت میں اس قدر شدید طور پر مبتلا ہونے کا احساس اسے آج تک، اس وقت سے پہلے تک کبھی نہ ہوا تھا۔

اسے پتا تک نہ چلا اور نمکین پانی کا ایک قطرہ اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر اس کاغذ پہ آگرا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی اسے ہلا رہا تھا شاید متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہوں...."

"ہاں...."

"کیا....؟"

غائب دماغی کی کیفیت میں بولتے ہوئے اس نے دیکھا۔



"Truth and dare" کھیلیں گے میرے ساتھ....؟"

ٹی وی کو اچانک میوٹ کر کے اس نے پوچھا وہ بیڈ پہ بیٹھی کمبل میں دبکی بڑی محبت سے مونگ پھلیاں کھا رہی تھی، چھلکے بیڈ، کمبل، قالین.... ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ اس کا مخاطب بیڈ کے انتہائی کونے پہ بیٹھا سنجیدگی سے اپنی فائلیں دیکھ رہا تھا۔

"کھیل لیتا ہوں مگر dare لوں گا...."

کچھ کچھ تو وہ اسے سمجھنے لگ ہی گیا تھا۔ انڈیا کے جس ڈرامے میں وہ آدھے گھنٹے سے محو تھی۔ وہ محبت محبت کی گردان کر رہا تھا، پہلی محبت.... سابقہ محبت.... نہ مل سکنے والی محبت!

"نہیں نا یار! مجھے کچھ پوچھنا ہے آپ سے...." وہ اس کے جواب پہ جی بھر کر بیزار ہوئی۔ صاف گو تو وہ بہت تھی، وہ قائل تھا اس بات کا۔

"اچھا.... پوچھو۔" اسے کچھ اور کہنا نہ سوجھا۔

"آپ کو پتا ہے مجھے لگتا ہے کہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔" اس سے بندھی توقع بڑی معصومیت سے وہ

بتانے لگی۔

وہ جواباً" بالکل خاموش رہا' مگن سے انداز میں فائل پہ کچھ نوٹ کرتا' اسے دیکھنے سے' اس سے بات کرنے سے گریز کرتا۔

"آپ کو کبھی محبت ہوئی ...؟" اس نے بہت دلچسپی سے بہت واضح پوچھا۔

"ہاں.... ہوئی۔" مختصر دو لفظی جواب.... انداز ایسا تھا جیسے کسی نے کھانے کا پوچھا ہو اور اس نے بتایا کہ ہاں کھایا۔

"تو آپ نے ان سے شادی نہیں کی؟" اس کی دلچسپی لمحہ بھر میں سوا ہوئی۔

"نہیں۔" اب کی بار قدرے دھیمی آواز میں جواب آیا۔

"کر لیتے نا!" وہ کہتی ہوئی اس کے ذرا قریب ہوئی۔ جواب میں وہ چشمے کے پیچھے سے اسے دیکھتا' مسکرایا۔ عجیب سے انداز میں' نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں۔

"یہ خیال بڑی دیر سے آیا۔" وہ بہت دھیمے سے دل گرفتی سے بولا تھا۔

"آپ نے کسی سے اس بارے میں کچھ کہا بھی تھا یا نہیں۔"

وہ کوئی خیال آنے پہ اچانک متفکر ہوئی' وہ بھلا کہاں کچھ کہتا تھا' بتاتا تھا' خاموشی سے جو ہوا ہونے دیا' جو ملا لے لیا۔ کہا تو بہت کچھ تھا مگر.... ماضی میں ہوئی بحثیں' لڑائیاں اس کے اندر شور بپا کرنے لگیں۔

"کہا تو ہوگا مگر دباؤ نہیں ڈالا ہوگا نا' آپ کہاں اپنی بات منوا سکتے ہیں بھلا!" وہ سادہ دل بے ریا لڑکی اس کے غم میں گھلی جارہی تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ اتار کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور اپنے سیدھے بنا مانگ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"تب میں ہر بات منوا لیا کرتا تھا۔" ایک اداس سرگوشی تھی جو اس نے سنی "تو کیا وہاں شادی ہو نہیں سکتی تھی؟"

اب کی بار کیے گئے سوال نے ؛ واب نہیں دیا۔

"ہنس کیوں رہے ہیں؟ بتائیں نا! نہیں ہو سکتی تھی کیا؟" وہ اور ہنسا اور زور سے ہنسا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا!" وہ اس کے ردعمل پہ احتجاج کر رہی تھی مگر وہاں کی ہنسی اب قہقہے میں بدل گئی کھوکھلا' بھربھرا' بلند و بانگ قہقہہ! اسے پہلی بار سامنے بیٹھے شخص سے ایک بے نام سی وحشت ہوئی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی پارک کر کے وہ پچھلی سیٹ کی جانب آیا اور بہت احتیاط سے پھولوں والے شاپر اٹھائے سرعت سے اندر کی جانب لپکا۔ وہ لوگ بس پہنچنے کو تھے۔ اس کی گاڑی سے تین چار منٹ پیچھے کی ڈرائیو پہ ان کی گاڑیاں تھیں۔ گھر والوں کو یقیناً" اطلاع مل چکی تھی کیونکہ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے افراتفری اور انتظامات کا عروج پہ ہونا محسوس ہو گیا تھا۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ لڑکیوں کا ٹولہ باہر آیا' رنگ برنگے ملبوسات پہنے' اونچی ہیل کے ساتھ سہولت سے بھاگتے دوڑتے.... یہ سب اس کی کزنز تھیں۔ فرسٹ کزنز' سیکنڈ کزنز' دلہن کی سہیلیاں....

وہ ان سے بچتا بچاتا آگے کو ہوا اور متلاشی انداز میں یہاں وہاں دیکھنے لگا' چچی جان فون کان سے لگائے عجلت میں باہر جارہی تھیں مگر اسے پکارنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"امی!" اچانک اس کی امی سامنے والے کمرے سے دو خواتین کے ساتھ برآمد ہوئیں' وہ تو جیسے کھل ہی اٹھا۔

"شجی بیٹا تم رکھ آؤ نا بخت آور کے کمرے میں' مجھے مہمانوں کے استقبال کے لیے فوری پہنچنا ہے۔" انہوں نے محض لمحہ بھر کے لیے اس پہ نظر ڈالی اور فوراً" سے پیشتر معذرت کرتی چلتی بنیں۔

شادی والے گھر جیسی بے ترتیبی دکھاتے لاؤنج میں اب وہ تنہا کھڑا تھا۔

چاروناچار وہ سیڑھیاں چڑھا۔ ارادہ تھا کہ دروازے پہ ہی شاپر رکھ کر پلٹ جائے گا' مگر نازک سا شاپر کسی شے کے ٹکرانے سے پھٹ چکا تھا' شاید تیزی میں گزرتے ہوئے کسی لڑکی کا ناخن یا انگوٹھی وغیرہ اسے چیر گئی تھی' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھول موتیے کے تھے اور فرش پہ جوتوں کے نشان اور مٹی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دروازے کو بے آواز دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

☆ ☆ ☆

"امی' آپ کو پتا ہے انہیں کسی سے محبت ہوئی تھی؟"

ناشتے کے لیے انڈے پھینٹتے ہوئے اس نے اطلاع دی' انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی بے حد دلچسپ اور بہت مزے کی بات بتا رہی ہو' امی تھوڑا سا گڑبڑائیں' بیٹے کے دل کو بھلا ان سے بہتر کون جانے؟

"تو کیا ہوا' تمہارے انکل کو ابھی تک ہو جاتی ہے محبت۔ کبھی کسی سے کبھی کسی سے۔" امی کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔ اپنے تئیں وہ اس کوشش میں تھیں کہ شانزہ بات کو دل پہ نہ لے۔ کوئی غلط خیال نہ اس کے دل میں آنے پائے' مگر وہ لاپروائی سے بولی۔

"میں جانتی ہوں' ان کی بیوی صرف میں ہوں' میری جگہ نہ کوئی آج لے سکتا ہے نہ بعد میں کبھی۔"

امی نے اس کے انداز پہ بمشکل ہنسی روکی' ان کی بہو اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھتی تھی بھلا ہو اسٹار پلس کا (انہوں نے پہلی بار اسٹار پلس کو دعا دی) کہ اس کے ہر ڈرامے میں آخر کار شوہر کو بیوی سے شدید قسم کی محبت ہو جاتی تھی۔

ان کی بہو کم عمر تھی' اس کی معصومانہ پلس بے وقوفانہ حرکتوں سے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ پہلے پہل وہ دو چوٹیوں میں بال باندھے رکھتی تھی۔ انہوں نے اسے ہیئر کٹ کے لیے سیلون بھیجا تو ایسا کٹ کروا آئی کہ مزید بچی لگنے لگی۔ انہیں اچھا لگتا تھا کہ وہ سونے کے زیور پہنے' مگر وہ کلائی پہ ست رنگی بریسلیٹ پہنے پھرتی (یہ کالج گرلز میں آج کل بہت ان تھے) انہوں نے اکلوتی بہو کے لیے بے شمار کام دار جوڑے بنوا ڈالے تھے' مگر وہ جب بھی باہر جاتی ٹائٹس کرتا اٹھا لاتی' مگر وہ پھر بھی خوش تھیں کہ بالآخر ان کا بیٹا شادی شدہ ہو گیا ہے۔ بیالیس سال کی عمر تک وہ کنوارا رہا تھا اور جب تک صرف وہ ہی تو تھیں جو اس کی مختار کل تھیں' اب اگر بہو اسے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی تو بھی انہیں اعتراض نہ ہوتا مگر شانزہ تو ایسی تھی ہی نہیں۔ وہ ایک کمسن اور معصوم لڑکی تھی اور بہت غریب گھرانے سے تھی' اس کے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہ ہاتھ کھول کر خرچ کر سکتی ہے اور اس کا شوہر سرجن ہے۔

☆ ☆ ☆

رات ڈھائی بجے اس کی گاڑی گیٹ کے سامنے آکر رکی۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا تو وہ چابی گاڑی میں ہی لگی چھوڑ کر باہر آگیا اور اسے اشارہ کیا کہ وہ گاڑی اندر لے آئے۔ کمرے میں آکر اسے لائٹ آن ہونے پہ حیرت ہوئی اور مزید حیرت خالی بستر کو دیکھ کر ہوئی۔ اس نے شانزہ کی تلاش میں نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں اور وہ نظر آئی تو اس کا تھکن کا احساس سوا ہو گیا۔

وہ کمرے سے ملحق ڈائننگ ہال میں کرسی پہ بیٹھی میز پہ سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ کمرے اور ڈائننگ ہال کے درمیان لہراتا سفید جالی کا پردہ ہٹا کر اس تک آیا تو ٹیبل پہ موجود اشیاء دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چھوٹا سا چاکلیٹ کیک جس پہ ایک موم بتی لگی تھی اور ایک پلیٹ میں سجے تازہ پھول جو کچھ مرجھا سے گئے تھے مگر بہرحال مہک رہے تھے۔ اس نے نرمی سے پھولوں کو چھوا اور ایک پل کے لیے کہیں جیسے کھو گیا۔

جہاں تک اسے علم تھا آج شانزہ کا برتھ ڈے تو ہرگز نہیں تھا اور ویڈنگ اینورسری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابھی ان کی شادی کو فقط ڈھائی ماہ ہوئے تھے۔

"شانزہ!" اس نے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ کر نرمی سے پکارا۔

وہ شاید گہری نیند میں تھی' اس نے دو ایک بار مزید پکارا مگر جواب ندارد' پھر اس نے خوب بلند آواز میں اسے پکارا اور پکڑ کر ہلایا بھی مگر وہ جواباً "بس ہلکا سا کسمسائی۔

"کیا مصیبت ہے یار!" وہ بری طرح زچ ہوا۔ اس کی بچکانہ حرکتوں سے وہ بہت تنگ تھا۔ ایک آخری کوشش کے طور پہ اس نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑا مگر وہ ہلی تک نہیں۔ وہ وہیں کرسی پہ خاموش بیٹھا کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کر اس کی دونوں سائیڈز پہ بنا آواز پیدا کیے ایک ایک کرسی مزید رکھ دی۔ کیک اٹھا کر روم فریج میں رکھا۔ پھر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو بیڈ سے دونوں تکیے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پہ اس کے بازوؤں کے ساتھ رکھ دیے۔ اسے یقین تھا وہ گرے گی نہیں مگر احتیاطاً" وہ وہیں ـــــ زمین پر میٹرس ڈال کر سو رہا۔



صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا احساس اسے یہ ہوا کہ فجر قضا ہو گئی ہے کیونکہ کھڑکی سے آتی روشنی بتا رہی تھی کہ باہر دن چڑھ چکا ہے۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اسے لگا کہ شانزہ اس پہ جھکی اسے جگا رہی ہے مگر وہ شدید تھکن کے باعث محض ہوں ہاں کر سکا تھا' جانے وہ اسے گھسیٹ کر لائی تھی یا وہ خود چل کر آیا' اسے کچھ یاد نہ آیا مگر بہرحال اب وہ بیڈ پہ تھا' محترمہ خود بھی ساتھ ہی تھیں۔ اسے گردن میں کھنچاؤ سا محسوس ہوا تو اس نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے گردن سہلانی چاہی مگر ـــــ وہ اس کے بازو کو تکیہ بنائے سو رہی تھی۔ سارے کو فت کے اس کا برا حال ہو گیا' اس نے ایک جھٹکے سے بازو اس کے سر کے نیچے سے کھینچا' اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ تیزی سے بازو کھینچے جانے کی بنا پہ غالباً" اس کے کان کا زیور اسے چبھا تھا' بال کھنچے تھے' گردن گھوم کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک ناراض نگاہ اس پہ ڈالی اور کروٹ بدل کر سو گئی' احساس جرم نے

اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چمکیلی اجلی صبح پورے گھر کو روشن کر رہی تھی۔ دم پہ رکھی چائے کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عطیہ بانو اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ایک دراز کھولے کھڑی تھیں۔ انور صاحب کی اسٹک کی ٹک ٹک سنائی دی تو وہ ہولے سے مسکرائیں' دراز میں رکھے پرس سے تین چار سبز نوٹ کھینچے اور لاؤنج میں چلی آئیں۔

"السلام علیکم!" ہشاش بشاش متبسم سلام پیش کرتی وہ کچن کو ہولیں۔

"کیا بات ہے؟ بڑی خوش ہیں آپ!" انور علی ان کے پیچھے ہی آگئے۔

گو کہ بیٹے کی شادی کے بعد سے وہ بہت خوش رہنے لگی تھیں مگر آج جیسی خوشی تو ان کے چہرے پہ پہلی مرتبہ نظر آئی تھی۔ ان کی چائے کا مگ لے کر وہ لاؤنج میں چلی آئیں وہ پھر ساتھ ہو لیے۔

"یہ صدقہ کی رقم ہے' ناشتے کے فوراً" بعد خالہ نظیر کے ہاں دے آئیے گا۔" انہیں نوٹ تھماتی وہ تاکید سے بولیں۔ "اللہ تعالیٰ میرے بچوں کو نظر بد سے بچائے۔" ان کی زیر لب کی گئی دعا انور علی کو سنائی دی تو وہ بچوں کو یہاں وہاں تلاشنے لگے۔ پھر گھڑی تک نگاہ گئی کہ کہیں وہ چلا تو نہیں گیا' وہ تو بہت ہی کم رہتا تھا۔ دکھائی بھی کم دیتا۔

"کہاں ہیں بچے؟ اور ٹی وی تو آن کرو ذرا۔"

"سو رہے ہیں اور ٹی وی آن نہیں ہو گا۔ خواہ مخواہ بچوں کی نیند خراب ہو گی' آپ جب تک نیوز پیپر دیکھ لیں۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے ٹیبل پہ رکھا اخبار انہیں تھما دیا۔

"اس وقت تک سو رہے ہیں' خیریت تو ہے نا؟"

"ارے بھئی' لیٹ سوئے ہوں گے نا' کل رات شانزہ بہت اہتمام کر رہی تھی' کیک بھی بیک کیا تھا اس نے کوئی پلان تھا شاید ان کا۔"

وہ بہت خوشی سے بتا رہی تھیں' انور علی مسکرا دیے۔

ادھر شانزہ کان کی لو سہلاتی' آنکھیں سختی سے میچے لیٹی تھی اور وہ کارنس پہ ٹکی اپنی اور اس کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس سے شادی کے وقت وہ بیالیس سال کا تھا اور شانزہ سترہ سال کی۔



رشتے میں وہ اس کی خالہ تھی۔ وہ امی کی سگی خالہ کی بیٹی تھی۔ یعنی ان کی خالہ زاد بہن۔ امی کی ان خالہ کو بانجھ ہونے کی بنا پہ طلاق ہو گئی تھی۔ طلاق کے کچھ عرصے بعد ہی خالہ بھائی بھابھیوں کو بوجھ لگنے لگیں تو انہوں نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کر انہیں پھر سے بیاہ دیا۔ اب کی بار ان کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو گاؤں گاؤں پھیری لگا کر پھل بیچا کرتا تھا' اس کے پانچ بیٹے تھے۔

تین نے مل کر ڈھابہ بنا رکھا تھا اور دو باپ کی طرح ہی پھل بیچتے تھے۔ ان کی ماں ہیپاٹائٹس کا شکار ہو کر وفات پا گئی تھی۔ نئی ماں کی ان کی زندگی میں اتنی ہی وقعت تھی' جتنی باپ نے بنائی۔ باپ کو کپڑے دھونے' کھانا پکانے کے لیے گھر میں ایک عورت چاہیے تھی۔ سو وہ ان کے لیے محض ایک کام والی تھی۔ مگر کسی روح کا جب دنیا میں آنا لکھا ہو وہ آ کر ہی رہتی ہے اور ایسے میں شانزہ آئی۔ رب کی طرف سے ایک خلاف توقع تحفہ۔

ماں باپ دونوں کی ہی وہ اخیر عمر کی اولاد تھی۔ سو انہیں عزیز از جان ٹھہری۔ انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر اس کے لاڈ اٹھائے۔ گاؤں کے واحد گورنمنٹ اسکول میں داخل کرایا۔ کلائیاں بھر بھر کے چوڑیاں پہننے کو لے کر دیتے۔ ماں روز سر میں تیل ڈالا کرتی۔ ابا کہانیوں والی کتابیں' بنٹیاں' قلفی لالا کر دیتے نہ تھکتے مگر وہ ساتویں میں تھی کہ ابا ایک ٹرک تلے کچلے گئے اور تب پہلی بار عطیہ بانو نے اسے دیکھا۔ خوش اخلاق' تمیز دار اور بے پناہ خوب صورت شانزہ جو ابا کی پٹی سے لگ کے بے طرح روئے جا رہی تھی۔

عطیہ بانو کی خالہ کی دوسری شادی کے بعد ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ بیوگی کے غم سے نڈھال تھیں۔ عین بڑھاپے میں ان کا گزارے لائق سہارا بھی چھن گیا تھا' ان کی حالت غیر تھی۔ جب ہی عطیہ بانو نے ٹھانی کہ وہ خالہ کی خبر لیتی رہا کریں گی۔ ان کا خیال رکھیں گی۔ پھر وہ اکثر ہی ان کی طرف چلی آتیں۔ کبھی گوشت سبزی لے کر' کبھی شانزہ کے لیے کھلونے کپڑے' جوتیاں لیے ہوئے۔

شانزہ کی اٹھان اچھی تھی' پہلی نظر میں ہی وہ ان کے دل میں گھر کر گئی تھی مگر پھر انہوں نے دیکھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ مرجھاتی جا رہی ہے۔

ابا کی وفات کے بعد ماں کے لیے بھی ممکن نہ رہا تھا اس کے لاڈ اٹھانا۔ ان کے گاؤں کا اسکول مڈل تک تھا لہٰذا جونہی شانزہ نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا عطیہ نے شہر کے ہائی اسکول میں اس کا داخلہ کرایا اور ماں بیٹی کو ایک چھوٹی سی بستی میں ایک کمرے کا گھر لے دیا۔

شانزہ کے بھائیوں کو تکلیف تو بہت ہوئی مگر بہر حال وہ خوش تھے کہ دو سال کے لیے خرچ تو کم ہوا' ویسے بھی پیسے والے رشتے داروں سے وہ بھلا کیونکر ناراضی مول لیتے' ہاسٹل میں شانزہ نے اسٹار پلس کے ڈرامے بھی دیکھے۔ فیشن بھی سیکھے اور تھوڑی بہت پڑھائی بھی کی اور اس کی ماں نے صرف ایک کام کیا... عطیہ بانو کی منتیں!

عطیہ بانو نے لاکھ حیل و حجت کی۔ بیٹے کے نہ ماننے کا بھی بارہا کہا مگر ان کے بیٹے کی عمر تو صرف انہیں دکھائی دیتی تھی۔ خالہ کو تو محض اس کی تعلیم اور شرافت دکھائی دی۔ وہ مزید بوڑھی' مزید کمزور ہو رہی تھیں اور پھول سی شانزہ کو اس کے بھائی کہیں بھی باندھ دیتے' کہیں بھی دے دیتے' بے پناہ خوب صورت بہو کا ارمان تو عطیہ کو بھی تھا۔ اور وہ تو تھی ہی گھر کی بچی' معصوم بے ضرر۔ لہٰذا وہ فرسٹ ایئر کے امتحانات کے بعد بیاہ کے ان کے ہاں آ گئی۔



شانزہ دوپہر کے کھانے کے لیے کوئی عجیب سی ڈش بنانے کچن میں گھسی تھی۔ وہ امی سے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ انور علی بھی پاس ہی بیٹھے کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ صبح سے وہ موقع اور الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ کیسے امی سے بات کرے اور اسے لگا کہ یہ بہترین وقت ہے کیونکہ امی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائیں گی کہ وہ تو صوفے پہ تھیں اور یہ نیچے فرش پہ بیٹھا تھا۔

''امی! میں سوچ رہا تھا کہ آج ہم کہیں باہر کھانا کھائیں۔''

''ارے واہ... کیوں نہیں بیٹا' اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے؟''

اس کے سر میں حرکت کرتی ان کی انگلیاں اور لہجہ دونوں ہی ان کی خوشی ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔

دراصل وہ تلافی کرنا چاہتا تھا۔ شانزہ بظاہر تو نارمل امی ابو سے گپ شپ بھی کر رہی تھی۔

ناشتے کی میز پہ بھی آئی مگر دو چیزیں اس نے نوٹ کیں۔ ایک تو وہ اسے مخاطب نہیں کر رہی تھی' دوسرا یہ کہ اس نے انڈا توس اپنی پلیٹ میں رکھا تو ضرور اسے ادھر اُدھر سرکاتی بھی رہی مگر کھایا نہیں۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ اسے ہرٹ کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور تھی بھی یتیم' وہ تو اس کی بے وقوفیوں پہ بھی مشفق رویہ ہی اپنائے رکھتا اور آج تو غلطی ہی اس کی اپنی تھی تو پھر وہ کیوں نہ مداوا کرتا۔

''تو پھر آپ سب ٹائم پہ تیار ہو جائیے گا۔ لنچ کے بعد کچھ شاپنگ بھی کریں گے۔''

''ہم سب...'' وہ اٹکیں ''بیٹا مجھے اور تمہارے ابو کو بھلا کہاں سوٹ کرتے ہیں باہر کے کھانے؟ کیوں انور! کیا کہتے ہیں آپ؟''

''ہاں ہاں بیٹا... بس آپ لوگ ہی جاؤ' مجھے تو یوں بھی میچ دیکھنا ہے۔''

انور علی نے فوراً'' سے پیشتر بیگم کی تائید کی' اسے جھجک سی محسوس ہوئی۔

''اف یہ امی ابو بھی نا...'' وہ لڑکیوں کی طرح گھبرا کر سوچ رہا تھا۔



اس نے چکن منچورین اور چکن کوفتہ رائس آرڈر کیے' وہ خوش تھی' اس کے انداز و اطوار سے بخوبی پتا چل رہا تھا۔ وہ گھومنے پھرنے اور لذیز پکوان کی شوقین تھی۔ شجی نے محض وقت گزارنے کے لیے موبائل پہ گیم کھیلنا شروع کرلیا' وہ ایک مصروف ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ویٹر ابھی کھانا سرو نہیں کر کے گیا تھا۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''آ... تم...؟'' یہ سوال اس کے لیے بہت اچانک تھا' وہ علی الصبح جیسی کوئی لاپروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تم بہت کمزور لگ رہی ہو۔'' ٹھیک تو ہو نا؟''

وہ اس کا خیال رکھتا تھا' اس کی صحت اس کے آرام کا۔ اس کی ضرورتیں پوری کرتا' اس کی خواہشوں کا

احترام کرتا، مگر تعریف، ستائش، چاہت، محبت آج تک ان کے درمیان نہیں آئی تھی۔
"میں کمزور لگ رہی ہوں؟" وہ یوں بولی جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہو۔
"ہاں اور کچھ دنوں سے تمہاری رنگت بھی زرد لگ رہی ہے، تم ڈائٹنگ تو نہیں کر رہیں؟" وہ فکر مند ہوا۔
"میں ڈائٹنگ نہیں کر رہی۔" اس نے خشک غصیلا جملہ اپنے تئیں اسے دے مارا۔
"اچھی بات ہے کرنا بھی نہیں۔"
"اور میرا وزن ان دنوں بڑھا ہے، کم ہرگز نہیں ہوا۔" اس نے جیسے اسے باور کرایا۔
"ویٹس گڈ۔"
"شجی! میں ڈاکٹر نہیں بنوں گی۔" اچانک اسے جانے کیا سوجھی تھی۔
"ہاں ہاں کوئی پابندی بھی نہیں۔"
(وہ کہنا تو چاہتا تھا کہ ہاں ہاں کوئی امید بھی نہیں)
شانزہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی لیکن اپنا بہت سارا قیمتی وقت وہ ڈرامے دیکھنے اور نت نئے فیشن کے ملبوسات بنانے میں ضائع کرتی۔
"ڈاکٹر بن گئی تو لوگوں سے سلام دعا کے بجائے ان کا بی پی اور ٹمپریچر پوچھا کروں گی۔" شانزہ نے جل کر کہا۔
"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔ اس کا سارا دھیان موبائل میں تھا اور کچھ اس سے پہلے شانزہ نے ایسی بات کبھی کی بھی نہ تھی۔ "مطلب یہ کہ میں چیک اپ کے لیے آپ کے سامنے پیش نہیں ہوئی۔ میں نے تو بس یہ پوچھا کہ آج کیسی لگ رہی ہوں؟ اچھی یا بری؟"
"تم مجھے کبھی بھی بری نہیں لگی ہو۔"
"اور آج... آج کیسی لگ رہی ہوں؟" تھوڑا سا حوصلہ افزا جواب پا کر اس نے مزید پوچھا تھا۔
"آج بھی بری نہیں لگ رہیں۔" وہ مسکرانے لگی

اس کا ننھا سا ذہن یہ نہیں سوچ سکا کہ اس نے یہ کیوں نہ کہا کہ تم مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہو۔۔۔ آج بھی اچھی لگ رہی ہو۔ اس نے کہہ دیا جو کہہ دیا شانزہ کے لیے وہی کافی تھا۔



"ہزار بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔"
وہ اپنے کمرے میں کاؤچ پہ نیم دراز ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا جب امی ابو چلے آئے اور ان کے بات کرنے سے پہلے ہی وہ ان کی آمد کا مقصد جانتا تھا عطیہ نے ہمیشہ کی طرح بہت لاڈ سے، بہت پچکار کر بات شروع کی تھی مگر وہ فوراً ہتھے سے اکھڑا تھا۔
"آئندہ جب بھی کہو تو یہ کہنا کہ مجھے آپ دونوں نہیں چاہئیں، میری طرف سے آپ جئیں یا مریں۔"
"امی!" وہ دکھ میں ڈوب گیا، یہ بحث ان کے گھر میں کئی سالوں سے چل رہی تھی مگر ایسی سخت بات عطیہ بانو نے آج ہی کہی۔
"ہاں بیٹا! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور حد کردی تم نے۔"
وہ تھکی تھکی سی بولیں۔ وہ اس کے کاؤچ کے ساتھ قالین پہ بیٹھی تھیں جبکہ انور علی صوفے پہ براجمان تھے۔
"تمہارے ہم عمروں میں سے اکثر کے بچے ہائی اسکول تک پہنچ رہے ہیں۔ جانے کون جنم جلی تھی جو،"
"امی پلیز!" اس نے سختی سے ان کی بات کاٹی، عطیہ بانو نے ٹھنڈی سانس خارج کی اور کچھ دیر خاموش رہیں۔
"سوری!" وہ اس لفظ (جنم جلی) کے استعمال پہ واقعی شرمندہ ہوئیں۔ یہ چیز ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھی مگر اب وہ تھک چکی تھیں۔
"بیٹا! کل کو کوئی ہمارے نام پہ صدقہ خیرات کرنے

والا تو ہو..... ہماری نسل تو چلے۔"

"مجھے مجبور مت کریں امی!"

"اور تم؟ تم ہمیں جتنا بھی مجبور کر لو۔ جیسی بھی بات کے لیے کر لو ہم ہوتے جائیں؟" طنزیہ' سفاک لہجے میں عطیہ نے سوال کیا۔

"کیا کچھ نہیں کیا ہم نے تمہارے لیے؟ کیسی کیسی بات نہیں مانی؟" اس نے مارے تکلیف کے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"یاد ہے نا اپنی ضد؟" وہ آج فیصلہ کر کے آئی تھیں۔ ہر حد پہ جانے کو تیار تھیں۔

"یاد ہے!" زخمی سا یہ دو لفظی جملہ بمشکل اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

"ہمیشہ ہم ہی کیوں مانتے جائیں بیٹا؟ کیا تمہارا حق نہیں بنتا کہ تم بھی کچھ مانو؟" وہ آنکھیں بند کیے گہری چپ سادھے بیٹھا رہا۔ عطیہ رو دینے کو ہوئیں۔

"میں یوں مر گئی تو میرا خون تمہارے سر ہو گا شیجی!"

"امی!" وہ تڑپ کر ان سے لپٹا۔

"آج آپ کو کیا ہو گیا ہے امی!"

محبت سے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتا وہ نم آواز میں بولا۔

"میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ آج ہمارے درمیان فیصلہ ہو گا اور تم ہرا دو اپنی ماں کو' لے لو جان اس کی۔"

"امی!" وہ ان کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"اگر تم نے شادی نہیں کرنی تو اللہ کرے مجھے ابھی کے ابھی موت آ جائے۔"

اور وہ ٹوٹ گیا' اس کی ضد ٹوٹ گئی اور دس سالوں کا ضبط بھی ٹوٹ گیا' وہ ماں کے ساتھ لگ کے بے تحاشا رویا۔ عورتوں کی طرح بلکہ نہیں کمزور بے بس لڑکیوں کی طرح' انہوں نے اسے رونے دیا' زندگی میں پہلی بار اس کا رونا انہیں راحت دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں اس رونے سے اس کے اندر کا غبار صاف ہو گا۔ وہ اسے عرصہ دراز سے دھمکا رہی تھیں کہ میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ قطع تعلق کر لوں گی تمہارے ابا سے کہوں گی۔ تمہیں عاق کر دیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر وہ کبھی بھی اس سے جیت نہ سکی تھیں۔ آج جب جیتیں تو بڑی شان کے ساتھ' وہ سوچ رہی تھیں کہ پہلے اسے شادی کے لیے منائیں گی پھر شانزہ کے لیے' مگر دوسرا معرکہ انہیں سر ہی نہ کرنا پڑا کہ اس نے کہا تھا کہ آپ جب جہاں چاہیں' جس سے چاہیں شادی کر دیں۔

اور پھر وہ لاتعلق ہو گیا۔ انہوں نے خود ہی سارے انتظامات کیے' اس کی شاپنگ' دلہن کی شاپنگ' نہایت شاندار ولیمہ' اس نے بہت بے دھیانی اور عدم دلچسپی سے شانزہ کے ذکر کو سنا تھا' وہ اس کے متعلق سوچنے سے آخر وقت تک گریز کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے سوال ہی نہ کیا کہ کم عمر ہے تو کتنی؟ نکاح اور بارات میں اس کا لباس' میک اپ' زیور اتنا بھاری بھرکم تھا کہ مہمانوں میں سے بھی کسی کو احساس نہ ہوا کہ وہ اتنی کم عمر ہے اور حقیقی بات تو یہ ہے کہ شجاع اللہ ویل بیلڈ بھی تھا اور شریف النفس بھی' خاندان کے انتہائی قریبی گھرانے بھی اس کی عمر کو نظر انداز کر کے کئی ایک دفعہ اپنی بیٹیوں کے لیے پیش قدمی کر چکے تھے۔ بہرحال آسمانوں پہ اس کا اور شانزہ کا جوڑا بنا لکھا تھا سو وہ اس کی زندگی میں آ شامل ہوئی۔



دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ وہ دونوں ابھی تک نہیں لوٹے تھے مگر عطیہ بانو اور انور علی مطمئن تھے' شانزہ شاپنگ میں بہت وقت اور دل لگاتی تھی۔ گول گپے اور گولا گنڈا جیسی چیزوں پہ رکتی بھی ضرور تھی لہٰذا ان دونوں نے کھانا کھا لیا۔ عطیہ بچا ہوا سالن فریج میں رکھ رہی تھیں کہ گاڑی کی آواز سنائی دی' انہوں نے کھڑکی سے محبت بھری نگاہ گیٹ پہ ڈالی اور دل ہی دل میں ان کی نظر اتاری پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

"ارے..... چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" وہ کمرے

میں داخل ہوئیں تو انور علی آرام کرسی پہ آنکھیں بند کیے جھول رہے تھے۔ ان کی بات پہ چونک کر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔

"کچھ سوچ رہے ہیں کیا؟"

"ہاں...! وہ دن یاد آگیا تھا جب ہم نے شجی کو شادی کے لیے منایا تھا۔"

"اللہ کا بہت شکر ہے۔" وہ اس بات پہ دن میں بیسیوں بار اللہ کا شکر ادا کیا کرتی تھیں۔

"بچے آگئے؟"

"ہاں جی... بس ابھی پہنچے ہیں۔ دیکھیں نا شانزہ کتنی اچھی ثابت ہوئی ہے ہمارے شجی کے لیے... وہ جتنا گم صم رہنے لگا تھا اسے ایسی ہی چنچل لائف پارٹنر کی ضرورت تھی۔"

وہ گلے ہے لگا ہے اس طرح کی باتیں کرکے اپنے فیصلے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔

"واقعی... اللہ کریم کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے بیگم!" وہ ان سے متفق تھے۔

شجاع اللہ لاؤنج سے راہداری کو مڑتا اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ ان کا اور امی ابو کا کمرہ آمنے سامنے تھا۔ شانزہ اور چوکیدار شاپرز اٹھائے چند قدم پیچھے تھے۔

"ارے ہاں سنیں بختاور آرہی ہے۔"

منہ پہ پانی کے چھینٹے مارتے مارتے اچانک عطیہ بانو کو یاد آیا تو انھوں نے وہیں سے آواز لگا کر انور علی کو اطلاع دی چونکہ وہ کچھ دور تھیں اور نل سے گرتے پانی کی آواز بھی آرہی تھی لہٰذا انور علی کو تصدیق کے لیے پوچھنا پڑا۔

"بختاور...؟"

مدتوں بعد یہ نام شجاع اللہ کی سماعت سے ٹکرایا اور وہ پتھر ہوگیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ابو نے کیوں اس کا نام لیا۔ اسے تو صرف یہ پتا تھا کہ آج رات اسے کروٹیں بدلنا تھیں۔ یہ نام جب بھی اس کی سماعت سے ٹکراتا نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ جاتی اور بے خوابی کروفر کے ساتھ اس کے سامنے آٹھہرتی۔



اگلی شب وہ لان میں ٹہل رہا تھا کہ شانزہ چلی آئی۔

"آپ پریشان ہیں؟"

"نہیں تو..." اس نے روانی سے جھوٹ بولا۔

"تھکے ہوئے ہیں کیا؟"

"ہاں شاید...!"

"آپ شاید رات سو نہیں سکے۔"

"نن... نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ اس کے درست اندازے پہ جزبز ہوا اور پوچھا "تمہیں کیوں یہ لگا؟"

"آپ کی آنکھیں سرخ ہیں اور ہلکے سے حلقے بھی ہیں۔" وہ اس کے مشاہدے پہ لحہ بھر کو گھبرایا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

"ہلکے سے حلقے تو تھکن سے بھی ہو جاتے ہیں مائی ڈیئر!"

"اتنا کام مت کیا کریں آپ!"

"کام تو کرنا پڑتا ہے' زندگی کے لیے ضروری ہے یہ۔"

"زندگی کے لیے تھوڑا سا کام کریں... کام کے لیے ساری زندگی تو نہ لگائیں۔"

وقت نہ ملنے کا شکوہ بڑے سبھاؤ سے آپ ہی آپ اس کی زبان پہ آگیا۔ وہ جتنی کمسن تھی' اتنی کم فہم تو ہرگز نہیں تھی۔ اس غیر متوقع جملے پہ شجاع اللہ نے چونک کر سر اٹھایا اور نظر بھر کر اسے دیکھا وہ اس کا خیال رکھتی تھی' اس کے لیے پریشان ہوتی تھی۔ اس کی فکر کرتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتی تھی۔ (یہ اس کو ابھی ابھی پتا چلا) یعنی اس کو محتاط ہونا پڑے گا۔ اس کے ساتھ جو ہوا سو ہوا مگر پھول سی شانزہ کو کانٹے چبھونے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لہٰذا محض اس کی دل جوئی کو اس کے ساتھ وقت گزارنے کی خاطر وہ اس سے چھوٹی چھوٹی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ پورے چاند کی رات میں وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

ٹھنڈی مہربان چاندنی انہیں محبت سے تکنے گئی۔



"شانزہ.... شانزہ!" وہ اسے پکارتا کمرے سے نکلا مگر کوئی جواب نہ آیا نہ ہی وہ کہیں دکھائی دی۔ چاروناچار وہ خود ہی کچن میں آ گیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ چائے کی طلب تھی۔ کچن میں آتے ہی اس نے ٹوکری سے برتن اٹھا کر چائے کا پانی چڑھایا۔

"شانزہ گھر پہ نہیں ہے۔" وہ پانی میں پتی ڈال رہا تھا جب عقب میں امی کی آواز سنائی دی۔ "گھر میں ہی ہے امی! اس نے کہاں جانا ہے۔"

ساس پین کو ڈھکن سے ڈھکتے اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

"میں پوچھ نہیں رہی' بتا رہی ہوں!" امی کا لہجہ تاسف بھرا ڈپٹتا ہوا سا تھا۔ وہ گڑبڑا کے رہ گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

"تمہاری بیوی ڈیڑھ دن سے گھر میں نہیں ہے اور تمہیں خبر تک نہیں!"

"میرا دھیان نہیں گیا امی!" اس نے ہولے سے کہا۔

"وہ تمہاری ذمہ داری ہے **شجی**! اور تم اتنے لاپرواہ اتنے غیر ذمہ دار تو کبھی نہ تھے۔" وہ افسوس اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے بولیں۔

اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو خاموشی سے فریج سے دودھ نکال کر چائے میں شامل کرنے لگا۔

"بوجھ نہیں سمجھو اسے' خوشی سے نبھاؤ اس رشتے کو۔" وہ کچن کے کونے میں لگے ننھے سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچتے بولیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنی بڑی بات پہ وہ **شجی** کی خبر نہ لیتیں۔ **شجی** نے انہیں فرصت سے کرسی پہ براجمان ہوتے دیکھ کر سوچا تھا۔

"میں آئندہ خیال رکھوں گا امی!" وہ معذرت خواہانہ سا بولا۔

"چائے پی کر کال کرو اس کو۔"

"جی میں کرتا ہوں۔" اس نے فوراً ہامی بھری حالانکہ ارادہ بالکل نہیں تھا۔

"نانی کا حال احوال اچھے سے پوچھنا بلکہ اسے کہنا ان سے بات کروائے تمہاری۔"

"کیوں' کیا ہوا نانی کو؟"

"ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اچانک جب ہی تو میں نے شانزہ کو رہنے بھیجا ورنہ ہمارا کہاں دل لگتا ہے اب اس کے بنا۔"

شجی نے فوراً تائیدی انداز میں گردن ہلائی جبکہ اندر سے وہ قدرے مطمئن ہوا کہ کچھ دن کے لیے سہی مگر وہ اب زیر مشاہدہ نہیں ہے۔

"اینگزائٹی کا اٹیک ہوا تھا خالہ کو۔"

"اچھا.... آآآ؟" وہ یکدم متفکر ہوا۔ امی کی یہ خالہ ہو بہو اس کی نانی کی شکل کی تھیں۔ گو کہ ان سے اٹھارہ برس چھوٹی تھیں مگر پھر بھی بیشتر عادات بہن جیسی تھیں۔ لہٰذا **شجی** کو ان سے خاص انسیت تھی۔ عطیہ بانو خود بھی خالہ سے بہت قریب تھیں کیونکہ ان کی عمروں میں محض ڈیڑھ برس کا تفاوت تھا۔

"ہاں تو اور کیا.... میں اور تمہارے ابو کل صبح جائیں گے انہیں دیکھنے' تم بھی وقت ملتے ہی جانا۔"

اس کی مصروفیت کے پیش نظر وہ اسے ساتھ چلنے پہ مجبور نہیں کر رہی تھیں۔

"جی پرسوں ترسوں تک چکر لگاتا ہوں میں بھی۔"

"**شجی**! تم خوش ہو نا؟" وہ اچانک اس کے چہرے پہ جانے کیا کھوجنے لگیں۔

"جی امی! الحمدللہ آپ کی دعا سے بہت خوش ہوں۔" اس نے ایسے لب و لہجے میں کہا کہ امی کی ٹھیک سے تسلی ہو سکے۔

"اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے میرے بچے!" وہ گلوگیر ہوئیں۔

"ہم تو اب دن گن رہے ہیں کہ کب تمہاری خوشی دیکھنے کو ملے....." اور اسے اچھو لگ گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ فوراً فکرمندی سے آگے کو ہوتی اس کی کمر سہلانے لگیں کہ جیسے وہ کوئی ننھا بچہ ہو۔

"کچھ نہیں امی! آخری گھونٹ تھا تو کچھ پتی گلے میں چلی گئی۔" اسے بروقت بہانہ سوجھا تھا۔



"افسرنی ہوگی تو اپنے گھر میں، خبردار جو یہاں افسری دکھائی تو۔"

وہ نانی کے گھر کا بدرنگا نیم وا دروازہ کھول کر اندر داخل ہی ہوا تھا کہ اس نے ایک پاٹ دار زنانہ آواز سارے میں گونجتی سنی۔

وہ شانزے کو کئی بار نانی سے ملوانے لے کر آیا تھا۔ ہمیشہ یہ گیٹ ادھ کھلا ہی ملتا آج بھی ایسا ہی ہوا۔ گیٹ کے پار ڈیوڑھی تھی جسے وہ قدم قدم چلتا عبور کر رہا تھا۔

"اس نے گالی دی تھی، سمجھانے پہ بھی باز نہ آیا تو سزا دینی پڑی۔" اس پاٹ دار آواز کے جواب میں کوئی منمنایا۔

"تو ہوتی کون ہے سزا دینے والی، تیری اتنی جرأت؟" آواز پاٹ دار لب و لہجہ جاہل، انداز لڑاکا شجی کی رفتار میں تیزی آئی۔

"اتنی بڑی بڑی گالیاں دے رہا تھا۔"

"وہ چھوٹی دے یا بڑی، تیرے باپ کا کیا جاتا ہے؟"

"آپا جی!" وہ عزیز از جان باپ کے یوں ذکر پہ روہانسی ہو گئی۔

جب ہی شجی نے کمرے میں قدم رکھا۔ ایک لمحے کے لیے اندر موجود تمام نفوس کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر ایک دم افراتفری سی مچ گئی۔ کسی نے اس کو راستہ دیا، کوئی کرسی لے آیا۔ ایک دم سے پانی کا گلاس بھی آ گیا، وہ سب کو نظرانداز کرتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا جو نانی کی چارپائی کے پاس آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے کھڑی تھی۔

"تم روئی ہو؟" وہ پوچھ اس سے رہا تھا مگر نظریں اس موٹی جاہل عورت پہ گڑی تھیں جسے کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے ہاتھ نچا نچا کر بولتے سنا تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔ شانزہ کے آنسو جہاں تھے وہیں تھم گئے۔

"ارے بیٹا بیٹھو تو سہی۔" نانی نے بروقت مداخلت کی اور سمٹتے ہوئے چارپائی پہ اس کے لیے جگہ بنائی۔ مارے غصے کے اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے مگر نانی جو مزید کمزور ہو چکی تھیں اور بہت ہی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ انہیں وہ کیسے نظرانداز کرتا، سو بیٹھ گیا۔

"کیسی ہیں اب آپ؟" ان کے ساتھ لگتے ہوئے اس نے محبت اور چاہت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بیٹا! اصل میں شہناز تھوڑی سی زبان کی تیز ہے ورنہ تو بہت خیال کرتی ہے شانزہ کا۔" انہوں نے فوراً سے بیشتر صفائی دی۔

"نانی! اپنی زبان کی تیزی کوئی کسی کو بھی دکھائے مگر شانزے کو نہیں۔" وارننگ دیتے سخت لہجے میں وہ بولا اور ایک بار پھر اس عورت کو دیکھا۔

وہ پھر سے گڑبڑائی۔ زبان کی وہ واقعی بہت تیز تھی مگر چمچماتی گاڑی کے مالک نندوئی کو وہ بھلا کیونکہ تیزی دکھاتی، اور اس کے ہاتھوں میں تو بہت سے شاپرز بھی تھے جنہیں اس نے اپنی نانی کی چارپائی کے ساتھ رکھا تھا۔ چند ہی منٹوں میں شانزہ چائے لے آئی۔ اس موٹی عورت نے شجی کے سامنے ہی اپنے بچے کو دکان پہ بھیجا اور جتاتے ہوئے لہجے میں اونچی آواز میں تاکید کی تھی کہ بسکٹ کریم والے لانا اور نمکو بھی بڑھیا والی۔ مگر وہ نمکو بسکٹ کو یکسر نظرانداز کرتا سادہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ ساتھ ہی نانی سے ڈھیر ساری باتیں بھی کر ڈالیں۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں شانزہ کو آج ہی واپس لے جاؤں؟" شانزہ برتن اٹھانے آئی تو اس نے نانی سے سوال کیا۔

وہ تو اپنی بیٹی کی اتنی پذیرائی پہ کھل ہی اٹھیں اور فوراً شانزہ کو تیاری کا کہا۔ وہ تیار ہونے گئی تو شجی نے غیر محسوس انداز میں کچھ نوٹ نانی کے ہاتھ میں منتقل کیے۔ سارے محبت کے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اپنا خیال رکھا کریں نانی اور خوش رہا کریں۔" وہ محبت سے انہیں تاکید کر رہا تھا۔

"بس بیٹا! تم لوگوں کو دیکھتی ہوں تو بیماری ' بڑھاپا سب بھول جاتی ہوں' جوان ہو جاتی ہوں میں۔"

"تو پھر طے ہوا آپ آئندہ کوئی بات دل پہ نہیں لیں گی۔"

"بس بیٹا! تنہائی سے گھبرا جاتی ہوں جب سے شانزہ کے ابو گئے ہیں پہلے سی بات نہیں رہی۔" وہ کہتے ہوئے کچھ تلخ ہوئیں اور اس بات کا تو وہ خود بھی گواہ تھا کہ جو تین سال وہ شانزہ کے ساتھ رہیں' قدرے صحت مند رہیں مگر جب سے شانزہ بیاہی گئی تو وہ واپس اپنے مرحوم شوہر کے گھر آگئی تھیں۔ جو اب ان کے سوتیلے بیٹوں کا گھر تھا۔

"فون میں بیلنس ہے یا میں جاتے ہوئے کرا دوں؟"

اس کی نظر اچانک ان کے تکیے کے ساتھ پڑے ہوئے سے فون تک گئی تو اس نے پوچھا۔

"ہاں صدقے تو کس کس چیز کا خیال رکھتا ہے۔ اللہ تجھے خوشیاں دے' تیرا باغ کھلائے' تجھے رونقیں دے۔"

وہ دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

شعبجی کے لیے مزید رکنا مشکل ہو گیا وہ الوداعی کلمات کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اف یہ مائیں بھی نا!" باہر جا کر گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بڑبڑایا۔"کم از کم شانزہ کا ہی سوچ لیں کتنی کم عمر ہے وہ۔"

گاڑی موڑتے ہوئے اس نے سوچا' اس حقیقت سے بے نیاز کہ جس بستی میں وہ کھڑے تھے۔ وہاں پہ سولہ سترہ سالہ بچیاں بڈھوں سے بیاہ دینا نہایت عام تھا' سالہ شادی شدہ' رنڈوؤں سے اور وہ تو پھر تیس بتیس سے زیادہ کا ہر گز نہیں لگتا تھا۔

شانزہ آکر بیٹھی تو اس نے فوراً" گاڑی دوڑا دی۔ راستے میں اس نے نوٹ کیا کہ وہ کچھ خاموش سی ہے' شاید اپنی امی کو الوداع کہتے ہوئے جذباتی ہو گئی تھی جو کافی روئی روئی لگ رہی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"پہلے جیسی۔" اس کا انداز جلا کٹا تھا مگر شعبجی کو محسوس نہ ہوا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ نانی کو اپنی طرف ٹھہرالیں۔"

شانزہ نے خوشگوار حیرت میں گھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اچھا تھا مگر آج اسے بہت اچھا لگا۔

"امی ابو سے ڈسکس کرتے ہیں پھر اسی ویک میں کسی دن جا کر انہیں لے آئیں گے۔"

وہ مزید بولا۔ شادی کے بعد آج وہ پہلی بار نانی کے گھر گھنٹہ بھر بیٹھا اور پہلے ہی دن اسے گھر کا گھٹا گھٹا بیمار ماحول بہت محسوس ہوا۔ اس سے پہلے تو وہ بس کھڑے کھڑے ملنے کے لیے جاتے تھے کہ امی ابو کو شانزہ کا نظروں سے اوجھل ہونا گوارا نہیں تھا اور نانی بھی اعتراض نہ کرتیں' شانزہ سکھی تھی ان کے لیے یہی کافی تھا۔ شانزہ کچھ دیر کے لیے سکھیوں پڑوسنوں اور بھابیوں کی باتوں کو بالکل بھول گئی۔ اس کا موڈ بے حد خوشگوار ہو گیا تھا شعبجی کو خوشی ہوئی۔

"میں دو منٹ میں نانی کے نمبر پہ لوڈ کروا کر آتا ہوں۔"

اس نے اچانک گاڑی ایک دکان کے سامنے روکی اور ڈیش بورڈ پہ پڑے بٹوے سے پانچ سو کا نوٹ نکالتا باہر نکلا۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی موبائل' بٹوہ وغیرہ جیب سے نکال کر رکھ دیتا یہ اس کی عادت تھی۔ وہ بٹوے سے نوٹ نکال رہا تھا تو شانزہ کی نظر غیر ارادی طور پہ بٹوے کی سمت گئی پھر ساتھ ہی پڑا موبائل اس کی نظروں کی زد میں آیا اور اس نے چور نظروں سے شعبجی کو دیکھا گو کہ وہ تیز چل رہا تھا مگر واپس آنے تک پھر بھی اسے پانچ سات منٹ لگ جانے تھے۔ اس نے اس کا موبائل اٹھالیا۔ خلاف توقع کوئی کوڈ نہیں لگا تھا۔

وہ میسجز میں گئی ان باکس میں چند ہی میسج تھے' موبائل کمپنی کے کسی برانڈ پہ سیل لگی ہوئی تھی۔ اس کا میسج' بل' پے ہو چکنے کا میسج اور بس۔۔۔ اس کی تسلی نہ ہوئی وہ کانٹیکٹس میں گئی' وہ سوشل نہیں تھا یہ اندازہ وہ کر چکی تھی مگر پھر بھی نہایت کم' گنے چنے کانٹیکٹس دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور ان میں بھی قابل

اعتراض کوئی نہیں تھا۔ امی ابو' صالحہ آپا (اس کی پھپھی زاد بہن) تائی شانزہ' ڈاکٹر سعود' ڈاکٹر علی' ڈاکٹر مہوز اور چوکیدار۔

اس نے بے زار ہو کر موبائل واپس رکھا اور اس سمت دیکھنے لگی جہاں سے اسے پلٹنا تھا۔ جلد ہی وہ پہلے کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتا آتا دکھائی دیا۔ وہ دراز قد تھا' گندمی رنگت اور نقوش تیکھے۔ سادہ ڈیسنٹ ڈریسنگ کرتا' بال بنا مانگ کے پیچھے کو جمائے رکھتا۔ وہ ہیرو تھا' مکمل ہیرو' اس کا رکھ رکھاؤ' سنجیدگی اور ذہانت اس کی شخصیت کو چار چاند لگاتے تھے۔ گاؤں بھر کی لڑکیاں اس سے جلتی تھیں' اماں نے اسے بارہا باور کرایا اور خود اس نے بھی نہ چاہنے کے باوجود محسوس کیا۔ اس بار جب وہ رہنے گئی تو رشتہ دار خواتین اور سکھیاں سہیلیاں اسے کریدتے کریدتے نہ تھکتی تھیں۔ ان کی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق سے خود اس کے ذہن میں ان گنت سوال پیدا ہو گئے تھے۔ بائیں طرف والی چچی نسرین کے سامنے اس کے منہ سے بے خیالی میں جانے کیا بات نکلی تھی کہ وہ اسے شوہر کو قابو کرنے کے گر سمجھانے لگیں' اسے جھلی بیوقوف کہا اور اس کے نہ چاہنے کے باوجود بہت ساری باتیں اس کے کانوں میں سرگوشیوں کی صورت کہہ ڈالیں۔



یہ گرما کی لمبی دوپہروں میں سے ایک تھی۔ زرد' گرم اور تھکا دینے والی۔ شجاع اللہ خوش قسمتی سے ہسپتال سے جلد فارغ ہو گیا۔ گزشتہ دو روز سے وہ اتنا مصروف رہا تھا کہ ٹھیک سے سو بھی نہ سکا تھا۔ لہٰذا گھر پہنچتے ہی اس نے لمبی تان کر سونے کی ٹھانی۔ امی ابو کو سلام کر کے وہ سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ جوتے جرابیں اتار کر بنا ہاتھ منہ دھوئے کسل مندی سے لیٹا۔ گرمی بہت محسوس ہوئی تو سائیڈ ٹیبل پہ ہاتھ مار کر اے سی کا ریموٹ پکڑنا چاہا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اے سی ریموٹ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ شانزہ دھاڑ سے دروازہ کھول کے آئی۔

اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ شجی نے اس کے ہاتھ کی جانب دیکھا' وہ شادی کا دعوت نامہ پکڑے ہوئے تھی۔

"شادی کا کارڈ ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں بتایا۔

"کس کے لیے؟" وہ سختی سے پوچھ رہی تھی شجی کو اس کے انداز پہ حیرت ہوئی۔ اے سی ریموٹ اسے ڈریسنگ ٹیبل سے مل گیا تھا۔ اس نے اے سی آن کر کے دروازہ بند کیا۔

"میرے لیے ہے۔"

"جھوٹ!" وہ تیزی سے بولی۔ "یہ آپ کے لیے نہیں ہمارے لیے تھا۔"

"ہاں تو ایک ہی بات ہے نا۔" وہ اس کے انداز اطوار کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"ایک ہی بات نہیں ہے کیونکہ آپ نے مجھے ساتھ لے جانا تو درکنار مجھے بتانا تک مناسب نہ سمجھا۔"

"مجھے لگا کہ تم بور ہو گی۔" وہ اب بیڈ پہ لیٹا اور اوڑھنے کے لیے چادر کھول رہا تھا۔

"جھوٹ مت بولیں شجی!" وہ درشتی سے بولی۔

"کیا ہو گیا ہے شانزہ! میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں

"اس لیے کہ ایک غریب یتیم لڑکی کو بطور بیو متعارف کرواتے ہوئے آپ کو شرمندگی ہوتی مسٹر شجاع اللہ!"

اور شجاع اللہ کا تھکا ماندہ وجود اور نیند میں جاتا ذہ اس کی بات پہ کرنٹ کھا کر رہ گیا۔ وہ حیرانی کے سا چپ چاپ اسے تکنے لگا۔

"جس جس نے ہمیں کھانے پر بلایا آپ نے منع کر دیا تاکہ آپ کو خفت نہ اٹھانی پڑے۔" وہ تلخی سے کہ بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھی۔ غصے سے اس نے کارڈ دور اچھال دیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے شانزہ!" وہ رسان بولا۔

"تو پھر کیسی بات ہے؟ بتائیں مجھے۔" وہ ایک دم ٹانگیں اوپر کرکے اس کی جانب رخ کرکے بیٹھ گئی۔ وہ لڑائی پہ آمادہ تھی۔ اس کے انداز و اطوار بتا رہے تھے۔ بلکہ جو بات وہ کہہ رہی تھی ایسا شجاع اللہ کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

"میں مصروف تھا شانزہ! ہر ایک کے ہاں ٹھہرانے یا عشائیے پہ جانا ممکن نہیں تھا۔" وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"تو ہر ایک کے ہاں نہ جاتے کسی ایک کے ہاں ہی لے جاتے مگر نہیں آپ کیوں لے کر جاتے خوامخواہ شرمندگی اٹھانی پڑتی آپ کو!"

"شانزہ!" اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"کسی ایک کے ہاں جاتے تو باقی سب اعتراض کرتے۔" بچوں کی طرح پچکارنے کے انداز میں وہ بولا' شانزہ نے یقین کرتی' نہ کرتی' شش و پنج میں پڑی نگاہ اس پہ ڈالی' وہ مسکرایا اور نرمی سے اس کے ہاتھ دبائے۔

"بلیومی... جو تم نے کہا۔ ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہے ڈیئر!"

وہ کچھ لمحے چپ چاپ اسے تکتی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو آئندہ آپ مجھے ہمیشہ ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"آئی پرامس' میں تمہیں ضرور لے کر جاؤں گا۔"

"مجھے پتا ہے آپ نے نہیں لے کر جانا۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ "وقت نہ ملنے کا بہانہ کر دیں گے آپ۔"

"یار وقت تو آنے دو... پہلے سے جج منٹ مت کرو۔"

"اچھا آآآ... نہیں کرتی!" اس نے کہا اور پھر اچانک حیرت سے پہلے اس کے ہاتھوں کی سمت دیکھا پھر چہرے کو' دل سے ناراضی کچھ ہٹی تو پتا چلا کہ اس کا جسم گرم ہے۔

"آپ کو بخار ہے؟" وہی ہمیشہ والی فکر مندی!

"ہاں... تھکن سے شاید حرارت ہو گئی ہے۔"

اس نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ اپنی گود میں واپس کر لیے۔

"تو آپ کو آتے ہی لیٹ جانا چاہیے تھا! آپ بھی نا' چلیں اب آرام کریں۔"

"ایکچوئلی تمہاری تو بہت خواہش تھی کہ میں آتے ہی لیٹ جاؤں آرام کروں مگر میں نے سوچا کیوں نہ پہلے تھوڑی سی لڑائی کر لیں۔" وہ شریر ہوا۔ شانزہ بری طرح جھینپی۔

"چلیں اب سوئیں۔" اس نے شجی کو تکیے کی طرف دھکیلا۔ "میں خود بہت تھکی ہوئی ہوں مجھے بھی آرام کرنا ہے۔" کہتے ہوئے خود بھی اس کے پہلو میں آلیٹی۔

"ہاں بھائی... بندہ دن میں ایک سو بیس ڈرامے دیکھے تو تھکتا تو ہے نا پھر!" اس کی آنکھوں میں شرارت' لب و لہجے میں سنجیدگی اور الفاظ میں ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔

شانزہ بری طرح چڑی' کہنیوں کے بل بازو ٹکا کر ان پہ چہرہ رکھتی غصے سے بولی۔

"میں صرف ڈرامے نہیں دیکھتی' گھر کو بھی دیکھتی ہوں' آپ کی بیوی ہونے کے ناتے میری بہت ساری ذمہ داریاں ہیں۔ بہت سارے فرائض ہیں۔"

"اچھا جی؟" اس کی طرف رخ کرتے بیڈ پہ دائیں کہنی اٹھا کر اس پہ چہرہ رکھتے وہ چونکا انداز یوں تھا کہ جیسے یہ اطلاع بہت نئی اور انہونی ہو' وہ پھر چڑی۔

"آپ کی طرح نہیں ہوں' ہر فرض ہر ذمہ داری سے بری الذمہ۔" دل کی جلن جو جانے کب سے اپنا آپ دکھانے کو بے قرار تھی۔ فوراً اپنا ضبط کھوتے ہوئے اس کے لبوں سے نکلی۔ غصے سے مخالف رخ کروٹ پلٹتی وہ جیسے اس کو جھنجوڑ گئی۔

اے سی کی خنکی
کمرے کی تنہائی
دبیز پردے گرمی' روشنی کو کمرے میں آنے سے
روکتی بند کھڑکیاں

ان لمحوں میں ہوئی لڑائی ' شرارت وعدہ اور بالخصوص شکوہ....

سب مل کر اس کے اندر اتھل پتھل کر رہے تھے '

اسے اپنا جسم پہلے سے زیادہ گرم ہوتا محسوس ہوا۔

شادی کے لیے ہاں کرتے وقت اسے لگا تھا کہ اس سے کٹھن کام دنیا میں اور کوئی نہیں ہو گا مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے احساس ہو رہا تھا کہ شادی کو نبھانا دنیا کے ہر کام سے زیادہ کٹھن اور چیلنجنگ ہے!

وہ اس شادی کو نبھانے کے لیے بہت کچھ کر رہا ہے

تسلی اس کا دماغ اسے ہمہ وقت دیتا۔

"مگر میں اس شادی کو نبھانے کے لیے سب کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے بے قرار ہو کر کروٹ پلٹی۔ بازو' ماتھے پہ رکھ کر آنکھیں سختی سے میچیں۔ اندر ایک شور بپا تھا' دل بضد تھا کہ.... وہ اسے نظر بھر کر دیکھ تو لے.... لانبی پلکوں تلے چھپی ناراض آنکھوں کو پلکوں سے چھو تو لے۔



اگلے روز وہ شام کو جلدی ہی گھر پلٹ آیا۔ اسے امی ابو سے بات کرنی تھی 'نہایت ضروری.... شانزہ کا لب و لہجہ 'انداز و اطوار سب بدلے ہوئے تھے۔ اسے وقت تو لگا مگر بالآخر وہ اس سب کی وجوہات پہ پہنچ گیا۔ شانزہ جب سے نانی کے ہاں کچھ روز ٹھہر کے آئی تھی تب ہی سے یہ تبدیلی اس کے مزاج کا حصہ بنی۔ بستی کی تمام خواتین کم پڑھی لکھی تھیں اور ہمہ وقت گھر گرہستی میں لگی رہتیں۔ باہر کی دنیا نہ انہوں نے دیکھی نہ سوچی۔ ان کی سوچ بہت محدود تھی اور ظاہر ہے گپ شپ کا دائرہ سوچ کو ضرور ہی چھوتا ہے.... وہ دوبارہ شانزہ کو وہاں نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی نانی کے حالات وہ دیکھ آیا تھا وہاں ٹھہرے رہنا ان کے لیے بھی مضر صحت تھا اسی بات کو جواز بنا کہ اس نے امی ابو سے شام کی چائے پہ درخواست کی۔

"ہم نانی کو اپنے ہاں ٹھہرالیں؟"

انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا' یہ ان کے لیے خوشی کی بات تھی کہ وہ شانزہ کا اس حد تک احساس کر رہا ہے.... اور اگلے ہی دن نانی ان کے ہاں موجود تھیں۔



"پوہ' سار.... جیٹھ.... ہاڑ.... ساون.... بھادوں"

نانی انگلیوں پہ مہینے گن رہی تھیں وہ شانزہ اور شعجی کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں۔ آج انور علی اور عطیہ بانو کسی عزیز کی عیادت کو گئے ہوئے تھے لہٰذا نانی کو تنہائی سے بچانے کے لیے وہ انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔ شانزہ الرٹ سی ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈرامے کا نہایت اہم اور جذباتی سین چل رہا تھا۔ وہ پوری منہمک تھی۔

"شعجی بیٹا آٹھ ماہ ہونے کو آئے تمہاری شادی کو"

نانی نے ساتھ ہی بیٹھے شعجی کو مخاطب کیا۔ دونوں تربوز کھا رہے تھے۔

"ہاں جی۔ کم و بیش!" اس نے کہتے ہوئے تربوز کا چھوٹا سا سلائس اٹھایا۔

"میں سوچ رہی تھی شانزہ کو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

"بھلا کیوں نانی؟ میرا نہیں خیال اسے کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" نفاست سے سلائس میں کٹے تربوز کا سب سے چھوٹا پیس اپنے لیے منتخب کرتے ہوئے وہ بولا۔ شانزہ جو اس دن زرد کہے جانے پہ ناراض ہوئی تھی تو وہ خاصا محتاط ہو گیا تھا تب سے۔

"تم لوگ تو نئے دور کے بچے ہو یہی کہو گے.... اور ہو سکتا ہے واقعی اللہ کی طرف سے بس دیر ہو' لیکن دکھلانے میں کیا حرج ہے بھلا؟"

"جج.... جی؟" وہ اٹکا۔

"ہاں نا بیٹا.... احتیاطاً" کہہ رہی ہوں نا کہ اگر کوئی پیچیدگی ہے بھی تو فوراً "سامنے آجائے۔"

وہ اکلوتا تھا.... اور شانزہ بھی لہٰذا امی اور نانی کی طرف سے وہ بہت بار اس بارے میں کچھ نہ کچھ سن چکا تھا مگر شانزہ کے سامنے "اف" اس نے گردن اٹھائی دو بھر ہوا اور شانزہ.... اس کی تو وہ حالت تھی کہ مارو کاٹو

بدن میں لہو نہیں' امی نہ تو اس سے اسے بوڑھی لگیں نہ بیمار۔ وہ صرف بے تاب تھیں اور بے حدو حساب تھیں۔

"تم سے کون سا ڈاکٹروں نے پیسے لینے ہیں بیٹا!" نانی اب دونوں کی کیفیت سے یکسر بے خبر مزید بولی تھیں۔ شانزہ کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اس منظر سے غائب ہو جائے اور اے سی کی زبردست کولنگ کے باوجود شجی کو ماتھا پسینے میں نہاتا محسوس ہوا۔

"نہ ہی تمہیں اسپیشل جانا پڑے گا' روز جاتے تو ہو کل اسے بھی لے جانا۔" اپنی ہی رو میں انہوں نے کہا۔ شانزہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان تک آئی۔

"امی! آپ اپنے کمرے میں چلیں۔ میں آپ کی دوا اور دودھ لاتی ہوں رات بہت ہو گئی ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ انہیں اٹھانے لگی۔

"اچھا بیٹا! پھر کل صبح ہی اسے دوائی لا دینا۔" اٹھتے اٹھتے بھی وہ تاکید کرنا نہ بھولیں۔

"مجھے دوائی کی نہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" زچ ہو کر وہ بڑبڑائی۔ اور اس کی امی باقی امیوں کی طرح چاہے کچھ بھی نہ سنتی ہوں مگر اس طرح کی باتیں تو فوراً سنتیں۔ جبھی جواباً بولیں۔

"لے پگلی ڈاکٹر تو تیرا اپنا گھر والا ہے۔"

"گھر والا تو ہے مگر میرا اپنا نہیں ہے۔"

اماں اٹھ کر دو قدم آگے چلی گئیں تو اس نے جھک کر تربوز والا خالی برتن اٹھاتے ہوئے اتنی آواز میں کہا کہ صرف وہ ہی سن سکے' اس نے ذرا سی گردن اٹھا کر اسے دیکھا' نہ بھی دیکھتا تو جانتا تھا۔ وہ صرف اسے سنانے کے لیے کہہ رہی تھی' جوں ہی وہ کمرے سے باہر ہوئیں وہ بستر میں آ دبکا' نیند بہترین فرار تھی اور اسے شانزہ کے لوٹنے سے قبل گہری نیند سونا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے بھرپور اجلی صبح کو ان کے آنگن میں اترے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس نے شجی کو ایک نہایت چھوٹے سے بیگ میں اپنے کچھ کپڑے رکھتے دیکھا۔

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟"

وہ نماز کے بعد پھر سارا سونے کے ارادے سے آئی تھی مگر اسے پیکنگ کرتے دیکھ کر بجائے بیڈ کی طرف آنے کے... وہیں دروازے میں ساکت سی ہو گئی۔

"ہاں' دو دن کے لیے کراچی جانا ہے۔"

اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تک نہیں' بیڈ پہ پڑے چند کپڑوں کو تہ کرتا رہا۔

"کیوں؟"

"ایک کورس ہے چھوٹا سا' بلکہ ورکشاپ سمجھو۔"

"جانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں کچھ خاص ضروری بھی نہیں بٹ میں نے سوچا' جانے میں کیا حرج ہے۔"

"شجی...!" وہ کہتے ہوئے کچھ قریب ہوئی۔

"آج میرا رزلٹ ہے۔" وہ اس کے سامنے بیڈ پہ آ بیٹھی۔

"اوہ اچھا! بیسٹ آف لک!" اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تک نہیں' نہ اسے کوئی ایکسائٹمنٹ ہوئی نہ اس کی ایکسائٹمنٹ نظر آئی۔ وہ بیگ کی زپ بند کرتا سیدھا ہوا' لائٹ بلیو ڈریس شرٹ کو براؤن جینز کے ساتھ پہنے وہ جانے کے لیے تیار تھا۔

"اللہ حافظ...!" کہہ کر شانزہ نے لحہ نہ لگایا اور بیڈ پہ پڑی چادر میں چھپ گئی۔ شجی نے بیڈ پہ پڑا بیگ اٹھایا اور چپ چاپ جانے کے لیے مڑ گیا۔ بنا آواز پیدا کیے' بنا اس کی سسکیوں کی آواز سنے!

☆ ☆ ☆

وہ پہلے دن کی مصروفیات نمٹا کر کولیگز کے ساتھ کافی شاپ پہ آیا تو موبائل سائلنٹ سے ہٹانے کا خیال آیا۔

"بیس مسڈ کالز' چار میسجز!"

وہ دیکھ کر حیران ہوا اور کچھ فکر مندی سے میسج

کھولا' ابو کا میسیج تھا' شانزہ کے رزلٹ کے متعلق۔۔۔ اسے نمبر دیکھ کر حیرت ہوئی اس نے دوبارہ پورا میسیج پڑھا مگر جب بھی یقین نہ آیا' دو میسیجز میں کال اٹھانے کا کہا گیا تھا اور ایک اور میسیج میں پھر وہی رزلٹ والی بات!

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فون ملایا دوسری گھنٹی پہ ہی فون اٹھالیا گیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام بیٹے' میں بلاتی ہوں شانزہ کو۔'' امی چھوٹتے ہی بولیں۔

''ارے نہیں امی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ کہہ رہا تھا مگر امی نے کون سا کان دھرے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے وہ تو فوراً ہی شانزہ کو آوازیں دینے لگ گئی تھیں۔

''السلام علیکم۔۔۔ کیسا لگا سرپرائز!'' وہ بھی فوراً ہی آ گئی تھی اور چھوٹتے ہی بولی۔

''سرپرائز۔۔۔؟ میں تو ایکچوئلی شاکڈ ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ گیا اور کافی شاپ کے نسبتاً کم چہل پہل والے کونے کی طرف بڑھا۔

''اچھا۔۔۔ اتنی گئی گزری سمجھتے ہیں مجھے!'' اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

''آہ۔۔۔ نہیں گئی گزری تو نہیں ہو۔۔۔ اچھی خاصی ہو۔''

جواباً وہ بری طرح بلش ہوئی۔

''اچھا بتائیں کیا لائیں گے میرے لیے؟''

''میں جلدی آجاؤں گا۔'' وہ اصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میرا جلد ہی واپس لوٹنے کا ارادہ ہے تو شاپنگ کے لیے وقت نہیں نکل سکے گا مگر شانزہ نے اس کے لفظوں کو اپنی پسند اپنی چاہ کا مفہوم پہنایا۔ اتنی اہمیت کی حامل ہے میری یہ چھوٹی سی کامیابی؟؟

کسی لطیف سے گدگدائے سے احساس کے زیر اثر وہ تائید چاہ رہی تھی جب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی بات ٹھیک سے بتا نہیں پایا ہے۔ اسے کوفت ہوئی۔ ایک تو یہ جھلی سی لڑکی۔۔۔ بلاوجہ ہی رومینٹک ہو جاتی ہے۔

''اب تو میں اس سال ٹاپ کرنے کی کوشش کروں گی جب تو آپ دور جائیں گے ہی نہیں' کبھی دور ہوں گے ہی نہیں۔''

گداز سی ہو کر سوچتے ہوئے اس نے جیسے سرگوشی سی کی۔

''شانزہ! میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میری جلد ہی تو واپسی ہے کچھ لینے کچھ خریدنے کا ٹائم بھلا کب ہو گا۔''

وہ سنجیدہ' بے تاثر لہجہ لیے بولا شانزہ کو جیسے کسی نے جھنجھوڑا۔

''اس وقت مصروف ہوں اللہ حافظ۔'' کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔ شانزہ نے بھی بجلی کی سُرعت سے فون کریڈل پہ پٹخا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔ اس نے اب رونا تھا بہت سا۔۔۔ بے حد حساب!

اور شیجی ستا ہوا سا' تھکا ہوا سا کافی شاپ سے نکل رہا تھا۔ ساتھ آئے کولیگز کو وہ بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اسے اب سڑکوں کی خاک چھاننا تھی۔ اسے اب خود سے لڑنا تھا۔

اسے ناخوش کر کے وہ خوش نہیں تھا مگر وہ اسے خوش بھی نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ برسوں سے اس کے دل میں کوئی ہلچل نہ تھی وہ ویران پڑا تھا۔ سالوں سے نہ کوئی اس میں جا سکا نہ ٹھہر سکا۔ اس پہ قفل پڑا تھا اور اب شانزہ اپنی تمام تر خوب صورتی' کم سنی اور معصومیت کے ساتھ اس قفل سے نبرد آزما تھی۔ جانے وہ بخت آور ہوتی یا نہیں' کیونکہ یہ قفل تو کسی بخت آور کے نام کا ہی تھا اور اسے کسی بخت آور کے نام سے ہی کھلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

''بخت آور۔۔۔!'' اس نے پکارا ضرور مگر اس کے لبوں سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ پھولوں کو احتیاط سے اٹھائے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا دروازہ ادھ کھلا ہی تھا۔ باہر کا جو شور تھا۔۔۔ عورتوں کی بچوں کی ڈھول

باجوں کی آوازیں۔۔۔۔ وہ باہر ہی رہ گیا تھا۔ یہاں سکون تھا خاموشی تھی۔

وہ کمرے کے انتہائی بائیں جانب والے کونے میں جائے نماز پہ موجود تھی۔ اس کی جائے نماز ایسے زاویے پہ تھی کہ دروازے سے ذرا بھی دکھائی نہ دیتی مگر اب جہاں شجی کھڑا تھا وہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ بے اختیار ہی شجی کی نگاہ اس تک گئی۔

گہرے سبز رنگ کا نہایت ہلکے کام والا دوپٹہ چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹے ہوئے، اجلے اجلے گداز گداز حنا رچے ہاتھ لیے اور لرزتی نم جھکی پلکوں کے ساتھ وہ التحیات میں بیٹھی تھی۔

شجی کو محسوس ہوا کہ اس کی نظر اس تک جا کر پلٹنا بھول گئی ہے۔ بالکل ہی بھول گئی ہے۔

اس وقت یہ احساس۔۔۔۔ نہایت تباہ کن تھا مگر وہ اپنی تباہی سے بے نیاز اس کو تکے گیا۔

"یہ کتنی موہنی سی ہے نا!" اسے اچانک ادراک ہوا بہت غیر متوقع ادراک۔

"امی! وہ مجھے زہر لگتی ہے۔" بہت پہلے وہ امی کے سامنے کھڑا چلا رہا تھا۔

اس سے کچھ اور پہلے۔۔۔۔ کسی عید کے دن امی اسے گلے لگا رہی تھیں، چوم رہی تھیں اور پھر بولیں۔

"کتنی پیاری ہے نا میری بہو۔۔۔۔ بالکل چاند کا ٹکڑا!"

اور وہ جو تنک سک سے درست، دوستوں کے ساتھ باہر جا کر گھومنے کو تیار کھڑا تھا اچانک بگڑا اور کمرے میں بند ہو گیا۔

اسے بخت آور کا اپنے حوالے سے سننا، پکارا جانا سخت ناپسند تھا۔۔۔۔ زہر لگتا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟" امی اس کے بند کمرے کا دروازہ دھڑدھڑا رہی تھیں۔

"ساری دنیا کو وہ اتنی پیاری لگتی ہے۔ ہم لوگ سے نظر بھر کر دیکھتے نہیں۔ ماشاء اللہ کہتے کہتے نہیں تھکتے۔۔۔۔ تم کبھی اسے ہماری نظر سے دیکھو تو سہی!" امی نے تب اس کی منت کی تھی مگر وہ نہیں مانا تھا اس کی یہی ضد تھی کہ وہ اسے ان سب کی نظر سے کیوں دیکھے۔

اور ضد تو اسے آج بھی وہی تھی۔ وہ بھلا کب اسے ان کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ ایسی نظر سے آج تک بھلا اسے دیکھا ہی کس نے تھا۔ اس کی کھڑی لمبی ناک جسے وہ ہمیشہ اس کے غرور کی نشانی کہتا آیا۔۔۔۔ آج خوب صورتی کی انتہا لگ رہی تھی۔

اس کی سیاہ۔۔۔۔ بے حد سیاہ آنکھیں۔۔۔۔ جن میں ہمیشہ اسے چالاکی نظر آتی اور وہ دانت پیس کر کہا کرتا تھا۔

"ان آنکھوں سے ہی تو یہ سب کو فریب دیتی ہے اپنی مظلومیت کے، اپنی معصومیت کے! مگر میں کسی چکر میں نہیں آنے والا نہ آج نہ آئندہ!" وہ آنکھیں آج اسے بھی فریب دے گئی تھیں اور ایسا دلفریب کہ وہ بچ ہی نہ پایا۔

ہمیشہ اس کی تلاش میں رہنے والی اس کی آنکھیں۔ اس کی ایک نظر پانے کے لیے جتن کرنے والی۔۔۔۔ اس کی بے اعتنائی پہ لاکھوں بار رونے والی وہ سیاہ آنکھیں۔۔۔۔ آج تو چار بھی نہ ہوئیں کہ زیر کر گئیں، آج تو اٹھیں ہی نہیں مگر اس کا دل گھٹنے ٹیک گیا۔

ٹن ان ان۔۔۔۔ کمرے کے سامنے کی دیوار پہ لگی گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔ شجی کی نظریں گھڑی تک گئیں۔ چھ بج گئے تھے۔ اہم ترین چھ۔۔۔۔

"چھ بج کر دس منٹ پہ نکاح ہو گا اور چھ تیس پر کھانا لگ جائے گا۔" کچھ دن پہلے اس نے دادا کو یہ اعلان کرتے سنا تھا اور وہ وقت کے بہت پابند تھے۔ اس نے گھبرا کر ایک نظر اسے، ایک نظر گھڑی کو دیکھا۔ یہ وقت کو کیا ہوا تھا۔ یہ کیسے یوں سرعت سے گزر گیا۔ مہینہ بھر پہلے جب دادا اسے آخری بار دس دنوں کا الٹی میٹم دے رہے تھے۔۔۔۔ وہ ابھی کل کی ہی تو بات لگتی تھی!

وہ بڑا خوش ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اس بار کو خود ہی آخری بار ڈکلیئر کر دیا ہے۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔"

"ایک آخری بار سوچ لو۔"

"آرام سے سکون سے۔۔۔۔ جتنا وقت چاہے لے

کے سوچ لو۔"

جیسے جملے اب اسے مزید سننے کو نہیں ملنے والے تھے۔ اس نے دس گھنٹوں میں دادا کو آخری فیصلہ دے دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہت محبت کرنے والے دادا یقیناً" آہستہ آہستہ سب کچھ بھول جائیں گے' اس سے پھر پیار کرنے لگیں گے۔ ماں باپ تو معاف کر ہی دیتے ہیں۔۔۔ تایا تائی کو تھوڑا وقت لگے گا اور بخت آور کو ذرا زیادہ وقت۔۔۔ مگر خیر میرا کیا قصور؟ میں نے تو کبھی اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ میں نے تو کبھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

اور واقعی اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا' اس نے اسے دیکھا تک نہیں تھا چڑ۔۔۔ بیزاری۔۔۔ غصہ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے ہٹتے تو کچھ دکھائی دیتا نا۔ وہ سولہ سال کا تھا جب بختاور سے منسوب کیا گیا۔ وہ دونوں ہی میٹرک کے اسٹوڈنٹ تھے جب دادا' تایا اور ابا کی ملی بھگت کے نتیجے میں ان کا رشتہ طے پایا۔ یہ سب اس کے لیے نہایت غیر متوقع اور قبل از وقت تھا' اسے پہلی بار سننے میں ہی برا لگا۔ دوست احباب اسے چھیڑتے چھیڑتے مذاق تک اڑانے لگتے۔۔۔ وہ مزید چڑتا۔ وہ دونوں کلاس فیلوز تھے۔ بختاور کی وجہ سے وہ ہر ایک کا بھائی بن کر رہ گیا تھا۔ سونے پہ سہاگہ بختاور نے اس کا نام لینا چھوڑ دیا۔ انہیں' "آپ' ان' وہ۔۔۔ کہہ کر ذکر کرتی یا مخاطب کرتی۔ اس کا غصہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن کے ٹیچر نے جب ساری کلاس کے اسٹوڈنٹس کا وزن کیا تو بختاور (جو ان دنوں بے حد موٹی تھی) اس سے بلا مبالغہ ڈبل وزن کی نکلی۔ پورے اسکول میں مذاق بن کر رہ گیا تھا۔ بڑے' چھوٹے۔۔۔ ہم عمر سب ہی لڑکے اسے چھیڑتے کہ وہ مستقبل میں بیوی سے خوب مار کھایا کرے گا۔ کپڑے بھی دھویا کرے گا۔ برتن بھی صاف کرے گا!

خاندان میں کوئی بھی خوشی غمی ہوتی تو تائی جان ہر وقت اسے ہی پکارتی رہتیں اور کسی نہ کسی سے اس کا تعارف کراتی رہتیں کہ یہ میرا داماد ہے' وہ چھ چھ دن منہ پھلائے رکھتا مگر سب لوگ اسے اس کی جھجک اور شرم پہ محمول کرتے۔

نو عمری کی وہ عمر جب کچھ کر دکھانے کی' اپنا نام بنانے کی لگن انسان میں بہت شدید ہوتی ہے۔۔۔ اس عمر میں اس نے یہ احساس پال لیا کہ اس کی منگنی نے اس کی شناخت ختم کر دی ہے۔ اب وہ ہر جگہ بختاور کا منگیتر کہلایا اور پکارا جاتا تھا۔ اسے نفرت سی ہونے لگی

پری میڈیکل میں آخری دن جب وہ اپنے ٹیچرز کے ساتھ ہلا گلا کر رہے تھے تو اس کے موسٹ فیورٹ ٹیچر بھی موجود تھے وہ انہیں بے حد آئیڈیلائز کرتا تھا اتنا کہ اگر وہ کبھی کوئی کمنٹ کر دیتے تو فوراً" اپنی درستی کرتا۔ کوئی کمپلیمنٹ دیتے تو گھنٹوں اس کو ہی سوچتا رہتا۔ ان کے سامنے باتوں باتوں میں اس کے کسی اسکول کے ساتھی نے اس کی منگنی کا بتایا تو وہ بے ساختہ ہنس دیے اور بولے۔

"ٹیچرز ابھی کنوارے بیٹھے ہیں اور اسٹوڈنٹس منگنیاں شادیاں کر رہے ہیں' لو بھئی بن گئے آپ تو ڈاکٹر!"

ان کا ہلکا سا' مزاح سے بھرپور طنز اس کے دل میں ا جیسے چھید ہی کر گیا۔ وہ وہاں سے فیصلہ کر کے اٹھا تھا کہ اسے بختاور سے شادی ہرگز نہیں کرنی' آج اس کی وجہ سے اس کے فیورٹ ترین ٹیچر اس پہ ہنسے تھے۔۔۔ اور کہیں نہ کہیں یہ بات بھی اس کے دل میں دبک کے بیٹھ گئی کہ یہ رشتہ شاید اس کے پاؤں کی بیڑی بن سکتا ہے۔۔۔ اسٹڈیز پہ فوکس نہیں کرنے دے گا وغیرہ وغیرہ اور ستم ظریفی کہ خود ان کے کالج میں ایک آدھ ایسی مثالیں تھیں کہ اچھے خاصے ہونہار لڑکے جب گرل فرینڈ' منگیتر وغیرہ کے چکروں میں پڑے تو ان کے GP ڈاؤن ہوتے گئے اور وہ میرٹ پہ بھی نہ آسکے۔ اسے کیریئر بنانا تھا' نام بنانا تھا وہ ایسی بے وقوفیوں کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ منڈے کو گرینڈ ٹیسٹ ہو اور سنڈے کو آپ محبوب کی سالگرہ مناتے رہیں۔

خیر۔۔۔ وہ اسے محبوب تھی ہی کب؟ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں نے مل کر اس کے خلاف ایک بڑا محاذ تیار کر لیا تھا۔ اب وہ اس پر نظر تک نہیں ڈالتا تھا۔

حالانکہ سمجھ دار ہوتے ہی اس نے اپنے وزن پہ بہت اچھے سے قابو پالیا تھا اور تائی جان کا بخار بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اب وہ منگنی کے اولین دنوں کی طرح اسے ہر راہ چلتے سے میرا داماد کہہ کر متعارف نہیں کراتی تھیں مگر اس کی بیزاری کا عالم عروج پر پہنچ چکا تھا وہ عید تہواروں پر تائی جان کے دلائے کپڑے تو دیکھتا تک نہیں تھا۔ بختاور کو تائی فائیڈ ہوا وہ سیڑھیوں سے گری اس کی دوست کا انتقال ہوا۔۔۔ مگر کوئی سانحہ کوئی حادثہ شجی کو بختاور سے بات کرنے پہ مجبور نہیں کر سکا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے امی ابو کو انکار کرنے لگا جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ تایا تائی اور دادا کا لحاظ بھی کم ہوتا ہوتا آخر ختم ہو گیا وہ ان کے سامنے بھی برملا رشتہ ختم کرنے کی بات کرنے لگا۔

اس کا ایم بی بی ایس مکمل ہوا تو سب کو شادی کی سوجھی تو تب اس کے قطعی جواب، قطعی رد عمل صاف اور واضح انکار نے گھر میں جیسے صف ماتم بچھا دی۔

اس وقت اس کے ذہن میں صرف اور صرف اسپیشلائزیشن تھی۔ بختاور سے شادی تو اسے ویسے ہی نہیں کرنی تھی مگر اس وقت، ان دنوں تو اسے کسی سے بھی شادی نہ کرنی تھی۔ اسے والدین کی تمام تر جمع پونجی چاہیے تھی اور جس حساب سے گھر میں شادی کی پلاننگ ہوتی تھی اس طرح تو امی محض بہو کے گہنے بری اور ولیمہ بھگتانے تک سب کچھ لٹا دیتیں۔ ایسا وہ ہرگز ہرگز نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کا انکار ان دنوں پہلے سے کہیں بڑھ کر اٹل اور حتمی نکلا۔ تایا کی منت سماجت امی کی حد درجہ کی جذباتی بلیک میلنگ اور دادا کی شدید ڈانٹ پھٹکار کے باوجود بھی آخر کار رشتہ ٹوٹ ہی گیا اور اب۔۔۔ اس وقت وہ گھڑی کی حرکت کرتی سوئیوں سے بے طرح ڈرا۔۔۔ دس سال وہ اس سے منسوب رہی مگر اب مزید نہیں۔ اب اس کا نصیب کسی اور سے جڑنے جا رہا تھا۔ وہ پڑھی لکھی خوب صورت تھی۔ صاحب حیثیت والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اس کا تو حقیقتاً" پلک جھپکنے میں رشتہ طے پا گیا تھا۔

دس سال وہ شجاع اللہ کی منگیتر رہی مگر اس نے اس پہ نگاہ غلط تک نہ ڈالی تھی اور آج جب اس پہ نگاہ ڈالنا غلط تھا تو اس کی نگاہ ہٹتی ہی نہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کسی اور کی منکوحہ ہونے والی تھی یہ آخری دس منٹ تھے اور وہ محبت۔۔۔ جو اسے دس سالوں میں نہ ہوئی تھی ان دس منٹ میں ہو گئی فوراً" ہی ہو گئی، شدید ترین ہو گئی! شجی کو اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہوا۔

اس نے آمین کہہ کر چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

ایں سے وہ اتنی معصوم، اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ شجی کو لگا کہ جہان بھر میں اس جیسا کوئی اور نہیں ہوگا۔ اس نے جائے نماز کو سلیقے سے تہ کر کے اس کی مخصوص جگہ پہ رکھا پھر ڈریسنگ ٹیبل کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا، ہونٹوں پہ لالی جمائی۔ اپنے کمرے کے بیچ و بیچ کھڑے شخص سے بالکل بے نیاز۔۔۔ وہ سنگھار کر رہی تھی۔

شجی کے اندر کوئی لاوا سا ابلنے لگا اسے لگا وہ ابھی کہ ابھی گر جائے گا۔

آج۔۔۔ برسوں بعد بختاور کی دعائیں قبول ہوئی تھیں۔ اسے محبت ہو گئی تھی اور بختاور سے ہی ہوئی تھی مگر غلط وقت پہ غلط جگہ پہ ہوئی تھی بہت ہی دیر سے ہوئی تھی۔

اس نے کوئی بہت سا میک اپ تو استعمال نہ کیا تھا مگر پھر بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ وہ کوئی بہت سے رنگوں سے تو نہ کھیلی تھی مگر باکمال لگ رہی تھی۔ چبھتے ہوئے سبز رنگ کے کامدار جوڑے میں بھی وہ حسین لگ رہی تھی۔ پہلی بار اسے لگا کہ وہ رنگوں کی نرمی کی محتاج نہ تھی اس گہرے، تپش دیتے رنگ میں بھی وہ پھول سی کومل دکھتی تھی۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل نہیں پا رہا تھا، پلکیں جھپک نہیں پا رہا تھا اور وقت کو روک نہیں پا رہا تھا۔ اسے اپنا آپ بے بسی کی انتہا پہ محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا وہ ایک سیکنڈ سے بھی پہلے بھاگ جائے مگر اس کے قدم ہل نہ سکے۔ اسے تایا تائی کی پریشانی دادا کا دکھ یاد آیا اسے امی کی ملامتی نظریں خود

پہ گڑی محسوس ہوئیں۔ کسی نے بد دعا نہ دی تھی' والدین بھلا کب دیا کرتے ہیں بد دعا مگران کے دل دکھے تھے' قصوروار تو وہ ان کا تھا ہی ناں! اسے سزا مل رہی تھی۔۔۔ ممکنہ سخت ترین سزا!

وہ دو انگلیوں کی مدد سے چہرے کے گرد لپٹے سبز آنچل کو ڈھیلا کرتے اس کے قریب سے گزری وہ کچھ کہہ نہ پایا مگر سہہ بھی نہ پایا۔ برسوں سے اس کے اندر منجمد ہوتی سرد مہری ٹوٹ کر اس کی آنکھ سے گری گال پہ لڑھکی اور کالر میں جاکر کھو گئی۔

بختاور نے صوفے پہ بیٹھ کر پاؤں ٹیبل کے کنارے پہ ٹکائے اور ہاتھ میں پکڑی جار سے کچھ نکال کر ہاتھوں اور پاؤں پہ لگانے لگی۔ شجی یوں کھویا ہوا تھا جیسے کوئی نہایت دل موہ لینے والا نظارہ سامنے ہو۔

بختاور نے جار میز پہ رکھا تو نظر قریب ہی پڑی نیل پالش تک گئی۔ ایک لمحے کو جیسے وہ سوچ میں پڑ گئی پھر نظر اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔ شجی کو واضح محسوس ہوا کہ جیسے وہ نیل پالش لگانا نہیں چاہتی تھی مگر وقت بتانے کو۔۔۔

وہ تو جیسے زخمی ہی ہو گیا۔ جس وقت کے ٹھہر جانے کے لیے وہ سراپا دعا بنا ہوا تھا وہ اسے بتانے کے بہانے کر رہی تھی۔

یہ انمول ترین ساعتیں۔۔۔ اس کے لیے بے معنی تھیں۔ ان کا گزر جانا' ٹھہر جانا یا موجود ہونا۔ سب ایک برابر تھا اس کے لیے۔

وہ پتھر ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے پہلے ہاتھوں پھر پاؤں کو نیل پالش سے سجایا۔

اس کا جی چاہا وہ اس کا سجنا سنورنا غارت کر دے اس پہ مٹی' کیچڑ اچھالے۔۔۔ یا اسے کسی پردے میں چھپا لے۔

نیل پالش رکھ کر وہ سیدھی ہوئی تو پہلی بار شجی سے آنکھیں دو چار ہوئیں۔ شجی کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ وہ اس کے چائے کھانے سے لے کر بخار سر درد تک۔۔۔ ہر روٹین سے واقف تھی اسے لگا وہ دیکھ لے گی' جان جائے گی مگر اب کی بار۔۔۔ اس آخری بار۔۔۔ نہ وہ دیکھ سکی نہ جان پائی ایک پل سے بھی پہلے۔۔۔ بڑے

غیر محسوس انداز میں اس کی نظر کا زاویہ بدل گیا البتہ اس نے اشارے سے پھول ضرور مانگے۔

اور اس سارے عرصے میں شجی کو پہلی با[ر] احساس ہوا کہ وہ ان پھولوں کو احتیاط سے اٹھائے ہوئے تو نہیں ہے۔ وہ تو ان کو محبت سے اٹھائے ہوئے ہے۔

وہ باری باری سب زیور پہنتی چلی گئی
بالیاں' ٹیکا' ہار' بگرے

وہ اپنی آنکھوں سے سب نکال باہر کرتا گیا۔
چڑ۔۔۔ بیزاری۔۔۔ غصہ۔۔۔
نظروں پہ بندھی پٹی۔۔۔ جو اس کی قسمت کی گھنا[ؤنی] تھی۔

کاریڈور سے قدموں کی چاپ سنائی دی اس ک[ی] آنکھوں کے آگے سائے سے ناچے۔۔۔ کچھ منظر بھ[ی] جگمگائے۔ اس کے مزید کچھ بھی سوچنے سے قبل بختا[ور] نے اسے پکارا۔

"شجی!"

وہ تڑپ کر رہ گیا۔ برسوں بعد آج وہ اس کا نام [لے] رہی تھی برسوں بعد آج وہ برسوں کے بندھن کو تو[ڑ] رہی تھی۔ اس کی وہ بے وجہ والی خوب صورت شہ[...] آج کسی بدصورت حقیقت کی وجہ سے ختم ہو چ[کی] تھی۔ وہ باقی سب کی طرح بالکل عام سے انداز می[ں] اسے بلا رہی تھی۔

"تھینک یو!" اس نے مزید کہا تھا۔ شجی کا د[ل] چاہا وہ ابھی کے ابھی زمین میں سما جائے۔ وہ جس [نے] برسوں کانٹے چبھوئے جانے پہ اف نہ کی تھی' آ[ج] پھول لانے پہ اس کی ممنون تھی۔

اور یہ آخری دس سیکنڈ تھے جب شجی [نے] محسوس کیا کہ بختاور کے پاس اب اس کے لیے چاہ[ت] ذرہ بھر بھی نہیں رہی' مروّت البتہ باقی ہے!

✡ ✡ ✡

وہ لمبے لمبے نیل پالش لگے ناخنوں کے ساتھ ٹیبل

ابھار رہی تھی۔ پیزاہٹ میں حسب معمول اے سی کی خنکی، موسیقی کی مدھر لے اور اشتہا انگیز خوشبو میں پھیلاتی پھر رہی تھیں۔ وہ ہر ایک شے سے بے نیاز اس کی نیل پالش کو دیکھتے ہوئے برسوں پہلے کی کسی نیل پالش میں کھویا ہوا تھا۔ امی ابو نے اس کی خوب طبیعت صاف کی، اسے معذرت بھی کرنا پڑی۔ شاپنگ بھی کرانی پڑی اور اب یہ پیزا بھی اسی تلافی کا آخری مرحلہ تھا۔

"ہر وقت ٹی وی دیکھنا تو میں نے شادی کے بعد شروع کیا۔ امی مجھے کام جو کوئی نہیں کرنے دیتیں۔ تو اور کیسے وقت بتاؤں.... ہاسٹل میں تو ہم سب فرینڈز لڑ بوری پوری رات بھی پڑھا کرتی تھیں۔"

وہ اپنے تئیں اسے بڑی اہم معلومات فراہم کر رہی تھی.... ایک ایسی بات کہ جس میں وہ دلچسپی لے سکتا تھا۔

اسے متوجہ کرنے کے لیے اس نے اسے پکارا اور ٹیبل پہ دھرے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"ہاں.... ہاں کیا بات ہے؟" وہ بری طرح چونکا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، خالی خالی نظروں سے اسے تکتا وہ بے حد ڈسٹرب لگا تھا اسے شکوہ کرنا مناسب نہ لگا۔

"کچھ نہیں.... آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں گھر چلیں؟"

اس کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ابھی کے ابھی اٹھ کر بھاگنے والا ہو۔

"شجی! ہم نے تو ابھی کچھ کھایا بھی نہیں۔" وہ دل گرفتی سے بولی جواباً "شجی پہلے سے بھی بڑھ کر عجلت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کا موڈ بھی غارت ہوا۔ بڑی مشکل سے چند لقمے لے کر وہ اٹھ گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں ان دونوں سے زیادہ جگہ گاڑی میں خاموشی نے لی ہوئی تھی۔



وہ بڑے انہماک سے ٹی وی اسکرین کو تکے جا رہی تھی۔ ہاتھ میں پاپ کارن سے بھرا بڑا سا پیالہ تھا جسے وہ گاہے بگاہے شجی کے سامنے بھی کر دیتی۔ اسے ان سب سے تھوڑی سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔

عمروں کا تفاوت ہی اتنا تھا کہ ان کی دلچسپیاں، شوق، مشاغل سب ہی مختلف تھے۔ بہرحال شجی کوشش کرنے لگا تھا کہ جب بھی فارغ وقت ملے، وہ اسے کمپنی ضرور دیا کرے۔ لہٰذا کبھی باہر لے جاتا کبھی ساتھ میں ٹی وی دیکھتا یا کبھی اکٹھے واک کر لیتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سب کے دوران بھی وہ اکثر گم صم ہو جاتا تھا۔

اس وقت بھی وہ بہت ہی بیزاری سے یہ سوپ سیریل دیکھ رہا تھا جس میں اس وقت کوئی لڑکا اپنی کلائی پہ کسی کا نام کندہ کر رہا تھا۔ وقفہ ہوا تو اس نے شکر ادا کیا۔ حالانکہ بریک میں بھی وہ کچھ خاص سکون کا سانس نہ لے سکتا تھا کہ شانزہ نہ صرف خود تبصرے کرتی بلکہ اس کی بھی رائے مانگا کرتی اور اکثر ناراض بھی ہوتی کہ وہ ایک دم ہی سب کچھ کیسے بھول گیا۔ حالانکہ وہ بھولتا نہیں تھا۔ بس اس کا دھیان ڈرامے کی طرف نہیں ہوتا تھا مگر بہرحال شانزہ سے بات چیت ان گھسے پٹے سین سے تو بہتر ہی ہوتی تھی۔

"کیا واقعی لوگ محبت میں ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کیا کرتے ہیں؟" عادت کے مطابق وہ اس سے رائے لے رہی تھی۔

"نہیں تو، یہ تو بس انہوں نے ڈراما چلانا ہوتا ہے تو ایسے سین بناتے ہیں۔"

"اچھا تو جن لوگوں کو سچ مچ میں محبت ہو جاتی ہے وہ کیا کرتے ہیں؟"

"وہ.... آئی تھنک بزی ہو جاتے ہیں۔ خود کو مصروف کر لیتے ہیں۔"

"جیسے آپ نے کر لیا ہے.... خود کو بہت مصروف۔" شانزہ کے تبصرے پہ اس کا پاپ کارن کے پیالے میں حرکت کرتا ہاتھ ذرا سی دیر کے لیے ساکت ہوا۔ خاموشی ان کے بیچ آ بیٹھی۔

"شجی....!" شانزہ نے اسے پکارا۔ وہ اپنے اور

اس کے بیچ خاموشی کو کم سے کم بیٹھنے دیتی تھی۔

"مجھے بھی محبت ہو گئی ہے۔۔۔" اس نے اس کے ہاتھ تھامے۔ "میں بھی مصروف ہونا چاہتی ہوں۔۔۔ فیملی میں!"

حیا کی لالی سے سرخ ہوتی، آنکھوں میں ڈھیروں چمکتے ستارے لیے، لرزتے ہاتھوں کے ساتھ۔۔۔ بااعتماد رہنے کی کوشش میں بھی پزل ہوتے ہوئے وہ اس سے اپنا حق مانگ رہی تھی، بڑی معصومیت سے اس پہ حق جتا رہی تھی بڑی خوب صورتی سے اسے اس کے فرائض یاد دلا رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی کا منکر تو وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

"وہ اسے کمزور کر دے گی۔" یہ یقین اسے کیا اس کے ماں باپ کو بھی تھا جب ہی تو وہ اس گھر میں لائی گئی تھی۔



اگلے روز ایک سہانی صبح طلوع ہوئی۔ بہت سے ملگجے دھندلے دنوں کے بعد ایک روشن دن طلوع ہوا تھا۔ نانی نے خاص اہتمام کیا اور صبح سویرے ہی کرسی دھوپ میں ڈال کر بیٹھ گئیں کہ آج ان کا دن بھر دھوپ انجوائے کرنے کا ارادہ تھا۔ عطیہ بانو نے منع بھی کیا کہ ابھی تو بہت سویرے کا وقت ہے۔ دھوپ کے باوجود ٹھنڈ ہو گی مگر بقول ان کے وہ دھوپ کے لیے اداس تھیں۔ انور علی واک کر کے لوٹے تو وہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ عطیہ بانو ان کی چائے دینے آئی تو ان لوگوں نے انہیں بھی گپ شپ میں شامل کر لیا۔ سب کا موڈ خوشگوار تھا۔ عطیہ چائے کے برتن سمیٹ رہی تھیں کہ شانزہ لاؤنج کے دروازے سے بھاگتی ہوئی آئی۔

"شجی کہاں ہیں؟" اس نے بنا کسی کو مخاطب کیے پوچھا۔ "وہ تو چلا گیا۔" عطیہ برتنوں کی ٹرے اٹھاتے ہوئے اٹھیں۔

"کہاں؟ کہاں چلے گئے وہ؟ کب گئے؟"

"وہ تو بہت سویرے نکل گیا تھا، تمہیں نہیں پتا چلا اس کے جانے کا؟" وہ حیران ہوئیں۔

"مجھے نہیں پتا چلا مگر آپ کو تو چلا تھا ناں آپ نے انہیں کیوں جانے دیا؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"خیریت تو ہے نا بیٹے؟ کیا کوئی بات ہوئی ہے۔" نا فکرمندی سے بولیں۔ انور علی اور نانی بھی پریشان ہو گئے تھے۔

"آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں؟ آپ انہیں کہتیں تو کہ مت جاؤ۔" وہ تو جیسے رو ہی دی تھی۔

"بیٹا اسے کام تھا ناں میں کیوں روکتی۔"

"کوئی کام نہیں تھا۔۔۔ کوئی بھی کام نہیں تھا انہیں

لرزتی۔۔۔ نم آواز کے ساتھ اس نے ان کی بات کاٹی اور جیسے بھاگتی ہوئی آئی تھی ویسے ہی واپس مڑ گ بالوں سے نکلتے پانی کے قطرے اس کی کمر کو بھگو ر تھے اور آنکھوں سے نکلتے گالوں کو!



شام تک وہ کمرہ بند کیے پڑی رہی۔ گھر میں ایک سوگواری کی سی کیفیت تھی۔ گھر کے سب ہی لوگ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے نہ انہیں کچھ دکھائی دیا تھا نہ سنائی۔ لہٰذا کوئی رائے قائم کرنے سے بھی قاصر تھے۔ شام کو وہ نکلی تو نیا جوڑا پہنے ہوئے خاصی تیار سی تھی۔ سب کو خوش گوار حیرت ہوئی مگر چپ تھی نہ کسی کو مخاطب کیا نہ بات کی۔ خاموشی سے اپنے لیے چکن زنگر بنایا اور خوب دلجمعی سے کھایا۔ سب حیران تھے مگر کوئی بھی کرید نہیں رہا تھا مبادا کوئی دبی ہوئی چنگاری پھر سے آگ نہ بھڑکا دے۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں چلی گئی تو نانی نے عطیہ سے کہا۔

"شجی کو فون ملاؤ۔"

عطیہ نے تھوڑی سی پس و پیش کی کہ انہیں دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں ک

خالہ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے مگر کال ملانے سے واضح انکار بھی نہ کر سکی تھیں۔ دل میں خیر کی دعائیں مانگتے انہوں نے فون ملا کر نانی کو دیا۔

"وعلیکم اسلام بیٹے کیسے ہو؟"

یقیناً" اس نے ہیلو کے بجائے السلام علیکم کہہ کر فون اٹھایا تھا عطیہ نے اندازہ لگایا۔

"ٹھیک سے پہنچ گئے ہو نا بیٹا؟"

"جی نانی الحمد اللہ!" عطیہ نے خوب کان لگائے تو سری جانب کی آواز سنائی دی تھی۔

"کھانا وانا کھا چکے ہو بیٹا؟"

"جی بالکل ابھی کھایا۔۔۔ اور آپ لوگ بھی کھا چکے ہیں نا؟ میں نے تصویریں دیکھی ہیں!"

"کیا مطلب بیٹے؟" وہ حیران ہوئیں "کیسی تصویریں؟"

"شانزہ نے مجھے سینڈ کی تھیں تصویریں، زنگر چکن بنایا ہے نا اس نے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ نانی کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر وہ خوش بے حد ہوئیں۔

"شانزہ سے بات ہوئی ہے بیٹا تمہاری؟ کب ہوئی؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے تصویریں بھیجی ہیں!"

نانی کی تسلی ہوگئی تھی لہٰذا انہوں نے بات کو مزید طول نہ دیا۔ شجاع اللہ نے فون بند کر کے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ وہ بھلا کب مصروف تھا؟ شانزہ ٹھیک ہی پہچانی تھی۔ اسے کوئی کام نہیں تھا وہ تو بس بھاگ گیا تھا فرار ہوا تھا۔ اسے اپنا آپ دوغلا محسوس ہو رہا تھا، جھوٹا لگ رہا تھا۔ اسے خود پہ بے حد غصہ تھا۔ اسے علم تھا وہ خوش ہوگی مگر وہ خود خوش نہیں تھا۔ کمزور لمحوں کی زد میں آجانے سے وہ اس قدر ناخوش تھا کہ بھاگ ہی کھڑا ہوا۔

"آج کل کے بچے بھی ناں۔۔۔ پریشان کر دیتے ہیں اور بات کوئی ہوتی نہیں۔" نانی فون عطیہ کو واپس تھماتے ہوئی بڑبڑائیں۔ عطیہ نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ وہ رابطے میں تھے یعنی ان کے درمیان کوئی ناراضی نہیں تھی اگر تھی بھی تو ختم ہو چکی تھی دونوں کی ماؤں نے یہی سوچا۔

ادھر شانزہ بند کمرے میں بیڈ سے ٹیک لگائے موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ سامنے شجی کی تصویر تھی۔

"آپ اس دنیا کے ظالم ترین شخص ہیں۔ لیکن مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" دل جیسے اس پہ ہنسا۔

"آئی ڈیم کیئر۔۔۔" اس نے اب کی بار پہلے سے زیادہ سختی سے جھوٹ بولا۔

"آئی رئیلی ڈیم کیئر۔۔۔" وہ جیسے خود سے لڑ پڑی تھی۔ دل پھر بھی ہنس رہا تھا۔

وہ ذرا سا کھسک کر بیڈ پہ نیم دراز ہوئی اور منہ تکیے میں چھپا لیا۔ محض شجی کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ اس نے نیا جوڑا پہنا، دل لگا کر کوکنگ کی، پیٹ بھر کر کھایا اور ہر لمحے کی سیلفی لے کر اسے بھیجی مگر پھر بھی دل کو ٹھنڈک نہ محسوس ہوئی، ابھی بھی وہ پہلے سا جل رہی تھی، کڑھ رہی تھی۔

اسے گھر سے نکلے ہوئے مہینہ بھر سے زائد ہو گیا تو جیسے اچانک وہ رخت سفر باندھ کر نکلا تھا ایسے ہی واپس بھی آ گیا۔ وہ اس کی گھر والی تھی۔۔۔ اس سے بھاگ تو وہ نہیں سکتا تھا۔ اس سے کچھ دیر چھپ ضرور سکتا تھا۔ نظروں سے اوجھل ضرور ہو سکتا تھا اور یہ تدبیر کچھ کچھ کارگر بھی ہوئی تھی۔ بات کچھ پرانی ہو گئی تھی لہٰذا پہلے سا اثر نہیں رہا تھا۔ البتہ شانزہ کا رویہ اس کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ وہ اس سے نہایت کم بات چیت کر رہی تھی۔ محض ضرورت پڑنے پہ بات کرتی۔ اسے عجیب سی کوفت ہونے لگی۔ اس کے اس رویے کی وجوہات جاننے کے لیے شجی نے اس کی عادات وغیرہ کا بغور مشاہدہ شروع کیا اور تب اسے ایک انکشاف ہوا۔ وہ جانا مانا ڈاکٹر تھا، اس کے اندر ہوتی تبدیلی اسے فوراً" ہی محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا سا گیا اس

کے سونے جاگنے' کھانے پینے کی ڈسٹرب ہوئی روٹین اتر تا چڑھتا بی پی شجی کو کئی سوچوں میں غوطہ زن کر گیا وہ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔



وہ کمبل میں گھسی لیپ ٹاپ گود میں رکھے ڈراما ڈاؤن لوڈ کر رہی تھی۔ یہ کام اس نے نیانیا ہی سیکھا تھا۔ لہٰذا آج کل اسی میں لگی رہتی۔ شجی بظاہر کسی مریض کا کیس اسٹڈی کرنے بیٹھا تھا مگر اس کا سارا دھیان اس میں ہی تھا۔ اس نے نوٹ کیا وہ اچھے موڈ میں ہے کچھ سوچتے ہوئے۔ وہ اپنی فائل ٹیبل پر چھوڑ کر کچن میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں کافی کے مگ تھے۔

"کافی!" وہ اس کے کہنے پہ چونکی۔ حسب معمول وہ ڈرامے میں بری طرح گم تھی۔ اسے اچانک پاس پا کر حیران ہوئی اور کافی پہ تو بے حد حیرانی ہوئی۔

"میرے لیے؟" وہ مگ تھام چکی تب بھی پر یقین نہ تھی۔

"جی جناب... کوئی شک؟" وہ خوش دلی سے کہتا اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ سمٹ کر اس کے لیے مزید جگہ بنائی وہ مزید ریلیکس ہو کر بیٹھا اور کچھ کمبل بھی اپنے اوپر ڈال لیا۔ شانزہ کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی۔ اس کی قربت اس پہ عجیب ساسحر پھونک رہی تھی۔ مہینہ بھر سے بھی زائد عرصے سے چڑھا بے پروائی اور ڈیم کیئرِ والا خول کچھ ہی ساعتوں میں اتر گیا۔ نہ کوئی بات ہوئی تھی نہ آنکھیں' دوچار ہوئیں مگر محبت اس کے اردگرد آگے پیچھے آ کر ناچنے لگی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ اتنی کہ ذرا سی توجہ ملنے پہ بھی پھولے نہ سماتی۔ پچھلا سب کچھ بھول جاتی اور نئے خواب دیکھنے لگتی۔ نہ صرف اس نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی بلکہ ڈراما بھی دلچسپی سے دیکھا۔ کمنٹس بھی پاس کیے۔ بس اتنے میں ہی شانزہ کا دل ہواؤں میں اڑنے لگا۔

"کل کہیں باہر چلیں؟" اسے اچھے موڈ میں دیکھ کر شانزہ نے دیر نہ کی' اس کے ساتھ باہر جانا' اس کے ساتھ باہر کھانا کھانا اس کے لیے بہت بڑی تفریح تھی۔

"کل تو نہیں... کل میں تھوڑا بزی ہوں' آپریشن ڈے ہے نا!" وہ معذرت خواہانہ سا بولا۔

"پرسوں چلے چلیں گے؟" اس نے فوراً" نئی تجویز دی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے' میں کپ رکھ کر آتا ہوں۔" اسے رضامندی دے کر وہ کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ شانزہ کا دل چاہا وہ نہ جائے۔ مڑ آئے پھر سے اس کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ وہ بڑی حسرت سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی کہ وہ مڑا۔

"ذرا جلدی تیار ہو جانا !" وہ مڑا بھی تھا۔ اس سے بات بھی کر رہا تھا یعنی اس کی دعائیں بیک وقت قبول ہوئی تھیں۔ وہ بے پناہ خوش ہوئی۔ شجی مزید بولا۔

"تمہارا چیک اپ کروالیں گے پہلے... جاتے ہوئے ہی... ٹھیک ہے نا؟"

"چیک اپ؟" وہ جو محبت کے زیر اثر تھی ایک دم گلال ہوئی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" کہتے ہوئے اس کی آنکھیں حیا کے بار سے جھک گئی تھیں۔

"مجھے... کوئی جلدی نہیں ہے!" اس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور دانت پیس کر بولا تھا۔ شانزہ اپنے غلط اندازے پر ششدر سی رہ گئی۔

"اور سنو..." اس نے انگلی اٹھا کر اسے مخاطب کیا۔

"تمہیں بھی جلدی نہیں ہونی چاہیے۔ سمجھیں"

کیسی کاٹ تھی اس کے لہجے میں کہ وہ حیران ہی رہ گئی۔ وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ اندھی سی پاگل سی... کچھ لمحے پہلے تک ناچنے والی محبت اب کمرے میں سہمی کھڑی تھی۔



ایک بے حد مصروف اور تھکا دینے والا آپریشن

اے بھگتا کروہ تھکا تھکا سا گھر پہنچا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا مگر جانے کیوں اسے گھر میں کسی ہلچل کسی چہل پہل کا احساس ہوا مگر وہ اس احساس کو جھٹکتا کچن میں آگیا۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس کی نظر کاؤنٹر ٹاپ پہ رکھی مٹھائی کی ٹوکری پہ پڑی۔

"شاید کوئی آیا ہو۔" اس نے لاپروائی سے سوچا اور بیٹھ کر پانی پینے لگا۔

"کون آیا ہو گا؟" دفعتاً" اس کا ذہن بڑی غلط جانب بھٹکا۔

عنبھتے زرد رنگ کی شلوار قمیص کے ساتھ گہرے سبز رنگ کا دوپٹہ اوڑھے کوئی دلہن اچانک اسے اپنے سامنے چلتی پھرتی سی محسوس ہوئی مگر وہ مٹھائی ہی کیوں لائے گی! اس نے خود کو دکھ سے چھڑانے کی سعی کی اور پانی کی بوتل فریج میں واپس رکھ کر مٹھائی کی ٹوکری تک آیا۔ جونہی گلاب جامن کا پہلا نصف حصہ اس نے منہ میں رکھا اسے ایک اور خیال آیا۔ بقیہ آدھا گلاب جامن ٹوکری میں پھینک کر وہ تیزی سے کچن سے نکلا۔

اسی سمے انور علی صاحب کچن کے ساتھ والے کمرے سے نکل رہے تھے۔

"آگئے بیٹا تم؟ دیکھو آج گاڑی کی آواز کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔" وہ کہہ تو اس سے یہ سب رہے تھے مگر ان کا انداز' ان کا لب و لہجہ..... اسے لگا وہ کہہ رہے ہوں "میں بہت خوش ہوں میں بہت خوش ہوں میں بہت خوش ہوں۔" وہ جواباً" کچھ بھی نہ کہہ پایا انور علی اپنی خوشی میں مگن تھے کہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ محسوس نہ کر سکے۔

"یہاں..... اس کمرے میں آجاؤ..... سب ادھر ہی ہیں۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ یہ امی اور ابو کا کمرہ تھا۔ اسے کمرے کی تبدیل ہوئی سیٹنگ فوراً" محسوس ہوئی۔ یہاں اب ان کے کمرے کا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔

نانی اور شانزہ ڈرائی فروٹس کی پلیٹ سامنے رکھے کمبل اوڑھے بیٹھی تھیں۔ عطیہ بیڈ کی پائنتی کی طرف تھیں اسے دیکھتے ہی والہانہ پن سے اٹھیں اس کا ماتھا چوما اور زور سے سینے سے لگالیا۔

"میرے بیٹے کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے' اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی امان میں رکھے میرے چاند!"

وہ فرط جذبات میں کچھ گلوگیر سی ہو گئیں۔ انہیں خود سے الگ کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اور آنکھیں تو ایک طرف ان کا پورا وجود خوشی اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ صحیح معنوں میں دمک رہی تھیں۔ وہ آنکھوں کے تفکر کو زبردستی کی ہنسی میں چھپاتا بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا۔ "کیسی ہو؟"

اس نے اپنی طرف سے خوشی اور ایکسائٹمنٹ کا اظہار یوں اس کا حال پوچھ کر کیا' کوئی بات نہ کرتا تو ان سب کا مجرم ہو جاتا اور فی الحال اسے یہی بات سوجھی تھی۔

"ٹھیک ٹھاک ماشاء اللہ..... تم اس کی فکر نہ کرو ہم سب ہیں ناں!" اس کے بجائے نانی کی طرف سے جواب آیا۔ وہ بھی کوئی کم خوش نہ تھیں۔

وہ جواباً" صرف مسکرایا پھر اسے بروقت کچھ یاد آیا تو وہ بولا۔

"امی پلیز کھانا گرم کر دیں۔ دن بھر کچھ کھا نہیں سکا۔ بڑی مصروفیت رہی۔"

"ہاں میں ابھی گرم کرتی ہوں۔ تم فریش ہو لو۔"

وہ فوراً" اٹھی تھیں۔ شجی بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔ شانزہ کا منہ پھول گیا۔ آٹھ ماہ میں اتنا وہ سمجھ گئی تھی کہ کہاں کن باتوں سے وہ بڑی چالاکی سے کترا جاتا تھا کہاں گریزاں ہوتا۔

ادھر شجی کو از سر نو خود پہ تاؤ آیا۔ اسے ڈاکٹرز سرکل میں شرمندگی اٹھانے کا خوف تھا کہ سب کہیں گے کہ کیسا شوقین مزاج نکلا کہ اپنے سے نہایت کم عمر والی لڑکی بیاہ لایا۔ اب اس کی فکریں دوچند ہو گئیں کہ سب باتیں بنائیں گے کہ کمسنی کی پریگننسی میں ہونے والی تمامتر پیچیدگیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی شریک حیات کا کوئی خیال نہ کیا اور سب سے بڑی بات کہ جس محبت کے الاؤ میں وہ سولہ

سال سے جھلس رہا تھا۔ وہ اسے چین نہ لینے دے رہی تھی۔ وہ اسے جھوٹا دوغلا اور دھوکے باز کہہ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ رو دے۔ کیسے دس سال وہ خوامخواہ کسی سے نفرت کرتا رہا تھا اور پھر اچانک یہ نفرت۔ ریت کے ڈھیر کی طرح ڈھے گئی اور اسے بلاوجہ ہی کسی سے محبت ہو گئی۔

اور اب ضمیر اس سے سوال کر رہا تھا کہ پچھلے سولہ سالوں سے اس نے جس کو محبت سمجھ کر نبھایا۔ کیا واقعی وہ محبت ہی تھی؟ یا وہ ایسے ہی اتنے سالوں دل کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا' نارسائی کی آگ میں جلتا رہا۔ شانزہ کی کمسنی بھی پیش نظر تھی اور خود یہ کسی کو منتے ہوئے بھی وہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان تمام الجھنوں کے باعث آج کی خبر اسے خوش نہ کر پائی بلکہ وہ مزید الجھ گیا تھا۔

امی ابو کے چہروں پہ جو خوشی اس نے آج دیکھی وہ گئے برسوں میں کبھی نہ دیکھی تھی مگر پھر بھی وہ مطمئن نہ ہو پایا۔ اسے اپنا آپ بناوٹی لگ رہا تھا۔ شانزہ کو بیاہ کے لاتے وقت اگرچہ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اس یتیم کمسن بچی کا حتی المقدور خیال رکھے گا۔ اس کے حقوق کی ادائیگی میں پس و پیش نہیں کرے گا مگر پھر بھی بنا محبت کے قائم ہوا یہ تعلق اسے اس کے ضمیر کے آگے سر نہ اٹھانے دے رہا تھا۔ اس کے خیال میں شریک حیات کے ساتھ کسی بھی مزید تعلق سے پہلے محبت کا تعلق استوار کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر اسے ابھی تک اپنی شریک حیات سے محبت نہ ہو سکی تھی تو پھر وہ شریک حیات کا بھی مجرم تھا اور سابقہ محبت کا بھی!



جب سے شانزہ امید سے ہوئی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اچانک بیک گراؤنڈ میں چلا گیا ہے۔ اب چاہے وہ کتنا ہی لیٹ کیوں نہ ہو جاتا کسی کو فکر ہی نہ ہوتی۔ علی الصبح سے لے کر رات گئے تک شانزہ کے لاڈ اٹھائے جاتے تھے۔ اس کا چٹ پٹا کھانے کو بہت جی چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ کبھی خود اور کبھی امی اس کے لیے کچھ نیا کچھ تیکھا بنا رہی ہوتیں۔ کام کاج اب وہ برائے نام ہی کرتی۔ البتہ امی اس کو واک کی پابندی ضرور کرواتیں۔ ہر دوسرے ہفتے چیک اپ کے لیے لے جاتیں۔ شجی ابھی تک اسے اپنے ساتھ اپنے اسپتال نہیں لے کر گیا تھا۔ اسے خود پہ سوال اٹھائے جانے کا خدشہ تھا۔ البتہ وہ پہلے سے بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ دھیان رکھتا کہ اس کی خوراک میں الابلا کے علاوہ دودھ جوسز اور فروٹس بھی شامل رہیں۔ اس کا بی پی وغیرہ بھی چیک کرتا رہتا۔

کالج جانا وہ ترک کر چکی تھی۔ شجی کو خود جب وقت ملتا وہ اسے پڑھا بھی دیتا۔ گاہے بگاہے اس کے لیے کوئی نہ کوئی سرپرائز گفٹ بھی لے آتا۔ تاکہ وہ خوش ہو۔ وہ خاص خیال رکھتا کہ شانزہ ہر وقت پرسکون اور ٹینشن فری رہے۔ وہ ان دنوں اسے اگنور کرنے یا ہرٹ کرنے سے آخری حد تک گریز کر رہا تھا۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی پیچیدگی نہ ہو جائے۔ اور اگر وہ کسی قسم کی کوئی ٹینشن پال لیتی تو پھر پیچیدگی کے چانسز مزید بڑھ جاتے۔ اور یہ اسے گوارا نہ تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی۔ اس کی زندگی اس کی صحت سلامتی شجی کے لیے بے حد اہم تھی۔ البتہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والا یا والی اس قدر جلد اسے یوں عزیز ہو جائیں گے۔ وہ ان کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ ان کی شاپنگ کرنا... بیسیوں ناموں کی فہرست ترتیب دینا اور پھر ناموں کے مطلب ڈھونڈنا... اسے سب میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر ایک ایکٹیوٹی میں وہ شانزہ کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس سب کے دوران ان کے درمیان مروت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ بے تکلفی جنم لے رہی تھی۔ شانزہ خوش تھی بے پناہ خوش۔ اسے یقین تھا مروت نہیں رہی تو پھر اب محبت تو ہو ہی جائے گی!



وہ سگنل پہ رکے تھے۔ آگے کافی ٹریفک جام تھا۔ دس پندرہ منٹ انہیں اس ٹریفک جام کا حصہ بنے گزر

چلے تھے اور مزید یقیناً" بیس سے تیس منٹ لگنے والے تھے جونہی اگلی گاڑیاں تھوڑی بہت حرکت کرتیں وہ بھی اپنی گاڑی کچھ کھسکاتا۔ اسے کوفت ہو رہی تھی جبکہ شانزہ بہت آرام سے یہاں وہاں دیکھتی گود میں رکھے چپس کے پیکٹ میں بار بار ہاتھ ڈالتی قدرے پرسکون تھی۔ شبجی کی سنگت میں گزرنے والا وقت ہمیشہ اسے سکون ہی دیتا تھا۔

دن بھر میں اسے سب سے مزے کا وقت وہ لگتا جب وہ اس کے ساتھ ہوتا۔ حالانکہ وہ اکثر و بیشتر اپنا کوئی کام ہی کر رہا ہوتا تھا یا پھر کہیں اور کھویا ہوتا مگر بہر حال ہر گزرتے دن کے ساتھ شانزے پہلے سے زیادہ قانع اور صابر ہوتی جا رہی تھی۔ گھر کے دیگر افراد تو اس کا خیال رکھ ہی رہے تھے وہ خود بھی اپنا بے حد خیال رکھتی تھی۔ آنے والی ننھی جان اس کے لیے حد سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اسے ابھی سے اس پہ بے حد پیار آنے لگا تھا۔ وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے باپ کے رویے میں واضح بدلاؤ لے آیا تھا تو دنیا میں آکر تو اسے یکسر ہی بدل ڈالتا۔۔۔ یہ شانزہ کا یقین تھا۔

خوش رکھے جانے کی اور خوش رہنے کی کوششوں نے اس پہ بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ اب قدرے مطمئن نظر آتی۔ چہرہ پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر دمکنے لگا تھا۔ چونکہ اس کا دل شاد تھا لہٰذا وہ ٹریفک جام سے بھی ذرا بیزار نہ ہوئی تھی۔ پہلے آرام سے چپس کھاتی رہی پھر چپس کے پیک کو فولڈ کر کے بیگ میں رکھا اور بیگ سے ایک جوس برآمد کیا۔

"شبجی یہ تو گرم ہو گیا ہے۔۔۔" پہلا سپ لیتے ہی اس نے بتایا۔

"اچھا۔۔۔ ابھی گزارہ کرو یار' آگے نکل کے لیتے ہیں۔"

"یہاں کوئی کولڈ کارنر نہیں ہے قریب میں؟" اس نے متلاشی نگاہیں یہاں وہاں دوڑائیں۔ شبجی کے کہنے پہ ایک اور سپ لیا تو تھا مگر بالکل بھی مزہ نہ آیا تھا۔ کولڈ ڈرنک یا جوس کی شاپ تلاشتے اس کی نگاہ سڑک پار کہیں اٹک سی گئی۔

یہ ایک نو عمر لڑکا تھا جو لکڑی کی ڈنڈی پہ موتیے کے گجرے سجائے کسی کار کے بیک ڈور پہ جھکا شاید بھاؤ تاؤ کر رہا تھا۔ شبجی نے اس کا انہماک محسوس کر کے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"آپ میرے لیے کبھی پھول نہیں لائے؟" اس نے فوراً" سوال داغا۔

"پھول۔۔۔؟" وہ جیسے کہیں کھویا۔

"پھول لاؤں گا تو تم سے محبت ہو جائے گی لڑکی!" وہ اداس سی ویران سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ گزرے چار ماہ انہیں اتنا قریب تو لے آئے تھے کہ وہ دل کی بات کہتے ہوئے زیادہ سوچتا نہ تھا۔

"غلط۔۔۔" شانزہ نے قطعی انداز میں ٹوکا۔

"پھول لانے سے محبت نہیں ہوتی۔۔۔ محبت ہو تو پھول لائے جاتے ہیں!"

"اچھا؟" وہ پھر سے وہی بے جان ہنسی ہنسا۔

"کاش کہ تم مجھے کچھ پہلے مل جاتیں' یہ عقل کی بات بتانے کے لیے۔" ۔۔۔ "مثلاً"؟ کتنا عرصہ پہلے؟"

"یہی کوئی سولہ سال قبل۔"

"تب ملتی تو شاید نہ بتا سکتی' سال ڈیڑھ سال کا بچہ اتنی باتیں تھوڑی کرتا ہے!"

وہ شرارت سے گویا ہوئی تھی۔ شبجی کو اس کی آنکھوں میں لب و لہجے میں صاف شرارت دکھائی دی تھی مگر وہ پھر بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں میری عمر کے حوالے سے کوئی کمپلیکس ہے کیا؟"

"نہیں' بالکل نہیں شبجی! ایسا کبھی سوچیے گا بھی مت۔"

"پتا ہے مجھے اپنی شادی کی یہی بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے کہ یہ ایک بے جوڑ شادی ہے۔"

"ہاں واقعی۔۔۔ آپ کی شادی تو کسی سرجن ڈاکٹر سے ہونی چاہیے تھی۔" وہ جل کر بولی۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں اپنے حوالے سے نہیں کہہ رہا۔" شبجی نے اسے باور کرایا۔

"تو میرے حوالے سے یہ کہنا تو سراسر مذاق ہی ہے شعجی! ایک یتیم و یسیر لڑکی جس کے باپ کا پھل کا ٹھیلا ہوا کرتا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ بھلا کس سے شادی ہو جاتی بتائیں؟" وہ ایک دم جذباتی ہو گئی تھی اس کی آواز بلند ہوئی اور سانس تیز تیز چلنے لگا۔

"ریلیکس!" شعجی نے فوراً" اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"جب آپ یہ کہتے ہیں تو مجھے لگتا کہ آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی شعجی نے اسے یقین دلانے کی خاطر اس کے ہاتھوں پہ دباؤ ڈالا۔ وہ ایک دم ہانپ ہوئی تھی لہٰذا اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔

"لیکن آپ جب بھی ایسی کوئی بات کرتے ہیں تو مجھے سچ مچ میں یہی محسوس ہوتا ہے۔"

اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا جوس کا ڈبا ڈیش بورڈ پہ رکھا۔

"آئی ایم سوری... پلیز!" وہ دل سے ملتجی ہوا۔

"پتا ہے مجھے تو یہ ایک پرفیکٹ میچ لگتا ہے۔" اس کے ہاتھ کی پشت پہ اپنی نازک انگلیاں پھیرتے بڑی چاہت سے وہ بولی۔ شعجی نے اس کے لال گلابی گالوں کو دیکھا۔ اس کا چہرہ، اس کے ہاتھوں کی حرکت، اس کا انداز، اس کے الفاظ کسی فسوں میں گرفتار تھے، بڑے جذب کی کیفیت میں تھے۔ شعجی سے نظریں اور دھیان ہٹانا مشکل ہوا۔

ٹرن ٹرن... پچھلی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ان سے اگلی گاڑی کچھ آگے جا چکی تھی مگر چونکہ وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا لہٰذا اس نے اپنی گاڑی کو حرکت نہ دی تھی۔ اب یہ ہارن سن کر اس نے جھٹ سے گاڑی آگے کی اور مڑ کر کسی کی تلاش میں دیکھا۔ پھول والا کافی پیچھے رہ گیا تھا۔

"آگے جانے کب کہاں پھول نصیب ہوں۔" وہ افسردہ سا ہوا۔

"آپ تو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے کچھ پیچھے چھوٹ گیا ہو۔"

"ہاں... نہیں تم لوگ ہو میرے ساتھ تو میرا سب کچھ ٹھیک ہے سیٹ ہے!"

شانزہ گلال ہوئی، وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کی روٹین کچھ اور ہے۔ اسے پھول لا کر دینے کے بعد محبت ہوا کرتی ہے اور وہ جلد اس کے لیے پھول لانا چاہتا تھا۔ پھولوں سی چاہت رکھنے والی پھول سی شانزہ کو پھول پیش کر کے وہ محبت کا سنگ بنیاد رکھنا چاہ رہا تھا۔ اسے اس لمحے شانزہ سے محبت کرنے کی بے حد چاہ ہوئی۔ وہ دل کے رضامند ہونے پہ خوش ہوا تھا۔ تبھی ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پہ آ گئی۔

"پرانی محبت یاد آ رہی ہے؟" وہ پھر سے شریر ہوئی۔

"پرانی محبت؟" اسے اس کی اصطلاح پہ ہنسی آئی۔

"کیوں کچھ غلط کہا میں نے؟"

"نہیں، پرانی تو ہے، کافی پرانی ہے۔" اس نے خوش دلی سے بتایا۔

"شاید کچھ دنوں میں سابقہ بھی ہو جائے۔" (یہ بات وہ محض سوچ کر رہ گیا)

"اچھا بتائیں بھلا ہوئی کیسے آپ کو یہ اتنی شدید والی محبت؟"

اس کی موجودہ کیفیت سے یکسر انجان وہ اسے سولہ سال قبل کے ایک منظر تک لے جا رہی تھی۔

"چھوڑو..." اسے بتانے کا شعجی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"بتائیں بھی۔" اس نے پرزور اصرار کیا۔

"کیا کرو گی جان کر؟" اسے کوفت ہوئی۔

"بس بتائیں آپ مجھے۔" وہ ضدی ہوئی۔

"حد ہوتی ہے بھئی۔"

"شعجی! آج آپ مجھے بتائیں گے، ہر صورت لازمی طور پر!"

اس نے قطعیت سے کہا۔ شعجی بے بس ہوا۔ سولہ سال قبل بھی وہ اس کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر بھیج دیا گیا۔ آج بھی وہ کنی کترا رہا تھا مگر شانزہ کے اصرار نے اسے اس کمرے میں دھکیل دیا۔

شانزہ ہمہ تن گوش ہوئی یہ جانے بغیر کہ وہ بہت غلط وقت پہ بہت غلط ذکر چھیڑ رہی ہے۔

اور وہ جو سالوں سے چپ تھا' جو اپنے بہترین دوست یا اپنی ماں تک کو بوجہ شرمندگی بتا نہ پاتا اب بولنے لگا وہ محبت جس کے متعلق کچھ دیر قبل اس کے دل نے خواہش کی تھی کہ سابقہ ہو جائے۔ لبوں پہ آئی لفظوں میں کھلی' باتوں میں ڈھلی تو ایسی تھی کہ اسے مکمل طور پر بیگانہ کر گئی' ہوش و حواس سے بھی' شانزہ سے بھی۔ سنتے سنتے وہ رو دی تھی۔ اس کی محبت کے دکھ میں بھی اور اس دکھ میں بھی کہ اس وقت برسوں پہلے وہ کیوں نہ تھی اس کے ساتھ کوئی اور کیوں تھی؟ اس کی پہلی محبت بننا اس کے نصیب میں کیوں نہ تھا' کاش کہ اس کی پہلی محبت بننا اس کے نصیب میں ہوتا۔

ٹریفک جام ہٹتا ہٹتا بالآخر ہٹ ہی گیا تھا۔ ایک معمول کی کیفیت میں وہ گھر کے راستے پہ رواں دواں ہوئے۔

نہ باتیں رکیں نہ گاڑی۔

"وہ اس کمرے سے نکلی تو سراپا حسن تھی۔"

گھر کے گیٹ کے سامنے بریک لگاتے ہوئے بولا گیا شعجی کا یہ جملہ شانزہ کو چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ وہ ان گنت چاہتوں سے گندھا تھا سالوں کی محبت میں لپٹا تھا۔

"اور آپ؟ اس کا کیا بنا؟" اس نے جی کڑا کے پوچھا جواباً شانزہ نے اسے ایسی ہنسی ہنستے دیکھا کہ جس سے بہتر تھا وہ رو ہی دیتا۔

"آپ اس کمرے سے کبھی باہر نہیں آئے نا پھر؟" اس نے خود پہ پھر جبر کیا پھر سوال کیا۔

حالانکہ جانتی تھی جواب میں وہ خود نہ بھی رویا تو بھی اسے رلا دے گا۔

"سال لگے ... بلکہ سالوں لگے لیکن تم نے اچھا نہیں کیا۔" اس کی آواز لرزنے لگی۔

"میری سالوں کی ریاضت آج اکارت ہوئی۔ تمہاری ضد تمہارے اصرار نے آج مجھے اس محبت کے سامنے لا کھڑا کیا ہے جس سے میں نے برسوں نظریں چرائی ہیں۔"

ایسی تلخ صاف گوئی پہ شانزہ کا دل ڈوب کر ابھرا۔

"لیکن اب میں پہلے کی طرح کمزور نہیں پڑوں گا۔ بالکل بھی نہیں۔" وہ اب خود کلامی کر رہا تھا۔ شانزہ کو اچانک گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

گیٹ پہ گاڑی روکتے ہی شعجی نے ہارن دے دیا تھا۔ جانے امی یا ابو ابھی تک کھولنے کیوں نہ آئے تھے۔ شاید کہیں مصروف تھے۔ شاید کوئی آیا ہو۔ اس نے سوچا جبھی چرچراہٹ سی ہوئی اور پھر گیٹ کھلتا چلا گیا۔

"نماز عصر ادا کر رہے ہوں گے نا امی ابو جبھی گیٹ لیٹ کھلا۔"

اس نے اب روزمرہ کی ایک عام سی بات کر کے گزشتہ گفتگو کا اثر جیسے زائل کرنا چاہا۔ شعجی نے خاموشی سے گاڑی اندر کی۔ واقعی نماز عصر کا وقت تھا۔ انور علی مسجد جا چکے تھے۔ نانی جائے نماز پہ تھیں اور سارے میں پھیلی الائچی کی چائے کی خوشگوار مہک بتا رہی تھی کہ عطیہ بانو کچن میں ہیں شانزہ متجسس سوالیہ نگاہوں کے ساتھ گیٹ بند کرتی ہستی کو دیکھنے لگی۔ خوب صورت نقوش اور صاف رنگت والی فربہی مائل جسم کی حامل وہ ایک خوش پوش خاتون تھیں۔

گاڑی سے نکل کر ہاتھوں سے بالوں کی کنگھی کرتا شعجی پتھر ہوا۔ وہ گھبرا کر گاڑی سے نکلا تھا کہ وہاں ہر سو محبت گنگنا رہی تھی مگر یہاں سے فرار ہو کر وہ کہاں جاتا' یہاں تو اس کی محبت' مجسم حسن کھڑی تھی شانزہ نے دیکھا اب کی بار وہ واقعی کمزور نہ پڑا تھا بلکہ پتھر ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شانزہ؟"

سوالیہ مگر پُرجوش انداز میں شانزہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی۔ یہ اس کی اور شانزہ کی پہلی ملاقات تھی۔ اپنی طرف سے وہ تائید چاہ رہی تھی کہ کیا میں نے ٹھیک پہچانا؟ تم شانزہ ہی ہو نا؟

شانزہ بڑی کوشش کے بعد بھی بے دل سا ہی مسکرا سکی۔ اس نے بڑھ کر گرم جوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

"ماشاءاللہ تم تو بالکل جاپانی گڑیا ہو!"

اس نے کہا تو شانزہ کا تنا چہرہ کچھ ڈھیلا پڑا۔ شعبی لا تعلق کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شانزہ بیٹا؟" وہ منہ تک کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ جب عطیہ بانو کی نرم پکار سنائی دی۔

"جی؟" اس نے منہ سے ذرا سا کمبل ہٹایا۔

"بیٹا! کھانے کا وقت ہو گیا ہے آؤ باہر۔" پہلے سے شفیق لہجے میں وہ بولیں۔

"مجھے نہیں کھانا۔" نظریں چراتے ہوئے ہولے سے وہ بولی۔

"کیوں بیٹا کیا ہوا؟" تفکر سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ماتھا چھوا۔

"میں شعبی سے کہتی ہوں تمہارا بی پی دیکھے۔"

بخار نہ پا کر ان کے ذہن میں اگلی بات یہی آئی۔

"امی؟" وہ بجلی کی تیزی سے اٹھی۔ پھر ان کو حیران پا کر کچھ خجل بھی ہوئی "ان سے کچھ مت کہیں۔"

"کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" اس کے لہجے میں خفگی پا کر وہ ایک دم پریشان ہو گئیں۔

"بس میں نے کھانا آپ ان سے کوئی بات نہیں کریں گی۔" اس کے جواب پہ کچھ دیر خاموشی سے ٹٹولنے والے انداز میں وہ اسے دیکھتی رہیں۔ مگر کچھ اندازہ نہ لگا سکیں۔

ایک ہی ایک بہو وہ بھی اخیری عمری میں نصیب ہوئی' وہ لاڈلی تو انہیں ویسے ہی بہت تھی مگر آج کل وہ پہلے سے بڑھ کر خیال رکھ رہی تھیں اس کا۔

"شعبی ہے کہاں؟" یکدم انہیں خیال آیا۔

"اسٹڈی میں۔"

"اسٹڈی میں؟ کیوں؟" اس کے بتانے پہ وہ حیران ہوئیں اور اسٹڈی روم کا بند دروازہ دیکھ کر مزید حیران ہوئیں وہ دروازہ کبھی بند نہیں کرتا تھا۔ بس پردہ آگے کر لیتا یا کبھی کبھار وہ بھی رہنے دیتا۔

وہ متفکر ہوتی اسٹڈی کے دروازے پہ آن کھڑی ہوئیں۔

"شعبی؟" انہوں نے ہاتھ سے دروازہ بجایا۔

"شعبی! دروازہ کیوں بند کیا ہے؟"

"شعبی کھولو!" وقفے وقفے سے وہ کہتی رہیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ "کیا کر رہے ہو؟ کھولتے کیوں نہیں؟" اب کی بار وہ غصہ ہو گئیں۔ مگر دروازہ بند کا بند ہی رہا۔ مایوس ہو کر وہ پلٹیں۔

"میں ادھر ہی کھانا بھیج دیتی ہوں' پلیز کھا لینا۔"

شانزہ کے پاس رک کر وہ ملتجی سا بولیں اور اس کا جواب سنے بنا کمرے سے نکل گئیں۔ شعبی اور شانزہ کی شادی کے بعد سے اب تک انہوں نے بہت بار خود کو شانزہ کا مجرم پایا تھا۔ آج بھی وہ ایسا ہی محسوس کر رہی تھیں۔ آج رات ایک بار پھر وہ یہی سوچنے والی تھیں کہ انہوں نے شاید خالہ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا لیا تھا' شاید شانزہ کے ساتھ زیادتی کر ڈالی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے خود کو بہت الجھائے رکھا۔ سگریٹ پھونکنے میں اسٹڈی میں ٹہلنے میں' کتابوں کی ورق گردانی میں' کینسر کی اسٹڈی میں بھی مگر ہر کام کو چھوڑ کر' ہر بار تھک کر وہ سالوں پیچھے کا سفر کرتا اس کمرے میں پھولوں کے سنگ کھڑا ہو جاتا۔

"جانے میں کیوں اس آخری وقت سے کچھ پہلے نہیں پہنچا۔ میرے نصیب میں دس سال اس سے لاپروا رہنا لکھا تھا کاش کہ مزید کچھ گھنٹے بھی ایسی لاپروائی کے ہوتے' میں اسے تکتا ہی نا اور وہ چلی جاتی۔ خود سے لڑتے ان سوالوں جوابوں میں الجھتے اس کے سر میں شدید درد ہو گیا کچھ بھوک کی وجہ سے بھی۔ کچھ ذہنی تھکن کی وجہ سے بھی۔ اکثر ہی وہ چائے خود بناتا وقت ہوتا تو سب گھر والوں کے لیے بھی بنا دیتا مگر آج دماغ اتنا ماؤف تھا کہ چینی کا ڈبا مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔

"شعبی!" اس آواز پہ وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔

وہ دروازے میں ایستادہ تھی۔ شعبی کی نظر پڑی

توپھر نہ وہ نظر ہٹا سکا نہ پلک جھپک سکا۔ جبکہ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ شرمندہ کچھ دل گرفتہ سی وہ۔۔۔ اسے مخاطب تو کر بیٹھی تھی مگر اب بات کرنا نہ آرہا تھا۔ ۔پچھلے سولہ سالوں سے اس نے شجی سے کوئی بات نہ کی تھی اور اس سے پچھلے دس سال میں شجی نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔

سوں۔۔۔ نہایت ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ چائے ابلتی ہوئی پتیلی کے کناروں سے باہر جا گری۔ شجی جیسے ہوش میں آگیا۔ پلٹ کر اس نے چولہا بند کیا۔

"چائے بنا رہے ہو؟"

اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا کہ جیسے دیکھا ہی نہ ہو وہ کیا کر رہا ہے۔

"نہیں۔۔۔ میں تو۔۔۔ بس کچھ نہیں۔" اس کا سامنا کرنا مشکل تھا تو اس سے بات کرنا مشکل ترین! یہ اسے ابھی احساس ہوا تھا۔ کئی ساعتیں خاموشی کی نذر ہوئیں وہ اس پہ نگاہ نہیں ڈال رہی تھی اور شجی مزید نگاہ ڈالنا نہ چاہتا تھا کہ پھر اس کا پلٹنا کٹھن ہو جاتا تھا۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

"ارے ہاں!" شجی کو اس کے کہنے پہ چائے نکالنے کا خیال آیا۔

"تم پیو گی؟" چائے ایک کپ سے زائد ہوئی تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔ ورنہ اس کے ساتھ چائے پینے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"میں چائے کے لیے ہی آئی تھی۔"

"سوئیں نہیں تم؟" اس کے لیے چائے چھانتے ہوئے اس نے پہلی بار خود سے کوئی بات شروع کی۔

"وہ یہاں کے اور لندن کے ٹائم میں فرق ہے تو کچھ ڈسٹرب ہوں۔" اپنا کپ اٹھا کر وہ کچن سے نکلنے کے لیے مڑا کہ وہ پکاری۔

"شجی!"

جواباً" وہ بولا کچھ نہیں بس ٹھہر گیا۔

"مجھے تم سے منسوب کرنے والے اس دنیا سے بھی جا چکے، پلیز وہ وقت بھول جاؤ!" اس کے لفظ تھے کہ زنجیر۔۔۔ وہ جکڑا ہی گیا ایک تلخی سی اس کے چہرے پہ بکھری "اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ کیوں نہیں بھولا۔

"زندگی رکتی تھوڑی ہے!"

وہ مزید کہہ رہی تھی، شجی کا چہرہ مزید تلخی سے وھلا۔

"میری زندگی تو رک ہی گئی تھی بخت آور۔۔۔ اور جو چلی بھی تو آج پھر سے گول چکر کاٹ کر واپس آرکی۔"

"شجی! میں یہاں بھی نہ آتی۔ تو کہاں جاتی؟ اب میرا اس دنیا میں تم لوگوں کے علاوہ ہے ہی کون؟"

اس کی آواز میں نمی گھل گئی۔ جانے اس نے شجی کی بات کا کیا مطلب لیا تھا، شاید یہ کہ وہ اپنی ناپسندیدہ ترین کزن کو پھر سے دیکھ کر از سرنو چڑچڑا ہو گیا ہے۔

"بخت آور؟" اب کی بار اس نے بغور اسے دیکھا۔ پہلی بار اسے وہ، اس کا لب ولہجہ اس کے انداز و اطوار سب اداس اداس لگے۔

"کیا بات ہے؟" لمحہ بھر میں وہ بے پناہ فکر مند ہوا۔ بخت آور جواباً" پلکیں تیزی سے اور متواتر جھپکنے لگی تاکہ آنکھوں میں اکٹھی ہوتی نمی قطروں میں ڈھل کر برسنے نہ لگے۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" وہ یکایک بے طرح بے چین دکھنے لگا۔

"ہوں۔" وہ ہلکے سے ہوں کے علاوہ کچھ بھی کہتی تو شاید ساتھ ہی رو دیتی۔

"چلو بیٹھو چائے پئیں۔" اس نے کچن ٹیبل کی طرف اشارہ کیا پھر اپنی اور اس کی چائے گرم کرنے لگا وہ اس بدلے ہوئے شجی کو تکنے لگی۔



شائزہ نے آدھے گھنٹے کی محنت سے ہیئر اسٹائل بنایا، براؤن ڈیزائنر سوٹ پہنا ہم رنگ جوتے جرابیں پہنیں، کانوں میں پلاٹینم کے ٹاپس پہنے اور ایک جان دار مسکراہٹ چہرے پر رکھ کر کمرے سے نکلی۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔ عطیہ بانو نے انور علی صاحب

کے لیے دم والی چائے چڑھا رکھی تھی ساتھ ہی ساتھ وہ آملیٹ کے لیے پیاز اور مرچیں کاٹ رہی تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا اس کے لباس اور مسکراہٹ نے دل کی افسردگی کہیں چھپا دی تھی۔

"ماشاء اللہ!" وہ دل ہی دل میں بولیں۔

"شجی نہیں آیا ابھی تک؟ لیٹ نہ ہو جائے۔"

وہ شجی کے ناشتے کی ہی تیاری کر رہی تھیں۔ عموماً" وہ اس وقت لان میں واک کر رہا ہوتا مگر آج لیٹ تھا' لیٹ تو خیر شانزہ بھی تھی مگر اس نے تو تمام وقت اپنی خاص تیاری پہ صرف کیا تھا۔

"آجاتے ہیں۔" شانزہ نے گول سا جواب دیا اور فریج سے انڈے نکالے۔ انڈے پھینٹنے سے قبل وہ دوپٹہ رکھنے ٹیبل کی طرف آئی۔ چائے والے دو مگ ساتھ ساتھ رکھے تھے۔ شجی کا مخصوص مگ پیندے میں چائے کے آخری بچ جانے والے ایک آدھ گھونٹ دکھا رہا تھا۔ پل بھر میں ہی اس کی ننھی سی ناک غصے سے بے حد پھول گئی مگر اس نے کہا کچھ نہیں نہایت خاموشی سے انڈے پھینٹے آملیٹ بنایا۔ وہ توس سینک رہی تھی کہ شجی آگیا۔

"السلام علیکم!" حسب عادت اس نے با آواز بلند کہا شانزہ کو غصہ اتنا تھا کہ سلام کا جواب بھی نہ دیا۔

"امی! بختاور کہاں ہے؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ شانزہ کا خوب جی برا ہوا۔

"وہ تو سو رہی ہے۔" عطیہ بانو نے بتایا ساتھ ہی وہ انور علی کے لیے چائے نکالنے لگیں کیونکہ ان کی چھڑی کی ٹک ٹک سنائی دینے لگ گئی تھی۔ یعنی وہ گھر میں داخل ہو چکے تھے۔

"سو رہی ہے؟ ابھی تک؟" اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ "اتنا تو وہ نہیں سوتی۔"

"ہاں.... سوتی تو نہیں ہے اتنا!" عطیہ بانو عام سے لہجے میں کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"رات کو چائے کے دور چلتے رہے تو اب لیٹ ہی اٹھیں گی نا۔" اس نے پہلے آملیٹ اس کے سامنے پٹخا پھر یہ جملہ۔

شجی اس اچانک اٹھا پٹخ پہ گھبرا سا گیا۔ شانزہ پھر توس کی پلیٹ اس کے آگے پٹخ گئی۔

"وقت کے فرق کی وجہ سے وہ ڈسٹرب تھی تو اس لیے..." شجی کو احساس ہو گیا کہ اب صفائی دیتے ہی بنے گی جب ہی وہ بولا تھا۔

"واٹ ایور.... آئی ڈیم کیئر!" اس نے غصہ سے کہا۔ ٹیبل سے اپنا دوپٹہ اٹھایا اور کچن سے نکل گئی۔ شجی کا دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔



ان دنوں وہ خود کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ لباس' جلد' بال حتی کہ ناخنوں تک کو خاص توجہ دیتی۔ کبھی فیشل کرانے جا رہی ہوتی تو کبھی مساج۔ کسی روز بال کرل کرا آتی تو کبھی ڈائی۔ وہ کسی صورت اس سے کم نہیں لگنا چاہتی تھی۔ گھر کے سبھی افراد اس کی اس تبدیلی سے بہت خوش تھے۔ ایک نہیں فرق پڑا تھا تو شجی کو وہ بیسیوں حیلوں بہانوں سے توجہ دلاتی تو جب اسے کچھ احساس ہوتا ورنہ تو لحہ بھر کے لیے اس کا دھیان نہیں جاتا تھا ان باتوں پہ۔

بختاور البتہ حیران سی حیران تھی۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو ہر روز یوں بے حد اہتمام کے ساتھ سجتے سنورتے نہ دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ عموماً" اس عمر کی لڑکیاں اسٹوڈنٹ ہوتی ہیں اور جب تک وہ بیاہی جاتی ہیں تو اتنی میچور ہو چکی ہوتی ہیں کہ ایک حد تک ہی بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔ وہ اندازے لگاتی رہتی۔ اپنی طرف سے وہ شانزے کے ساتھ وقت گزارنے کی خاص طور پر کوشش کرتی مگر شانزہ نے خود کو مصروف ہی اس قدر کر رکھا تھا کہ بمشکل وہ اس کے ہاتھ آتی۔ جو وقت اس کے پاس بچتا بھی تھا اسے وہ بڑے اہتمام اور انہماک سے ٹی وی اور لیپ ٹاپ کی نذر کر دیتی۔

شجی البتہ اسے کچھ نہ کچھ کمپنی دینے کی کوشش ضرور کرتا۔ کبھی کبھار چائے بھی بنا کر پلا دیتا گو کہ یہ سب بعد میں اس کے لیے تکلیف کا باعث بھی بنتا کہ سالوں کی گرد و غبار میں گم' وقت کی دھند سے متاثر

محبت" چائے کی نشستوں کی بدولت ایک بار پھر نمو پانے لگی تھی۔ مشترکہ قہقہوں سے ڈھلنے لگی تھی۔

اور پھر شانزہ کے تلخ و ترش جملے اسے مزید اذیت میں مبتلا کرتے مگر وہ کیا کرتا' وہ مجبور تھا' دل کے ہاتھوں بھی' اپنی فطرت کے ہاتھوں بھی۔

وہ بخت آور کو اپ سیٹ نہیں کر سکتا تھا کبھی بھی کسی کو بھی اپ سیٹ کر کے وہ خوش نہ رہ پاتا تھا اور یہ تو بختاور تھی اس کی دیرینہ 'شدید اور پہلی محبت' گزرے مہینوں کی نسبت ان دنوں وہ شانزہ سے کچھ لاپروا سا ہو گیا تھا اور زندگی میں دوسری بار۔۔۔ چھبیس برس کے طویل وقفے کے بعد وہ ایک بار پھر بختاور سے بے تکلف ہو رہا تھا۔ ان کے بچپن والی بے تکلفی دھیرے دھیرے لوٹ رہی تھی۔ انور علی اور عطیہ بانو خوش تھے کہ یتیم کزن کو اس نے فراخ دلی سے قبول کر کے اسے میکے کا بھرپور احساس فراہم کیا ہے لیکن شانزہ اپنی تمام تر کمسنی اور ناسمجھی کے باوجود اس صورت حال کو عورتوں والی مخصوص نظر سے دیکھ رہی تھی۔



تھکن کے شدید احساس کے ساتھ اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائی۔ گردن کو دائیں بائیں ہلا کر مسلز کو حرکت دی پھر انٹرکام اٹھا کر کسی کو ہدایت کی۔

"اسٹرانگ ٹی ود آ لٹل بٹ شوگر۔"

یہ ہسپتال میں اس کا کیبن تھا۔ آج کا دن مشورے کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز وہ اپنی کوئی فیس نہ لیتا تھا۔ لہٰذا ہر ہفتے پہلے سے بڑھ کر رش ہوتا' ہمیشہ وہ یونہی تھک جایا کرتا۔ انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہی اس نے اپنا موبائل اٹھایا۔ واٹس ایپ کھولا۔ کچھ میسیجز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اس نے جوابات ٹائپ کیے۔ ہوا کے دوش پہ اڑتے اس کے پیغام اس کے گھر کے لاؤنج میں کسی کی گود میں رکھے موبائل کی اسکرین کو چمکا گئے۔

بختاور نے ایک دھیمی سی مسکان کے ساتھ موبائل اسکرین ان لاک کی۔ میسیج دیکھتے ہی اس کی مسکان گہری ہوئی تھی۔ شانزہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ خلاف معمول آج وہ ایک ساتھ بیٹھ کر ایک دلچسپ اینی میٹڈ مووی دیکھ رہی تھیں۔ سامنے مونگ پھلی کی ٹرے رکھی تھی جس کے ایک طرف وہ کھائی ہوئی مونگ پھلی کے چھلکے دھرے جاتیں۔

ادھر شجی ایک چیٹ کلیئر کر چکا تو اچانک اس کا دھیان مسز کے نام سے محفوظ ایک کانٹیکٹ پہ گیا۔ اس نے ڈی پی اوپن کی ایک نئی تصویر تھی۔ نئے ہیئر کٹ کے ساتھ۔ اسے کبھی بھی احساس نہ ہوتا کہ یہ ایک نیا ہیئر کٹ ہے اگر یہ اتنا بے ڈھنگا نہ ہوتا۔

"شانزہ!" اس نے فوراً" اسے میسیج کیا۔

شانزہ اس کے میسیج پہ بہت حیران ہوئی۔ شاید اس نے پہلی بار اسے خود سے میسیج کیا تھا۔ اس نے جواباً" ایک مسکراہٹ کے ساتھ سوالیہ نشان بھیجا۔

"تم نے کٹنگ کروائی ہے؟"

اس کے اگلے پیغام پہ وہ ایک خوشگوار احساس میں گھری۔ پہلی بار اس نے خود سے اس کی کسی چیز کو نوٹ کیا تھا۔ یہ بہت اہم بات تھی۔

"جی ابھی کچھ دیر پہلے ہی کروا کے آئی ہوں۔"

شرماتے لجاتے مسکراتے اس نے ٹائپ کیا' جب وہ نوٹ کر رہا ہے تو یقیناً" تعریف بھی کرنے والا ہے۔ اسے پکا یقین تھا۔

"کیا حال بنا لیا ہے تم نے یار؟ بالکل بھی سوٹ نہیں کر رہا ہے۔

اور یہ تصویر تو ذرا بھی اچھی نہیں آئی۔"

یکے بعد دیگرے اس کے تین پیغام موصول ہوئے۔ پہلے نے اس کی مسکراہٹ اڑائی۔ دوسرے نے آنکھوں کی جوت بجھائی۔ تیسرے نے گالوں کی لالی چرائی۔ یہ کٹنگ واقعی اس کے چہرے پر کچھ خاص سوٹ نہ کر رہی تھی۔ مگر اس وقت اس کے بے رحم تبصروں نے شانزہ کے چہرے کو کچھ زیادہ ہی بے رونق بنا دیا تھا۔ اس نے فرنٹ کیمرہ کھولا' اپنے برے موڈ کی

وجہ سے اسے اپنا آپ اتنا بدصورت لگا کہ یکدم گھبرا کر کیم بند کر دیا اور کچھ خوفزدہ سی نگاہوں سے بختاور کو دیکھا کہ کہیں وہ اس کی بدصورتی کو انجوائے تو نہیں کر رہی۔ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل اسکرین کو دیکھتے وہ کسی اور ہی احساس میں تھی مگر شانزہ کے دیکھنے پہ متوجہ ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ "شعجی کتنا بدل گیا ہے نا... پہلے تو ایسا نہیں تھا!"

اس کا موڈ خوش گوار تھا' شانزہ کو اندازہ کرنے میں ذرا دقت نہ ہوئی۔ "اچھا؟ پہلے کیسے تھے؟"

"روکھا... کم گو اور زیادہ تر بیزار رہنے والا!"

اس کے کہنے پہ شانزہ ایک زخمی سی ہنسی ہنسی۔

"وہ اب بھی ایسے ہی ہیں' پہلے آپ کے ساتھ تھے اب میرے ساتھ ہیں۔" کڑواہٹ سے کہہ کر وہ رکی نہیں۔ بختاور حیران پریشان اسے دیکھتی رہ گئی۔



آج کل وہ اماں سے بچپن کی طرح سر میں خوب تیل ڈلوانے لگی تھی بالوں کو بڑھانے کے لیے ایک خاص شیمپو کا بھی استعمال شروع کر رکھا تھا۔ تیل میں چپڑے بالوں کی سیدھی چوٹی بناتی اور سر پہ دوپٹہ بھی اوڑھے رکھتی۔ گھر والوں نے اسے بھی اس کا نیا شوق ہی سمجھا' شعجی بھی ایک بار کہہ کر بھول ہی گیا تھا۔ دوبارہ نہ بال اس کی نظروں میں آئے نہ اسے وہ بات یاد آئی۔ مگر بختاور کو اس کی اس دن والی بات بالکل نہ بھولی تھی۔ آج کل وہ اس کا خاص مشاہدہ کر رہی تھی۔ اس کا پل پل بدلتا موڈ۔ دنوں میں بدلتے شوق منٹوں میں بدلتی رائے... اسے ایک ناہموار شخصیت کا حامل ظاہر کرتے تھے۔

چونکہ بختاور نے نفسیات پڑھ رکھی تھی۔ لہٰذا اسے لگا کہ اوائل عمری کی محرومیاں اور پھر ٹین ایج میں ملنے والا اتنا کچھ ہے شاید اسے کچھ عجیب و غریب سا بنا چکے ہیں مگر حیرت اسے اس بات پہ تھی کہ شعجی کے ہوتے ہوئے ایسا کیوں تھا۔ اول تو ایسا ہونا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر ہوا بھی تو اب تک رفتہ رفتہ اس اثر کو زائل ہو جانا چاہیے تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ اسے کہیں شعجی کا کردار نظر نہیں آ رہا تھا۔ چونکہ انہیں پہلے دن سے سب کچھ سامنے نارمل ری ایکٹ کرنے کی عادت تھی۔ لہٰذا ان کے باہمی تعلقات کو فی الحال بختاور ٹھیک سے جج نہ کر سکی تھی۔ اسی موضوع پہ بات کرنے کے لیے اس نے خاص طور پہ بہانہ ڈھونڈا اور ایک صبح جب شعجی اسپتال کے لیے نکلنے لگا تو وہ بھی ساتھ ہولی کہ میں نے پرانے محلے جانا ہے سہیلیوں سے ملنے تو شعجی ڈراپ کر دے گا۔

"پرانا محلہ کیسے یاد آ گیا آج؟"

وہ اس کے شانہ بشانہ چلتی گاڑی تک جا رہی تھی کہ شعجی نے پوچھا۔

"ایسے ہی سوچا کہ کچھ پرانی یادوں کو تازہ کر لیا جائے!"

"جو پرانی ہو جائیں وہ یادیں تھوڑے ہی رہتی ہیں۔"

"اچھا؟" وہ اس کی بات پہ حیران ہوئی۔

"ہاں... وہ تو ماضی ہو جاتی ہیں نا!"

"یادیں تو ہمیشہ تازہ رہتی ہیں' ہمیشہ جوان' ہمیشہ خوب صورت!" وہ چلتے چلتے گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔

"شعجی!" وہ اس کی بات پہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہوں؟" وہ سوالیہ انداز میں کہتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"تم کتنی خوب صورت باتیں کرنے لگ گئے ہو!"

"اور تم کتنی خوب صورت لگنے لگ گئی ہو۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولا اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کا یہ جملہ اثر نہ کرتا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گلال ہوئی۔ وہ اس کی لڑکپن کی محبت تھا۔ اس نے کئی برسوں تک اس سے بے لوث پیار کیا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھا اتنی خوب صورت باتیں کر رہا تھا اسے خوب صورت کہہ رہا تھا اور بختاور محمد علی جتنی بھی سمجھ دار اور حقیقت پسند سہی' ان لمحوں کے فسوں میں گرفتار

ہوگئی تھی۔

"چلیں میم!"

اس کی جانب کا دروازہ محبت اور تکریم سے کھولے وہ اسے بیٹھنے کا کہہ رہا تھا۔

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھی۔ پہلی بار اس کے سنگ وہ اس جگہ پہ بیٹھ رہی تھی جہاں بیٹھنے کے سپنے کچھ برس قبل وہ روز دیکھتی تھی۔ اس کا دل اچھل پتھل ہوا اور جب وہ دوسری جانب آکر بیٹھا تو اس کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی وہ لمحوں میں بھولی کہ اسے شجی سے کیا بات کرنا تھی۔ اس روز انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن کی اسکول کی مشترکہ دوستوں کی، مشترکہ پسندیدہ چیزوں کی اس روز انہوں نے سڑکوں کی خوب خاک چھانی۔ ساتھ ساتھ بیٹھے بات بات پہ مسکراتے رہے۔ نہ اسے اسپتال یاد رہا۔ نہ اسے پرانا محلہ۔ نہ ہی کوئی اور بات۔ بہت پہلے وہ صرف کام کی بات کرتے تھے اور پھر عرصہ دراز بات ہی نہ کی۔ آج جو کرنے پہ آئے تو ہزاروں باتیں کرڈالیں مگر کام کی بات کوئی ایک بھی نہ کی۔



یہ بلا مبالغہ کوئی دسویں بیل گئی تھی مگر دوسری جانب سے جواب ندارد۔ نجاور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی لندن کا ایک نمبر ڈائل کررہی تھی۔ وہ نمبر جو اسے دن میں بیسویں بار ڈائل کرنا ہوتا مگر پھر بھی۔

اس نمبر سے جواب آتا تو ہفتے میں بس ایک آدھ بار۔ خود ہی کال کاٹتے ہوئے اس کا دل ڈوب کر ابھرتا مگر وہ حقیقت سے کب تک بھاگ سکتی تھی۔ سولہ سالوں سے اس کی کوکھ بنجر تھی۔ اس روشن خیال پڑھی لکھی فیملی نے کچھ سال ہنس کر انتظار کیا۔ پھر مسکرا کر مگر جوں جوں سال بڑھتے جارہے تھے۔ ان کا ظرف گھٹتا جا رہا تھا۔ دواؤں ٹوٹکوں سے بات دم درود پر پہنچی اور دم درود سے طعنے تشنوں تک اور جب سے اس کا میکہ ختم ہوا، اس کے اماں ابا نہ رہے تھے تب سے تو وہ اعلانیہ طور پہ تنہا کردی گئی تھی۔ ارمانوں سے بیاہ کر لائی گئی بہو اب ان کے لیے ایک ناکارہ شے سے بڑھ کر کچھ نہ تھی۔ سال بھر سے زائد ہوا کہ نہ اسے شوہر سے وقت ملا، نہ توجہ، نہ محبت، نہ لمس۔ وہ گھبرا کر تھک کر یہاں چلی آئی تھی۔ اسے حالات سے فرار چاہیے تھا۔ اسے کچھ ذہنی آسودگی درکار تھی۔ یہاں آکر وہ خوش بھی تھی۔ سب ٹھیک تھا مگر آج سے پہلے تک۔

آج شجی کے ساتھ ایک لمبا خوشگوار دن گزار کر وہ لوٹی تو ایک احساس جرم میں مبتلا ہوگئی۔

"شجی یقیناً" مجھے بطور کزن لے رہا ہے اور جو اسے پتہ چل جائے کہ میرے دل میں آج بھی۔۔۔"

بے دردی سے لب کچلتے ہوئے اس نے سوچا۔

"یا اللہ میری مدد فرما۔" کھلی کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھتے ہوئے اس نے دعا کی "میرے اللہ مجھ سے کوئی غلطی کوئی گناہ سرزد نہ ہو!

اس نے بے آواز مگر دل کی گہرائیوں سے دعا کی اور کھڑکی بند کرکے پلٹ آئی۔

"شجی کو اگر کوئی ایسی ویسی بات پتا چلے تو وہ تو مجھ سے پھر سے نفرت کرنے لگے۔ وہ تو اس وقت بھی بیزار ہوتا تھا اور اب تو وقت ہی سالوں آگے نکل چکا تب تو پھر کوئی حوالہ تھا مگر اب۔۔۔ اب تو وہ میرے نصیب میں مزید ایسا کوئی حوالہ بھی نہیں رکھتا! مگر خیر اب کچھ بھی بے قابو بے لگام نہیں رہا۔"

اس نے لڑکپن کی بے وقوفیوں کے مقابلے میں سوچا۔

"یہ تو بس ہلکی سی کسک ہے وہ لفظوں سے جانے کس کو تسلی دے رہی تھی۔

"چائے پیوگی؟" اچانک میسیج آیا تھا۔

"نہیں!" اس نے سوچنے میں لمحہ بھی نہ لگایا تھا اسے اپنے لیے کوئی مشکل نہیں چننی تھی۔

"ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

اگلا پیغام آیا تو اس نے بے اختیار گھڑی پہ وقت دیکھا رات کے پونے دو ہو رہے تھے۔ بس سونے لگی ہوں۔

اس نے فٹافٹ آنسر کیا اور ٹیوب لائٹ آف کر

کے نائٹ بلب جلایا۔ مگر نیند ان بچوں والے حیلوں سے ___ تو نہیں آنی تھی۔

وہ یونہی بے آرام سی سوچوں سے بچنے کی کوشش کے باوجود سوچوں میں الجھتی کروٹیں بدلتی رہی۔ فون کی اسکرین پھر سے چمکی تو وہ میسج دیکھے بنا نہ رہ سکی۔

"وائبریہ تو ابھی تک آن لائن ہو۔"

"کہانا سو رہی ہوں۔"

"جھوٹ کس سے بول رہی ہو؟" جھٹ سے اگلا پیغام آیا تھا وہ حیران ہوئی۔

شجی کیسی باتیں کرنے لگا ہے؟

اور پریشان بھی ہوئی' وہ واقعی جھوٹ خود سے ہی تو بول رہی تھی اور شجاع اللہ جیسا بھی نفیس سلجھا ہوا سہی مگر تھا تو مرد ہی' مرد جو بڑی آسانی سے کسی بھی عورت کی وفاؤں محبتوں اور وجود کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اس نے آج کل فراموش کیا ہوا تھا۔ کسن محبت کرنے والی خوب صورت بیوی کو!

☆ ☆ ☆

اور یہ تو طے شدہ بات تھی کہ مرد ہمیشہ اپنی اس محبت کو سرفہرست رکھتا ہے جو لاحاصل ہو مردوں کی اکثریت اپنی بار بار کی گئی محبتوں میں سے اسی کو زیادہ خالص' زیادہ پختہ سمجھتی ہے جو ہاتھ نہ آئی ہو۔ جو عورت ان کی کبھی نہ ہوئی ہو۔ اس میں انہیں زیادہ ہی کشش محسوس ہوتی ہے اور شجاع اللہ نے تو حقیقتاً آج تک ایک ہی محبت کی تھی اور وہ بختاور محمد علی سے کی تھی۔ اس کی محبت میں واقعی دم تھا' خلوص تھا' اور اچھے اچھوں کو اندھا کر دینے والی محبت بھلا اسے کیسے اندھا نہ کرتی۔ شانزہ کو مسلسل نظر انداز کرتے رہنا بالکل ہی فراموش کر دینا۔ اس نے نہ سوچا تھا نہ پلان کیا تھا۔ یہ سب خود بخود ہو رہا تھا وہ تو اس بات سے بھی یکسر انجان تھا کہ وہ شانزہ کو کس قدر ہرٹ کر رہا ہے اور ادھر شانزہ اس کے بختاور کی طرف جھکاؤ سے پریشان تو بے حد ہوتی مگر کہیں نہ کہیں اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ کون سا اس کے شوہر کی محبت سے آگاہ ہے۔ وہ شدت سے بختاور کی واپسی کی منتظر تھی' اس کے بس میں ہوتا تو اسے وقت سے پہلے ہی بھیج دیتی مگر وقت سے پہلے بھلا کب کچھ ہوا کرتا ہے اور جب تک اس کی واپسی کا وقت نہ آتا اسے اپنے نصیب سے مزید کوئی بھی پلٹا کھانے کا___ ڈر تھا!

☆ ☆ ☆

اس روز اتوار تھا۔ وہ نماز ادا کر کے پھر سے سو رہی کہ شجی نے اسپتال تو جانا نہیں تو ناشتہ ذرا لیٹ ہی ہونا تھا سب کا مگر کچھ ہی دیر بعد آہٹ کے احساس سے اس کی آنکھ کھلی اس نے کمبل سے باہر جھانکا تو وہ الماری سے کپڑے نکالتا نظر آیا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں___ بختاور نے پرانے محلے جانا ہے!" مصروف سے انداز میں اس نے جواب دیا۔ شانزہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی مگر پھر ایک خیال آنے پہ اس نے خود کو کچھ بھی غلط کہنے سے روکا۔

"میں بھی ساتھ چلوں؟" اس نے نارمل سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں' تمہاری ضرورت نہیں۔"

"ظاہر ہے بختاور ہوں تو میری ضرورت بھلا کیسے ہو گی؟" شجی کے دوٹوک انکار نے اس کا حلق تک کڑوا کر دیا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" اس نے الماری ٹھک سے بند کی۔

"تو ساتھ چلتی ہوں نا' راستے میں دیکھ لوں گی بختاور کیسی کام کی باتیں کرتی ہیں!"

"تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم ساتھ چلو۔" مڑ کر اس نے سختی سے کہا۔

"اوہ تو یعنی آپ کو بھی احساس ہے میری حالت کا۔" شانزہ نے چبھن کے ساتھ کہا۔

"کب میں نے تمہاری حالت کا احساس نہیں کیا؟" اس کے تو سر پہ لگی تلووں پہ بجھی غصے سے اس کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔

"کون سی بات تمہاری نہیں پوری کی؟ کیا چیز ہے جو تمہیں نہیں دی؟"

"محبت مسٹر شجاع اللہ محبت۔۔۔ نہیں دی آپ نے۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنسا "تو سنیے مسز شجاع اللہ! محبت تو آپ کو نہیں ملے گی' یوں تو بالکل نہیں!" آنچ دیتے لہجے میں اس نے کہا اور تن فن کرتا کمرے سے نکل گیا شانزہ ششدر رہ گئی۔

ایسا جواب۔۔۔ بلکہ ایسا پتھر اس نے پہلی بار اس کے منہ پہ مارا تھا یہ اس کے لیے ایک نیا شجاع اللہ تھا۔ کیونکہ وہ اس حقیقت کو بھلائے ہوئے تھی کہ شجاع اللہ تو تھا ہی ایسا' برسوں پہلے بختاور کی دیوانگی اور وارفتگی کے جواب میں وہ اسے بھی تو یونہی بے مول کیا کرتا تھا!



عطیہ بانو نے حسب معمول دم والی چائے چڑھا رکھی تھی ساتھ ہی ساتھ وہ برتنوں کے اسٹینڈ میں برتن سلیقے سے سیٹ کر کے رکھ رہی تھیں کہ بختاور آئی۔

"چچی جان! شجی کہاں ہے؟"

"سویا ہو گا بیٹے سنڈے ہے نا!"

انہوں نے بتایا تو بختاور کو شرمندگی نے آن گھیرا۔ ایک سنڈے ہی تو ہوتا تھا اس کے پاس اپنے لیے' فیملی لیے اور اس سنڈے کو بھی اس نے اسے اپنا ذاتی کام کہہ دیا تھا۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔ کچھ دیر وہ یونہی بے مقصد کچن میں کھڑی رہی پھر نانی سے گپ شپ کا سوچ کر ان کے کمرے کی طرف گئی۔ شجی کی دیکھا دیکھی وہ بھی شانزہ کی امی کو نانی کہتی تھی۔ وہ بہت مزے کی خاتون تھیں۔ اسے ان کی دلچسپ باتوں میں ہمیشہ خوب مزہ آتا۔ اس سے ذرا پہلے شانزہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مجھے اپنے گھر جانا ہے' اپنے بھائیوں کے گھر۔"

چھوٹتے ہی اس نے کہا تھا نانی جو مزے سے بیڈ پہ لیٹے مارننگ شو کے ویک بیسٹ دیکھ رہی تھیں اس کے اچانک مطالبے پہ حیران ہوئیں۔

"کیوں؟ اداس ہو گئی ہو کیا؟"

"بس جو بھی ہے' مجھے جانا ہے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"اچھا کسی روز چلتے ہیں۔"

"کسی روز نہیں' آج ہی!" اس نے ضدی پن سے کہا۔

"آج ہی؟ مگر ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"میں نے کہا جو ہے مجھے جانا ہے تو آپ کیوں نہیں مجھے لے جاتیں؟" وہ روہانسی ہوئی۔

نانی پریشان ہو کر اٹھیں اسے ساتھ لگایا پھر ساتھ ہی لے کر بیڈ پہ بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے میرے بچے کیا ہوا ہے؟" انہوں نے اسے پچکارا۔

"مجھے جانا ہے اماں پلیز میں نے آج ہی جانا ہے۔"

وہ کہنے کے ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"ارے۔۔۔ جھلی نہ ہو تو۔"

وہ مسلسل اسے پچکارتی چپ کرانے کی کوشش کرتی رہیں مگر وہ برابر روئے گئی۔

بختاور کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کرے۔ کھڑی رہے یا چلی جائے۔ آخر کار وہ کچھ سوچ کر شانزہ کے کمرے میں گئی۔ ارادہ تھا کہ شجی کو بلا کر لائے گی مگر وہ کمرے میں نہیں ملا۔ پھر وہ کچن سے پانی کا گلاس لیے دوبارہ نانی کے کمرے میں آئی۔ تب تک انور علی اور عطیہ بانو بھی اس کمرے میں پہنچ چکے تھے شانزہ اب باقاعدہ رو تو نہیں رہی تھی مگر ذرا ذرا دیر بعد سسکی ضرور لیتی۔ سب ہی پریشان نظر آتے تھے' عطیہ بانو اب شانزہ کے دوسری طرف بیٹھی تھیں۔

"بس نا بیٹے' کوئی بات نہیں۔ اللہ خیر کا وقت لائے گا ہم سب کی دعائیں ہیں نا تمہارے ساتھ!"

یقیناً انہوں نے اس کے رونے کی بابت خود سے ہی کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔ نانی کا جھریوں زدہ چہرہ بے حد پریشان نظر آتا تھا شاید وہ عطیہ بانو کے اندازے سے متفق نہیں تھیں اور متفق تو ان سے بخت اور بھی

نہیں تھی۔ یقیناً" کوئی اور بات تھی جو شانزہ کو رلا رہی تھی اس کا دل اس پیاری سی چھوٹی سی لڑکی کے لیے ایک دم اداس ہوا۔

وہ یقیناً" اس گھر کی رونق تھی اس نے انور علی اور عطیہ بانو کی زندگی میں کئی رنگ بھرے تھے' شرارتوں کے محبتوں کے امنگوں کے مستقبل کے' وہ اس گھرانے کا اہم ترین فرد تھی۔ اس لحاظ سے وہ بختاور کے لیے بھی اہم تھی۔ یہ اس کا میکہ تھا۔ لہٰذا اس ناطے وہ اسے بڑی عزیز تھی۔ یوں بھی وہ شوخ و چنچل سی لڑکی بہت بے ضرر تھی۔ بختاور نے اسی وقت ارادہ کیا کہ وہ آج ہی شعجی سے اس کے متعلق تفصیل سے بات کرے گی ساتھ ہی اسے افسوس بھی ہوا کہ پچھلی بار جب وہ خاص طور پہ اسی کے متعلق بات کرنے گئی تھی تو تب بھولی کیوں؟



صبح سے وہ جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں وہاں ٹہلتی شعجی کا انتظار کرتی رہی' دوپہر ڈھلی سب لوگ قیلولہ کرنے کو لیٹے تو تب کہیں شعجی گھر میں داخل ہوا اسے یہ وقت بہت مناسب لگا شانزہ بھی سو رہی تھی بلکہ اسے تو عطیہ بانو نے صبح سویرے ہی دودھ کے ساتھ سکون آور دوا دے کر سلا دیا تھا۔ شعجی گھر آتے ہی لاؤنج میں ٹی وی آن کرکے بیٹھ گیا۔ بخت آور بھی وہیں چلی آئی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ہاں تو آؤ نا بیٹھو۔"

"شانزہ کی وجہ سے آج گھر میں سب بہت پریشان ہوئے۔"

"میں بھی.....!" اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔

"تمہیں بتایا کسی نے کچھ؟"

"کیا مطلب کیا بتانا تھا کسی کو مجھے؟" وہ حیران ہوا۔

"وہ روتی رہی ہے..... بہت زیادہ!"

بختاور نے پریشانی سے بتایا مگر اس نے اس ذکر پہ کوفت سے منہ موڑا۔

"شعجی!" بختاور کو اس کے ردعمل پہ حیرت ہوئی۔

"وہ ڈسٹرب ہے اور تم؟"

"دوسروں کو ڈسٹرب کرے گی تو خود بھی تو ہوگی نا!" وہ بیزاری سے بولا۔

"کیا کوئی بات ہوئی ہے تم میں؟"

"لیواٹ..... چائے بنالاؤ۔" بیزاری ہی بیزاری تھی۔ بختاور مزید کچھ کہے بنا چائے بنانے چلی گئی۔ اس کے اندر شور سا بپا ہو گیا جسے دبانے کے لیے اس نے ٹی وی کا والیوم تیز کر لیا لاؤنج کا جائزہ لیا جاتا تو ٹی وی کا سب سے کم فاصلہ ان کے کمرے سے تھا لہٰذا وہاں خوب آواز جا رہی تھی۔ شانزہ یوں بھی صبح کی سوئی اب اٹھنے کو تھی لہٰذا اس کی نیند اس شور سے ٹوٹنے لگی۔

بختاور جلد ہی چائے بنالائی۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے اور تم ڈھنگ سے بات بھی نہیں سن رہے!" اس نے ناراضی سے کہا تھا۔

"تم بات کر رہی ہو تو سن رہا ہوں' ورنہ ڈھنگ سے تو کیا کان سے بھی نہ سنتا۔" ایک بار پھر بنا خواہش کے بنا چاہت کے بختاور کے گال لال ہوئے دھڑکن تیز ہوئی مگر آج اس نے بہت جلد خود کو سنبھالا اور چائے کے سپ لینے لگی۔

"اچھا بتاؤ کیا ہوا ہے اس کو؟" اس نے محض بات برائے بات پوچھا۔

"وہ عام سی باتوں پہ بھی بہت زیادہ ری ایکٹ کر جاتی ہے شعجی! اکثر ہی یک دم اداس ہو جاتی ہے!"

"وہ ایسی ہی ہے۔" اپنے تئیں اس نے شعجی کو بڑی اہم بات بتائی مگر شعجی نے ہوا میں اڑائی۔

"تو وہ کیوں ہے ایسی؟ کیا وجہ ہے آخر؟"

"بس ہے کوئی وجہ۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"کیا ہے وہ وجہ؟ وہ بھلا کیوں پریشان ہو شعجی! بھلا کیوں روئے وہ؟"

"تم کیوں ہلکان ہوتی ہو؟" اسے چڑ ہوئی "اس کا رونا ہی ہے تم اسے رونے دو!"

"تم مجھے بتاؤ تو سہی۔ اسے آخر مسئلہ کیا ہے پریشا

کیا ہے؟ کیوں روتی رہے گی وہ؟"

"کیونکہ میں اس سے محبت نہیں کرتا!"

تنگ آکر شجی کو آخر کہنا ہی پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بختاور کیسے سن ہو گئی گو کہ وہ اچھی شکل و صورت والی تھی مگر شجی کے رویے کی وجہ سے نو عمری سے ہی وہ اس کمپلیکس کا شکار ہو گئی کہ شاید وہ خوب صورت نہیں اور پھر یہ بھی سننے میں آتا رہا کہ شجی شادی کے لیے نہیں مانتا پھر جب مانا تو بے حد حسین دلہن بیاہ کر لایا تو اس نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ حسن پرست ہے اور ویسے بھی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ برسوں بعد بھی وہ جس شادی کے لیے مانا ہے وہ محبت کی شادی نہیں ہے۔ یہ انکشاف کہ اسے کم عمر اور خوبرو شانزہ سے بھی محبت نہیں ہے، بہت اچانک اور غیر متوقع تھا جبھی اس نے اگلا سوال یہ کیا۔

"تو تمہیں محبت آخر ہے کس سے؟"

شجی نے اس سوال پہ جواباً بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ حیران سوالیہ نگاہوں سے اسے ہی تک رہی تھی۔ بہت دیر سے مگر آج شجی کے پاس موقع تھا وہ اعتراف جو اس کے سامنے کرنے کا اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وہ اظہار جو اس نے ہمیشہ ناممکنات والی کیٹگری میں رکھا آج اچھل کر اس کے لبوں پہ آنے کو بے تاب ہوا۔

ادھر شانزہ پہلے ٹی وی اور باتوں کی آواز سے بچنے کی کوشش میں پہلے تو تکیہ کانوں پہ دباتی رہی اور آخر کار جب نیند مکمل ٹوٹی تو وہ اٹھ کر دروازے کی طرف آئی۔

"تو تمہیں محبت آخر ہے کس سے؟" اسی لمحے کوئی کسی سے پوچھ رہا تھا وہ جواب سننے کو رکی۔

"تم سے!"

صرف وہ نہیں اس کی آنکھیں بھی بولی تھیں۔ وہ چالیس کا ہندسہ عبور کر چکے تھے پھر بھی ان کی زندگی میں سب کچھ پہلی بار ہو رہا تھا تو پھر بھلا شجی کا یوں پہلی بار براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا کیسے اسے موم نہ کرتا۔۔۔ بلکہ وہ موم تو نہ ہوئی تھی وہ تو کملی ہی ہو گئی تھی۔

دنیا بھر میں تنہا رہ گئی۔۔۔ تنہا کر دی گئی عورت کے سامنے وہ شخص اظہار محبت کر رہا تھا جو اس کی پہلی محبت تھا۔۔۔ تو وہ کیسے کملی نہ ہوتی!

"نہیں!" وہ بے آواز بولی۔

"نہیں مانتی ہو؟" وہ کہہ کر عجیب طور سے ہنسا۔

"مان بھی کیسے لو' میری سولہ سال کی محبت ہے تمہیں دو تین ماہ میں تھوڑے ہی دکھ جائے گی!"

"شجی؟" اسے جیسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہ آتا تھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو شجی؟"

"میں وہ سچ کہہ رہا ہوں بخت جو میں نے سولہ سال جھیلا ہے۔"

شجی نے اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ کر کہا' شدت جذبات سے وہ لال ہو رہا تھا۔

دروازے کی ہلکی سی جھری سے شانزہ نے دیکھا کہ وہ بے یقینی حیرت اور ملال کے ملے جلے تاثرات لیے نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی اس کی آنکھیں مکمل نم تھیں۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ سراپا سوال تھی۔

"تمہاری کوئی دعا مجھے تب لگی جب وہ میرے حق میں دعا سے زیادہ بد دعا تھی۔" اضطرابی کیفیت میں اپنے ہاتھ اس کے شانوں پہ اوپر نیچے رگڑتے' لب چباتے وہ بہت کرب سے بولا تھا۔

"یہ نہیں ہونا چاہیے تھا!" وہ آنسوؤں کو پیتی گلوگیر ہوئی۔

"تمہارے ساتھ۔" اس نے بے دردی سے لب کچلے۔

"نہ میرے ساتھ!" آنسو بالآخر ایک جھڑی کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ شجی نے دیکھا کہ اس کا وجود ہولے ہولے سے لرزنے لگا ہے۔ اس کی ڈھارس بندھانے کی خاطر اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے' بخت کے آنسوؤں میں مزید تیزی آئی۔ ٹھنڈے برف ہوتے اس کے ہاتھ جو شجی کے ہاتھوں میں پیوست اس کی گود میں رکھے

تھے‘ اس نے اس انکشاف کے بارے سے نڈھال ہو کر اپنا سر ان ہاتھوں پہ گرا دیا۔ ضبط گریہ سے لال ہوتے شجی کے چہرے کو شانزہ نے جھری میں سے بخت کے سر پہ جھکتے دیکھا۔

"بی پی انتہائی لو ہے اور شاید یہ کسی پریشانی کے زیر اثر بھی رہی ہیں۔"

سب افراد دم سادھے بے حد خاموش کھڑے تھے۔ جب ڈاکٹر نے یہ جملہ بولا۔ اسی لمحے شجی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ نہا رہا تھا کہ عطیہ بانو نے واش روم کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا۔ اپنے تئیں وہ فوراً سے بیشتر نہا کر نکلا مگر تب تک وہ لوگ بالکل قریبی گھر میں مقیم ڈاکٹر انعم کو بلا چکے تھے۔ یہ ڈاکٹر کالونی تھی تو فوراً ہی ڈاکٹر میسر آ گئیں۔

"دراصل میں ڈاکٹر صاحبہ یہ صبح سے ڈسٹرب تھیں‘ میں نے ہی انہیں دودھ کے ساتھ ایک گولی دی اور سونے کا کہا!" عطیہ بانو نے ڈاکٹر انعم کو بتایا۔

"دن بھر کے کھانے میں سب سے اہم ناشتا ہوتا ہے‘ اور اس حالت میں ان کو کوئی بھی گولی یا کیپسول ڈاکٹر کے مشورے کے بنا نہیں دینا چاہیے۔ کیوں شجاع؟"

عطیہ بانو کو رسان سے سمجھا کر ڈاکٹر انعم نے فوراً ہی شجی کی طرف رخ کیا۔

"جج.... جی!" مارے شرمندگی کے اس کا برا حال ہوا۔

"آپ انہیں ابھی کچھ کھلائیں اور پلیز ان کے ذہنی سکون کو بھی مدنظر رکھیں۔"

وہ شجی کو ہی بتا رہی تھیں۔ سارے خفت کے اس کا خون تپنے لگا حالانکہ اس نے نہا کے بال بھی نہ خشک کیے تھے‘ قطرے ٹپکاتے بالوں کے ساتھ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ہی وہ آ گیا تھا مگر اب یکایک اس کا جسم گرم ہو گیا اور چہرہ سرخ۔

"تھینک یو سو مچ ڈاکٹر صاحبہ!" وقتی طور پر اسے ان سے کہنے کے لیے بس یہی سوجھا۔

"اٹس اوکے آپ انہیں وقت دیں۔ میں چلتی ہوں۔"

وہ اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکتی باہر کو ہو لیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے جاتے ہی شجی بھی کمرے سے نکل گیا۔ عطیہ بانو اس کے پیچھے بھاگیں۔ انور علی نے جھک کر شفقت سے شانزہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کی ویران آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔ نانی کا جھریوں زدہ چہرہ اب صبح سے کہیں بڑھ کر اداس لگ رہا تھا۔ انہوں نے بیڈ پہ شانزہ کے قریب ہی ذرا سی جگہ پہ خود کو ٹکایا۔ بیٹی کی خاموشی اور یہ حالت..... ان کے وجود سے جیسے تمام تر انرجی نچڑ گئی تھی۔ بختاور چور سی بنی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"آپ پانچ منٹ انتظار نہیں کر سکتی تھیں؟" وہ امی پہ دھاڑا غصے میں وہ ٹیرس پہ آ گیا تھا۔

"کیسے کرتی؟ اسے کچھ ہو جاتا تو؟"

"تو اچھا ہی ہوتا۔ یقیناً"۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"شجی؟" بے یقینی نے جیسے ان کو توڑ ہی ڈالا تھا۔

"تو اس کی حالت کے ذمہ دار تم ہو؟" نہایت سخت لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

شجی نے بنا کچھ کہے منہ پھیر لیا۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں شجی!" وہ پہلے سے بڑھ کر سختی سے بولیں۔

"میں نے کچھ نہیں کہا‘ اپنی حالت کی ذمہ دار وہ خود ہے۔" اب کی بار وہ قدرے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

"یعنی وہ خود اپنی جان کے درپے ہے؟" وہ چبھتے طنز سے بولیں۔

"تو کیا میں اس کی جان کے درپے ہوں؟ حد ہے امی۔" وہ خفگی سے کہتا‘ دور‘ ٹیرس کے جنگلے پہ جا کھڑا ہوا۔ عطیہ بانو بھی اس کے پیچھے ہو لیں۔

"شجی مسئلہ کیا ہے بیٹے؟" اب کی بار وہ قدرے نرمی قدرے حلاوت سے بولیں۔

"امی اس میں اتنا بچپنا' اتنی ناسمجھی ہے کہ ہر روز کوئی نیا مسئلہ جنم لے لیتا ہے۔"

"تو بیٹا تم تو سمجھ دار ہو نا۔" انہوں نے جنگلے پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر رسان سے کہا تھا۔

"میں سمجھ دار ہوں تو آپ کو میرے لیے کوئی سمجھ دار لڑکی چننی چاہیے تھی۔"

"وہ تمہارے نصیب میں لکھی تھی اور صرف وہی لکھی تھی' نصیب سے مختلف نصیب سے زیادہ بھلا کب کسی کو ملا کرتا ہے۔ نصیب میں نہ ہوتی تو یہاں نہ ہوتی۔"

"آپ نے اچھا نہیں کیا امی۔" اس کے لہجے میں جانے کون کون سے دکھ سمٹ آئے تھے۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے بیٹا۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا امی اگر ہم۔۔۔"

"بس۔۔۔ مزید ایک لفظ نہیں' نہ بولنا نہ ہی کبھی سوچنا۔" وہ تو جیسے اس پہ ٹوٹ ہی پڑی تھیں۔ بات مکمل کرکے وہ رکی نہیں تھیں ایک غصیلی سخت ناراض نگاہ اس پہ ڈالتے وہاں سے چل دیں۔ اس نے غصے سے جنگلے پہ زوردار مکا مارا۔

***

عطیہ بانو ٹرے میں چائے کے خالی برتن لیے کچن میں آئیں تو بختاور کو چائے بناتا پایا۔ انہوں نے ٹرے کچن ٹیبل پہ ہی رکھ دی اور بولیں۔

"بختاور بیٹا! صبح جلدی اٹھ جانا۔ قرآن خوانی رکھوائی ہے تو کمرہ تم ہی صاف کروانا۔ میرا تو دماغ آج کل اتنا ماؤف ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔"

"جی اچھا۔۔۔" اس نے سعادت مندی سے کہا' مگر دل میں سوچا ضرور کہ چچی آپ کا دماغ جتنا بھی ماؤف ہو مجھ سے زیادہ بری حالت میں نہیں ہوگا۔

"جانے کس کی نظر لگ گئی ہے میرے گھر کی خوشیوں کو۔۔۔" تاسف سے بڑبڑاتے ہوئے وہ اب واپس جا رہی تھیں۔

"جانے کس کا سایہ پڑ گیا ہے میرے گھر کی رونقوں پہ۔۔۔" ان کی آواز دور ہوتی گم ہو گئی۔ یقیناً' وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی ہوں گی' مگر بختاور کو تڑپانے کے لیے تو یہ جملے بھی بہت تھے۔ وہ جیسے احساس ندامت سے پانی پانی ہو گئی۔ اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"بخت!" وہ جانے کہاں سے چلا آیا تھا۔ بختاور اس کے آنے پہ چونکی پھر فوراً" چولہا بند کیا۔ کچی پکی چائے ہی کپ میں نکالی اور واپس جانے لگی تھی کہ وہ عین سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیوں avoid (نظر انداز) کر رہی ہو مجھے؟"

"کیونکہ یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

"خدارا ایسے مت کرو۔" وہ روہانسا ہوا۔

"شجی پلیز۔۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر کہہ نہ پائی۔

"کیا۔۔۔ بولو نا! پلیز بولو۔" وہ ملتجی ہوا۔

"اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا۔ تم وقت سے' قسمت سے لڑائی مت کرو اور مجھے۔۔۔ مجھے کمزور مت کرو۔۔۔" بے بسی ہی بے بسی تھی۔

"کیا میں اب بھی تمہاری کمزوری ہوں؟" امید وبیم میں الجھا کسی من پسند جواب کی چاہ میں تڑپتا سوال۔

"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہے۔" جھوٹ کو سچا دکھانے کی خاطر اس نے لہجہ آخری حد تک کٹھور کر لیا تھا۔ شجی نے اداس سانس خارج کی جو کسی آہ کے مترادف تھی۔

"پرسوں رات تمہارا فون کچن میں رہ گیا تھا۔" وہ اس کے پہلو سے گزرتی کچن سے باہر جانے کو تھی کہ وہ پیچھے سے بولا تھا۔

"میں نے صبح لے لیا تھا۔"

اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا اور تیز تیز ڈگ بھرتی اپنے کمرے تک گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کرنا چاہا' مگر چوکھٹ اور دروازے کے درمیان شجی کا جوگر والا پاؤں آڑ بن گیا وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے کچھ وائس میسجز سنے تھے۔"

بختاور کی رنگت لٹھے کی طرح سفید پڑی۔ بھرم یقیناً "ٹوٹ چکا تھا وہ ناطاقتی کے احساس سے مغلوب ہو گئی۔ اس نے دروازے کو زور لگانا چھوڑا اور رخ موڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اب بھلا وہ اس کا سامنا کس منہ سے کرتی۔

شعبی نے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور بنا چاپ کے قدم اٹھاتا اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ ادھ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے نہایت سرد جھونکے آ رہے تھے۔ بخت کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ تیزی سے حدت کھونے لگا۔

"تم نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ شیئر کیوں نہیں کیا؟" وہ شکوہ کناں تھا۔ وہ خاموش رہی۔

"تم اتنی ارزاں نہیں ہو کہ....."

"کم از کم تم تو یہ مت کہو۔" بختاور نے تکلیف کے احساس کے ساتھ تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ اب کی بار خاموش ہونے کی باری اس کی تھی۔

"بخت! جو میں نے کیا اس کی کوئی تلافی ہے تو بتاؤ' کوئی سزا کوئی جرمانہ کرنا چاہتی ہو تو کرو۔" کیا کچھ نہ تھا اس کے لہجے میں..... شرمندگی افسردگی بوجھل پن۔

"معافی تلافی کے بعد تم تو بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ اصل سزا تو میری ہے۔ میری زندگی تو تب بھی سزا ہی رہے گی۔" سرد مہری ہی سرد مہری تھی۔ شعبی بری طرح مچلا۔

"کیوں رہے گی سزا؟ میں ہوں ناں' ہر لمحہ ہر وقت ہر طرح سے میسر ہوں تمہیں۔"

"کیوں خود کو اور مجھے مصیبت میں دھکیلتے ہو شعبی؟" وہ حقیقت پسندی سے بولی۔

"سب کچھ پہلے کی طرح ہو سکتا ہے اور باآسانی ہو سکتا ہے۔" اس کا انداز قائل کرنے والا تھا۔

"میں بھی یہیں رہتی ہوں' دیکھ اور سمجھ سکتی ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے کیا نہیں۔"

"اور سب سے بڑھ کر میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ اتنی تمیز تو میں کر ہی سکتی ہوں کہ کیا کچھ ہونا چاہیے اور کیا کچھ ہونے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔" کہہ کر وہ رغبت سے ٹھنڈی چائے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"ابھی میں نے امی سے واضح بات نہیں کی۔ اس لیے ان کا ایکشن زیادہ سخت ہے۔ تمہارا نام لوں گا تو وہ انکار نہیں کر سکیں گی۔"

"کیوں نہیں کر سکیں گی؟ پہلے تو میں ان کے بیٹے کے ساتھ برسوں سے منسوب اک دوشیزہ تھی اور اب..... اب تو میرے پیچھے دادا کی تھپکی بھی نہیں۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر کپ سائیڈ پہ رکھ دیا۔

"لیکن میں تو ہوں نا تمہارے ساتھ۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے سرد ہاتھوں سے اس کے سرد ترین ہاتھ تھام لیے۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آتی چاندنی ان کے ہاتھوں پہ گر رہی تھی۔ کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔

"اور تم کتنے خود غرض ہو نا شعبی۔" وہ بہت سادگی سے بولی پھر ایک ٹھنڈی آہ کھینچی۔

"پہلے بھی اپنے لیے تم نے سب گھر والوں کو ایک گہرے غم میں دھکیل دیا تھا اور اب بھی خود کے آگے کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا۔"

"جانے کیا ہو گیا ہے بخت کہ مجھے بس تم ہی تم دکھائی دیتی ہو۔" وہ بے بس سا نظر آتا تھا۔

"اور تب کیا تھا شعبی جب تمہیں سب دکھائی دیتے تھے مگر میں نہ دیتی تھی؟" بختاور نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچے اپنے اندر کا کرب اور اذیت ضبط کرنے کی کوشش میں وہ ہلکان ہو گئی تھی۔

"سنو بخت؟ کیا میں اپنی ناک سے لکیریں کھینچوں؟ بلکہ نہیں یہ تو کہیں کم ہے تم یوں کرو کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار ڈالو۔"

"شعبی!" وہ خود کو روک نہ سکی۔ نہ تڑپ کر چیخنے سے نہ اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھنے سے۔

وہ کمزور سی عورت جتنے بھی جتن کرتی' یہ محبت ماضی ہو ہی نہ پا رہی تھی۔ وہ کتنے ہی پردے ڈالتی مگر یہ

کہیں نہ کہیں اپنی جھلک دکھلا ہی جاتی تھی۔

وہ چلا بھی گیا' مگر پھر بھی وہ یہیں کیوں ہے؟ بخت چاندنی سے الجھتی' بے خوابی سے لڑتی' کوئی ستارہ مقدر کا کھوجتی۔۔۔ اس شب نیند کے انتظار میں ہی رہی۔

اس کا ہاتھ دہک رہا تھا اور اس حدت سے 'دل کے نہاں خانوں میں منجمد کردی گئی محبت کچھ تو متاثر ہوئی ہی تھی۔

گو کہ وہ تمام رات ہی جاگی تھی' مگر کمرے سے تب نکلی جب یہ اطمینان ہو چکا کہ وہ گھر سے جا چکا ہے۔ برائے نام ناشتا کیا اور پھر کمرے میں جا کے سو گئی۔ دوبارہ اٹھی تو ظہر کا وقت نکلنے کو تھا اس نے فٹافٹ وضو کیا' نماز ادا کی' نماز کے اختتام پہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار ہی اس کا وجود سجدے میں گر گیا اور وہ بے تحاشا رونے لگی۔

اسے اپنے کے لیے کوئی دعا نہیں مانگنی تھی سوائے دل کی مضبوطی کے۔ محبت کے بنا اب تک کی عمر اس نے کاٹ لی تھی تو باقی ماندہ بھی کٹ ہی جانی تھی۔ اسے اپنا آپ بس سیدھے راستے پہ چلتا ہوا چاہیے تھا۔ اسے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کرنا تھا۔ اس نے نیت کا درست رہنا مانگا۔ ہدایت پہ جمے رہنا مانگا۔

رات بھر محبت کے پیچھے بے خوابی کا شکار رہ کر صبح جب وہ فجر کے لیے کھڑی ہوئی تو احساس گناہ اتنا غالب آیا تھا کہ اس کا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ ڈر گئی تھی۔ اسے ضمیر کا اطمینان دے کر محبت ہرگز نہیں لینی تھی۔

بے ایمان دل اس کا ایمان کمزور کرنے کے درپے تھا' مگر اس نے ایک بار بھی اللہ سے محبت نہیں مانگی' ہرگز نہیں مانگی۔ آنسوؤں کے ساتھ سجدے میں گر گئی ایک طویل دعا سے وہ فارغ ہوئی تو دل میں ڈھیروں سکون اترتا محسوس ہوا۔ اس نے جائے نماز تہ کر کے صوفے کے ہتھے پہ رکھی ۔ دوپٹا ڈھیلا کیا اور ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔ آج کل اس کے موبائل پہ کچھ ہو تا نہ ہوتا شعجی کے پیغامات ہر وقت آتے رہتے۔ اس وقت بھی ایک نیا پیغام موجود تھا اس نے بے دلی سے کھولا' مگر مسیج پڑھتے ہی اس کی رنگت فق ہو گئی۔

"میں آج امی سے صاف صاف اور مکمل بات کروں گا۔"

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ الماری سے اپنا بیگ نکالا اور باہر کو دوڑی۔ بنا کسی دقت کے اسے کیب مل گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے اسپتال میں داخل ہو رہی تھی شجی بالکل اسی وقت ایک اچانک آئی سرجری کو بھگتا کر نکلا تھا۔ وہ اپنے کیبن سے ملحقہ واش روم میں اچھی طرح سے ہاتھ منہ دھو رہا تھا جب اسے بے ڈھنگے سے انداز میں کیبن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

"شجی!" اس آواز پہ وہ فٹافٹ نل بند کر کے تولیہ ہاتھ میں لیے ہی کیبن میں آگیا۔

"سر وہ..." استقبالیہ والی لڑکی غالباً" بخت کو روکنے کی کوشش میں ناکام رہی تھی۔ اب وہ کوئی صفائی دینا چاہتی تھی کہ شجی نے اشارے سے اسے جانے کا کہا۔ وہ عجیب سی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی چلی گئی۔

"بیٹھو۔" وہ چہرے پہ تولیہ رگڑتے بولا۔

"میں واپس جا رہی ہوں۔"

"مجھے اچھی طرح سے پتا ہے مستقبل قریب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں۔"

"جو تم سوچتے ہو امکان تو اس کا بھی کوئی نہیں۔" وہ جیسے طنز کر رہی تھی۔

"میں سب دیکھ لوں گا... ڈونٹ وری..." وہ عام دنوں سے زیادہ پرسکون تھا۔

"تم جو کچھ دیکھتے ہو اس کے بعد سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ پتا ہے نا تمہیں؟" وہ جتا رہی تھی۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر بار ایسا ہی ہو۔"

"اور ضروری تو یہ بھی ہرگز نہیں کہ ہر بار جو تم چاہو وہ کر گزرو۔"

"تمہارے دل میں میرے لیے ایک خاص گوشہ ہے یہ میں اچھی طرح سے جان چکا ہوں تو اب ان باتوں کا کیا مقصد ہے بخت؟"

"شجی دل پہ تو کم ہی کسی کا اختیار ہوتا ہے؟ لیکن دماغ پہ تو ہوتا ہے نا؟ ہم اپنے ارادوں اپنے اعمال کو تو کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں نا؟" وہ رسانیت سے سمجھانے لگی۔

"جب تم اتنی اذیت میں ہو' جب میں اتنا ناخوش ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟" وہ ٹیبل کی اس پار سے اس کی طرف جھکا۔

"اور جو لوگ خوش ہیں؟ وہ...؟ ان کا کیا شجی؟ ان کو کس غلطی کی سزا ہے؟ ہماری محبت کے بھگتان وہ کیوں بھگتیں؟" وہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئی تھی۔

"تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔" وہ بھلا کہاں قائل ہونے والا تھا۔

"اچھا آ آ آ؟ اور اپنے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں ٹھیک ہوں..." وہ یقیناً" اس بحث کو سمیٹنے کے موڈ میں تھا۔

"ہاں ایک تم ہی تو ٹھیک ہوتے ہو' تب بھی تم ہی ٹھیک تھے اور اب بھی تم ہی!"

"بخت!" اس نے کسی جذب کی کیفیت میں اس کا نام لیا۔

"یہاں دیکھو' میری آنکھوں میں..." جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ وہ فٹافٹ ہی اس کی آنکھوں میں دیکھ گئی' مگر پھر اس کی وارفتی اور شوق نے فوراً" اسے نگاہیں موڑنے پہ مجبور کیا۔

"چاہتی تو تم بھی یہی ہو نا کہ گزرا وقت واپس آجائے؟ تو اگر میں اس وقت کو گھیر گھار کے پیچھے کا آئینہ دکھا رہا ہوں تو غلط کیا ہے یار؟"

"غلط یہ ہے کہ اب کچھ بھی ویسا نہیں ہے۔" اس نے فوراً" جواب دیا۔

"نہیں ہے تو ہو جائے گا یار!" وہ زچ ہوا۔

"حقیقت پسند بنو شجی!"

"اچھا...!" وہ جیسے تنگ آگیا ہو۔ "مزید کوئی حکم؟"

"مزید کچھ نہیں' بس یہی کافی ہے۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ اس کے ساتھ کوئی اور حکم

بھی فرمائیں۔۔۔۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ آپ اس کے علاوہ کوئی بھی حکم فرما سکتی ہیں۔" وہ بے وقت شریر ہو رہا تھا۔

"شجی!" جواباً وہ سنجیدہ ہی رہی۔

"چچا، چچی اور ان کا گھر ہی اب میرا میکہ ہے۔ پلیز، مجھ سے میرا میکہ مت چھینو۔" وہ باقاعدہ منت کر رہی تھی۔

"تمہیں کیوں یہ لگتا ہے کہ وہ نہیں مانیں گے یا تم سے چھن جائیں گے؟" اسے کوفت ہوئی۔

"کیونکہ ایسا ہی ہے شجی اور میں نہیں چاہتی کہ تم یہ بات کسی ٹھوکر سے سمجھو، تم عقل سے ہی سمجھ جاؤ، کیا ضروری ہے کہ میرا نقصان کر چکنے کے بعد ہی تم سمجھو، تم ابھی کیوں نہیں سمجھ جاتے؟ تم اپنی تقدیر سے اور وقت کے تقاضوں سے سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتے۔"

وہ باقاعدہ رو دینے کو ہوئی۔ شجی کا کچھ دیر پہلے تک کا پرسکون نظر آتا چہرہ اب تفکر کی کئی پرچھائیاں دکھا رہا تھا۔



سونے کے لیے لیٹنے سے قبل اس نے عادتاً موبائل تھاما۔ حسب توقع شجی کا میسج موجود تھا۔

"میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور تو میرا بھی نہیں تھا، مگر تب وقت اور تقدیر نے جو حد فاصل کھینچی میں نے اسے قبول کر لیا۔"

"تو تم یہ چاہتی ہو کہ جو تم نے سہا، میری سزا بھی وہی ہو؟ کیا اس سے کم، اس سے کچھ مختلف کوئی سزا نہیں بچی دنیا میں؟"

"نہیں۔۔۔!" اس نے بنا تردد میں پڑے ٹائپ کیا۔

"میں امی ابو کو منا سکتا ہوں، لیکن جب تم ہی ساتھ نہ ہو گی تو تب میں کیا کر سکوں گا۔"

"یہ کوشش مت کرنا شجی! میرے ماں باپ جیسے چچا چچی کو مجھ سے بدظن مت کرنا خدارا۔"

"کہیں کوئی تو گنجائش ہو گی نا میری؟" اس نے بہت امید سے لکھا تھا۔

"دل میں ہے، دعاؤں میں رہے گی۔"

"کتابی باتیں مت کرو بخت! مجھے تمہاری زندگی میں تمہارے مستقبل میں جگہ چاہیے۔"

"کہہ جو دیا کہ یہ ممکن نہیں۔"

"مجھ پہ ترس کھاؤ بختاور!"

"مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔"

"اور جو میرا دل توڑ رہی ہو؟" وہ جیسے اب لڑائی پہ آمادہ تھا۔

"تو جو دو گھر جڑے رہیں گے وہ؟"

"تمہارے گھر کی مضبوطی جانچ چکا ہوں اور اب تو میرا گھر بھی تم سے چھپا نہیں رہا۔"

"دیکھا تمہیں خود بھی کہیں نہ کہیں خیال ہے کہ میرے اور تمہارے گھر الگ ہیں۔ میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں، میں اور تم الگ ہیں۔"

اور شجی نے جب یہ پیغام پڑھا تو موبائل دور کھینچ مارا اور لگا اپنے بال نوچنے، وہ ان دنوں کرب کی انتہاؤں پہ تھا، ڈپریشن کے شدید اثر میں تھا۔ برداشت محال تھی اور صبر اذیت ناک۔

اور ادھر بختاور جب "میں اور تم الگ ہیں" ٹائپ کر رہی تھی تو ایک سیل رواں اس کے گالوں پہ بہہ نکلا۔ اگرچہ وہ نہیں چاہتی تھی پھر بھی لاشعوری طور پر جانے کتنی دیر موبائل گود میں رکھے منتظر نگاہوں سے اسکرین کو دیکھتی رہی تھی۔



اس روز وہ آخری بار بے بی کے لیے ضروری اشیا خریدنے گئی تھی۔ شاپ کاؤنٹر پہ رکھی باسکٹ میں سے بار بی اسٹیکرز کھنگالتے کھنگالتے اقوال زریں یا ماشاء اللہ وغیرہ کے خوب صورت اسٹیکرز بھی نظر سے گزرے پھر ایک آٹھ لفظی جملے والا قدرے سادہ انداز میں لکھا گیا اسٹیکر اس کے ہاتھ میں آیا۔ لفظ ایسے تھے کہ فٹافٹ ہی دل میں گھر کر گئے۔

"وقت سے پہلے نہیں، نصیب سے زیادہ نہیں!"

اس نے زیر لب یہ جملہ پڑھا اور پھر وہ اسے اسٹیکرز کی باسکٹ میں واپس نہ رکھ سکی۔ وہ اس کی نظر میں کھب گیا تھا۔ اسے آج کل خود کو یہ باور کراتے رہنے کی اشد ضرورت تھی لہٰذا اس نے اسے بطور نفسیاتی دوا، خرید لیا۔ اپنی حالت کے پیش نظر ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی تجی ہو رہی تھی اکثر کوئی نہ کوئی ورد کرتی رہتی۔ نماز میں باقاعدگی آگئی تھی بلکہ اب تو اکثر ہی اس کی نماز لمبی ہو جایا کرتی۔ ایک بات جس کی وہ مکمل طور پہ قائل ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ سب سے بڑھ کر جو شخص اس کا خیال رکھ سکتا تھا وہ اس کی اپنی ذات تھی۔ لہٰذا اب وہ خود اپنا خیال کر رہی تھی۔ اپنی بیمار بوڑھی ماں کو پریشان سے پریشان تر کرتے رہنے کا اس کا مزید کوئی ارادہ نہ تھا۔ اگرچہ اب وہ محسوس کر لینے سے ہرٹ ہو جانے سے حتی الامکان دور بھاگتی تھی، مگر اندر ہی اندر دل اس دشمن جاں کی لاپروائی پہ اب بھی کڑھتا تھا، لیکن اب وہ خود کو سمجھا لیا کرتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شجی کے ساتھ اس کا رشتہ دنیا کے خوب صورت ترین رشتوں میں سے ایک تھا، مگر اب جو ایک نیا رشتہ کہیں اور استوار ہونے جا رہا تھا۔ وہ رعنائی اور دلکشی میں اس پرانے رشتے سے کہیں بڑھ کر تھا چونکہ وقت بہت قریب تھا لہٰذا غیر ارادی طور پہ ہی اب اس کا دھیان زیادہ تر نئے، خوب صورت اَن ٹوٹ رشتے کی طرف رہتا۔



یہ ایک مصروف سا اتوار تھا۔ عطیہ بانو نے شانزہ کے کمرے کا تمام سامان باہر نکلوا کر کمرہ دھلوانے کی ٹھانی۔ صوفوں کے کورز اور کھڑکیوں کے پردے بھی دھلوانے تھے بختاور نے بنا ان کے کہے سب کام کروانے کی ذمہ داری لے لی اور انہیں فارغ بٹھا دیا خود وہ تندہی سے کام کرنے لگی تھی ملازمہ کو ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی برابر کا کام کر رہی تھی۔ کپڑے اور کمرہ دُھل چکا تو وہ باہر لان میں بے ترتیب رکھے فرنیچر کو اچھی طرح سے خوب تسلی کر کے جھاڑنے پونچھنے لگی۔ وہ آخری صوفہ صاف کر رہی تھی جب شجی لاؤنج سے نکلا اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا وہ یقیناً "موقع تاک کر نکلا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس بختاور نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور چھوٹتے ہی بولی۔

"وہ مجھے واپس بلا رہا ہے۔"

"اچھا؟" شجی ٹھٹک سا گیا۔ "بات تو ڈھنگ سے کرتا نہیں اور واپس بلوا لیا۔" اسے جیسے یقین نہ آیا تھا۔

"بات تو خیر ابھی بھی ڈھنگ سے نہیں کی، لیکن چھوڑو.... کوئی بات نہیں۔" وہ سرسری سے انداز میں اتنی لاپروائی سے بولی کہ شجی کو اس کی لاپروائی واضح طور پہ مصنوعی لگی۔

"تو تم چلی جاؤ گی؟" اسے جانے کیوں اپنی آواز مری مری سی لگی۔

"ہاں.... وہی میرا گھر ہے وہی میری جگہ ہے، مجھے واپس تو جانا ہی ہے نا۔" کہیں نہ کہیں وہ اداس بھی تھی ہی۔

"تمہیں یہاں کیا مسئلہ ہے؟" وہ ایک دم بچوں کی سی ضد سے بولا۔

"شجی.... میں وہاں ٹھیک ہوں، سیٹ ہوں۔" وہ اس سے زیادہ خود کو بتا رہی تھی۔

"مجھے کیوں لگتا ہے کہ تم یہاں زیادہ ٹھیک رہی ہو یہاں زیادہ سیٹ ہو۔"

"جو بھی ہو.... مگر وہاں ان سیکورٹی تو نہیں نا! ادھر میں زیادہ محفوظ ہوں۔"

"بختاور؟" وہ دکھ سے جیسے ٹوٹ جانے کو تھا۔

"یہاں....؟" اس نے انگلی کی مدد سے زمین کی جانب اشارہ کیا۔ "اس گھر میں...." اس نے اب ہاتھ سے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ "تم غیر محفوظ ہو؟ ان سیکو[illegible] ہو؟" سخت دکھی اور بے پناہ بے یقینی والا لہجہ اسے [illegible] طرح شرمندہ کر گیا۔

"تم غلط سمجھے ہو، میرا مطلب تھا میں یہاں کی نسبت وہاں.... کسی غلطی یا لغزش سے زیادہ محفوظ

[illegible]۔" وہ جھاڑن صوفے پہ رکھ کر اسے اپنا مطلب سمجھانے لگی۔

"یہاں ہمہ وقت ہی ان سیکور رہتی ہے کہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے، کہیں خود غرض نہ ہو جاؤں۔۔۔ وہاں ان خود غرض ہو جانے سے اور بے حس ہو جانے سے بچی رہوں گی۔"

"ڈرتی ہو؟" اب کی بار اس کا انداز اکسانے والا تھا۔

"ہاں شجی ڈرتی ہوں۔" وہ بلا کی صاف گو تھی۔

"اتنا کہ ڈر کے بھاگ جانے کے سوا چارہ ہی نہیں۔" وہ ایک بار پھر اسے اس کے جذبات اپنے الفاظ اپنے انداز میں دکھانے لگا۔

"انسان ہوں نا تو ابھی ڈر باقی ہے، ڈر نہ رہا تو انسان کہاں رہوں گی؟" وہ صاف گوئی سے سفاکی تک جا پہنچی تھی۔ یہ بات سن لینا، برداشت کر لینا نہایت کڑوا گھونٹ تھا جو شجی نے بمشکل پیا۔

"جو شخص تمہیں مہینوں دیکھتا تک نہیں تم اس کے ساتھ زندگی بتانے پہ آمادہ ہو۔" اب کی بار اس نے ایک جذباتی وار کیا تھا۔ شانزہ چونکہ کئی دنوں سے خود کو ایسی باتوں کے لیے تیار کرتی رہی تھی لہٰذا کمزور نہ پڑی اور بولی۔

"ہم عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں شجی! جس کو گھر والے منتخب کرلیں اسی کے نام کی مالا جپتی ہیں پھر چاہے وہ مہینوں نہ دیکھے یا برسوں۔" برسوں کہتے ہوئے اس کی آواز میں کوئی کرب گھل گیا تھا۔ "آج تک کسی شانزہ نے خاندانی منگیتر کی بے اعتنائی پہ رستہ نہیں بدلا شجی!" وہ کہتے کہتے جذبات کے بار سے لرزنے لگی تھی۔

"اور ہاں آج تک کوئی شانزہ بھی شوہر کی بے رخی پہ واپس نہیں پلٹی ہے۔" وہ بے پناہ جذباتی ہو رہی تھی اس کی رنگت لال ہو چکی تھی۔ "ہم عورتوں کی اکثریت مٹی سے زیادہ وفا سے گندھی ہوتی ہے شجی! ہم میں سے چند ایک ہی ہوں گی جو وفائیں یا محبتیں بدلتی ہوں گی ورنہ ہمیں تمہاری طرح گرگٹ بننا نہیں آتا۔" وہ بڑی تیاری کے ساتھ بڑی ہی فرصت سے ہر بات کہہ رہی تھی۔ شجی گنگ، ساکت کھڑا تھا۔

"والدین کی خواہشوں کے مطابق، وقت کے تقاضوں کے تحت ہم کٹھن سے کٹھن سمجھوتا کر گزرتی ہیں، ہماری ترجیحات نہیں بدلا کرتیں شجی! کبھی بھی نہیں۔"

بنا لچک والا، ہموار اور نہایت سنجیدہ لہجہ شجی کے چودہ طبق روشن کرنے کو کافی تھا۔ اس کے دل میں مچلتی، آنکھوں میں تیرتی محبت اس کی منتیں ہی کر رہی تھی کہ وہ کچھ بولے، مگر اس وقت زبان اس کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ اس کے پہلو سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے کو بھاگی تھی، مگر اسے روکنے کی ہمت نہ ہوئی، ضبط کی تمام تر کوششوں کے باوجود بے طرح روتی ہوئی بچوں کی طرح مچلتی ہوئی وہ لاؤنج کے دروازے کے پار گم ہو گئی۔



اس کی باتیں تھیں کہ کوئی کاری ضرب۔۔۔ شجی کو فرق کرنا مشکل ہوا۔ تمام دن وہ ڈسٹرب رہا۔ رات کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا اور سونے کا وقت ہوا تو حسب معمول اس کی راہ فرار اسے اسٹڈی روم تک چھوڑ آئی۔

رات کے اس پہر خاموشی اور قدرے سکون سے تمام تر واقعات کو سوچتے ہوئے اچانک اسے یاد آیا کہ جب وہ بت بنا کھڑا تھا تب وہ روتی ہوئی اندر کو بھاگی تھی، اندر تو چلو وہ گئی ہی، مگر وہ اس طرح روئی کیوں؟ دماغ نے اسے نکتہ سمجھایا۔ جھٹ سے اس نے موبائل جیب سے نکالا اور میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"تمہاری باتیں میرے جتنا ہی تمہیں بھی ہرٹ کرتی ہیں۔۔۔"

"ہے نا؟" جھٹ سے دو میسج سینڈ کر کے وہ اضطراری انداز میں میز پر انگلیاں بجانے لگا۔ اسے یقین تھا میسج ضرور آئے گا۔

کچھ دیر گزری تو اس نے بے تابی سے اس کا لاسٹ

سین چیک کیا، وہ آن لائن تھی اور اس کے میسیج دیکھ چکی تھی۔

"کیوں اوائڈ کر رہی ہو بخت؟" کچھ پل انتظار کے بعد آخر اس نے پھر میسیج کیا۔

تقریباً" اسی وقت شانزہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ گہری، مگر غیر آرام دہ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ کسی عجیب و غریب خواب نے اس وقت اسے بری طرح ڈرا دیا تھا۔ اٹھ کر بیٹھنے کے کچھ لمحات بعد تک تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اس نے اپنا تنفس تیز تیز چلتے پایا اور خوف کی شدت سے اس کو اتنا پسینہ آیا تھا کہ لباس نم ہو گیا تھا حالانکہ یہ سخت سردی کے دن تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے کچھ دیر وہ وہیں بیٹھی رہی پھر سائیڈ ٹیبل کی طرف آئی۔

گلاس بھر کے پانی پیا۔ شعجی کی خالی جگہ اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اسٹڈی کا دروازہ بس برائے نام کھلا تھا۔ صرف اتنا کہ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر وہاں سے کمرے تک آ رہی تھی۔ اس نے پاؤں میں سلیپر اڑسے اور اٹھ کر اسٹڈی تک گئی۔

دروازہ کھولا تو شعجی بڑی فرصت سے موبائل اسکرین پہ جھکا دکھائی دیتا تھا، مگر اس وقت دروازہ کھلنا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لہٰذا وہ چونک کر کرسی سے اٹھا۔ سامنے شانزہ زخمی سے تاثرات لیے کھڑی تھی۔

"آپ کی وجہ سے، صرف اور صرف آپ کی وجہ سے میری زندگی کا سب سے خوب صورت ٹائم پیریڈ ڈر اور خوف کی نذر ہو گیا۔"

وہ انگلی اٹھا کر اسے بری طرح ڈپٹ رہی تھی، اس پہلی بار کے غصے پہ وہ کچھ حیران ہوا۔

"سپنے بننے کا وقت تھا شعجی، مگر میرے ہاتھ دہشت زدہ کر دینے والے خواب ہی آئے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، جلتی کڑھتی۔۔۔ مرتی رہتی ہوں۔ میرے بس میں ہو تو میں آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور ہی سزا دلواؤں۔۔۔ آپ کی بے رخی، آپ کی لاپروائی۔۔۔

ہرگز اس لائق نہیں کہ کوئی معافی ہو۔ کبھی میری طرف آنا ہو تو معافی لینے مت آیئے گا۔۔۔ ہاں سزا لینے ضرور آ جایئے گا۔۔۔ جب میں بنا قصور کے سزا بھگت سکتی ہوں تو پھر آپ کیوں نہیں؟ آپ کی تو بنتی بھی ہے۔ جتنی اسپیس آپ مجھے دیتے رہے ہیں اس سے اتنا تو سمجھا ہی دیا ہے کہ مجھ سے آپ کو معافی والی گنجائش تلافی والی رعایت کبھی نہیں ملنی چاہیے۔ لہٰذا آپ نے خود کے لیے سوچنی ہو تو صرف سزا سوچیے گا، تلافی کی کوئی صورت نہیں۔"

کہہ کر وہ کھٹاک سے دروازہ بند کر کے لوٹ گئی۔ جانے کیا بات تھی کہ آج شعجی نہ اس کو روک پایا، ٹوک سکا۔ حتیٰ کہ وہ اس کے دعووں، اس کی باتوں پہ ہنس بھی نہ سکا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ضرور سوچتا کہ معافی چاہ کون رہا ہے؟ تلافی کر کون رہا ہے؟

بلکہ عین ممکن تھا وہ یہ تک کہہ دیتا کہ اس نے کیا غلط کیا ہی کب ہے؟ لیکن آج وہ اس سے ذرہ بھر بھی اختلاف نہ کر سکا تھا، آج پہلی بار تھا کہ وہ اس کی اس قسم کی گفتگو سے بھی بے زار نہ ہوا تھا، تلخ نہ ہوا تھا۔

آج پہلی بار تھی کہ وہ باقاعدہ بیویوں والے انداز میں، بیویوں والے استحقاق کے ساتھ اسے کھری کھری سنا گئی تھی اور آج پہلی بار تھی کہ وہ اچھے شوہروں کی طرح کچھ نہ بولا تھا، کچھ بول ہی نہ پایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جس روز وہ اسپتال جانے والی تھی اس صبح قدرے خوف زدہ تھی۔ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد اتنی دیر تک جائے نماز پہ بیٹھی رہی کہ دن نکل آیا۔ آج اس کی دعائیں ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ اس نے اپنے بچے کے لیے تندرستی، صحت بھری زندگی، مکمل اعضا مانگے خود کے لیے آسانی مانگی، آج تک سرزد ہوئے گناہوں کی معافی مانگی اور بار بار مانگی۔ عطیہ بانو کئی ایک بار اس کے کمرے کا چکر لگا گئیں۔ آج ان کے چہرے کی خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی۔

جائے نماز سے اٹھ کر اس نے محض لباس تبدیل

لیا اور بال برش کیے آج کے لیے یہی کافی تھا۔ اس کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے ناشتا نہیں کیا۔ کمرے سے نکلنے سے قبل اس نے الوداعی نظر اس گوشے پہ ڈالی جہاں ایک خوب صورت بے بی کاٹ رکھا تھا۔ دیوار پہ کئی اسٹیکرز چپکے تھے۔ اگرچہ وقت کم تھا سب اس کو جانے کے لیے پکار رہے تھے مگر پھر بھی وہ اس طرف کھنچی چلی آئی۔ کاٹ کے قریب جب وہ آکر رکی تو اس کی آنکھیں بے ساختہ ہی مسکرا دیں۔

اس نے نرمی سے اس تکیے کو چھوا جو کاٹ میں رکھا تھا۔ نومولود بچوں کا مخصوص تکیہ! پھر وہ دیوار کی طرف مڑی یہاں باربی (اسٹیکر کی صورت) چپکی تھی اور ڈان (گڑیا کی صورت) ٹنگی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ ہر ایک شے کو چھوئے ایک ایک چیز کو پیار کرے جانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا سا لگا تھا۔

عورت کے لیے تخلیق کا مرحلہ زندگی اور موت کی کشمکش ہوتا ہے۔ وہ بار بار یہی سوچ جاتی۔ اسے اپنے لیے بھی سلامتی چاہیے تھی اسے وہ رشتہ محسوس کرنا تھا۔ آنے والے کو چھونا تھا چومنا تھا خود کے معتبر ہو جانے کو بھی محسوس کرنا تھا ایک بار پھر اس نے اپنے لیے دعا کی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو عطیہ بانو بیگ ہاتھ میں لیے نکلنے کو تیار تھیں۔ وہ بڑھ کر اماں کی طرف گئی جو صوفے پر خاموش بیٹھی تھیں خوش تو وہ بھی تھیں ہی مگر بیٹی کی تکلیف کے خیال سے کچھ اداس بھی تھیں۔ شانزہ ان کے گلے لگی انہوں نے اس کے گال چومے ساتھے پہ پیار کیا ڈھیروں دعائیں دیں۔ ان کی طبیعت کے پیش نظر انہیں گھر میں ٹھہرائے رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

انور علی بھی ان کے پاس ہی تھے۔ اماں سے دعائیں اور پیار لے کر اسے کچھ حوصلہ ہوا تو وہ جانے کے لیے اٹھی بختاور نے بھی اس کی تائید کی۔

لاؤنج اور لان کے درمیان والی تین سیڑھیاں عبور کرتے وقت بختاور نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا۔ وہ اسے مدد دینا چاہ رہی تھی۔ اس نے بنا وقت ضائع کیے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما۔ آج اسے دل میں کوئی کدورت نہ رکھنی تھی۔ شجی جو گاڑی موڑے نکلنے کے لیے تیار تھا اس نے بیک ویو مرر سے شال میں اچھی طرح لپٹی شانزہ کو دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ وہ بدقت چل رہی تھی اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا اور یہ دقت اس کے ساتھ آج سے یا ابھی سے نہیں تھی یقیناً "کافی وقت سے وہ اسی دقت کا شکار تھی۔ وہ چھوٹی سی نازک سی لڑکی کتنی دقت میں تھی کیسی نازک صورت حال سے دوچار تھی اسے خود پہ تعجب ہوا کہ کیونکر وہ اس سے اس قدر لاپروا ہو گیا تھا۔ وہ بھی ان دنوں کہ جب اسے اس کے ساتھ کی پیار کی تسلی کی پہلے سے کہیں بڑھ کر ضرورت تھی۔

وہ تینوں خواتین دھیرے دھیرے چلتی کار تک آکر رکیں۔ عطیہ بانو نے شانزہ کو اپنے ساتھ پیچھے بٹھایا اور بختاور کو آگے جانے کا کہا۔

شجی کی اس سمے کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ نہ شانزہ سے نہ بختاور سے نہ ہی خود سے۔ دل پہ ایک بوجھ کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ عطیہ بانو تمام راستہ اسے گاڑی احتیاط سے چلانے کی ہدایت کرتی رہیں۔ گاڑی شہر کے سب سے اچھے میٹرنٹی ہوم کے سامنے آکر رکی۔ بختاور نے وہ بیگ ڈگی سے نکالا جو چلتے سے عطیہ بانو لائی تھیں۔ عطیہ بانو نے شانزہ کو اترنے میں مدد دی۔ چونکہ ڈاکٹر سے وقت لے رکھا تھا لہٰذا وہ لوگ سیدھے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف گئے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے سیٹ سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ شانزہ اور عطیہ بانو سے رسمی دعا سلام کے بعد وہ شجی سے پروفیشنل قسم کی باتیں کرنے لگیں۔

اسی دوران ایک نرس نے آکر شانزہ کا ذرا سا بلڈ کسی ٹیسٹ کے لیے لیا۔ عطیہ بانو اور شانزہ دونوں ہی زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ شجی اور ڈاکٹر صاحبہ کی باتیں بھی جاری تھیں۔ شانزہ اور عطیہ بانو ایک بڑے صوفے پہ ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ عطیہ بانو کبھی اسے ساتھ لگاتیں۔ کبھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتیں وہ اس کے خوف سے آشنا تھیں کچھ ہی دیر گزری کہ

نرس نے ایک فائل لاکر ڈاکٹر صاحبہ کو تھمائی۔ شاید یہ ٹیسٹس کی رپورٹ تھی۔ انہوں نے چشمہ لگا کر رپورٹ کو دیکھا پھر کچھ متفکر ہو کر شانزہ کی جانب نظر دوڑائی اور رپورٹس شعجی کی طرف بڑھا دیں۔

"شانزہ آپ پلیز الٹرا ساؤنڈ کے لیے اس کمرے میں چلیں۔" انہوں نے اس دروازے کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا جو ان کی سیٹ کی سیدھ میں تھا۔ رپورٹس پہ نظر دوڑاتا شعجی اس وقت پریشان نظر آتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ ان کا HB تو بالکل ٹھیک تھا' چار پانچ ماہ پہلے میں خود آیا تھا ان کے ساتھ تفصیلی چیک اپ ہوا تھا تب...." وہ خود کو بھی اور انہیں بھی اپنی وضاحت دے رہا تھا۔

"شروع کے تین چار ماہ تو یہ بالکل ٹھیک رہی ہیں' مگر پھر اچانک ان کی صحت ڈاؤن ہونے لگ گئی۔ آپ کو دھیان رکھنا چاہیے تھا۔"

"وہ... ایکچوئلی... مصروفیت ہی بے حد ہوتی ہے... مم... مگر امی تو باقاعدگی سے ان کا چیک اپ کراتی رہی ہیں۔" اسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا بے حد مشکل لگا' خود اپنی نگاہ میں بھی۔

"جی' مگر میں نے انہیں بالخصوص کہا تھا کہ وہ کسی روز آپ کو بھی ساتھ لائیں۔" شعجی کو کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔

"چونکہ یہ بہت کمسن ہیں اور کچھ کمزور بھی تو ان کا کیس پہلے ہی سیریس تھا... اب پیچیدگی مزید بڑھ گئی ہے۔"

ڈاکٹر صاحبہ مزید بتا رہی تھیں۔ انہوں نے آواز قدرے دھیمی رکھی مبادا ساتھ والے کمرے میں موجود مریضہ سن نہ لے۔

"تو ابھی پھر کیا ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحبہ؟"

"آپ بلڈ ارینج رکھیں اور دعا کریں... ہمیں بھی پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔"

وہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئیں۔ ان کا رخ ملحقہ کمرے کی جانب تھا جو یقیناً "الٹرا ساؤنڈ روم تھا۔ شعجی نے ان کے جانے کے بعد ایک بار پھر رپورٹس کو دیکھا۔ اس کا دل گہری پریشانی کی زد میں آیا۔ [illegible] مرجھائی مرجھائی سی رہا کرتی تھی۔ یہ بات تو بنا کو[illegible] کے ہی اس کے نوٹس میں آگئی تھی۔ مگر وہ ایک سنجیدہ نوعیت کی خون کی کمی کا شکار ہو رہی ہے یہ اسے بالکل اندازہ نہ تھا۔ وہ رپورٹس وہیں ٹیبل پہ چھوڑ کر باہر آیا۔

اسپتال کی یہ راہداری فی الحال سنسان تھی۔ وہ کچھ آگے چلتا بائیں طرف مڑا اور حیران ہوا۔ یہاں بختاور راستے کے بیچ و بیچ ساکت کھڑی تھی۔ صبح والا بیگ اس کے قدموں میں یوں رکھا تھا جیسے اچانک ہاتھ سے چھوٹ کر گرا ہو۔ اسے اس کے بیچ راہ میں کھڑے ہونے پہ حیرت ہوئی۔

"بختاور؟" قریب جا کر اس نے آہستگی سے پکارا تھا مگر وہ تو اس دھیمی سی پکار پہ بھی ڈر کر بری طرح اچھلی۔ وہ مڑی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ڈر کر نہیں بلکہ بری طرح چونک کر اچھلی تھی۔ اس نے چھپانے کی لاکھ کوشش کی مگر شعجی نے اس کی آنکھوں کی نمی پھر بھی دیکھ لی۔

"کیا ہوا بخت؟" وہ بری طرح پریشان ہو کر بولا۔

"اس... نے... شادی کر لی۔" اس کا لہجہ یوں نقاہت لیے ہوئے تھا جیسے کسی نے خوب زدوکوب کیا ہو۔

"مائی گاڈ!" شعجی نے سر تھام لیا۔ بختاور کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"فار گاڈ سیک یار' تم اس شخص کے لیے رو رہی ہو؟" اسے حقیقتاً غصہ آیا بلکہ دکھ بھی ہوا۔

"اس کے لیے نہیں' اپنے لیے رو رہی ہوں۔ پہلے ناممکن سا لگتا تھا کہ وہ مجھے چھوڑے گا' مگر اب ہر وقت مجھے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔"

"وہ چھوڑے گا بخت! تو میں تمہیں سر آنکھوں پہ رکھوں گا۔"

شعجی نے کہنے کے ساتھ ہی اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ادھر الٹرا ساؤنڈ روم سے نکل کر شانزہ نے پہلے اسے ڈاکٹر کے کمرے میں پھر راہداری میں

اسے وہ دکھائی نہ دیا تو شانزہ آگے چلی آئی تھی۔ راہداری سے بائیں مڑنے سے قبل ہی اسے باتوں کی دھیمی سی آواز سنائی دی یوں کہ سمجھ کچھ نہ آتا تھا' لیکن یہ پتا تھا کہ کوئی بول رہا ہے۔ عطیہ بانو کو ڈاکٹر صاحب نے کوئی ضروری بات بتانے کے لیے روک لیا تھا۔

"نہیں شیجی' ایسا تو سوچنا بھی مت!" وہ خود کو اس سے چھڑانے کے لیے اس کی گرفت میں کسمسا رہی تھی مگر چھوٹ نہ سکی' اس کے ہاتھوں کی گرفت زور آور تھی۔

"میں تمہارا سیکنڈ آپشن بھی نہیں؟"

اسے اس اسٹیج پہ' اتنی بڑی بات ہو جانے کے بعد بھی بختاور سے اس بات کی امید ہرگز نہ تھی' دکھ' افسوس اور امید کے ساتھ وہ ایک آخری بار فیصلہ کن انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں تمہارا سیکنڈ آپشن بھی نہیں؟"

شانزہ نے راہداری مڑ کر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ اسے شیجی بولتا دکھائی اور سنائی دیا اور اسے بے یقینی کا شدید ترین دھکا لگا۔ اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر خود کو چیخنے سے روکا اور بے ساختہ پیچھے کو مڑی۔

"میں اس شخص کے لیے زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے جا رہی ہوں اور یہ آج بھی' اس وقت بھی ایک غیر عورت کے ساتھ کھڑا ہے۔" وہ اذیت کے شدید ترین احساس سے دوچار ہوئی۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا جیسے کبوتر طوفان سے بچتا ہو۔

اور ادھر بختاور نے ایک قطعی اور غیر لچک دار نہیں اس کے منہ پہ کھینچ مارا۔ اس نے جواباً" مارے غصے کے اس کو تقریباً" دھکا دیتے ہوئے چھوڑا۔ وہ بمشکل گرنے سے بچی تھی۔

مرد کی انا بس اتنی ہی ہوتی ہے وہ بھلا کب بار بار انکار سنتا ہے' آج اس نے بھی یہ انکار آخری بار سنا تھا۔ سولہ سالہ محبت کو اس انا نے بڑی سہولت سے پچھاڑ دیا۔ انکار سنتے رہنا' دھتکارے جانا اس کے لیے اذیت ناک تھا وہ کوئی عورت تھوڑے ہی تھا کہ مسلسل دھتکارے جانا برداشت کر لیتا اور مرد یوں ہی تو کیا کرتے ہیں۔ انا کے آگے باآسانی محبت قربان کر دیتے ہیں۔ محبت چاہے جتنی بھی دیرینہ ہو جب ان کی انا کے مقابلے میں آتی ہے تو پھر اسے ہارنا ہی پڑتا ہے۔

محبت اور انا کی آنکھ مچولی میں اکثر ہی ان کی محبت لمحوں میں چاروں شانے چت ہو جاتی ہے۔

ٹھیک اسی لمحے جب وہ بختاور کو دھکیل کر گرا رہا تھا۔ عطیہ بانو اور ڈاکٹر صاحب کمرے سے نکلیں۔ انہوں نے ان لوگوں کی تلاش میں گردن دائیں بائیں گھمائیں پھر جس طرف شانزہ کھڑی نظر آئی وہاں چل دیں۔ اس وقت وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر زرد دکھائی دیتی تھی۔

"آپریشن ہی ہو گا۔" عطیہ بانو نے بتانے کے ساتھ ہی اس کے شانوں پہ بازو پھیلایا۔ وہ عجیب سی ہذیانی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ وہ اس وقت یہاں کھڑے ہو کر رونا ہرگز نہیں چاہتی تھی مگر لاکھ کنٹرول کے باوجود وہ چیخ کر رو پڑی بلکہ چیخی اور اس کی چیخیں نہایت کرب ناک تھیں جبکہ آنکھیں مکمل طور پر خشک۔ ڈاکٹر صاحب اور عطیہ بانو دونوں ہی گھبرا گئیں شیجی بھی پل بھر میں وہیں چلا آیا شانزہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

"شانزہ!" شیجی نے زمین پہ اس کے پاس دو زانو بیٹھتے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا "کیا ہوا؟" وہ حد درجہ پریشان تھا۔

"ریلیکس!" اس نے محبت سے اس کے چہرے کو دبایا تھا۔ مگر اس وقت وہ نہ کچھ سن رہی تھی نہ محسوس کر رہی تھی۔ خشک ویران آنکھوں سے اسے دیکھتے وہ فقط یہی سوچ رہی تھی کہ جانے اس شخص کے دل تک رسائی کب حاصل ہو گی۔

جانے کب وقت اسے میرا صرف اور صرف میرا بنائے گا۔

حسرت سے اسے دیکھتی وہ سوچے گئی' وہ کچھ بول رہا تھا' اس کے قریب ہوتا اسے ساتھ لگاتا وہ اس وقت نہایت پریشان تھا۔

"کب میرے نصیب پہ پڑا بخت کا قفل کھلے گا......"

ذہنی صدمہ اس کے اوپر بری طرح طاری ہوتا جا رہا

تھا۔

میرے بخت کب کھلیں گے؟..... میں کب بخت آور بنوں گی آخر کب وقت مجھے نصیب والا بنائے گا۔

شجی اس کے گال تھپکاتا' اس سے کوئی بات پوچھتا' اس سے جواب لینے کی اس کو بات کرانے کی سعی کررہا تھا اسے اپنا وجود بے جان ہوتا محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا سامنے بیٹھے شخص کا گریبان پکڑ لے وہ آخر کیوں نہیں اس سے محبت کرلیتا۔ وہ آخر کیوں نہیں بس اس کا ہی ہوجاتا۔ اس نے اپنی چکراتی' اندھیروں میں ڈوبتی نظر اوپر اٹھائی۔

"اے نصیب لکھنے والے اسے میرا نصیب کردے۔"

اسے کہیں درد محسوس ہوا تھا' بلکہ نہیں اسے ہر جگہ ہی درد ہوا تھا۔



نرس نے اسے ایک فائل تھمائی' اس میں موجود پیپرز پہ اس نے سائن کرنے تھے۔ لمحہ بھر میں ہی اس نے اسٹیٹ منٹ پڑھ لیا اور وضاحت طلب نظروں سے ڈاکٹر صاحبہ کو دیکھا۔

"ان کے اس وقت اچانک نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے ہمیں تمام تر احتیاطی تدابیر کرنا پڑ رہی ہیں۔" وہ غالباً" اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھیں لہٰذا فوراً" بولی تھیں۔ اس وقت وہ سب آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے تھے۔

"ایسا کیسے ہوگیا ڈاکٹر صاحبہ؟ میں نے تو اسے آپریشن کے لیے بہت پہلے سے مینٹلی تیار کرنا شروع کردیا تھا۔"

عطیہ بتارہی تھیں مگر وہ اس وقت کسی کی بھی کوئی بات سن نہ پارہا تھا۔ اس کی سماعتوں میں ایک شور بپا تھا۔

"Truth and Dare کھیلیں گے میرے ساتھ.....؟" اس ننھی سی لڑکی نے ایک دفعہ کمبل میں دبکے دبکے مونگ پھلیاں کھاتے اس سے سچ اگلوانے کی خاطر..... اپنے تئیں ایک چال چلی تھی پھر وہ اسے اپنے بازو پہ سوتی دکھائی دی وہ اذیت پسندی سے ہنسا۔ اسے آج احساس ہورہا تھا کہ وہ گردن تلے سے تکیہ کھینچے جانے پہ اس روز کس قدر ہرٹ ہوئی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں۔" ایک نئی ایک مختلف ایک خوب صورت رات وہ چکن منچورین اور چکن کوفتہ رائس کے انتظار میں ٹیبل پہ کانٹا بجاتے بجاتے اچانک اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

"آپ شاید رات سو نہیں سکے؟" فکر ہی فکر پروا ہی پروا تھی۔

پھر اسے اپنی نانی کے گھر میں کھڑا ہونا یاد آیا اسے یاد پڑتا تھا اس نے پوچھا۔

"آپ روئی ہیں؟" اور اس کے آنسو جہاں تھے وہیں جم گئے تھے۔ آنسو تو آج بھی کسی کی آنکھوں میں تھمے تھمے جمے تھے۔ ہاں اس وقت اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو جمے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ نادم تھے۔

اچانک سے ایک بوریت زدہ تھکا دینے والا ٹریفک جام یاد آیا اور اسے یاد آیا کہ وہ تب بھی کتنی مطمئن کتنی مگن تھی۔

اس نے کرب سے اپنا لب دانتوں کے درمیان دبایا۔

وہ اس کے ساتھ ہمیشہ یوں ہی تو مطمئن رہتی تھی چاہے جگہ یا مقام کتنا بھی غیر آرام دہ کیوں نہ ہو۔ اسے یاد پڑتا تھا وہ اس وقت بھی رومانٹک ہورہی تھی اس نے کہا تھا پتا ہے مجھے تو یہ ایک پرفیکٹ میچ لگتا ہے۔'

اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر خود کو چیخنے سے روکا۔ اس کا دل درد سے پھٹنے کو تھا۔

وہ اسے اپنے سنگ لان میں ٹہلتی' بازاروں میں گھومتی ہوٹلوں میں چلتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ جس کے لیے ہمیشہ لاپروائی والا رویہ اپنائے رکھتا آج گنگ تھا کہ اسے تو اس کی باتیں ازبر ہیں۔

اس کے بولے گئے جملے حرف بہ حرف یاد ہیں۔ کبھی وہ اسے غصے سے آملیٹ پٹختی دکھائی دیتی' کبھی اسے ضد کرتے تپاتا۔

"نہیں شعجی! آج آپ مجھے بتائیں گے' ہر صورت لازمی طور پر۔" اور اس کے ساتھ ہی ایک احساس فخر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوا کہ وہ تو اسے بے حد بے حساب چاہتی تھی اس کی تو ضد میں بھی چاہ ہوتی تھی پیار ہوتا تھا مان ہوتا تھا۔

"آپ کی وجہ سے صرف اور صرف آپ کی وجہ سے میری زندگی کا سب سے خوب صورت ٹائم پیریڈ ڈر اور خوف کی نذر ہوگیا۔" اب کی بار اسے اس کا بالکنی میں کھڑے ہو کر خود پہ برسنا یاد آیا۔ اس کا دل بے آواز کراہا۔ وہ اس کے نصیب کا ستارہ تھی۔ وقت نے اسے بڑی شان سے اس کی زندگی میں داخل کیا تھا مگر وہ۔ اس کو خود پہ افسوس ہوا اور بے حد ہوا۔

اسے یاد آیا کہ اس نے خود ایک بار کسی سے کہا تھا کہ۔

"جو پرانی ہو جائیں وہ بھلا یادیں کہاں ہوتی ہیں' وہ تو ماضی ہوا کرتی ہیں۔" اسے مزید یاد نہ پڑتا تھا کہ اس نے یہ جملہ کس سیاق و سباق میں کہا تھا ہاں مگر اس کا روم روم اس وقت اس بات کی گواہی ضرور دے سکتا تھا کہ اس کی زندگی میں اگر کوئی شے اس وقت اپنی تمام تر تروتازگی کے ساتھ موجود ہے تو وہ صرف وہ ہی ہے۔

اس کے علاوہ..... اس کے پہلے..... اس کے بعد کا سب کچھ ماضی تھا صرف وہ ہی تھی جو اس وقت اس کے اندر اس کے باہر پوری شان اور مکمل تازگی کے ساتھ موجود تھی۔ کسی بھی زاویے سے اس کا وجود ماند نہ پڑتا تھا دھیمانہ دکھتا تھا پھیکا نہ نظر آتا تھا۔ تروتازگی نہ کھوتا تھا۔ دل و دماغ سے روح و نظر تک..... خوابوں سپنوں سے دعاؤں' آہوں تک ہر جگہ صرف وہ ہی تھی' وہ..... جو اس کی قسمت تھی..... وہ جو اس کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی' وہ..... کہ جس سے زیادہ وہ کچھ پا نہ سکتا تھا۔ ہاں وہ کہ جس کی محبت میں اس قدر شدید طور پر مبتلا ہونے کا احساس اسے آج تک اس وقت سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ وقت معین سے پہلے ہوتا بھی کیسے؟ اسے پتا تک نہ چلا اور نمکین پانی کا ایک قطرہ اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر اس کاغذ پہ آگرا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی اسے ہلا رہا تھا شاید متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

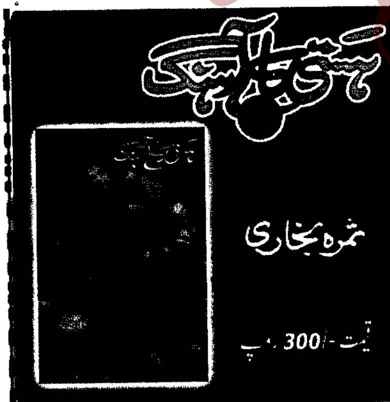
"ہوں... ہاں.... کیا؟" غائب دماغی کی کیفیت میں بولتے اس نے دیکھا کہ وہ اس کی امی تھیں جو اسے کچھ بتا رہی تھیں شیخی کو اس وقت ان کی کوئی بات سنائی نہ پڑتی تھی۔

اس کی نگاہیں ایک بار پیپر کی طرف واپس گئیں پھر ماں کے چہرے پہ آٹھہریں۔ وہ شانزہ سے بہت محبت کرتی تھیں۔

مگر آج اگر انہیں یہاں اس پیپر پہ سائن کرنے پڑتے تو؟ شیخی نے سوچا۔ وہ اس کی ماں تھیں' وہ انہیں جانتا تھا سمجھتا تھا وہ اولاد کی اولاد کے لیے اس قدر جذباتی تھیں کہ چناؤ کا وقت آن پڑتا تو وہ اولاد کی اولاد کو ہی شاید ترجیح دے جاتیں۔

پچاس کی دہائی کو چھوتی عمر کے ساتھ پہلی اولاد کا تصور تھا تو اس کے لیے عزیز از جان مگر اسے خود پہ حیرت ہوئی کہ چناؤ کے وقت اس کے دل و دماغ نے سوچنے کے لیے لمحہ بھی نہ لگایا بنا چوں چراں کے..... بنا کسی وقت کے اس کا قلم شانزہ کے نام کو چھو گیا تھا۔

سماعتوں میں بپا شور پہ دھیان لگانے سے بھی پہلے وہ اس کے نام پہ دستخط کر چکا تھا۔ ایک طرف وہ (اولاد) تو جسے اگر جہان بھر کی دولت دے کر خریدنا پڑتا تو وہ خرید لیتا۔ جسے اگر دل گروہ آنکھیں بیچ کر بچانا پڑتا تو وہ



بچالیتا۔

اور دوسری طرف اس اولاد کی ماں تھی۔ جسے اس نے اولاد کے بدلے بچالیا۔

اور تب اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے لیے تھی کیا!

وہ جو روز اول سے یہی سمجھتا رہا کہ اسے اس سے محبت نہیں ہے تو درست ہی تو سمجھتا رہا تھا اسے اس سے محبت بھلا کب تھی۔ اسے تو اس سے عشق تھا۔

شاید یہ ابھی ابھی ہوا تھا یا شاید بہت پہلے سے اندر کہیں کونے کھدرے میں چھپا تھا مگر جو بھی تھا' یہ زور آور انتہا کا تھا۔ اسے سامنے سے سنجیدہ بے تاثر چہرے والی بختاور آتی دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھ کر فوراً مسکرایا۔

اس کے مارے گئے پتھر (نہیں) کی وجہ سے ہی اس کا قبلہ درست ہوا تھا تو وہ بھلا اس کا جنون کیونکر نہ ہوتا۔ اب کی بار اس سے صرف دیر ہوئی تھی' غلطی نہیں۔ اب کی بار وہ درست جگہ پہ پہنچا تھا۔

بختاور کی دس سالہ دعاؤں سے کہیں زیادہ بار آور تھیں شانزہ کی ایک سالہ دعائیں۔

اس کی دس سالہ محبت ریاضت اور عبادت کے باوجود بھی وہ اسے وقت سے پہلے نہ مل سکا تھا' نصیب سے زیادہ نہ مل پایا تھا۔ جب وہ اسے دھکیل کر گرا رہا تھا۔ تب ہی وہ سمجھ گئی کہ اب اس کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ شجی کی محبت مزید اب اس کے نصیب میں نہیں رہی ہے۔

اب وہ کسی اور کے نصیب کا ستارہ بن کر چمکنے والا تھا ننھی سی معصوم سی شانزہ۔ جسے کبھی ڈھنگ سے وقت ملا ہی نہ تھا کہ نہ وہ نئی شادی شدہ زندگی کو انجوائے کر سکی نہ ہی پریگننسی میں ریلیکس رہی..... جس نے اپنا وقت شروع ہونے کا بڑی قناعت اور بہت صبر سے انتظار کیا اب وقت اس کا تھا۔

عطیہ بانو بینچ پہ بیٹھے مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں وہ مضطرب لگتی تھیں۔ شجی البتہ پرسکون تھا اسے ان کی طرح آپریشن تھیٹر سے باہر کسی دو کا نہیں' بلکہ ایک ہی ہستی کا انتظار تھا اور شدید انتظار تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا۔ شانزہ سے وہ کوئی بھی سزا لینے کو تیار تھا مگر اللہ تعالیٰ سے اس کو صرف معافی چاہیے تھی وہ چپکے سے اٹھا اور جائے نماز کے کیپشن والے کمرے میں جا گھسا۔

یہاں وہ بچوں کی طرح رویا جی جان سے گڑگڑایا۔ بہت دعائیں بہت معافیاں مانگیں' اللہ کا کرم اللہ کا فضل مانگا کسی بھی سزا سے پناہ مانگی۔

میرے اللہ! میری سمت کی درستگی کو اگر اب اس وقت میرے نصیب میں لکھا ہے تو مجھے مہلت بھی دے مجھے کفارہ ادا کرنا ہے میرے مالک! مجھے شکر ادا کرنا ہے مجھے حق ادا کرنا ہے۔ وہ روتا رہا گڑگڑاتا رہا' احساس ندامت کے ساتھ توبہ کرتا معافی مانگتا سجدے میں گرا رہا۔

آزمائش کا امتحان کا وہ وقت مختصر ہونے کو ہی نہ آرہا تھا خیر وہ خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھولی پھیلائے دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو گیا تھا۔

جانے کتنی دیر گزری تھی کہ اسے عطیہ بانو کی آواز آئی' وہ یوں سنائی دیتی تھی جیسے کہیں دور سے آرہی ہو۔ شاید وہ اسپتال کی کسی دوسری طرف سے یہاں اس جائے نماز کی طرف آرہی تھیں شاید وہ کسی سے بات کر رہی تھیں۔ وہ سجدے کی حالت سے اٹھا ہاتھ کی پشت سے گالوں کو خشک کیا۔ شاید وہ اسے تلاش کر رہی تھیں۔ شاید وہ فون پہ مصروف تھیں۔

وہ کچھ بھی یقین سے نہ کہہ سکتا تھا ہاں مگر ان کی آواز سے اس کو یہ یقین ضرور ہو چلا تھا کہ وہ اس وقت بے حد خوش تھیں اسے دل میں ڈھیروں سکون اترتا محسوس ہوا۔ وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ نہ کسی کو ہدایت ملتی ہے نہ محبت۔ مزید صبر اب شانزہ کو نہیں کرنا تھا اس کے نصیب میں اب انتظار نہیں محبت تھی' جو اس وقت سے پہلے اس کے نصیب میں نہیں تھی' اور اب اس وقت وہ اس کے علاوہ مزید کسی کے نصیب میں نہیں تھی۔

☆

عندلیب زہرا

خوشبو بھری ساعتیں

ملہا کی خوشیوں کی مالا حویلی سے وابستہ تھی۔ رحیم یار خان میں واقع اونچی دیواروں اور بلند اسیلوں والی حویلی.... جس کا پھاٹک بہت مضبوط اور وزنی تھا اور یہ ساری حویلی سرسبز و شاداب دکھائی تھی کیونکہ یہاں کے مکینوں کو پودوں، درختوں اور پھولوں سے گہری انسیت تھی۔



"اگر حویلی اور اس میں سرو کا درخت نہ ہو تو عید کا چاند کبھی نہیں نکلے گا۔"
یہ ماہا کا یقین کامل تھا۔ کیونکہ خربوزے کی قاش جیسا، پہلی رات کا چاند درخت کی اوٹ سے اپنی جھلک دکھلا کر مسکراتا ہوا غائب ہو جاتا۔
کراچی کی روشنیاں، ہنگامہ پرور زندگی، سمندر کی لہروں کا کھیل اور موج مستی، رونق، چہل پہل ایک طرف۔۔۔
لیکن اسے سارا سال عید منانے کے لیے حویلی جانے کا انتظار رہتا۔ جب سب کزنز اور رشتے دار اکٹھے ہو کر چھٹیوں کا لطف دوبالا کرتے۔
"عید کی خوشی بلکہ ہر خوشی کا لطف اپنوں کی موجودگی میں ہی دگنا ہوتا ہے۔" ماہا کے ابو ہمیشہ یہی کہتے۔
عید سے پہلے سب بہن بھائی حویلی صاف کرتے، سجاتے، کھانے پینے کا اہتمام کرتے اور چاند رات کو تو گویا دھرتی کی ساری رونق اس حویلی میں جمع ہو جاتی۔
لڑکیوں کے نقرئی قہقہے، ماؤں کی گھرکیاں
تایا، ابو اور چچا کی تیاریاں اور شوخی لیے لڑکے۔۔۔
بہنوں کو تنگ کرتے، کپڑوں پر فقرے چست کرتے۔۔۔
نئے کپڑوں کی خوشی اور عیدی کے سہانے سپنوں میں کھوئے معصوم بچے۔
ہما کو مہندی لگانے میں کمال حاصل تھا۔ سو ساری لڑکیاں اس کی خدمات حاصل کرتیں۔
"آپی! ہمارے بھی چاند تارا بنا دیں۔" لڑکے فرمائش کرتے، بظاہر ہما آپی ناراضی کا اظہار کرتیں لیکن کسی کی فرمائش رد نہ کرتیں۔
ماہا کو تائی اماں کے ہاتھ کی دودھ والی سویاں پسند تھیں تو ردا کو چچی کے ہاتھ کے کوفتے۔
اگلے دن کی روشن، چمکدار، خوشبو بھری ساعتوں کا آغاز رب جلیل کے بابرکت نام سے ہوتا۔ میٹھی دودھ والی سویاں، عیدی، جھولوں پر بیٹھنا، غبارے خریدنا، رنگین عینکیں لگانا، کس کی کتنی عیدی جمع ہوئی یا ہتھیلیاں آگے کر کے دیکھنا کہ کس کی مہندی کا رنگ گہرا آیا ہے؟
"عید کے دن دادی اماں روتی کیوں ہیں؟ سب اتنے خوش ہوتے ہیں اور وہ آنسو بہا رہی ہوتی ہیں؟"
"خوشی کے موقع پر انہیں بچھڑ جانے والے، دور دیس میں رہنے والے بہت یاد آتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے آنسو بہاتی ہیں۔" اس کے استفسار پر امی نے بتایا۔
ماہا دادی کے پاس بیٹھ کر انہیں اپنی سہیلیوں کے قصے سناتی تاکہ وہ زیادہ اداس نہ رہیں اور ہوتا بھی یہی۔ اس کا انداز اتنا بے ساختہ اور دلچسپ ہوتا کہ دادی کے لب مسکرا اٹھتے۔
پہلے دن کا کھانا (دسترخوان) دادی کی طرف ہوتا۔ پر تکلف، پر لطف، محبت و مروت سے سجا وسیع دستر خوان۔۔۔
دادی عید کے پہلے دن کی دعوت سب رشتہ داروں کو دیتیں۔ جو ناراض ہوتے انہیں منانے میں جھجک محسوس نہ کرتیں۔
"میری حویلی سے کوئی ناراض یا افسردہ ہو کر نہ جائے۔" وہ ساری اولاد کو نصیحت کرتیں۔
"دادی! چھوٹے نانا کو آپ خود منانے گئیں۔ وہ خود بھی تو آسکتے تھے۔" نخریلے اویس کو دادی کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔
"بڑی دادو کی ہمیشہ آپ دعوت کرتی ہیں وہ خود تو کبھی نہیں کرتیں۔" مومنہ کو غصیلی دادو کبھی پسند نہ رہی تھیں۔ غصہ جن کی ناک پر دھرا رہتا۔
"کیونکہ میرے لال! مجھے اپنی انا سے زیادہ یہ رشتے عزیز ہیں۔ یہ دن، تہوار، تو شاید گزر جائیں لیکن اس دن کی محبتیں، چاہتیں ہمیشہ یاد رہ جاتی ہیں۔۔۔ اور بہنوں کے دل بھائیوں کے لیے تو وسیع ہوتے ہیں۔"
وہ پیار سے بچوں کو سمجھاتیں۔
عید کا دن اپنی خوشیوں سمیت اختتام پذیر ہو جاتا لیکن دادی کی بات وہ دن اپنی چاہتوں اور محبتوں سمیت

سب کی یادداشت میں سنہری یاد بن کر جگمگاتا رہتا۔ خاندان کے کتنے ہی لڑکے اور لڑکیوں کی نسبت اسی دن دادی کے ہاتھوں سرانجام پاتی۔



وقت کا پنچھی اپنی اُڑان بھر چکا تھا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے تو بڑے بوڑھے... کچھ بوڑھے ملک عدم سدھار چکے تھے۔ اور کچھ زمانے کے بدلتے رنگ دیکھ رہے تھے۔

دادی کی وفات کے بعد حویلی کی رونقیں اور چہل پہل ماند پڑتے پڑتے ختم ہو گئی تھی۔

اب حویلی ایک یاد تھی بھولی بسری...

غم روزگار میں الجھے لڑکے 'تو نئی زندگی کے پیچ و خم میں الجھی لڑکیاں...

کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ حویلی کے در و دیوار آج بھی اپنے مکینوں کی راہ تکتے ہیں۔ ان کے منتظر ہیں۔

ماہا کے نصیب کی ہوائیں اسے نیویارک لے گئیں۔ حساب کتاب میں الجھا شوہر' یکسانیت بھرے دن اور پھیکے تہوار۔ وہاں کی مشینی زندگی میں وہ خود بھی مشین بنتی جا رہی تھی ہاں بھی کبھی بچپن کی یادوں میں سے کوئی یاد جب چٹکی بھرتی تو سبزے سے ڈھکی حویلی کا تذکرہ لازمی ہوتا۔

"ماما! آپ کی حویلی تو ونڈر لینڈ تھی۔"

"آخر سب لوگ ایک وقت میں اتنے فارغ کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیا ان کی جاب نہیں تھی؟"

"اتنا فوڈ اتنے لوگوں کے لیے کافی ہوتا تھا امیزنگ!"

"مام! آپ سب حویلی میں اکٹھے ہوتے اور کوئی ٹینشن بھی نہ ہوتی واؤ..." اس کے جدید دور کے جدید بچے اپنی ڈیجیٹل سوچ کے مطابق تبصرے کرتے۔

"آئی تھنک مام! آپ سب ریلیٹوز میں پیار بہت تھا اور جہاں پیار ہو وہاں ایگو نہیں ہوتی۔" انعم نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ وہ اپنے مزاج اور سوچ کے اعتبار سے ماہا کا عکس تھی۔ مشرقی اور محبت کرنے والی۔

انعم کے جملے نے ماہا کے ذہن پر دستک دی۔ اور کسی پرانی یاد کا کواڑ کھل گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔



رحیم یار خان کی حویلی کے آنگن میں لگے پیڑ اور پکوانوں کی خوشبو... نقرئی قہقہے' مہندی اور سوندھی مٹی کی مہک...

"میں ملنے میں پہل اس لیے کرتی ہوں کیونکہ مجھے اپنی انا سے زیادہ رشتے عزیز ہیں۔"

کسی کے محبت بھرے جملے نے ذہن پر دستک دی تھی۔

"ہاں! اس مشینی زندگی اور انا نے ہم سب کو ایک دوسرے سے کتنا دور کر دیا ہے۔" ماہا نے سچائی سے اپنا تجزیہ کیا۔ کئی برس بعد اس کا پاکستان چکر لگتا اور مہینے دو مہینے شاپنگ اور سسرالی عزیزوں سے ملنے ملانے میں گزر جاتے۔ اس نے پاکستان کال ملائی۔

"ابو! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال ہم سب عید پرانی حویلی میں منائیں گے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہہ دیا۔

"ضرور بیٹا! ہم سب کی آنکھیں تمہاری دید کی منتظر ہیں۔" امی کی بھیگی آواز نے اس کی پلکوں کو بھی بوجھل کر دیا۔

"ہاں آپی!"

"ضرور ماہا... ہم سب وہیں پہنچ کر تمہارا انتظار کریں گے۔"

"یس پھپھو! ہم سب آپ کے منتظر ہیں۔"

بڑے بھائی' چھوٹا عمر' بھتیجے... بہنیں سب کی ملی جلی آوازیں اسے احساس دلا رہی تھیں کہ عید کی خوشیاں اس کے دامن میں آ گئی ہیں۔

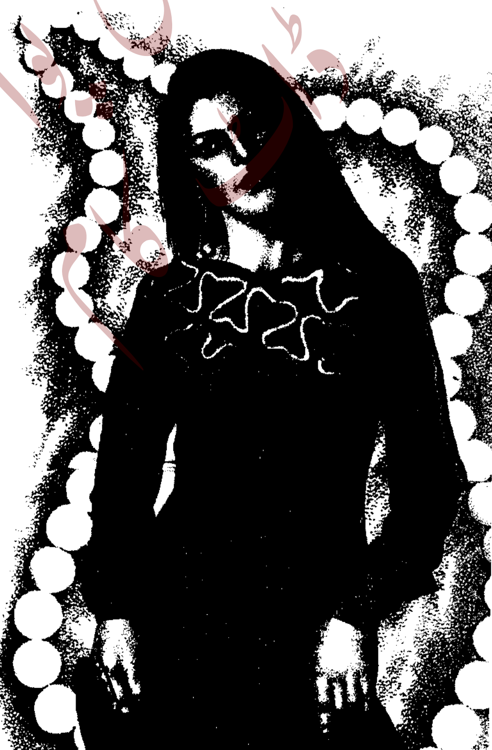


مصباح علی

میرا راج دلارا

پرانی طرز کی مسہری پر وہ اوندھے منہ سویا ہوا تھا، کہ اچانک اس قدر زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا کہ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا۔ پہلا خیال یہی آیا تھا شاید قیامت آگئی کیونکہ جس قدر زور سے وہ گرا تھا صرف وہ ہی جانتا تھا۔ زلزلوں میں عمارتیں ہل کر گرنے کا ذکر سن رکھا تھا یا موت

ناولٹ



کے منظر میں کہ جب قیامت آئے گی ہر چیز بے وزن ہوئی اڑتی پھرے گی، ایسے میں اسے سب سے پہلے اپنے منحنی سے وجود کا خیال آتا، کیسے قابو کرے گا۔ اب اس وجود کے ساتھ حیا کا حوالہ بھی جڑ گیا تھا۔ ہر وقت یہی دھیان رہتا جانے رخصتی پہلے ہوگی یا قیامت۔۔۔ اور آج تو قیامت آہی گئی، اینٹیں ہل کر گرنے سے اس کے گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی تھی، دو مہینے ہوگئے تھے' یہ وہ ہی جانتا تھا اس طرح اچانک گرنے سے اس کا جسم کہاں کہاں سے کتنا دکھتا تھا، گھٹنے رگڑتا ہوا سیدھا ہوا۔ دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔

"اٹھ جا عمر ایاز، اور کتنا سوئے گا"

بھابھی کی توپ جیسی آواز پر اندر تک کڑواہٹ بھر گئی۔

اس نے چلا کر کہا تھا، "رخصتی تک"۔

"ہیں۔۔۔؟"

بڑی بھابھی کو مزاح سمجھانا صرف بھائی جان کو ہی آتا ہوگا۔ عمر نے گردن جھٹکی۔

"آرہا ہوں۔۔۔ پہلے اینٹیں تو ٹھیک کرلوں"۔

"کیا ٹھیک کرلوں۔۔۔"

"اپنی قسمت۔۔۔"

اینٹوں کا ماجرا بھی اس کی قسمت میں سات بہن بھائیوں کے نور ظہور کی وجہ سے تھا۔ اچھی بھلی اماں ابا کی چھوڑی وراثت میں بھلے پرا سہی مگر پوری مسہری تو آئی تھی۔ بہن بھائی با سامان کی طرح یقیناً وہ بھی لے جاتے اگر

کے گھر میں اتنی گنجائش نکلتی۔ بڑی آپا نے البتہ یہ کہہ رکھا تھا۔

''جب تک تیری رخصتی ہوگی، میں اوپر کمرے ڈلوالوں گی، خبردار جو میری ماں کی نشانی بیچی،، تیسرے نمبر والی مصنفہ آپا نے بھی لگاوٹ سے ذکر کیا تھا۔

'' میرے جان سے پیارے بھائی، اس مسہری کو بیچنے کا سوچنا بھی نا، ہندوستان سے اٹھا کے لائے تھے ابا، تاریخی ہے تاریخی، میں نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے، جب تیرا جہیز آجائے گا تب تک میں سسرال سے لڑ جھگڑ کر الگ ہو ہی جاؤں گی ۔۔۔ بس پھر'' ......خود ہی تالی مار کر



ہمیشہ کی طرح ہنس کر دہری ہوتے ہوئے "اس کی پائینتی سرہانے رسیاں ڈلوا کر جھولا بنوالوں گی۔ جھولے میں بیٹھ کر تو ایسے تاریخی قصے لکھے جائیں گے، افف۔۔۔(جھرجھری) کیا نسیم حجازی نے لکھے ہوں گے"۔

دوسرے نمبر والی پیرنی آپا کو اس پر بیٹھ کر چلّہ کاٹنا تھا۔ وائے ری قسمت، گھر کرائے کا تھا۔ آئے دن بدلو، اتنی چلّے سے کمائی نہ ہوتی جتنی مسہری اٹھائے اٹھائے ریڑھی والوں کو دینی پڑتی۔

چوتھے نمبر والی کو پرانی چیزوں سے رغبت نہیں تھی، اس نے صاف کہا تھا۔

"بیچ منحوس کو، ایویں دیمک لگ جائے گی۔ جو پیسے آئیں، آدھے آدھے کرلیں گے"۔

اور سب سے چھوٹی آپا کو خیر سے روزِ قیامت کی طرح یقین تھا جتنا ان کی مٹھی میں عمر ہے، ان کے سوا کسی کو دینے کا سوچے گا بھی نہیں، بس اس سرکاری فلیٹ میں اللہ جگہ بنادے۔ اب رہ گئے دونوں بھائی تو ان کے لے جانے کو اتنا کچھ تھا کہ مسہری سے نگاہ مروتاً چرالی، آخر عمر ایاز نے بھی تو سزائے حیات کاٹنی تھی۔ اب اگر مسہری ان کے شر سے بچ گئی تو خیر سے اتنی اولاد تھی بغیر لحاظ و تمیز کے سب کے سب اس پر بیٹھ گئے۔ ڈیئر قارئین آپ یہاں پر الجھ گئے ہوں گے بھلا ایسی کیا قیامت آگئی کہ سب کے سب اس پر بیٹھ گئے۔۔

تو قصہ دو ماہ پہلے کا کچھ یوں تھا۔

نمازِ عید الفطر کے بعد سب بہن بھائی حسب عادت بڑے بھائی جان کے ہاں سالانہ اجلاس میں مدعو تھے۔ قضیہ وہ ہی عمر کی رخصتی کا تھا، یعنی کہ حیا کی۔۔۔ بارات میں کون کون اور کتنے افراد جائیں گے؟ طے یہ پایا دونوں بھائی جائیں اور حیا کے ابا سے ڈیل کرآئیں۔ سننے کی دیر تھی۔ سب بھانجے بھتیجے، بھانجیاں چڑھ گئے اس غریب مسہری پر، بڑی بھانجی کچن کی طرف بھاگ گئی ڈھول پیٹنے کو کچھ ڈھونڈنے، بہنوں کا جہاں جسم سمایا بیٹھ گئیں ایک دوسرے کا منہ تکنے، مصنفہ آپا کو ہمیشہ سے اپنے خوبصورت چہرے پر چھوٹی آنکھوں کا قلق رہتا تھا، حسب خواہش اتنا مسکارا لگایا کہ پلکیں آپس میں اس قدر جڑ گئیں کہ ہر چیز لرزتی دکھائی دے رہی تھی۔ بھلا ہو بڑی آپا کا جنہوں نے دیکھا اور ایک دھموکا جڑا۔

"اے تو پاگل تو نہیں ہوگئی، نابیناؤں کی طرح بارات میں جائے گی، ودھائیاں اکٹھی کرنے کو تجھے بھائی کی بارات ہی ملی"۔

مصنفہ نے کانپتی پلکوں سے آپا کو نخوت سے دیکھتے سوچا۔

"کاش آپا تیری موٹی آنکھوں میں موتیا اترے۔۔۔ پھر پتا چلے گا، نابینا کسے کہتے ہیں"۔

آپا کسی اور سے بات کرنے کو مڑیں، مصنفہ نے جھٹ سے آپا کے دوپٹے کے پلو سے مسکارا کچھ کم کیا، واقعی دیکھنے میں مشکل ہو رہی تھی، سب سے چھوٹی والی کے لپ اسٹک زیادہ لگ چکی تھی، عمر کے کمرے میں ٹشو نام کی کوئی چیز نہیں تھی، دل میں اس کی کنجوسی کو کوستے اس نے چپکے چپکے مصنفہ کی قمیص کے دامن سے ہونٹ رگڑ ڈالے، پیرنی آپا نے منہ پر قیامت خیزیاں مچا کر دوپٹا کسا اور کوئی ورد کرنے لگیں، بھابیاں ان کے رنگے منہ دیکھ دیکھ کر کلس رہی تھیں، بس نہیں چلتا تھا ان کے منہ پر بلڈوزر پھیر کر میک اپ کٹ کے ڈبے بھر دیں۔ چوتھے نمبر والی فطرتاً کنجوس تھی سو گھر سے تیار ہو کر آئی تھی، اتنا مہنگا میک اپ اگر کسی نے مانگ لیا تو خوامخواہ غربت کا رونا رونا پڑے گا۔ اب وہ آپا تمام بچوں کا جلوس لیے، ماہیا گاتی، تالیاں پیٹتی بڑی بھانجی کے انتظار میں تھی کہ ڈھول کے لیے کچھ ڈھونڈ لائے۔۔۔ زور کی ہانک لگائی۔

"اے بیلا۔۔۔ دفع بھی ہو۔ کچھ مل نہیں رہا

تجھے۔کوئی پرات ہی اٹھالا"۔

ایک پرات میں چننے کے لیے چاول رکھے تھے، بیلا بی بی نے چاول سلیب پر الٹے، اور بجائی ایک ٹانگ پر اچھلتی بھاگی آئی۔ یہ الگ قصہ ہے کہ بعد میں بڑی بھابھی نے اس سے اور اس کی اماں سے کیسے چاول چنوائے اور پکوائے بھی، لیکن فی الوقت وہ دھان پان سی لڑکی اچھل کر مسہری پر دھم سے آبیٹھی اور۔۔۔

"دھڑام"۔

ساری کابینہ آن واحد میں زمین بوس ہوگئی۔ یوں اچانک کابینہ گرے تو اللہ یا کابینہ ہی جانتی ہے، کس کے کہاں کہاں چوٹ آئی مگر بھابھیوں کے اندر تک سکون اتر گیا تھا، انہیں بیٹھنے کو جگہ نہ ملی تھی نا۔۔۔

چھوٹی بھابھی نے باقاعدہ بڑی بھابھی کے کہنی سے ٹھوکا دیتے سرگوشی کی۔

"بڑی آئیں لیپا پوتی کر کے دولہا کی گاڑی میں جانے والیاں، اب کولہے سہلاتی ایمبولینس میں جائیں گی"۔

بڑی بھابھی نے سنتے ہی ہونٹ جوڑ کر بے ہنگم قہقہہ مارا، ایسی افریقیوں والی شکل بنی تھی واللہ۔۔۔ اگر یہ کوئی اور وقت ہوتا تو نندیں اس شکل کا اتنا مذاق اڑاتیں کہ حد نہیں مگر اس وقت سب اپنا جسم سہلاتیں بھابجی کے وزن کو کوس رہی تھیں۔

"کم کھایا کر، کیوں دنیا میں کال ڈالنا ہے"۔

☆☆☆

قارئین یہ قصہ تو تھا عمر ایاز کے کمرے کا لیکن سڑک پر اس سے بھی دلچسپ فلم چل رہی تھی۔ بھائی جان اور بھیا آپس میں گفتگو کرتے حیا کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے گھر کی نزدیکی مسجد کے سامنے چھوٹی میز کرسیوں پر گلاس نما اسپیکر رکھے بہت سے افراد فطرانہ اکٹھا کر رہے تھے، بھیا کی نگاہ ایسے موقعوں پر بہت تیز ہو جاتی تھی۔ دور سے ہی عمر ایاز کو پہچان لیا، آنکھیں پھٹیں، منہ کھل گیا، ہونق پنے سے بھائی جان کو کہا تھا۔

"وہ اپنا عمر نہیں لگ رہا؟"

بھائی جان نے بھی آنکھیں سکیڑتے غور کیا۔ یقین آنے پر سکڑی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر کیا تھا قارئین، کچھ نہ پوچھیں، وہ دبے پاؤں پیچھے سے گئے۔ گدی سے دبوچ کر اٹھایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ بھائی جان کے بھاری پنجے میں ایسے لٹک رہا تھا جیسے کارٹون میں ٹام نے جیری کو اوپر اٹھالیا ہو۔

"سالے تو یہاں فطرہ اکٹھا کر رہا ہے۔۔"

بھائی جان نے ڈپٹا تو بھیا کو بھی ہوش آگیا۔

"بے غیرت اب تیری یہ اوقات رہ گئی ہے"۔

نگاہ حیا کے ابا پر گئی، ان کا اطمینان دیدنی تھا۔ ایک کہنی میز کی ہتھی پر جمائے دوسری پشت پر رکھے ذرا ترچھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ عمر نے حمایت طلب نگاہ سسر پر ڈالی تو وہ پوری بے مروتی سے پیسے جیب میں ڈالتے اٹھے۔

"بھیا! یہ تمہارا گھر کا معاملہ ہے، میں بولوں گا تو بات بگڑے گی"۔ کہتے چلتے بنے۔

بھائی جان کو تپ چڑھ گئی۔ گدی پر گرفت سخت ہوئی۔

"بے غیرت، اس حیا کے لیے تو بے حیا بن گیا۔۔۔ اب صدقے خیرات اکٹھی کرے گا"۔

بھیا کو بھی جوش آیا۔ انہوں نے ایک دھموکا پیچھے سے جڑا۔

"کمینہ رخصتی کے لیے مرا جا رہا ہے۔۔۔ بھکاری تک بننے کو تیار ہوگیا"۔

بھیا کا معاملہ تھوڑا الگ تھا، انہیں اس بات کا قلق تھا "اس (گالی) کی جرأت ہوئی کیسے خود سے نکاح کر لے ہمیں تو موقع نہ ملا، اماں ابا نے پسند تک نہ سنی۔ شکیلہ، راحیلہ، انیلہ، نادیہ،

شادیہ۔ خاندان کی کتنی لڑکیوں سے دھواں دھار عشق لڑایا، اماں ابا کی منتیں تک کیں پر کس سے مس نہ ہوئے، دنیا سے جانا تھا تو کچھ پہلے ہی چلے جاتے، میں بھی موقعے سے فائدہ اٹھاتا۔۔۔ پر نہ جی، جاتے جاتے گلے میں اپنی مرضی کا ڈھول لٹکا گئے، اب یہ اللہ یا محلہ جانتا تھا ڈھول بن کر صبح شام کون زیادہ پٹتا تھا۔

بھائی جان کا دکھ بھی کچھ کم نہ تھا۔ کہنے کو تو انہوں نے بھی بی۔ کام کر رکھا تھا مگر نوکری کے لیے ابا نے رشوت نہ دی۔ سفارش بھی نہیں بہت منتیں کیں، زمانے کی چال سمجھائی مگر انہیں عاقبت کی فکر تھی، اولاد کے مستقبل کی نہیں، پلاسٹک کے لوٹے، ڈبے، کولر، وائپر، ایک دکان میں بھر کر۔ بٹھا چھوڑا ''کماؤ کھاؤ''۔۔۔ اور یہ بے حیا۔۔ سوچتے ہی عمر کے چانٹا۔

''ادھر ایم۔ کام پورا ہوا نہیں، ادھر خود بخود نوکری مل گئی۔ چلو مانا قسمت اچھی مگر نوکری کے ساتھ لڑکی بھی پسند کر لی، ارے واہ تیری قسمت کی ایسی کی تیسی۔۔''

دو تین دھموکے پھر جڑے۔ ''چل سالے، تیری تو خبر گھر جا کر لیتے ہیں''۔

وہ دھموکوں اور ٹھونسوں کے فل پروٹوکول میں گھر تک آیا تھا۔

☆☆☆

مسہری کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور فوری حل کے لیے بچہ پارٹی کو سڑک سے اینٹیں جمع کرنے پر لگایا گیا، پھر طریقے سے مسہری کو مصنوعی سہارا دے کر اونچا کیا گیا، ایک ایک نے بیٹھ کر ہل کر، اچھل اچھل کر دیکھا، جہیز کا سامان آنے تک گزارہ ہو سکتا تھا۔ نئے سرے سے ڈھول کی تیاری شروع ہوئی چاہتی تھی، آپا نے راگ الاپا کہ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔

''لو اور سنو۔۔۔ اپنے شہزادے کے کرتوت''۔ بھیا دروازے سے ہی چیخے۔

بہنوں نے دل تھام لیا۔ عمر ایاز چوروں کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔

''انہیں کیا سنا رہا ہے، ان کے لاڈ پیار نے ہی بگاڑا ہے''۔

بھائی جان ہمیشہ کی طرح الزام دوسروں کے سر ڈال کر بری الذمہ ہوتے ایک جانب ہو گئے۔ بڑی آپا دل تھام کر آگے بڑھیں۔

''کیا ہوا، کیا ہوا۔۔۔ اب کیا کر دیا میرے بچے نے، کیوں بچے کے پیچھے پڑے ہو''۔

''بچہ نہیں ہے یہ''۔ بھائی جان چلا ہی پڑے۔

''مسجد کے باہر اس حیا کے باپ کے لیے فطرے کی پرچیاں کاٹ رہا تھا''۔

''اور ہماری ناک''۔ بھیا نے پھر دھموکا جڑا۔ ''ایں۔۔۔!'' بڑی آپا صدمے سے دو چار ہوئیں۔ ''شکل تو تیری تھی ہی ملنگوں جیسی، کمینے حرکتیں بھی شروع کر دیں''۔

''آئے ہائے! پھر کیا ہوا؟'' پیرنی آپا کے خون نے جوش مارا بھائی کو بچانے آگے بڑھیں۔

''ثواب کا کام ہی ہے، خود تھوڑی رکھے گا، غریب غربا کے لیے کر رہا ہوگا''۔

''آں ں ں!'' چوتھے نمبر والی نے ڈھول بنی برات پھینکی ایک طرف اور اپنی ناک سے مخصوص ہوٹر جیسی آواز نکالی۔ ''اس حیا بے حیا سے زیادہ کوئی غریب ہوگا، دھیلے دھیلے پر جان دے رہی ہے کم بخت۔۔۔ آپ کیوں نہیں تھیلا لے کر چل پڑتیں، ہمارے بھائی کو بھیج دیا مانگنے کے لیے، اور تو'' کہنی سے ٹھوکا دیا۔ ''اب تھا تیرے پاس ٹائم؟ میں نے اس دن کہہ دیا اپنے بھائی کے ساتھ بال لینے لاہور چلا جا، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، کیسا صاف انکار کر دیا تھا''۔ منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ ''بینک سے چھٹی نہیں ملتی''۔ ایک دھپ لگاتے ہوئے۔ ''مانگنے

کے لیے دے دی چھٹی تیرے بینک نے"۔
مصنفہ نے آہستگی سے کان میں پوچھا تھا۔
"کوئی شوٹنگ وونگ کا چکر تو نہیں تھا، بتادے ایسے ہی خوامخواہ پٹے جا رہا ہے۔ میرا اسکرپٹ ہوتا تو کم ازکم ہیرو یوں سرعام نہ پٹتا"۔
بڑی بھابھی نے طنزاً ناک چڑھاتے سوچا۔
"ہیرو کی شکل تو دیکھو"۔
بھانجے نے اشارے کناروں میں پیسے پوچھے تھے۔ کتنے جمع ہوئے، البتہ بھانجی کو کچھ ہمدردی ہوئی جب سب لعنتیں ڈال کر آگے پیچھے ہوئے، بھاگ کر گئی۔ ٹھنڈے جوس کا گلاس لے آئی، ادب سے پیش کرتے کہا تھا۔
"ماموں!" ماموں کی بے بس نگاہیں اوپر اٹھیں، وہ دلار سے بولی۔
"آج دودھ پلائی کا تو چانس نہیں، جوس پلائی سہی۔۔۔ یہ پیو اور مجھے تازہ کمائی سے نیگ دے دو"۔
ماموں نے خون خوار نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ جی چاہا یہ ٹھنڈا جوس اس کے فٹ بال نما منہ پر ہی الٹ دے۔ اور کبھی ان میں سے کسی کی شکل نہ دیکھے۔

☆☆☆

جب ہڈیاں ٹوٹ رہی ہوں تو ایک مسہری کے ٹوٹنے کا کتنا غم اور کہاں تک مناتا، صبر شکر کرتا اسی پر دن گزار رہا تھا کبھی تو رخصتی ہوگی اور جہیز کا بیڈ ملے گا۔
قطرہ کے واقعے کے بعد بہن بھائی الگ ناراض تھے ساس سسر الگ۔ ان کا یہ کہنا تھا۔
"ساری زندگی بہن بھائیوں پر لٹا دی، کیا تھا ایک پورا دن سسر کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ اور نہیں تو بارات کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا"۔
سب کی ناراضی ایک طرف، حیا کی ناراضی سب پر بھاری، اس کا معصومانہ شکوہ۔

حد ہوتی ہے عمر جی۔۔۔ تین سال ہوگئے نکاح کو۔۔ اگر بارات نہیں لا سکتے تو بھگا کر لے جاؤ"۔
سنتے ہی چپکی پلکیں کھلیں، اور آنکھیں ابل پڑیں۔ سوکھی پسلیوں میں چپکا دل دھڑکنا بھول گیا۔ بھلا بھگا کر کہاں لے جاتا؟ ٹوٹی مسہری پر؟
ایک ہی حل تھا کسی طرح سب کو راضی کیا جائے۔
"رب راضی کرنا بہت آسان ہے بجائے اس کے بنائے انسان"۔ اور عمر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان انسانوں کو راضی کرے تو کیسے؟ حیا کے ابا سے بنا بارات کے رخصتی کی منتیں تک کیں، انہوں نے صاف کہہ دیا۔
"بیٹا رخصتی دینے میں حرج کوئی نہیں، لیکن جس طرح کے چول تیرے بہن بھائی ہیں، انہیں بیٹی تو کیا میں جوتے نہ دوں۔۔۔ بے مروت، بد لحاظ۔۔۔ بنا بارات کے لڑکی دے دوں، تاکہ ناقدری کرتے پھریں میری پھول سی بچی کی نہ بابا نا، چار گواہ لا اور لے جا۔ اور ہاں"۔۔۔
جب وہ اٹھنے لگا تو بولے۔ "جس طرح انہوں نے بھرے بازار میں میرے داماد کی بے عزتی کی ہے، بارات سے پہلے مجھ سے معافی بھی مانگیں"۔
لو جی کر لو بات۔ وہ بارات لانے پر راضی نہیں تھے چہ جائیکہ معافی مانگیں۔ محلے سے اگر چار افراد اکٹھے کرنے ہوتے، وہ کب کے کر لیتا مگر شرط بہن بھائیوں کی تھی ساتھ معافی، بے چارہ دو ماہ سے انہیں راضی کرنے میں لگا تھا، ایک دن بھائی جان کا اچھا موڈ دیکھ کر قائل کرنے کے انداز میں بولا۔
"بزرگ بہرحال بزرگ ہوتے ہیں، احترام لازم، بھلے آپ معافی نہ مانگیں، آپ کا وہاں چلے جانا ہی معافی ہوگا"۔
بھائی جان اور بڑی آپا سنتے ہی ہتھے سے اکھڑے۔

"کیا کہا۔۔۔ ہم معافی مانگنے جائیں۔۔؟ بے غیرت"۔ بھائی جان بپھر کر بولے۔

آپا نے ایک چھتر رسید کیا "غضب خدا کا، ہمارے اچھے بھلے افسر بھائی کو بھکاری بنا ڈالا، اس نے، اور معافی بھی ہم مانگیں؟؟ اس حیا بے حیا کے باپ سے کہو، وہ آئے ہم سے معافی مانگنے، کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔۔ پھر سوچیں گے بارات لے جانی ہے یا نہیں"۔

دراصل آپا کا یہ کہنا اس لیے تھا، جب نکاح کے بعد سب بہن بھائی اکٹھے ہو کر حیا کے اماں ابا سے لڑنے گئے، تو بعد میں عمر کے منتیں کرنے پر معافی بھی مانگنے گئے تھے کیونکہ حیا کے ابا نے تب بھی معافی مانگنے کی شرط رکھی تھی، جب تو ان کی غلطی تھی، چلے گئے مگر اب انہوں نے ہمارے بچے کو منگتا بنایا، کیوں بھئی۔۔۔؟ بدلہ تو اب ہو گا، اب وہ معافی مانگنے آئیں، ہاتھ جوڑیں، منتیں کریں"۔۔ یہ شرط تو کسی صورت پوری ہونی مشکل تھی۔ اتنی عمر کے بندے سے عمر کیسے کہے کہ آ کر معافی مانگو، اور پھر بندہ بھی سسر ہو، وہ خود ہی سب کو راضی کرنے میں لگا تھا۔

بقر عید کی آمد تھی، سسر چاہ رہے تھے کسی طرح عید سے اگلے روز رخصتی رکھ دی جائے، ایک تو مہمان کم آئیں گے دوسرے جو ہوں گے قربانی کے گوشت میں ہی بھگت جائیں گے۔ اس لیے آئے دن عمر کو فون پر یاد دہانی کرواتے رہتے، کہ بہن بھائی راضی ہوئے یا نہیں۔ وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔

"جی جی، سب آنا چاہ رہے ہیں مگر میں ہی ذرا ڈھیلا ہوں، بس عید کے قریب ہی آئیں گے تاکہ مزید کوئی ایشو نہ ہو"۔

صبح اتوار اور چھٹی بھی تھی۔ سوچا بھائی جان کی دکان پر جا کر کچھ کام میں ہاتھ بٹائے اور موقع دیکھ کر کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کرے، اکیلے بندے کو تنہائی میں منانا قدرے آسان ہے بہ نسبت سارے مجمعے میں، اسی لیے وہ بھابھی کو کہہ کے سویا تھا کہ صبح جلدی اٹھا دیں۔ بھابھی نے بھی وہ اندھا دھند دروازہ پیٹا کہ بے چارے کی ہڈیاں تک چیخ گئیں۔

وہ ناشتے سے جلدی جلدی فارغ ہو کر چائے پی رہا تھا اور بھابھی ذرا فاصلے پر بیٹھی بالوں میں کنگھی پھیرتے پورے انہماک سے مارننگ شو دیکھ رہی تھیں۔ رنگ برنگے عروسی پہناوے، سجی سنوری لڑکیاں دیکھ کر بھابھی کو طیش آ گیا۔

"اپنے گھر میں تو کوئی کام کاج ہوتا نہیں انہیں، آ جاتی ہیں سج سنور کر دوسروں کا دن برباد کرنے"۔

عمر کو ہنسی آ گئی۔ "دوسرے کیوں اپنا دن برباد کر رہے ہیں، اٹھ کر کریں اپنا کام کاج"۔

بھابھی حسب عادت منہ بنا کر بولیں۔

"مجھے تو ٹی وی دیکھنے کا بچپن سے ہی شوق نہیں، یہ تو کنگھی کرتے ہوئے چلا لیا، کیا پتا کوئی کام کی بات بتا ہی دیں، پچھلے دن ٹوٹکے بتا رہی تھی رنگ گورے کرنے کے۔۔" اسے استہزائیہ دیکھ کر ہنسیں "اب سہرا باندھنے کا تو رواج رہا نہیں جو تو چھپ جاتا، سفید شیروانی میں تو خود سوچ کیسا لگے گا۔۔۔؟ بھابھی کا استہزائیہ انداز اسے اندر تک سلگا گیا تھا، اس نے نظر انداز کر کے اپنی توجہ ٹی وی پر کر لی۔

بھابھی چٹیا بنا کر پیچھے پھینکتے ہوئے دوپٹے ہوئے بولیں۔

"اور تو کیا لڑکیوں کو دیکھے جا رہا ہے، چل اٹھ ذرا کچن سے لہسن پیاز اٹھا کر لا، بیٹھے بیٹھے وہی بن جائے گا"۔

عمر کو پورا یقین تھا اسے ہی بنانا پڑے گا اور انکار کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ کپ رکھتے اٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، وہ ادھر مڑا۔

فون اٹھاتے اس نے پوچھا تھا۔ "ہیلو۔۔

ہیلو۔۔۔کون ہو بھئی؟"

"تیری ماں۔۔۔"

اس نے حیرانی سے ریسیور کو دیکھا۔دوبارہ کان سے لگایا۔بڑی آپا انتہائی غصے میں تھیں۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں، تیری نوکری لگے، نکاح رچالیا۔۔۔اب کیوں میری آواز پہچاننے لگا، کیا ضرورت رہ گئی میری، وہ حیا بے حیا ہے نا کانوں میں رس گھولنے کے لیے"۔

"آپا آپا۔۔۔" وہ منمنایا۔"آپ بولیں گی تو پتا چلے گا"۔

"خیر چھوڑ"۔لہجے میں حلاوت اتری۔"تو آج فارغ ہے نا، جلدی سے میری طرف آ"۔

"خیریت۔۔۔؟"

"سب فون پر پوچھ لیا کر۔" آپا کوفت زدہ سی لگیں۔"اتوار دیکھ کر میں نے نئی ٹیچروں کا انٹرویو رکھ لیا تھا، اب سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں، تو آ فٹافٹ۔ایک تو ماسی بھی نہیں آئی"۔

بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے فون بند کیا۔

نئی ٹیچروں کا انٹرویو سنتے ہی عمر ایاز کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئی تھیں۔پورے خاندان میں ایک وہی افسر تھا۔اگر منہ روز صابن سے دھولے تو اتنی پرسنالٹی تھی کہ انٹرویو لے سکے۔اس نے خوشی خوشی منہ اچھی طرح دھویا، اپنا بہترین سوٹ پہنا، بال جماتے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔

آپوں آپ حیا کا خیال آگیا۔

"موقع اچھا ہے، کیوں نا انٹرویو دینے کے لیے حیا کو بلالوں، وہ آکر اپنی ذہانت سے آپا کو متاثر کرے، اور۔۔۔"

اور سوچتے ہی اس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکان رینگ گئی۔"میری پرسنالٹی کا بھی اسے پتا چلے"۔

عمر نے فوراً اسے کال ملا کر ادھر بلایا تھا فون بند کرتے ہی پہلی نگاہ اس کی اپنی پینٹ کے پائنچے پر گئی تھی۔"کہیں الٹی تو نہیں پہن لی"۔

شلوار کا پائنچا بار بار چیک کرنا اس کا سب سے بڑا کمپلیکس بن چکا تھا۔

اتنے پیار سے بلانے پر حیا دل جان سے راضی تھی۔سہیلی کے گھر کا بہانہ بنا کر جانے کی خوب تیاری کر رہی تھی۔

کسی کانفرنس میں جاتے منیجر کی طرح تیار ہوا عمر ایاز اچھا خاصا ڈیشنگ لگ رہا تھا۔آپا کی تو اسے دیکھتے ہی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ایہہ تو کس خوشی میں اتنا لشک پشک کے آگیا"؟اس کے ماتھے پر تحیر کی لکیریں ابھریں، آپا مزید کہہ رہی تھیں"کہیں تو یہ تو نہیں سمجھا' تیری بارات چڑھنے لگی ہے"۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے آہستگی سے کہا تھا۔

"آپا انٹرویو۔۔۔؟"

"ہاں تو تیرا تھوڑا لینا تھا"۔

آپا اس کا ہاتھ کھینچ کر صحن تک لے آئیں، نل پر پائپ چڑھایا اور جھاڑو اسے پکڑاتے مسکرائیں۔

"بتایا تو تھا آج ماسی نے چھٹی کر لی، میرے سے اب دہرا نہیں ہوا جاتا۔۔۔میں پانی گراتی ہوں میرے لال تو سونت سونت کر نالی تک لے جا"۔

جھاڑو اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ ٹونٹی کھولنے چل دیں۔وہ بت بنا آپا کی پشت اور اپنا لباس دیکھتا رہا۔"نل کھولتے آپا نے ہانک لگائی تھی۔

"پینٹ اوپر چڑھا لے، گیلی ہوجائے گی"۔

کس دل سے وہ فرش دھو رہا تھا یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔صرف ایک فکر تھی کہیں حیا نہ آجائے اور پھر یہی ہوا، گیٹ کے باہر کی نالی سلانٹیوں کے ریپر اور گرد سے اٹ کر بند ہوگئی تھی۔جب وہ لمبے بانس سے گلی میں بیٹھا نالی کھول رہا تھا حیا کی آمد ہوگئی۔مانو اس کے قدموں سے زمین نکل گئی تھی اور حیا کی چیخ۔

"عمر جی۔۔۔آپ پارٹ ٹائم میں خاکروبی کرتے ہیں"۔

بانس پھینک وہ نفی میں سر ہلاتا اٹھا تھا۔

حیا جمپ لگا کر اس سے دو فٹ دور ہوئی۔

"پیچھے پیچھے۔۔۔میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری شادی ایک بھنگی سے ہو رہی ہے"۔

وہ رو دینے کی حد تک انکار کرتا اس کے قریب ہو رہا تھا تب ہی آپا گیٹ پر آئیں اور حیا کو دیکھتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اتنی بے حیا، خود ہی رخصت ہو کر آ گئی"۔

پھر سین یہ تھا قارئین کہ آپا اور حیا نے اپنی گل افشانی کے جو جوہر دکھائے، عمر ایاز کی آنکھیں گالوں تک پھیل گئیں، بس ایک دوسرے کے بالوں کا ہیر اسٹائل نہیں بدلا تھا۔ باقی کوئی کسر رہی نہیں تھی۔ عمر کے کان ان کی جانب تھے اور نگاہیں محلے کی جانب کہ کون کون گالیوں سے مستفید ہو رہا ہے۔

ایک جانب آپا عمر سے خفا تھیں کہ اس کی متوقع بیوی نے ان کے گھر آ کر بے عزتی کی، اب وہ تو کسی صورت بارات میں نہیں جائیں گی، دوسری جانب حیا نے عمر ایاز کو دھمکی دی تھی کہ اس کی آپا اس کے ہونے والے شوہر کو خاکروب بنانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ اگر بارات میں آئیں تو ان کے ساتھ عمر کی بھی ٹانگیں توڑ دے گی۔ ایک بارات میں جانا نہیں چاہ رہی تھی، دوسری بلانا نہیں چاہ رہی تھی "اللہ اللہ خیر صلا" یہ مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔ ویسے بھی آج کل عمر ایاز کے پاس انہیں منانے کا وقت نہیں تھا بقر عید دن بدن قریب آ رہی تھی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا اس نے بکرا منڈی لگائی تھی، یا سڑکوں سے جانوروں کی آلائشات اٹھائی تھیں بلکہ گھر کا سب سے اہم ووٹ بھائی جان کو راضی کرنا تھا اور وہ ان کے ساتھ روزانہ کے حساب سے قربانی کا سستا جانور دیکھنے جا رہا تھا۔ جانور مل بھی گیا سستا بھی اور صحت مند بھی۔ عمر نے راستے میں ویسے ہی پوچھ لیا۔

"بھائی جان! قصائی سے وقت طے کر رکھا ہے"۔

بھائی جان نے اسے تعجب سے گھور کر دیکھا تھا۔

"اچھا۔۔۔! سسر کے ساتھ تو، تو لوگوں کی قربانیاں کروانے جائے، اور تیرا بھائی غیر قصائی ڈھونڈتا پھرے۔۔۔ ہیں؟

عمر ایاز کی آنکھوں کے ساتھ منہ بھی پھٹ گیا تھا۔ یعنی کہ اس عید پر بھی قصائی۔۔۔؟ بھائی جان نے دھپ لگا کر دونوں چیزیں بند کیں۔

"کیا ہو گیا بھائی، میں تیرے ساتھ لگوں گا۔۔۔ تیرے سسر کو بھی بلا لیں گے، اسی بہانے ہنسی مذاق میں دل کا میل بھی ڈھل جائے گا"۔

وہ ابھی تک ورطۂ حیرت تھا بھیا نے تھپکیاں لگاتے حوصلہ دیا۔

"پھر تیری بارات بھی تو لے جانی ہے۔ چل شاباش شادی کی تیاری کر"۔

حیا کو جس دن عمر ایاز نے بارات کی ساری تفصیل بتائی وہ بے حد خوش ہوئی۔

"چلو مشکل سے سہی مگر رخصتی تو ہونے لگی"۔

شادی کی تیاری زوروں پر شروع ہو چکی تھیں۔۔۔ چھوٹی سالی ندا نے کئی بار شاپنگ کی فرمائش کی کہ بہنوئی کے ساتھ شاپنگ کی جائے مگر بہنوئی صاحب دن میں بینک اور رات کو بیل کے ساتھ پائے گئے۔ لباس تو لباس اس کے وجود سے بیل جیسی خوشبو آنے لگی۔ دراصل اس میں بھی ایک درد چھپا تھا، جو بیل بھائی جان اور بھیا کو پسند آیا یقیناً اس کے مالک نے اسے بہت ہی لاڈ سے پالا تھا۔ مجال تھی کہ لمحہ بھر کے لیے اکیلا رہ جائے۔ جیسے ہی پاس سے ہٹ کر لائٹیں بند کرا وہ اپنی "بھاں بھاں" سے سارے محلے کو جگا دیتا تھا۔ محلہ جاگے سوئے اس سے گھر کے کسی فرد کو سروکار نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا اس کی ہر چنگھاڑ پر بھائی جان کے بچے ڈر کر رونے لگتے، عید میں دس دن تھے۔ اب دس دن تک کون اس کی خوفناک آواز برداشت کرے۔ طے پایا عمر تنہا ہے، اس کی مسہری بیل کے پاس بچھا دی جائے۔ اس کی تنہائی دور ہو، اور بیل کی بھاں بھاں۔ تو بس

حناسب، عمر آج کل اس کے ساتھ سورہا تھا اور حق ہمسائیگی کے سبب اس کی حرکتیں ہی نہیں خوشبو بھی لل جیسی ہو گئی تھی۔

بڑی، چھوٹی بھابھی درجنوں کے حساب سے بازار کے پھیرے لگا رہی تھیں۔ روز چیزیں لاتیں پھر ایک دوسرے کو فون پر تفصیل سناتیں۔

سب سے چھوٹی آپا کے میاں سرکاری ملازم ہونے کے سبب بہت آرام طلب تھے۔ تیاری کی ساری ذمہ داری یہ کہہ کر عمر کے سر ڈالی۔

''بھئی بارات تمہاری ہے، سجاوٹ کا سامان بھی تم کرو''۔

اور خود دوستوں کے ساتھ نکل گئے۔

سب کچھ صحیح سمت میں چل رہا تھا۔ شادی کے دن قریب آنے سے اس کے چہرے کی رونق دیدنی تھی۔ یہاں تک کے مصنفہ آپا کی باتیں بھی بری نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کے لکھے ڈائیلاگ منہ میں دہراتا، شرم چہرے پر جھلملاتی، نظریں جھک جاتیں، البتہ دل خوش ہی تھا۔ اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے پیرنی آپا نے کئی بار کہا۔

''عمر مجھے تو فکر ہی رہتی ہے، تیری رخصتی کی''۔

کیوں آپا۔۔۔اب تو اللہ کا شکر ہے۔ سب راضی ہیں۔۔۔بس آپ دعا کیا کرو''۔

''ہائے میرے بچے میری تو صبح شام ہی تیرے لیے دعائیں مانگتے گزرتی ہے۔'' کچھ توقف سے کہنے لگیں۔ ''دعا کے ساتھ دوا بھی تو ضروری ہے''۔

''کیسی دوا۔۔۔کوئی بیمار ہے۔۔۔؟''

آپا کا مالک مکان نچلے پورشن میں رہتا تھا۔ تین بچے تھے۔ چھوٹا بچہ کچھ معذور تھا۔ آپا نے اسی کا حوالہ دیا۔

''اکرام کا چھوٹا نہیں ہے۔۔۔اس کی بات بتانے لگی ہوں، کیا پیر بچہ ہے، جس کے سر پر ہاتھ پھر دے۔ سمجھو، دعا لگ گئی''۔

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے ماتھا سکیڑتے پوچھا تھا۔

''اہہ۔۔۔ایک تو تجھے اس حیا (دل میں یقیناً بے حیا بھی کہا ہوگا)۔۔۔۔ کے علاوہ کسی کی سمجھ ہی نہیں آتی۔۔۔بیوقوف۔ آتے جاتے اس بچے کو کچھ روپیہ پیسہ پکڑا آیا کر، سائیں بچہ ہے، اس کی دعا لگ گئی تو تیری رخصتی خیر و عافیت سے ہو جائے گی''۔

رخصتی کی جلدی اسے ضرور تھی مگر یوں کسی کے گھر خاص طور پر جا کر بچے کو پیسے پکڑانا اسے تو معیوب لگا۔ ویسے بھی انجانے لوگوں کے ہاتھوں اس کی جتنی پٹائی مصنفہ آپا نے کروائی تھی، وہ آسانی سے بھولنے والی تھی نہیں۔ اب پیرنی آپا حد ہے۔ انہیں ''اچھاجی'' کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا مگر ایسا ہرگز ارادہ نہیں تھا، اور قطعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ جلد ہی وہ اس بچے کو ڈھونڈتا پھرے گا۔

☆☆☆

آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی سیلی ہوا میں دل بہکنے لگا۔ آفس جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا آج لنچ ٹائم میں حیا کی طرف جائے، اور اسے ساتھ لے کر اور کچھ نہیں تو پیزا ہی کھا آئے۔ جو آپا کی طرف سے بدمزگی ہوئی ہے وہ شادی سے پہلے دور ہو جائے۔ اس نے حیا کو تیار ہونے کا کہا اور اپنے کولیگ سے اس کی گاڑی کچھ دیر کے لیے مانگی تھی۔ بنا تردد اس نے چابی پکڑا دی۔

''جب چاہو لے جانا، مگر تیل اپنا ڈلوا لینا''۔

اس نے خوشی سے گردن شکریہ میں ہلا کر اپنے ضروری کام نبیڑے، لنچ بریک ہونے والی تھی۔ عید کی چھٹیوں کے ساتھ اس نے مزید چند دن کی چھٹیوں کی درخواست لکھی تاکہ عید سے پہلے منظور ہو جائے۔ وہ ابھی باس کو درخواست دینے جا رہا تھا کہ بھیا کا فون آگیا۔ اس نے پہلی بیل پر اٹھایا تھا۔

''السلام علیکم''۔

"سلامیاں بعد میں بھیجتا رہ، ذرا جلدی سے گھر جا۔۔۔"

اس کا ماتھا ٹھنک گیا "خیریت تو ہے۔۔؟"

"ہاں ہاں خیریت ہے۔ تو جلدی گھر پہنچ تجھے پتا نہیں ہے، بارش کتنی تیز ہو رہی ہے"۔

"جی۔۔۔!" اس کے منہ سے مرا ہوا جی نکلا۔

"اوئے جی کے بچے، جلدی گھر پہنچ میں شہر سے باہر ہوں، ادھر سارا گھر پانی سے بھر گیا، بچوں کی جوتیاں، کاپیاں سب تیر کر باہر نکل رہی ہیں پانی نکالنے کا بندوبست کر جا کے۔۔"

بیٹھے بیٹھے اس پر بجلی سی گری تھی۔ ایک فیصد بھی دل نہیں تھا کہ وہ جائے لیکن مرتا کیا نہ کرتا، کے مصداق۔ اللہ اللہ کر کے تو بھیا اور بھائی جان راضی ہوئے تھے۔ اب ذرا سی تفریح کے لیے شادی کیا داؤ پر لگائی۔ وہ منیجر سے اجازت لے کر گھر کے لیے نکلا تھا۔ راستے میں حیا کا کئی بار فون آیا مگر اس نے اٹینڈ ہی نہیں کیا۔

وہ بالٹیاں بھر بھر باہر پانی نکال رہا تھا۔ چھوٹی بھابھی تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹی آرام سے رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ ساتھ تبصرہ جاری۔

"لو جی، باجی کہتی ہے، میں اتنی اچھی کہانیاں لکھتی ہوں، ادارے والے نہیں لگاتے۔۔۔ یہ دیکھ لے ساری کہانی اس رسالے سے چرائی ہے بڑی آئی اپنے آپ کو بڑی مصنفہ سمجھنے والی"

انہوں نے باقاعدہ رسالہ عمر کی جانب کیا اس کا دھیان صرف پانی نکالنے یا حیا کی ناراضی پر تھا۔ بھابھی پھر سے پڑھنے لگیں۔ پانی تقریباً نکل چکا تھا، اب صرف وائپر لگا رہا تھا جب اس کا موبائل تھرکنے لگا۔ اسے پورا یقین تھا حیا کی کال ہوگی اور وہ اسے منا لے گا۔ بنا نمبر دیکھے اس نے بٹن آن کر کے کان سے لگایا۔ بہت پیار سے بولا تھا۔

"السلام علیکم مائی ڈیئر!"

چوتھے نمبر والی آپا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ موبائل کان سے ہٹا کر نمبر چیک کیا۔ پھر تصدیق کی۔

"تو عمر ہی ہے نا۔۔۔؟"

آواز سنتے ہی اس پر اوس گر پڑی۔ اور آواز اس اوس میں بھیگ کر بہہ رہی تھی۔

"جی۔۔۔"

"ایسے کیوں بول رہا ہے، طبیعت ٹھیک ہے نا تیری۔۔۔؟"

"ہاں کچھ دیر پہلے تک تو ٹھیک تھی، لیکن اب لگ رہا ہے جان نکلنے لگی ہے۔"

وہ الفاظ کی طرح آواز بھی ڈبو کر نکال رہا تھا۔

"اللہ خیر۔۔ جان نکلے تیرے دشمنوں کی، یوں نہ بولا کر۔۔ میری جان ہے تجھ میں۔۔۔"

وہ کمیٹی والا واقعہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ زچ ہو کر بولا۔

"پھر آپا!" تمہیں تمہاری جان کا واسطہ میری جان چھوڑ دو۔"

اس کا اکتایا لہجہ آپا کو بہت چبھا تھا۔ اپنی مخصوص آواز و انداز میں شکوہ کرنے لگیں۔

"ہاں بھیا ایک میں ہی ہوں جو چھوٹا موٹا کام کروا کر تیری جان مصیبت میں ڈال دیتی ہے، باقی تو کسی کے گٹر کھولے، پانی نکالے، اس حیا بے حیا کے باپ کے لیے چندہ تک مانگے سب ہنسی خوشی کرلے گا۔ چل ٹھیک ہے۔ آئندہ نہیں کہوں گی"۔

عمر ایاز کا دل نہ چاہتے ہوئے بھی پسیج گیا۔ پیار سے بولا تھا۔

"اوہو آپا! آپ تو ناراض ہی ہوگئیں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ بتائیں کیا کام تھا"۔

آپا کے لہجے میں شوخی عود کر آئی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا میرا بھائی مجھے انکار کر ہی نہیں سکتا"۔

"کام بتائیں؟

"وہ میری ساس ہے نا۔۔"

آپا کی ساس بہت بیمار تھیں، اب تو ہاسپٹل انہیں اپنا گھر لگنے لگا تھا۔ آپا نے جس غم زدگی سے

کہا تھا۔ سنتے ہی عمر ایاز کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے یقین نہیں تھا بہن بھائیوں کے علاوہ بھی کوئی اس کی شادی رکوانے کا سبب بن سکتا ہے، اس نے آہستگی سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہا تو آپا اپٹ کر بولیں۔

"اوے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیا پڑھ رہا ہے تو۔ میری ساس زندہ ہیں۔۔"

"اوہ! وہ قدرے شرمندہ بھی ہوا اور آپا کے انداز پر غصے بھی۔ اس نے تحمل سے پوچھا۔

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ کیا ہونا، ہسپتال میں پھر داخل ہو گئیں، تجھے پتا تو ہے عید کے دن ہیں، گارمنٹس کا یہی سیزن ہے، عید پر کمائیں گے تو سارا سال کھائیں گے۔۔۔ صبح شام کھانا لے جانے کا مسئلہ بنا ہوا ہے، اگر تو بینک آتا جاتا پکڑا دیا کرے تجھے دعائیں ہی دیں گی۔۔۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "لیکن آپا! یہ ذمہ داری تو عتیق بھائی جان کی ہے۔۔ اور ویسے بھی عید کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔۔ پھر شادی۔۔۔"

آپا غصے سے بولی تھیں۔ "تو صاف انکار کر دے۔ بہانے کیوں بنا رہا ہے۔ کر لیں گے عتیق، اس سال سیزن نہیں لگے گا تو کون سا بھوکے مر جائیں گے"۔

آپا نے کھٹاک سے فون بند کیا تھا۔ عمر ایاز سمجھا شاید جان چھٹی لیکن وہ آپا آسانی سے جان چھوڑنے والی نہیں تھیں، بدلہ لینے میں دور کی کوڑی لاتی تھیں۔ ان کا فتنہ پرور ذہن لڑائی ڈلوانے میں بہت کام کرتا تھا۔ فوراً بڑی آپا کو فون ملایا ان کا حال احوال پوچھتے بہت دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"آپا! آپ عمر کی بارات میں کون سا سوٹ پہن کر جاؤ گی۔۔۔؟

کچھ دیر پہلے ہی آپا کے میاں بنا عینک کے اسٹور میں گھس گئے تھے۔ اچار کا مرتبان بچوں سے چھپا کر بستروں کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ میاں صاحب نے ایک چادر کھینچی مرتبان لڑھک کر ان پر آ گرا۔ چیخ پکار تو الگ بات تھی۔ آپا کو ان کے نئے سوٹ اور اچار کا بڑا غم تھا۔ میاں کے خوب لتے لیے۔

"میاں! تمہیں تو عینک لگا کر نہیں دکھتا، بنا عینک کے ضرور گھسنا تھا اسٹور میں۔۔ نیا سوٹ برباد کر دیا۔ اوپر سے سارا اچار بھی"۔

میاں کھسیانے سے عینک ڈھونڈ رہے تھے تب بلو نے ڈوری میں گردن کے پیچھے جھولتی عینک آگے کی۔

"یہ رہی ہے ابا۔"

آپا مزید تپ گئیں جی چاہا عینک کے شیشے ایلفی لے کر ہمیشہ کے لیے آنکھوں پر چپکا دیں اوپر سے بہن چسکے لے کر پوچھ رہی ہے کون سا سوٹ پہن کر جائیں گی۔

"بارات میں جاتی ہے میری جوتی۔۔۔ اس حیا، بے حیا نے میرے گھر آ کر میری بے عزتی کی۔۔۔"

"ہا آ آ آ آ۔۔۔! چھوٹی آپا نے غمزدہ سائرن بجایا۔" اور وہ بے غیرت سنتا رہا۔ آپ نے کچھ نہیں کہا"۔

"دفع کر تو اسے۔۔ وہ تو شروع دن سے ایسا ہے" بڑی کے رفع دفع معاملے پر وہ جوش سے بولی۔

"لو ایسے کیسے دفع کریں۔۔۔ چھوٹا سا تھا جب سے پالا ہے آپ نے۔۔ اب بارات اکیلے لے جائے گا۔۔۔ اور وہ حیا بے حیا اس نے بہت چبا کر کہا تھا]۔۔ میں نے تو سنا ہے، وہ کہہ رہی ہے اگر آپا آئیں تو جوتے مار مار کر عمر کی ٹانگیں توڑ دے گی۔۔ تب ہی تو اس بیچارے نے آپ کو منایا تک نہیں۔۔۔"

آپا کی تو سنتے ہی آنکھیں ابل پڑیں۔ غصے سے پوچھا۔ "اس کی اتنی جرات۔۔۔ میرے بھائی کی ٹانگیں توڑے گی۔۔۔ لے میں دیکھتی ہوں، کیسے روکتی ہے مجھے۔۔۔ پاؤں پکڑ کر مجھے

لے کر جائے گی"۔
چھوٹی آپا کا اندر تک باغ باغ ہو گیا تھا۔ فون بند کرتے ہی دوہری ہو کر ہنسیں۔
"بڑا آیا میری ساس کو کھانا نہ پہنچانے والا۔۔۔ اب اپنی ساس کے بارات لے جا کر دکھا۔"

☆☆☆

بارش رک چکی تھی، ٹھنڈی ہوا چلنے سے موسم خاصا خوش گوار ہو گیا تھا۔ وہ نہا دھو کر صاف ہوا۔ پہلا خیال حیا کا آیا تھا کہ اب بھی ٹائم ہے، اسے لے جایا جا سکتا ہے۔ وہ تیار ہو کر اپنی بائیک نکال رہا تھا کہ بڑی آپا کا فون آ گیا۔
"کہاں ہے تو۔۔؟
"وہ ہ ہ ہ ہ ہ۔۔۔" اس نے سوچ کر بہانا بنایا "بازار جانے لگا تھا"
"بائیک لے کر یہاں آ میری طرف۔۔۔"
"خیریت، کوئی ضروری کام تھا"
"مجھے تو ضروری لگ رہا ہے، اب تجھے پتا نہیں لگے نہ لگے"۔
وہ ٹپٹایا "کیا مطلب۔۔۔؟"
"مطلب یہ کہ اپنی اس لگتی سکتی سے کہہ، آ کر مجھ سے معافی مانگے۔۔۔ اگر چاہتی ہے، اس کی بارات آئے۔۔۔ سمجھا تو۔۔۔"
سنتے ہی وہ سن سا ہو گیا تھا۔ ہکلا کر بولا۔
آپ تو کہہ رہی تھیں، کہ۔۔ نہیں۔۔۔ جا۔۔۔ ئیں ۔گی۔۔"
"اور تو میرے بغیر لے جائے گا۔۔۔ اماں مرتے ہوئے میرے سپرد کر کے گئی تھیں تجھے اور تو اپنی بارات میرے بغیر چڑھا لے گا۔
صرف اس حیا کی خاطر۔۔۔ اب یہ اوقات رہ گئی میری۔۔۔ ہیں، اس دن کے لیے پالا پوسا تھا مکھن میں سے بال کی طرح نکال دے گا تجھے"۔
آپا ڈانٹتے ہوئے جذباتی ہو گئیں۔ آواز بھی رندھنے لگی، وہ بے حد شرمندہ ہوتے منمنا کر بولا
"کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔۔ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ آپ کے بغیر بارات جا سکتی ہے بھلا۔۔۔ وہ آئے گی، سر کے بل معافی مانگنے آئے گی"۔
آپا تو اس کی تسلی سے خوش ہو گئی تھیں مگر وہ عجیب الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔۔۔ ایک طرف آپا، دوسری طرف حیا۔۔۔ جسے حیا ماننے پر ہی کوئی راضی نہیں تھا۔

☆☆☆

آج اسے صحیح معنوں میں پیرنی آپا کی بات پر یقین آیا کہ اکرم صاحب کے بچے سے سر پر ہاتھ پھروا لینا چاہیے۔ اللہ گواہ تھا اس دن کے بعد وہ صبح شام بطورِ خاص اس بچے کے پاس جاتا، نہ صرف سر پر ہاتھ پھرواتا بلکہ سو دو سو اسے پکڑا آتا اب یہ صرف اللہ یا پیرنی آپا ہی جانتی تھیں انہوں نے اس ماہ کا کرایہ ایسے ہی طے کیا ہوا تھا۔ تفرتا تو رہ گئی ایک جانب وہ حیا کو قائل کرنے کی نیت سے جا رہا تھا کہ راستے میں مصنفہ آپا کی دو تین بار کال آئی، پبلیشرز اور پروڈکشن ہاؤسز میں بے وقت فون کرنے کی وجہ سے آل ٹائم کال بیچ ہوئی تھیں۔ تنگ آ کر اس نے فون اٹینڈ کیا او رو دینے کے انداز میں بولا تھا۔
"آپ بھی بتا دیں، کیا کام ہے"۔
"ہائے میرے بچے، کتنے پیار سے بولا تو۔ ۔کاش ایڈیٹرز بھی ایسے بات کریں مجھ سے"۔
"اگر آپ کچھ ڈھنگ کا لکھ دیں تو شاید بات کر ہی لیں آپ سے۔۔۔"
اچھا تیرے خیال میں، میں اچھا نہیں لکھتی۔۔
"آپ کام بتائیں میں بائیک چلا رہا ہوں۔"
"ہائے! کتنی بار کہا ہے تجھ سے بائیک چلاتے فون نہ سنا کر، کچھ ہو گیا تجھے تو کہاں سے لائیں گے اپنے ماں باپ کی آخری نشانی!"
"آپا کام بتا دو۔" اس نے جھلا کر کہا تھا۔
"بتاتی ہوں۔۔۔ میں نے ایک ون لاکا تیار کیا ہے، تو ایسا کر وہ جا کر پروڈکشن والوں

خود پڑھ کر سنا کر آ۔۔ کیا پتا ان بڑھوں کو اردو پڑھنی نہ آتی ہو۔۔۔تب ہی ریجکٹ کر دیتے ہیں
اس نے نخوت سے گردن جھٹکی۔ انہیں تسلی دیتے دل میں ان کے ذوق کے لیے دعا کی۔ آپا پھر بولیں۔
"چپ کیوں لگ گئی۔۔ ابھی تو میرا ڈراما آنے دے پھر دیکھ۔۔۔ یہ جو ایمل رضا، سائرہ رضا دونوں بہنیں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتی ہیں نا، میرا ڈراما دیکھ کہ اپنی انگلیاں چبا جائیں گی۔۔۔"
"حالانکہ آپ کو چبا جانے کو جی چاہے گا' آپ کے مسودوں سمیت۔" اس کی بڑبڑاہٹ آپا نے سنی نہیں۔۔ آپا پھر بولنے لگیں، وہ پہلے ہی بول پڑا۔
"آپا فکر نہیں کرو۔۔ بارات پروڈکشن ہاؤس کی جانب سے گزار لیں گے، آپ انہیں سنانے کے لیے اتر جانا۔۔ واپسی پر لیتے آئیں گے۔"
آپا کو پورا یقین تھا وہ اسے ضرور اتار دیں گے تب ہی فون بند کر دیا۔

☆☆☆

عمر ایاز نے بہت منت سماجت سے حیا کو منایا کہ آپا کو فون کر کے معافی مانگ لے۔ "میں ساری زندگی تمہارا غلام رہوں گا۔ تو اس کی ہنسی نکل گئی اپنی کھنکتی آواز سے عمر کے دل پر بجلیاں گراتی بولی۔
"وہ تو خیر سے تمہاری شکل اور قسمت میں لکھا ہی ہے۔"
اس نے اامید سے پوچھا تھا۔
"پھر امید رکھوں۔۔۔؟"
"ہاں ضرور۔۔۔ مگر۔"
اس کے رکتے ہی عمر ایاز کا دل رک گیا۔
"کیا مگر؟"
"ایک شرط ہوگی"۔
"ایک کیوں جناب، ہزار کہیے، بندہ تابع فرمان ہے"
"ٹھیک ہے وقت آنے پر"۔
حیا نے آپا کو فون کر کے ان کی ذہانت اور اسکول کی کارکردگی پر ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ، آپا دل سے اس کی گرویدہ ہو گئیں۔

☆☆☆

رینگ کر سہی مگر عید کا دن آن پہنچا۔ بیل، عمر کو دیکھ کر نتھنے پھُکا پھُلا رہا تھا، اور عمر اسے دیکھ کر آنکھیں۔ حیا کے ابا آگے بڑھے، عمر کو دھپ لگاتے بیل کی طرف دھکیلا۔ بیل اچھلا، عمر چیخا، قارئین یہ منظر دیکھنے کے قابل نہیں تھا کیوں کہ سمجھ نہیں آیا بیل کی آواز زیادہ ہے یا عمر ایاز کی۔۔ ہوا کچھ یوں بیل کی ٹانگیں باندھتے ہوئے عمر کے جوتے کا بکل رسی میں پھنس گیا تھا۔ بیل نے دم مار مار کر عمر کا چہرا رنگین کر دیا۔ قربانی کے بعد سب اس رنگینی کو دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے۔
حیا کے ابا جاتے ہوئے بارات کے افراد بتا کر عمر کو شام کی دعوت بھی دے گئے تھے جو اس نے

دل سے قبول کی تھی۔
عید کی شام تھی بہنوں بھابھیوں نے عمر کی مہندی کرنے کا پروگرام بنایا، چھت پر باربی کیو کے لیے کوئلے درکار تھے۔ تو عمر ہی فارغ شخص تھا جو فوراً لے آتا۔ وہ بائیک دوڑاتا لنک روڈ پر تھا جب حیا کا فون آیا۔ اٹینڈ کرتے ہوئے عمر کے دل میں شہنائیاں بج اٹھیں۔
''حد ہوتی ہے، عمر جی۔۔ ابا کتنی دیر سے آپ کا ویٹ کررہے ہیں۔۔۔ آئے ہی نہیں۔۔''
''وہ دراصل۔۔۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا ''بہنیں مہندی کررہی ہیں نا بس اس لیے''۔
''یعنی ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں، میں نے آپ کے ایک کہنے پر آپ کی خبطی آپا کو فون کرلیا تھا، آپ میرے ابا کی دعوت پر نہیں آئے۔۔۔ بڑے افسوس کی بات ہے''۔
''آپ خفا مت ہوں، میں آیا کہ آیا''۔
اب اس کی بائیک کا رخ حیا کے گھر کی جانب تھا۔ اپنا سیل وہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ حیا کے ابا تہبند بنیان پہنے دروازے پر عجلت بھرے انداز میں کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک گدھا ریڑھی کھڑی تھی۔ عمر ایاز نے اپنی بائیک روکی۔ اسے دیکھتے ہی ابا کے چہرے پر رونق آگئی۔
''کون کہتا ہے بیٹا نہ ہو تو مرد لاوارث ہوتا ہے۔۔۔ میرا داماد کسی بیٹے سے کم ہے کیا۔۔۔''
انہوں نے اس کے شانے پر تھپکیاں لگاتے ریڑھی والے کو سینہ تان کر دیکھا۔ ریڑھی والا مسکرایا البتہ عمر کچھ کنفیوز سا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ابا نے اس کی مشکل آسان کی۔
''میرے لال! بچیوں نے آج مہندی وہندی کا فنکشن کر رکھا ہے، میں ذرا اس میں مصروف ہوں۔۔۔ تو ذرا اس ریڑھی والے کے ساتھ جا۔ اور قربانی کی کھالیں اکٹھی کرکے میری دکان پر پہنچا دے''۔

عمر کی مسکراہٹ ہی نہیں سانسیں بھی غائب ہوگئی تھیں۔
''کک کیا مطلب۔۔۔؟
''مطلب کیا ہونا'' انہوں نے پیار سے سوکھے بدن پر ایک اور دھپ لگائی۔ ''گرمی بہت ہے میری ۔۔کھالیں سڑ جائیں گی ۔۔۔ میں پیسے دے چکا ہوں۔۔۔ جا میرا بچہ! جلدی جلدی جا پھر تیرے مہندی بھی لگانی ہے''۔
وہ رو پڑتا اگر پردے کی اوٹ سے پیلے آنچل میں حیا کی جگر جگر کرتی آنکھیں یہ نہ کہتیں۔
''ہم نے بھی تو آپ کے ایک کہنے پر آپ کی آپا سے معافی مانگی تھی۔۔۔ آپ ہماری خاطر کھالیں نہیں مانگ سکتے''۔

☆☆☆

قارئین اب گھر میں عمر ایاز کی ڈھنڈیا مچی تھی کسی کے بچے باربی کیو کھانے کے لیے ماؤں کے بال نوچ رہے تھے۔ تو کسی کا دل مہندی شروع کرکے مٹکنے کو مچل رہا تھا۔ بھابھیاں لمبے ہوتے سالانہ اجلاس سے اکتاہٹ کا شکار تھیں۔ بھیا اور بھائی جان اس کی ازلی سستی کو کوستے اسے ڈھونڈنے نکلے۔ سڑک کا منظر کچھ یہ تھا کہ وہ گدھا ریڑھی پر پچھی خون زدہ کھالوں پر بیٹھا ریڑھی بھگائے جارہا تھا جس جس گھر کا سسر نے کہا تھا وہاں گدھا ریڑھی رکتی، اتر کر کھال اٹھاتے ریڑھی پر پھینکتے آگے بڑھ جاتے۔ اچانک ایک موڑ کاٹتے بھیا دکھائی دیے۔۔ انہیں دیکھتے ہی عمر کے حواس ایسے اڑے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس نے گدھے کو چابک مار مار ریڑھی ہوائی جہاز کی طرح اڑائی۔۔ بھیا پیچھے پیچھے تھے اور وہ جہاں سینگ سمائے ریڑھی بھگائے لیے جارہا تھا۔۔

☆

سلویٰ سیف اللہ بٹ

سنہری دھوپ

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں' ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسیڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مر جاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے' احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیٹو آتی ہیں' وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کی

مکمل ناول





اس میں ہوتی ہے۔
الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بھتیجے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔
عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اپنی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی' وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔
دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔
الیاس احمد' عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں' جسے ریاض احمد سختی سے رد کردیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہوجاتا ہے۔
تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہوجاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں' کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوگئی تو باپ' بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہوجائیں گے۔
ریاض احمد' عمیر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں' مگر رابعہ' دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمیر کھٹک جاتا ہے۔
رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آجاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد برانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔
عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممانی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے' مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانا نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔
منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا' عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے' وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں' جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہیں۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کرپاتی' اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصوروار نہیں مانتا۔
الیاس احمد' مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

چوتھی قسط

"دعا ....." مریم کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔ اسے اپنی سماعت دھوکا لگی۔ الیاس احمد نے کندھے اچکا کے اقرار میں سرہلا کے' تصدیق کی مہر ثبت کی۔
"اگر یہ مذاق ہے الیاس احمد! تو بہت ہی گھٹیا ہے۔" مریم سرخ چہرہ لیے جانے کو کھڑی ہوگئی۔
"یہ مذاق نہیں بالکل سچ ہے۔ لیکن ہے واقعی بہت گھٹیا' صرف دعا ہی نہیں تمہارا بھائی آصف بھی۔" الیاس نے اسے جتلایا۔
"تم اپنی بدکردار بھانجی کو میرے بھائی سے compet(مقابلہ) کررہے ہو۔" مریم پھر سے دھپ کر کے بیٹھ گئی۔
"دعا بدکردار نہیں' ہاں اس نے اپنے بچپنے میں

غلطی ضرور کی ہے۔ اگر تم کچھ دیر کے لیے اس غلطی کو بھول جاؤ' چند روز پہلے والی دعا کا خاکہ اپنے ذہن میں لاؤ تو کیا وہ لڑکی واقعی تمہارے بھائی کے قابل نہیں یا تمہارا بھائی اس کے...."

انہوں نے مریم کو تصویر کا دوسرا رخ دکھا کے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"مگر اب میں اور پہلے والی دعا میں بہت فرق ہے۔" مریم نے ٹھونک بجا کر کہا۔ "اور میرا معذور بھائی اس سے ہزار ہا درجے بہتر ہے۔" اس کے ماتھے پر سینکڑوں سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ الجھن کا شکار تھی۔ اسے شوہر کی تجویز سخت بری لگی تھی۔ وہ اس کی دور بینی اور زیرک نگاہی کی معترف تھی۔ اتنی بڑی بات کے پیچھے کوئی مضبوط وجہ ضرور تھی۔

"اس فرق کو بھول نہیں سکتیں تو کم از کم نظر انداز کر دو' اپنے بھائی کی خاطر' اس کی زندگی سنوارنے کے لیے۔ اس کی خوشیاں لوٹ آئیں گی' اگر تم دعا کی اس غلطی کو مائنس کر دو۔ تو باقی سب گڈ ہی ہے۔ ابھی کم عمر ہے' انتہائی خوب صورت ہے' پڑھی لکھی ہے۔ بزدل ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ داغ دار ہے۔ اسی تیر کو استعمال کر کے اسے ساری زندگی اپنے بھائی کی بے زبان غلام بنا سکتی ہو۔ آصف کو اس سے بہتر ہم سفر نہیں ملے گا۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ جلد بازی سے نہیں تحمل سے کام لو۔"

الیاس احمد نے اپنی ساری عقل مندی انہیں شیطانی چالوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انہوں نے مزید بحث اگلے وقت کے لیے سمیٹ لی۔ ان کے پاس مریم کو راضی کرنے کے ایک سو ایک گر تھے۔

☼ ☼ ☼

عمر خوش تھا۔ بے حد خوش' ریاض احمد مر گئے یا جی رہے ہیں۔ اسے پروا نہیں تھی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار ماں سے باپ کی خیریت ضرور پوچھ لیتا۔ چہرے پر مظلومیت' سر جھکائے اس کا دل اپنا کاروبار شروع کرنے پر خوش تھا۔

"یار سکندر! وہ دن دور نہیں' جب میرے پاس مرسیڈیز ہو گی۔" عمر اپنے دوست کے آفس میں اس کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا' سکندر صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"جب تو اپنا بزنس اسٹارٹ کرے گا میں شکرانے کے سو نفل ادا کروں گا۔" وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔ "تو میری آفس ٹائمنگ کے ڈیلی تین گھنٹے ضائع کرتا ہے۔" سکندر کے اتنا برا منہ بنانے پر' عمر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"اسی لیے تو میں تجھے اپنا جگری یار کہتا ہوں' ساری دنیا میں تو واحد انسان ہے جو مجھے اتنی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔"

عمر نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے خندہ پیشانی پر زور دے کے ادا کیا۔

"کب تک ارادہ ہے تیرا۔" سکندر نے چائے کا گھونٹ بھرتے پوچھا۔

"ابھی تو ڈبل مائنڈڈ ہوں' گارمنٹس میں جاؤں یا فیبرکس میں' چند کروڑ ہیں اور مجھے سب کچھ اسی میں مینیج کرنا ہے۔ تم سے مشورہ کر کے' سب طے کروں گا۔" عمر نے آگے ہو کر اپنی سوفٹ ڈرنک اٹھائی۔

"اگر تم کاٹن مل لگانے کا ارادہ کرو تو میرا ایک پرانا دوست ہے جس کا۔ خاندانی کاروبار ہے۔ میں تمہیں اس سے ملوا دوں گا' وہ اس سلسلے میں تمہاری کافی مدد کرے گا اور مشینری وغیرہ خریدنے میں آسانی رہے گی۔" سکندر نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"تو پھر دیر کیوں' تم عنقریب میری کوئی میٹنگ رکھوا دو۔" عمر نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی۔

"چلو میں شام تک کنفرم کر کے' تمہیں انفارم کر دوں گا۔" سکندر خالی کپ رکھ کے اٹھ گیا۔ "میں اسٹاف کا راؤنڈ لگا کے آتا ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

عمر پلیٹ میں دھرا سینڈوچ اٹھا کے دانتوں سے کترنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ واش روم سے تولیے سے بال رگڑتا نکلا۔ تولیہ اسٹینڈ پر ڈال کے' وہ ڈریسنگ کی طرف آگیا۔ اس نے ٹراؤزر کے ساتھ بنیان چڑھا رکھی تھی۔ برش اٹھا کے بالوں میں پھیرنے لگا۔ شیشے کے قریب چہرے کو کر کے' قریب سے دیکھا۔

"ناٹ بیڈ...." اپنی تعریف آپ کی اور مسکرا دیا۔ برش اٹھا کے' باڈی اسپرے اٹھا کے' خوب چھڑکاؤ کیا۔ لمبا سانس کھینچ کے' اپنے اندر مہک اتاری۔ اسپرے رکھ کے' موبائل اٹھالیا۔

"ہیلو' السلام علیکم! چاچو جان' کہاں غائب ہیں' نہ کوئی رابطہ' خیر خیریت' نہ کوئی خوش خبری۔" عمر نے چھوٹتے ہی بولنا شروع کردیا۔ اسے تاخیر پر غصہ تھا۔

"جب خوش خبری ملے گی تو سب سے پہلے تمہیں ہی سناؤں گا' ابھی اور بھی بہت سی منزلیں ہیں۔ یہ آخری مرحلہ ہی طے کرنا مشکل ترین امر ہے۔ جلد بازی سارا کھیل بگاڑ سکتی ہے صبر سے ٹھنڈی کر کے کھاؤ عمر۔" الیاس احمد نے اسے تنبیہہ کی۔ وہ اپنے مشن میں اتنے مصروف تھے کہ عمر سے کانٹیکٹ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

"چاچو! میں نے اپنے حصے کا کام پوری کامیابی سے سرانجام دیا ہے' اب باقی کا کام مکمل کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ذرا سی بھی اونچ نیچ ساری محنت رائیگاں کر سکتی ہے۔" عمر نے خبردار کیا۔

"کوئی بھی منحوس بات کرنے کے بجائے خاموش رہو' جب تھوڑی امپروومنٹ ہوگی میں تمہیں انفارم کردوں گا بائے...." غصے سے بھرے الیاس احمد نے کال کاٹ دی۔ عمر نے بند موبائل کو گھور کے بیڈ پر پھینک دیا۔

☼ ☼ ☼

الیاس احمد بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے' آفس کی فائل سامنے پھیلائے' بال پین انگلیوں میں پھنسائے' کسی اور ارتکاز میں محو تھے۔

مریم ٹرے میں چائے کے دو کپ لیے بڑے خوشگوار موڈ میں چلی آئی۔

"یہ لیں جناب' آپ کی فرمائش پہ سونف' الائچی والی زبردست سی گرما گرم چائے۔"

مریم نے چائے ٹیبل پر رکھ کے' ایک کپ اٹھا کے شوہر کی طرف بڑھایا۔

"تھینک یو...." الیاس احمد نے فائل بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی۔

"موسٹ ویلکم۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنا کپ لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ الیاس احمد چائے کے تین چار گھونٹ بھرنے تک خاموش رہے۔

"آپ کا آج کا دن کیسا رہا؟" مریم اس خاموشی سے گھبرا گئی۔

وہ چونک گئے کیونکہ یہ ایک بالکل بے مقصد سوال تھا۔ جو اتنے سالوں میں کبھی نہیں پوچھا گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں وہ بات کرلینی چاہیے جو نہیں ہو پا رہی ہے۔" انہوں نے مریم کا حوصلہ بڑھایا۔

وہ چند پل خاموشی سے شوہر کو دیکھتی رہی۔

"مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ کیا دعا ہی وہ لڑکی ہے جس کا آپ نے بھائی صاحب سے کہہ رکھا تھا۔" انہیں اتنے پیچیدہ سوال کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اتنی باریک بین تھی۔

"نن.... نہیں.... نہیں تو' وہ فیکٹری کے چپڑاسی کی بیٹی ہے۔" وہ خاصا گھبرا گئے تھے لیکن خود پر کنٹرول رکھنے کی سعی کی۔

"آپ اتنا نروس کیوں ہوگئے ہیں۔" اس نے جانچتی نظروں سے ٹٹولا۔ وہ خاصی پر اعتماد شخصیت تھی' دوسروں کو کنفیوز کر کے' حظ اٹھانے والے۔

"میں.... میں بھلا کیوں گھبراؤں گا۔" انہوں نے ماتھے سے نادیدہ پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"تو پھر اب تک آپ بھائی جان کو ٹال کیوں رہے تھے۔" مریم پوری تفتیش کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ...سے یہ سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ وہ ...کے شوہر تھے واجب الاحترام۔ پھر جس ماحول میں

کی پرورش ہوئی تھی وہاں مردوں کو بہت اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے بھائی صاحب اصول پسند اور سخت گیر شخصیت تھے۔ بھابھی نے کبھی اونچی آواز میں بولنے کی جرات نہ کی۔ ہاں، حق بات کہنے یا سننے پر پابندی نہیں تھی اور یہی سب مریم کی تربیت کا بھی حصہ تھا۔ لیکن جوں جوں وہ الیاس احمد کی سخت گیر، لالچی اور حکمرانی والی فطرت کو جانتی گئی اس کے ہاتھ سے اپنی تربیت کا دامن چھوٹتا گیا۔ وہ روپے پیسے کی لالچ میں کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔ الیاس احمد نہ صرف غصہ ور تھے بلکہ ہتھ چھٹ بھی تھے۔

"وہ..... وہ اس لیے کہ....." انہوں نے گلا کھنکارا۔

"اس لیے کہ وہ لڑکی بیوہ ہے، شادی کے پانچ ماہ بعد ہی اس کا شوہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسا، وہ عدت میں تھی، اس لیے میں خاموش رہا، میٹرک پاس، بہت دکھی لڑکی ہے بیچاری۔" انہوں نے مریم کو اطمینان دلانا چاہا تاکہ اس کا ذہن مزید نہ بھٹکے۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ اسی لڑکی کو بھائی صاحب کو دکھادیں۔" اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" الیاس احمد کو ایک دم سے تپ چڑھ گئی۔ چائے کا کپ زور سے ٹرے میں پٹخ دیا۔ "میں جو تمہارے بھائی کے لیے کررہا ہوں، وہ غلط ہے، آخر تمہیں، میں ہمیشہ غلط کیوں لگتا ہوں، میں کسی کی بھلائی کی ٹھانوں، تم سے بھی شک کی نگاہ سے جانچا جاتا ہے۔ کیا میں اتنا برا اور گرا ہوا انسان ہوں، تمہارا بھائی، میرا کچھ نہیں لگتا، میں تمہارے معذور بھائی کی بددعائیں نہیں لینا چاہتا۔ اگر اس لڑکی کو چھوڑ کے تمہارے بھائی کے لیے مریم کا نام لیا ہے تو یقیناً کچھ بہتر سوچ کر ہی ایسا کیا ہے، او کے فائن، مجھے کوئی کنسرن نہیں اس لڑکی، دعا اور تمہارے بھائی سے، تم جانو اور تمہارا کام، ڈھونڈو اس کے لیے کوئی ایجوکیٹڈ، کنواری، معصوم اور پاک باز عورت۔"

الیاس احمد کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا ان کا جی چاہا کہ مریم کا منہ تھپڑوں سے توڑ دیں۔ جو ان کی محنت پر پانی پھیرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"آپ برا ہی مان گئے، آپ ہرٹ مت ہوں، میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ اگر بھائی جان کو دعا کے لوز کریکٹر کا پتا چلا تو وہ کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے۔" مریم نے صفائی کے ساتھ خدشہ ظاہر کیا۔

"انہیں بتائے گا کون؟ تم یا میں....." الیاس احمد نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"تو کیا ہم ان سے سب چھپائیں گے۔" مریم نے الٹا سوال داغا۔

"تو بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے، دیکھو، میری بات غور سے سنو۔" وہ بیڈ سے اٹھ کے صوفے پر آبیٹھے۔ انہوں نے آج مریم کو راضی کرکے ہی دم لینا تھا۔

"آصف کے آپریشن کے بعد، اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے پچاس فیصد چانس ہیں، اسے ڈپریشن کے دورے بھی پڑتے ہیں، ایسے میں کوئی بھی مضبوط بیک گراؤنڈ والی لڑکی اس کے ساتھ زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی سوائے دعا کے، جس کے نہ کوئی آگے اور نہ ہی پیچھے، وہ ذرا سی بھی چوں چراں کرے تم اسے ماضی کا حوالہ دے کے ڈرا دھمکا سکتی ہو۔"

الیاس احمد نے اسے تصویر کا سب سے روشن رخ دکھایا۔ مریم کئی لمحوں تک فکرانگیز نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی، دس سال اس شخص کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی، وہ ان کے رنگ میں نہیں رنگی تھی۔

"لیکن میں اتنی نیچ اور گری ہوئی حرکت کروں گی کیوں؟ دعا کی یتیمی اور بے چارگی کا فائدہ اٹھا کے 'اپنی زبردست غلام بنالیں' شاید یہی کہہ رہے ہیں ناں آپ؟"
مریم نے خاصی تلخ اور تولتی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔

"تو اس میں دعا کا بھی فائدہ ہے۔ اس کے گناہ اور بدکرداری پر پردہ پڑا رہے گا۔"

الیاس احمد نے گھبرا کر پینترا بدلا۔ مریم کبھی ان کے لیے اتنا مشکل تو نہیں رہی تھی۔

"معاف کیجیے گا برا لگے تو' ہمارے خاندان کا عزت و مرتبہ سات پشتوں تک بے داغ ہے۔" مریم کا صاف انکار تھا۔

"غلاظت' بدکردار' دھبہ یہ سب میری بھانجی کا کردار ہے۔ تو تمہارے اس شریف خاندان کو اڑھائی سال میں ایک لڑکی تک تو مل نہ سکی۔ ماشاءاللہ سے صاحب حیثیت ہیں۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ان کے بنگلے اور فیکٹریاں ہیں' ان کے لیے رشتوں کا حصول مشکل تھوڑی ہے۔" الیاس احمد نے توقف کر کے تنبیہ کے لیے انگلی اٹھائی۔

"اصل بات یہ ہے کہ تمہارے بڑے بھائی صاحب بہت ڈیمانڈنگ ہیں' بااصول اتنے کہ ہر کسی کے سامنے سارا کچا چٹھا کھول دیتے ہیں لڑکی پھر ایسی ہو جو ان کے معذور اور نفسیاتی مریض بھائی کو زور زبردستی یا پیسوں کے لالچ میں نہیں' اپنی خوشی اور دلی رضا مندی سے قبول کرے' حد سے بڑھی ہوئی حقیقت پسندی ہی' تمہارے بھائی کے رشتے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بھابھی نے کبھی شوہر کے بغیر باہر قدم نہیں نکالا' وہ کیسے لڑکی ڈھونڈیں گی اور تمہارا بھائی نوکروں کے رحم و کرم پر مزید پاگل پن اور تنہائی کا شکار ہوتا جائے گا۔"

الیاس احمد نے ساری بھیانک حقیقتیں اس کے منہ پر دے ماریں' ابھی چند منٹ قبل وہ جو کسی غبارے کی طرح اڑانیں بھر رہی تھی اس کی ساری ہوا نکل گئی۔ انہوں نے مریم کی سوچ پکڑلی۔

"کہیں نہ کہیں کمپرومائز کر کے ہی یہ بیل منڈھے چڑھے گی مریم بیگم' تو پھر دعا کیوں نہیں؟ ہم نے یہ پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تم دعا کی اس غلطی کو تھوڑا دیر کے لیے' اپنے ذہن سے مائنس کر دو تو اس کی خوبیوں اور معصومیت کی تم خود معترف ہو' اس سے پرفیکٹ میچ آصف کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا ایک دفعہ اپنے فیصلے پر نظرثانی ضرور کرلو' یہ نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔"

الیاس احمد نے ٹرے میں سے کپ اٹھا کے' ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتارلی۔ مریم نے تفکر بھری نگاہ سے یہ حرکت دیکھی' اب وہ اپنی جگہ پر لیٹ چکے تھے۔



بہت دنوں بعد ریاض احمد کمرے سے نکل کر لاؤنج تک آئے تھے۔ ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ تھا۔ آفس جانا چھوڑ رکھا تھا۔ نوال اپنی ٹف پڑھائی چھوڑ کے ساری شام باپ کے گھٹنے سے لگی رہتی۔ ان سے ادھر ادھر کے روٹین میٹرز ڈسکس کرتی' زبردستی کالج اور یونیورسٹی لائف کے قصے سنتی رہتی۔ جب تک رابعہ احمد اسے کچن سے نکل کر ڈانٹ کر بھگا نہ دیتیں۔ وہ ان پر سوار رہتی۔

عمیر رات کو آفس کی چھوٹی سے چھوٹی بات ان سے شیئر کرتا' مشورہ لیتا اگر پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آتا تو کال کر لیتا تاکہ وہ خود کو ہی مالک سمجھیں۔

رابعہ احمد کا دھیان بھی ان ہی میں اٹکا رہتا۔ ذرا ذرا سی حرکت پر چونک جاتیں۔ کوئی بھول کر بھی عمیر یا دعا کا ذکر نہ کرتا' نہ انہوں نے خود منہ سے بھاپ نکالی۔ وہ شوہر کی طبیعت سے واقف تھیں۔ وہ یقیناً" مصلحتاً خاموش تھے رابعہ احمد کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ خود سے ذکر چھیڑتیں۔ الیاس احمد نے جو کچھ ان کے ذہن میں راسخ کر دیا تھا' وہ نکلنے والا نہیں تھا۔ انہوں نے خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کر کے اس قابل کر لیا تھا کہ وہ ان سے بھرپور دلائل کے ساتھ اپنے گھر اور اولاد

ے محفوظ مستقبل کے لیے بات کرسکیں۔
"منیر... منیر چیئر ادھر لے آؤ۔" رابعہ احمد نے گوڈی کرتے لڑکے کو آواز دی۔ وہ اپنے پیروں پر چل کے لان تک آئے تھے۔ موڈ بھی کسی حد تک خوشگوار تھا۔
"نو پرابلم' میں وہاں تک چل کے جاسکتا ہوں۔" وہ الجھ رہے تھے لیکن ہمت نہ ہاری۔
"احتیاطاً اچھی چیز ہے ریاض صاحب۔"
منیر دو کرسیاں اٹھا کر لے آیا تو انہوں نے آمنے سامنے رکھ کے' احتیاط سے بیٹھنے تک ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔
"تمہاری اتنی کیئر اور محبت کا شاید میں کبھی شکریہ نہ ادا کرسکوں' تم نے میرے لیے دن رات ایک کر رکھا ہے۔" وہ دل سے ممنون تھے۔
رابعہ احمد خفیف سا مسکرا دیں۔ ان کی ساری تھکن وصول ہوگئی تھی۔
"تم تھکتی نہیں ہو۔" ریاض احمد کو ان سے ہمدردی تھی۔
"ہرگز نہیں' جو لمحات ہم نے ایک دوسرے کے سنگ گزارے ہیں' یہ میری پوری زندگی کا اثاثہ ہیں۔ ایسے ہماری شادی کے شروع کے دن تھے۔ پھر عمیر آ گیا' اس کے بعد عمر اور نوال۔ وقت پر لگا کے اڑ گیا' اپنے ساتھ بہت سی اچھی اور تلخ یادیں سمیٹے۔ سوچوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے ایک اجنبی مرد کے ساتھ زندگی کا سب سے قیمتی حصہ گزار دیا ہو۔" بہت عرصہ سے دل میں پلتا گلہ نوک زبان پہ آگیا۔
ریاض احمد کافی دیر ان آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ جن میں چھپی ہلکی سی نمی' شفاف رنگت پر بکھری زردی' پھیکی اور بے جان سی مسکراہٹ' جس نے برسوں سے ان ہونٹوں پر ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ جو ان گلابی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر چھب دکھلا کے غائب ہو جاتی۔
وہ اپنے خاندان کی سب سے خوب صورت اور خوب سیرت عورت تھیں۔ ریاض احمد نے بھی ان کی خوب صورتی اور سلیقہ کے چرچے سن رکھے تھے۔ ان جیسے پریکٹیکل بندے کو سیرت سے غرض تھی۔ ان کا دل بے لگام نہیں تھا۔ یہ ساری سنجیدگی اور بیگانگی صرف گھونگھٹ اٹھانے سے قبل تک کی تھی۔
گھونگھٹ کے اندر شرمائی لجائی' سہمی ہوئی سی گڑیا ان کے دل کی دھڑکنوں کو انگلی کی پوروں پر دھڑکا گئی۔ عمیر کی پیدائش کے بعد تک وہ شوہر کے سامنے سر اور آنکھیں حیا سے جھکا کے مخاطب ہوتیں۔ دھیرے دھیرے مسکراتی رہتیں۔ ریاض احمد جیسا میچور انسان بہت کم کھل کے' اپنی محبت کا اظہار کرتا لیکن انہوں نے کبھی بیوی کی کسی فرمائش' خواہش یا ضرورت کو نظر انداز نہ کیا۔ انہیں وقت اور توجہ دیتے۔ ساتھ لے جا کر اپنی مرضی کی شاپنگ کرواتے۔ ریاض احمد کو ان کے ہونٹوں پر پھیلی شرمیلی مسکراہٹ سے بے حد محبت تھی۔
وہ بھی شوہر کی سنگت میں خوش و مطمئن تھیں۔ صرف ایک بات کھٹکتی تھی کہ وہ اپنی آپا بیگم سے بہت محبت کرتے' ان کی بیٹی دعا کا نام بھی خود رکھا تھا۔ وہ انہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہ اپنے بیٹوں سے بڑھ کر اس پر توجہ اور شفقت دیتے۔ رابعہ احمد کو شروع میں بہت عجیب لگتا پھر وہ عادی ہوتی چلی گئیں۔ محبوب شوہر میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ایک اس نقطے پر اعتراض اٹھا کے وہ خود کو کم ظرف ثابت نہیں کرسکتی تھیں۔ وہ سخی دل کی تھیں۔ انہیں بھی من موہنی صورت والی دعا دل سے قریب محسوس ہوتی۔ ریاض احمد اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے' ہر سیزن میں سب سے پہلے اس کے کپڑے سلتے' ہر ماہ کی یکم کو فیس ادا ہو جاتی۔ دعا ان کے گلے میں جھول کے ہر بات' فرمائش منوا لیتی۔ رابعہ احمد نے اپنے بچوں کو کبھی دعا سے ضد یا برابری کی ترغیب نہ دی۔ ان ساری محبتوں اور چاہتوں کا دعا نے کیا صلہ دیا۔ ان کی چاہت' مان کو مٹی میں رول دیا۔
"اگر اتنے برسوں بعد میں آپ سے کچھ مانگوں تو کیا آپ مجھے دیں گے۔" رابعہ احمد نے تمہید باندھی۔

"میرے لیے ہمیشہ سے آپ کی ہر بات بہت اہم اور مقدم ہے۔" انہوں نے کھلے دل سے اجازت دی۔

"آپ دعا کی شادی کر دیں۔"

ان کے چہرے پر سنجیدگی ابھر آئی جو رابعہ احمد کے لیے بالکل ناقابل فہم تھی۔

"یہ مسئلہ میری عقل سے بالاتر ہے۔ میرا دل نہیں مانتا، جس دعا کو میں نے اتنی محبت دے کر پالا پوسا، وہ مجھے اتنا بڑا دھوکا کیسے دے سکتی ہے۔ وہ ذلت کی اتنی پستی میں بھی گر سکتی ہے۔ آپا جان نے اس کی تربیت ان خطوط پر تو نہیں کی تھی۔"

ریاض احمد کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ آنکھیں نمی سے بھر گئیں۔ رابعہ احمد نے انہیں بنا ٹوکے بولنے دیا۔ یہی غبار تھا جو ان کے سینے پر دباؤ ڈالتا تھا۔

"میرے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری بہن کو یہ دن دیکھنے تک زندہ نہ رکھا۔ وہ مجھے لڑکپن سے یہ درس دینے لگی تھیں کہ سب سے افضل جہاد اپنے نفس پر قابو رکھنا اور اس سے لڑنا ہے۔ پلیدگی اور پاکیزگی کی کتنی احادیث اور آیات سنا کر میرا ایمان قائم رہنے کی دعائیں مانگا کرتیں۔ انہیں اللہ اور قبر کے عذاب سے بہت ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے سر سے ڈوپٹہ نہ اتارا۔ نامحرم سے سخت پردہ کرتیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی.....

میں کس طرح سے سب برداشت کروں میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میں تمہیں اپنے اندر کی تکلیف کیسے سمجھاؤں، نہ دن کو چین پڑتا ہے نہ رات بھر نیند آتی ہے۔ میں کیا کروں....." وہ سر جھکائے باقاعدہ رونے لگے۔

"پلیز ریاض احمد! حوصلہ پکڑیں، اس طرح رونے سے سب سہل تھوڑی ہو جائے گا۔ ہمیں اس مسئلے کا حل نکالنا ہو گا، اس کا حل یہی ہے کہ دعا کی شادی کر دی جائے۔" رابعہ احمد ان کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگیں۔

"عمر کی انسانیت مر چکی ہے، اس نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ مجھے تکلیف دے کے اسے خوشی ملتی ہے۔" رابعہ احمد جذباتی تھیں بے وقوف۔

"عمر کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی میں جلد کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کے، دعا کی شادی کر دوں گی۔"

رابعہ احمد نے بڑے عام سے لہجے میں ساری صورت حال ان کے گوش گزاری۔

"کیا مطلب، کیا دعا کی شادی عمر سے نہیں ہو گی؟" ریاض احمد نے نم آنکھیں ہتھیلی سے پونچھ کر صاف کیں۔

"مطلب صاف ہے میں دعا کی شادی عمر سے نہیں کر رہی۔" رابعہ احمد نے فوراً" تیور بدلے۔

"لیکن کیوں عمر کا گناہ اسی کے سر تھوپو۔" ان کے مرجھائے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

"عمر میں ہر برائی ہے یہ سب جانتے ہیں لیکن اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ جھول اس کے کردار میں تھا ریاض صاحب! اور میں ایسی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی، جسے اپنے نفس پر قابو نہ ہو اور جو اچھی بیٹی نہ بن سکی۔"

رابعہ احمد نے سب کہہ دیا۔ وہ دبنے والی نہیں تھیں یہ سب الیاس احمد کا ازبر کروایا ہوا تھا۔ جو فیصلہ لیا جا چکا تھا وہ اس سے ایک انچ ہٹنے کو راضی نہیں تھیں۔

"تم عمر کو بری الذمہ نہیں کر سکتیں اس کی شادی سے ہی ہو گی، مائنڈ اٹ۔" وہ سختی سے کہہ کر غصے سے اٹھ کے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ رابعہ احمد کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ تھوڑا سا کرسی سے اٹھیں لیکن پھر سوچ کے بیٹھ گئیں۔ ریاض احمد تیز قدموں سے رہے تھے۔



مریم نے پورے قائم ہوش و حواس میں، شوہر فہم کا دل میں اعتراف کرتے، دعا کو اپنے بھائی کے مان لیا تھا۔ اس نے بھائی صاحب کو کال کر کے بتانا تو الیاس احمد نے منع کر دیا۔ ابھی تو رابعہ احمد تک کو

تھی انہیں بھی راضی کرنا تھا۔ الیاس احمد کو اکی تھی کہ مریم نے انہیں بغیر مشکل میں ڈالے رضا مندی دے دی۔ اب وہ بھی ان کے ساتھ لاشعوری طور پر اس مشن کا حصہ بن گئی تھی اور الیاس احمد بخوبی جانتے تھے۔ کہ اسے کیسے اور کس طرح استعمال کرنا ہے۔

"السلام علیکم بھابھی جان....." رابعہ احمد پانی کا گلاس پکڑے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے گم تھیں۔ مریم نے ان کے چہرے پر پھیلے پھیکے پن کو پڑھ لیا۔

"وعلیکم السلام مریم، آؤ بیٹھو، کیسی ہو؟"
رابعہ احمد چونک کر بے ربط بولنے لگیں۔ ورنہ وہ بے تحمل اور دھیمے سے مسکرا کے جواب دیا کرتی تھیں۔

"آپ بیٹھ جائیں بھابھی جان! اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہیں۔" مریم اس حرکت پر الجھ گئی۔

"بس یونہی، دھیان کہیں اور تھا۔"
رابعہ احمد پانی کا گلاس ٹیبل پر دھر دیا۔ ان کے چہرے پر مزید افسردگی چھا گئی۔

"مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کرلیں، دیورانی کے علاوہ میں آپ کی سہیلی بھی تو ہوں۔ آپ بھی میرے ہر دکھ سکھ کی شریک اور رازداں ہیں، آپ نے ہی میرے اندر اتنی ہمت اور جرات پیدا کی ہے کہ میں ہر کٹھن رستے اور مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرلیتی ہوں۔ کیا میں اس قابل نہیں کہ آپ کا درد بانٹ سکوں۔"
مریم نے ان کے نرم وملائم ہاتھ پکڑ کر سہلانا شروع کردیا۔

"پلیز مریم! میرا بھرم رہنے دو، کچھ مت پوچھو۔" رابعہ کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔

"کیا آپ کی پریشانی دعا ہے۔" اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد خود ہی نکالا گیا۔ رابعہ احمد نے سر اٹھا کے ہوں یا ہاں میں سرہلانے کی بھی کوشش نہ کی۔

"وہ تو میرے لیے بھی سر درد بنی ہوئی ہے لیکن میں نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔" مریم بھی اکتائی ہوئی تھی۔

"وہ کیا؟" رابعہ احمد نے بے تابی سے پوچھا۔

"الیاس چاہتے ہیں کہ میں دعا کی شادی اپنے چھوٹے بھائی آصف سے کروادوں اور اس کی اصلیت سب سے چھپالوں۔" مریم نے ایک پل میں سب بتا دیا۔

"کیا....." ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ "لل..... لیکن مجھ سے تو الیاس نے تمہارے بھائی کا ذکر نہیں کیا اور تمہارا چھوٹا بھائی ایکسیڈنٹ میں معذور ہو گیا ہے ناں۔" رابعہ احمد کی حیرانی بجا تھی۔ انہوں نے اپنے دماغ پر زور دے کے یاد کرلیا تھا۔
وہ رونا دھونا بھول چکی تھیں۔

"جی ہاں، لیکن اب وہ کافی بہتر ہے۔ ڈاکٹرز ہوپ فل ہیں کہ وہ آپریشن کے بعد مزید ریکور کرلے گا۔" یہ سب مریم نے نظریں چرا کے کہا تھا۔ کیونکہ "کافی بہتر" کے بجائے اس کی ذہنی حالت "کافی ابتر" ہو گئی تھی۔ مریم بھی اپنا ذہن بنا چکی تھی اس لیے غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔

"نہیں..... نہیں ریاض احمد کل سے مجھ سے ناراض ہیں۔ وہ دعا کو عمر کے پلّے ہی باندھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر انہیں یہ نئی رپورٹ مل گئی کہ ہم ایک معذور شخص کو اس کا مقدر بنا رہے ہیں تو وہ بہت بری طرح پیش آئیں گے۔"
رابعہ احمد کا لہجہ اٹل تھا۔ وہ کافی گھبرا گئی تھیں۔ مریم کا خیال تھا کہ وہ سنتے ہی راضی ہو جائیں گی۔ رابعہ احمد کے انکار نے آصف کی شادی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اسے تو اب دعا ہی بھائی کے لیے بیسٹ چوائس لگ رہی تھی۔

"میں چلتی ہوں بھابھی جان! الیاس کو بھیجوں گی۔ وہ آپ سے سب ڈسکس کرلیں گے۔" مریم نے باقی معاملہ الیاس کی چالاکی پر چھوڑ کے بھاگنے کی کی۔



رابعہ احمد جو عمر کی شکل تک دیکھنا چھوڑ چکی تھیں۔

مریم کی آمد کے بعد' عمر سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ کوئی بھی بڑا قدم اٹھانے سے قبل اس کی رائے جان لینا ضروری تھا۔ اب وہ دعا کے بارے میں کیا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس سب کی ضرورت قطعا" نہیں تھی۔ وہ مصمم ارادہ کر چکی تھیں کہ چاہے جو بھی ہو' دعا اس گھر کی بہو کبھی نہیں بن سکتی' ایک موہوم سی امید کہ اگر عمر خود انکار کر دیتا۔ تو پہلی بار اس کی ضد ان کے فائدے میں جانے والی تھی اس طرح وہ شوہر کے سامنے جھوٹی بھی نہ پڑتیں۔

وہ بیسمنٹ کے جم خانے میں آگئیں تاکہ آرام سے بات ہو سکے۔ عمر ویٹ لفٹنگ کر رہا تھا۔

"عمر..." وہ سر پر جا پہنچیں۔

اس پکار پر اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ویٹ رکھ کے جلدی سے اٹھا۔

"ماما جان آپ... وہ بھی یہاں..." عمر کی حیرانی بجا تھی کیونکہ وہ کبھی بیسمنٹ میں نہیں آتی تھیں۔

"ہاں' میں تم سے دعا کے متعلق بات کرنے آئی ہوں۔" انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کے صاف الفاظ میں آنے کا مقصد بتا دیا۔

عمر نے اتنے روز بعد ماں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ انہیں کندھوں سے تھام کر گھما ڈالے' گود میں سر رکھ کے لیٹ جائے' گالوں پر پیار کرے' ان کے ملائم ہاتھوں پر بوسہ دے لیکن ماں کے تاثرات اتنے اجنبی تھے کہ اسے خود پر ضبط کرنا پڑا۔

"جی کہیے' کیا کہنا ہے؟" وہ کرسی سے اٹھ کے تولیہ سے پسینہ صاف کرنے لگا۔

"میں چاہ رہی ہوں کہ بہت جلد کوئی اچھی سی فیملی دیکھ کے' دعا کی شادی کر دوں۔" انہوں نے کسی تمہید کے بغیر سیدھا کہہ دیا۔

"تو کر دیں' میں کیا اس کا بزرگ ہوں' جو مجھ سے مشاورت کی جا رہی ہے۔" وہ تولیہ سے بازو صاف کرتا تیکھے پن سے بولا۔

"میرا خیال تھا کہ میرا صاف گو اور منہ پھٹ بیٹا اپنے گناہوں کا بوجھ بخوشی اٹھا لے گا۔" انہوں نے ٹوہ لی۔

"کون سا گناہ؟ جو میں نے کیا نہیں بلکہ مجھ سے کروایا گیا ہے۔ ڈونٹ مائنڈ ماما جان' لڑکی میرے روم سے برآمد ہوئی ہے' میری اس آخری گفتگو کا سیاق و سباق بھی آپ کو یاد ہو گا' لہٰذا برائے مہربانی اسے کسی اور کے سر جا کے تھوپیں' میں اس کی شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔" عمر نے صاف انکار کرتے' پانی کی بوتل کا ڈھکن کھول کے منہ سے لگالی۔

"اپنے باپ کی سختی پر فیصلہ بدلو گے تو نہیں۔" رابعہ احمد نے شک کے تحت استفسار کیا۔

"سو جوتے ماریں یا جائیداد سے عاق کر دیں تب بھی نہیں مانوں گا اور اب آپ پلیز یہاں سے جائیں اور آئندہ مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے قطعیت سے کہہ کر بیزار سا منہ بنایا۔ رابعہ احمد اثبات میں سر ہلا کے چل دیں۔



ان کی انتیس سالہ ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے روٹھے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت بیت گیا تھا۔ رابعہ احمد خاموشی سے ان کے کام کیے جاتیں' ابھی بھی وہ میڈیسنز اور پانی کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔ ریاض احمد کو اٹھنے میں دقت ہوئی' وہ سہارا دینے کو بڑھیں۔ ریاض احمد نے ان کے اپنے بازو پر رکھے ہاتھ کو بغور دیکھا۔

"رہنے دو' میں خود ہی اٹھ جاؤں گا۔" انہوں نے ہاتھ ہٹا دیے۔

رابعہ احمد کا منہ لٹک گیا۔ وہ ہلکا اکھڑا سانس لیے گئیں۔ دوا کے لیے ہتھیلی آگے بڑھائی تو انہوں نے ٹیبلٹس رکھ کے پانی کا گلاس تھما دیا۔ وہ بیڈ کے قریب بیٹھ گئیں۔

"مجھ سے اتنے سخت ناراض ہیں کہ میں آپ کو اچھوت لگنے لگی ہوں۔" وہ رو دینے کو تھیں۔

"جس لہجے میں کل آپ نے مجھے سنایا' اس کے بعد مجھے آپ کی خوشامد کرنی چاہیے۔ آپ یہ بھلا

چکی ہیں کہ میں آپ کا شوہر ہوں۔" ریاض احمد نے خالی گلاس سائیڈ دراز پر دھرا۔ ان کے غصے کو نکاس کا رستہ مل گیا تھا۔

"میں اپنے رویے پر واقعی شرمندہ ہوں' میری یہ پہلی اور آخری غلطی معاف کر دیں۔" وہ سخت نادم تھیں۔

"وہ سب شائستگی سے بھی کہا جا سکتا تھا۔" اب کے وہ دھیما پڑ گئے۔

"جو انصاف اور سچائی ہو' وہی کہو رابعہ بیگم' دعا کی شادی عمر سے ہی ہو گی' یہی میرا حکم ہے۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"عمر نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ میرے بہت سمجھانے کے باوجود بھی۔" انہوں نے خود بحث کرنے کے بجائے عمر کا نام لے دیا۔

"تو آپ ابھی بھی اس کی طرف داری کر رہی ہیں۔" ریاض احمد کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں۔

"میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہی بلکہ اپنی آئندہ نسل کے لیے درست انتخاب کر رہی ہوں۔ دعا اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی' یہ عمر کا نہیں میرا بھی فیصلہ ہے۔"

رابعہ احمد نے سنجیدگی اور دھیمے پن سے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ ریاض احمد کی نگاہیں ان کے چہرے پر جم گئیں۔

"تو اب آپ مجھ پر اپنے فیصلوں کی حد لگائیں گی۔" ان کے تیور بگڑے۔

"آپ میرے مجازی خدا ہیں' آپ کی زبان سے نکلا حرف حرف میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ تیس سالہ زندگی میں' میں نے کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ نہ سوال' نہ گلہ' خاموشی سے سر جھکائے تعمیل کرتی آئی ہوں۔ کیا میں رتی بھر بھی جھوٹ بول رہی ہوں۔"

رابعہ احمد کے اندر اعتماد بھر گیا تھا۔ انہوں نے بہاؤ سے تمہید باندھی۔ انہوں نے اس مسئلے کو آر یا پار کرنے کا سوچ لیا تھا۔

"جو بھی کہنا ہے' واضح اور کھل کر کہہ دیجئے۔" وہ بچے نہیں تھے جو اس تمہید کا مفہوم نہ سمجھتے' بیوی کو بولنے کی آزادی دی۔

"آپ نے ہمیشہ مجھ پر اور میری اولاد پر آپا بیگم اور ان کی لاڈلی بیٹی دعا کو ترجیح دی۔ آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ ان کی ضرورتوں اور خواہشوں کی پروا ہوتی' دعا کو بڑی بیٹی کہتے۔ وہ آپ کو نوال سے بڑھ کر عزیز رہی اسے ہر موقع پر وقتاً" فوقتاً" آپ تحفے تحائف بھی دیتے' اپنی بہن کی ہر معمولی اور غیر معمولی بات آپ کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ میری حیثیت تو صرف ایک ملازم کی سی رہی ہیں....."

"اسٹاپ اٹ رابعہ بیگم! بہت بول چکیں آپ اور جو نہیں بولا وہ بھی میں سمجھ گیا۔" ریاض احمد کا چہرہ کھنچ گیا۔

"آپ اپنا مقابلہ میری بہن سے کیوں کر رہی ہیں۔ آپ اچھے سے جانتی ہیں کہ وہ میرے لیے بہن سے بڑھ کر ماں کی طرح تھیں کیونکہ ماں کے بعد انہوں نے میری پرورش کی اور دعا.... دعا ایک یتیم بچی کا مقابلہ اپنے بچوں سے کیونکر کرنے لگیں' ایسا کون سا اس بے چاری نے آپ کی اولاد کا حق غصب کیا ہے اور میری بھی وہ ذمہ داری بتایئے جو میں نے پوری نہیں کی اور وہ تحفے تحائف اس کی ضرورت کی چیزیں ہوتی تھیں۔ اور آپ نے خود کو ملازمہ کہہ کر' بہت زور کا تھپڑ میرے منہ پر مارا ہے۔ آپ کا کون سا حق میں نے ادا نہیں کیا' کس غرض سے نظریں چرائیں۔ آپ اس گھر کی بااختیار مالک ہیں جو چاہے اپنی مرضی سے کر سکتی ہیں۔ آپا بیگم نے بھی کبھی ہم دونوں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی پھر آپ کس طرح میری مرحومہ بہن بھانجی اور مجھ پر الزام تراشی کر رہی ہیں۔ یہ جو آپ مجازی خدا کا راگ الاپتی ہیں' یہ صرف ایک کھوکھلا لفظ ہے۔ مجھے آپ سے اتنی گھٹیا سوچ کی امید نہیں تھی' آپ اس بار بھی عمر کے عیبوں کی پردہ پوشی کے لیے مجھ پر انگلی اٹھا رہی ہیں۔ بہت خوب' بہت اچھا طریقہ اپنایا ہے۔ آئی ایپری شیٹ

یو۔“

ریاض احمد روہانسے ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی بیوی سے اس کم ظرفی کی توقع نہیں تھی۔ رابعہ احمد اتنی جلدی ہمت ہارنے والی نہیں تھیں۔ انہیں اس میدان جنگ کو سر کرنا تھا۔ انہیں شوہر کے بجائے اپنے گھر اور بیٹوں کو بچانے کی فکر دامن گیر تھی۔

”میں اپنی آپا بیگم کو روز قیامت کیا منہ دکھاؤں کہ میں ان کی بیٹی کو انصاف....“

”تو پھر میری بھی بات کان کھول کے سن لیں میں بھی روز قیامت آپ کا گریبان پکڑوں گی‘ انصاف مانگوں گی....“

رابعہ احمد کے اندر کی عورت آپا بیگم کے قیامت والے راگ سے اکتا گئی تھی۔ بپھرہوئی شیرنی کی طرح دھمکی دی گئی ریاض احمد نے حیرت اور دھندلی آنکھوں سے انہیں کمرے سے نکلتے دیکھا۔



مریم نے شام سے ہی گیراج میں آکے مشرق سے مغرب تک چکر کاٹنے شروع کردیے تھے۔ وہ تو اپنے تئیں دعا جیسی بدکردار کو اپنے معذور بھائی کی دلہن بنا کر رابعہ احمد کے بیٹے کا گناہ اپنی نسل پر تھوپ کے ’بہت بڑا احسان جتانے گئی تھی۔ لیکن وہاں معاملہ ہی الٹ نکلا۔ وہ تو نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس قصے سے بے خبر ہیں۔ الیاس احمد نے ان سے صلاح و مشورہ کیے بغیر ہی سب سوچ رکھا ہے۔

جیسے ہی الیاس احمد کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی‘ اس کی بے قراری کو سکون ملا۔ گاڑی پورچ میں رکنے تک وہ بھی تیز قدم اٹھاکے ان تک پہنچ گئی تھی۔

”خیریت! تم یہاں کھڑی ہو۔“ مریم نے بھی اتنی بے قراری سے استقبال نہیں کیا تھا۔

”کیا بھابھی جان آصف اور دعا کے رشتے سے آگاہ نہیں ہیں؟“ مریم نے چھوٹتے ہی سوال داغا۔ وہ تو شوہر کا کہا مان کے اس پر بڑی بھاری پڑ رہی تھی۔ رابعہ احمد کی سختی نے ساری اکڑ نکال دی تھی۔ اس کا دل تب سے وہموں میں گھر گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ بھابھی جان دعا سے اتنی بھی بددل نہیں ہیں جتنا اندازہ لگا چکی ہے۔

”نہیں.... آج کل میں ذکر....“

”ذکر میں نے غلطی سے کر دیا ہے۔“ مریم نے چبا کر الفاظ ادا کیے۔

”تو پھر....؟“ اس کے تیور سوالیہ تھے۔

”بھابھی جان کو صاف انکار ہے۔“ اس کی بھنویں ماتھے پر چڑھ گئیں۔

الیاس کے شاطرانہ ذہن نے بغور اس کے تیور اور لہجہ کو جانچا اور پلٹا کھایا۔

”ہو سکتا ہے‘ انہوں نے دعا کے لیے کچھ اور رفائنڈ کر لیا ہو‘ چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے سر پر سے بھی بلا ٹلی تمہیں بھی اس پرپوزل پر خاصا اعتراض تھا۔“ الیاس احمد نے ایکٹنگ کی۔

”کیا کہہ رہے ہیں‘ میں نے تو یونہی رفیوز (انکار) تھا‘ بعد میں سوچا تو آپ کا کہا سب ٹھیک لگا‘ اب تو میں اپنا مائنڈ سیٹ کر چکی تھی۔ دعا واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ آصف کے لیے پرفیکٹ میچ۔“ مریم بنا سوچے سمجھے روانی میں سارے اعتراف کیے جا رہی تھی۔ رو دینے کو تھی۔ الیاس احمد کو اتنی مشکل سچویشن میں بھی ہنسی آگئی۔

”آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟“ وہ تلخ ہو گئی۔

”اس لیے کہ تم رو رہی ہو۔“ ان کا انداز مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

”آخر آپ کیا کرنے والے ہیں۔“ وہ زچ ہو گئی۔

”ڈونٹ وری۔ تم اپنے بھائی کی شادی کی تیاری شروع کرو‘ صرف چند دن باقی ہیں۔“ الیاس احمد کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔

”نہیں الیاس! میں نہیں جانتی کہ آپ کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو‘ اب بھی ان لوگوں کا دعا پر زیادہ حق بنتا ہے۔ بھابھی جان کو پیار سے ہینڈل کرنا۔ اتنا سب ہونے کے باوجود بھی وہ دعا کے لیے بہت پوزیسیو لگ رہی تھیں۔“ مریم نے

محسوس کیا تھا' بتادیا۔
"تم ٹینشن مت لو میری چندا۔ میں فریش ہولوں' تم میرے لیے اسٹرانگ سا کپ چائے' دو ڈیپ فرائی کباب لے کر آؤ اس کے بعد میں بھابھی جان سے جا کرے نپٹتا ہوں۔"
الیاس احمد کے ہلکے پھلکے لہجے نے اس کی ساری مشکل حل کردی۔ اسے شوہر کے کہے پر یقین تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ واش روم سے نکل کر بڑی سست روی سے چلتی ہوئی دیوار گیر آئینے کے سامنے آرکی۔ اس کا چہرہ زرد' سوجن زدہ اور ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے پھولے ہوئے سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ بکھرے بال' ہونٹ پپڑی زدہ' ہاتھوں کی رگیں کھنچی ہوئیں اور کمزوری کی وجہ سے کپکپاہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں کے سارے آنسو اور جسم کی ساری ہمت و توانائی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے گال پر ٹرانس کی سی کیفیت میں ہاتھ پھیرا۔ پھر سے ہاتھ سیاہ حلقوں پر جا ٹھہرا۔ اس کا دماغ رونے کی وجہ سے سُن ہو چکا تھا۔
"میں یہاں پر کیوں ہوں' میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟" دعا کے ذہن کی الجھی سوچوں نے درست سمت سفر شروع کیا۔

☆ ☆ ☆

الیاس احمد دروازے پر ہلکے سے دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ رابعہ احمد نے سوئے ہوئے شوہر پر چادر درست کرتے مڑ کر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کے ان کو خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔
"کیسی طبیعت ہے بھائی جان کی؟" باہر آ کے انہوں نے پوچھا۔
"تھوڑے ڈپریس ہیں' آج میرے پاس مریم آئی تھی۔" وہ جلد مطلب کی بات تک آ گئیں۔ "تم دعا کا رشتہ اپنے معذور سالے آصف سے کروا رہے تھے بھائی۔" وہ دونوں باتیں کرتے کوریڈور کی طرف مڑ گئے۔ رابعہ احمد کا مزاج کافی گرم تھا۔
"جی' کیونکہ مجھے یہی مناسب لگا۔" انہوں نے رابعہ احمد کے غصے کو مزید ہوا دی۔
"افسوس ہے مجھے تم پر' میں تمہیں بہت رسپونسبل اور جینئس سمجھتی تھی' تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ تم یہ پوائنٹ کیوں مس کر رہے ہو کہ اس پر جان نچھاور کرنے والا ماموں ابھی زندہ ہے۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا ہے۔ برے وقت کے تحت یہ محبت راکھ میں ضرور دب گئی ہے۔ فنا نہیں ہوئی جس دن راکھ ہٹے گی اس دن یہ چنگاری پھر سے شعلہ بن جائے گی۔ تمہارا کیا جائے گا' سارا غصہ وہ مجھ پر اتاریں گے' یہ بھڑکتا شعلہ میرا گھر برباد کر دے گا..... نہیں الیاس! میں دعا کے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتی' ایک معذور شخص کے ساتھ' نہیں..... نہیں۔"
رابعہ احمد کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ انہوں نے سختی سے سر نفی میں ہلایا۔
"کس سے ڈر گئیں بھابھی جان! اللہ سے یا شوہر سے۔" الیاس احمد تلخ ہو گئے۔
"اللہ سے ڈر کے ہی چوبیس برس اس لڑکی کو اپنے اولاد کے حق پر غالب رکھا ہے لیکن اب مجھے ریاض احمد سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ ابھی بھی دعا کی طرف داری کر رہے ہیں۔" وہ ابھی اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی بہت سا وقت درکار تھا۔
"آپ دعا اور عمر کا نکاح پڑھوا دیں۔" انہوں نے قصہ ختم کر دیا۔
"عمر تو دعا کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتا اور خود میں بھی اس لڑکی کو دوبارہ گھر لانے کا سوچ نہیں سکتی۔" انہوں نے نظریں چُراتے سچ اگلا۔
تب ہی عمیر سیڑھیاں اتر کر ادھر ادھر دیکھتا' رابعہ احمد کو ڈھونڈتا کوریڈور کی طرف نکل آیا۔ اتنے خاموش گوشے میں وہ ان دونوں کو آخری سرے پر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔
"آپ دو کشتیوں کی سوار مت بنیں بھابھی جان! اپنے دل سے اس دعا نامی چڑیل کی محبت کھرچ کے فیصلہ لیں' معاف کیجئے آپ کے ذہن' دل اور زبان میں

خاصا واضح تضاد ہے۔ دل میں دعا کی محبت مری نہیں' ہاں کم ضرور ہوئی ہے۔ ذہن راسخ ہے کہ گھر کے کسی کونے میں بھی اس لڑکی کو جگہ نہیں دینی اور زبان سے اس کے اچھے کے لیے سفارشیں جاری ہیں۔ شوہر کا ڈر بھی دامن گیر ہے' خدا خوفی بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ مجھے سمجھائیں کہ آپ بیک وقت کتنے فیزز سے گزر رہی ہیں۔" وہ غصے و اشتعال سے بھر گئے آواز بھی قدرے اونچی ہو گئی۔

"پھر بھی الیاس' کوئی مناسب سا لڑکا دیکھ لو' جس پہ ریاض احمد مطمئن ہو جائیں۔" انہوں نے پھر بھی کہہ دیا۔

"اگر ریاض صاحب کی خواہش کا خیال ہے تو پھر اسے عمر کے پلے باندھ دیجیے' دیر کیوں کر رہی ہیں۔" انہوں نے کٹھور پن سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا' میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟" وہ رو دیں۔

"مجھ پر بھروسا کریں یا پھر اپنی عقل کا استعمال کر کے حالات سے لڑیں بٹ پلیز رونا دھونا مت ڈالیں۔" الیاس احمد خاصے گرم ہو گئے تھے۔

"دعا داغ دار ہو چکی ہے' یہ بات ابھی صرف اس گھر کے مکینوں تک ہی ہے۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اس کی بدکرداری سے پردہ نہیں اٹھے گا' میری نظر میں تو کوئی ایسی بے غیرت فیملی نہیں ہے۔ جو پیسوں کے عوض ہی اپنا منہ بند رکھے۔ دعا اس گھر سے باہر گئی تو سمجھو اس کی ذلت اور ہماری عزت بھی گھر سے باہر نکل گئی اس کے آلودہ دامن کے چھینٹے' آپ کی بیٹی تک آئیں گے' کیا نوال کو کسی عزت دار گھرانے میں رخصت نہیں کرنا' اپنی ہوس میں اس نے تو اپنی زندگی تباہ کرلی' آپ اپنی بیٹی کا مستقبل کیوں خطرے میں ڈال رہی ہیں۔"

رابعہ احمد کے دل و دماغ میں سوئیاں چبھنے لگیں اتنے نزدیک کی بات کیوں ان کی عقل سے بالاتر رہی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" رابعہ احمد نے سوچوں میں ڈوب کر۔ سر ہلاتے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

عمیر کے ماتھے پر سینکڑوں بل پڑ گئے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کے الیاس احمد کا گریبان پکڑ لے لیکن رشتے کا لحاظ و احترام آڑے آگیا۔ اسے ان ہی حرکتوں اور چالوں کی وجہ سے اپنا یہ چاچا کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"ابھی ہم جو کر رہے ہیں اسی میں مصلحت اور ہم سب کی بھلائی ہے۔ مریم کے بھائی آصف کی آپریشن کے بعد بہتری کے چانسز 70% پرسینٹ ہیں۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو دعا کی قسمت ورنہ میرا نہیں خیال کہ وہ چار' چھ سال سے زیادہ جی پائے گا۔ آپ اس کی کسی اونچے خاندان میں شادی کا خواب بھرپور اکر لیجیے گا اور خوب ثواب بھی ملے گا۔" آخری جملہ اس نے طنزیہ کہا تھا۔

عمیر کی مٹھیاں بھنچ گئیں اس سے آگے مزید سننا اور دیکھنا گوارا نہ ہوا تو واپس مڑ گیا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا۔



اگلی صبح مریم نے اپنے بڑے بھائی کو فون کر کے' سب سمجھا کے' پرسوں گیارہ بجے نکاح کا وقت بھی مقرر کر لیا تھا۔ مریم' رابعہ اور الیاس احمد کو دو دن کا انتظار بھی قیامت جتنا لمبا لگ رہا تھا۔ سب کے دل میں ریاض احمد کا خیال کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ لیکن ابھی ایک اور شخص بھی تھا۔ جو مصلحتاً" خاموش تھا۔ اس کے دل میں سالوں سے دعا کی محبت دھرنا مارے بیٹھی تھی۔ اس کا دل بے بس تھا۔ اس کا دعا پر بھروسا اتنا کمزور نہیں تھا کہ ٹوٹ جاتا۔ اس کا ذہن ابھی بھی کسی غلط فہمی کے گرد الجھا ہوا تھا۔ اس کی محبت ہر جرم و قید سے بری الذمہ تھی۔

اسے پچھلے کچھ دنوں سے دعا کا عجیب اور بدلا ہوا رویہ بہت کچھ باور کروا رہا تھا لیکن پھر بھی اس کا دل و دماغ شک کی زد میں نہیں آیا تھا۔ اگر وہ گناہ گار تھی تو وہ اس کا بھی اعتراف لینا چاہتا تھا۔ وہ بدکردار ہو سکتی تھی جھوٹی نہیں۔

"ماما جان بزی ہیں؟" وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑا پوچھ

رہا تھا۔

"نہیں' ہاں کچھ زیادہ نہیں تم آجاؤ۔"

رابعہ احمد نوال کے کپڑے تہ کر رہی تھیں۔ عمیر کو سامنے پاکے ان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکلے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہ آفس کے لیے نکل گیا تھا۔ انہیں اسی آمنے سامنے کا خطرہ تھا۔

عمیر نے کپڑے کے ڈھیر کو پرے کھسکا کے اپنے لیے جگہ بنائی۔

"تم آفس نہیں گئے۔" وہ کپڑے اٹھا کے وارڈ روب میں رکھنے لگیں۔

"آپ سے کچھ پوچھنا تھا اس لیے رک گیا۔"

اس نے دھیمے سے کہا۔ اسے دوغلی پالیسی اپنانا نہیں آتا تھی جو ذہن میں ہوتا وہی زبان پر' پھر اس کا رشتوں کی سچائی پر ایمان پکا تھا۔

"تمہارے پاپا بتا رہے تھے۔ بہت ضروری میٹنگ ہے۔" انہوں نے اس کی اہم ذمہ داری یاد کروائی۔

عمیر نے ماں کی پشت کو بغور دیکھا۔

"میں نے رات آپ کی اور چاچو الیاس کی کوریڈور میں کی جانے والی گفتگو سن لی تھی۔" اس نے سچ اگل دیا۔ رابعہ احمد کے ہاتھ رک گئے۔ وہ وارڈ روب بند کر کے اس کے پاس آبیٹھیں۔

"بہت بری حرکت کی تم نے۔" انہوں نے سرزنش کی۔

"آپ اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔" وہ ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی کہہ رہا تھا۔ اس کے اپنے دل میں بے شمار سوالات طوفان اٹھائے ہوئے تھے۔

"ہاں' پرسوں اس کا سادگی سے نکاح ہے۔" رابعہ احمد کے تیور بدل گئے۔

عمیر کے دل کو کسی نے زور سے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"پاپا جان کو انفارم کیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ان کی تم ٹینشن نہ لو' وہ ایگری ہیں۔" انہوں نے لامعنی جواب دیا۔

"یہ اتنی جلدی اور اچانک رشتہ کہاں سے ٹپکا' کیا کوئی فیملی اسے دیکھنے آئی تھی نہ لڑکا کیا کرتا ہے۔ کوئی انویسٹی گیشن کی گئی ہے۔" اس نے ایک سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

"الیاس احمد کے سسرال والوں میں سے کوئی ہے۔ تم اتنا انٹرسٹ شو مت کرو' جو کچھ وہ ہمارے ساتھ کر چکی ہے' اس کے بعد کسی قسم کی ہمدردی کی مستحق نہیں وہ۔" رابعہ احمد کا لہجہ کھردرا تھا۔

"جو ہو چکا' اسے یہیں اس گھر کی دہلیز میں دفن کر دیں' وہ اکیلی قصور وار نہیں ہے۔" عمر نے ماں کی اصلاح کی۔

"شام کو لڑکے والوں کی فیملی کو بلائیں' میں خود ملنا چاہوں گا' ریاض احمد ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے کہ ان کی بیٹی کو کوڑا کرکٹ کی طرح اٹھا کے کسی اور کے گھر میں پھینک دیا جائے اور ان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا عیش و عشرت سے دندناتا پھرے۔" عمیر کا انداز دو ٹوک تھا۔

اسے اپنی ماں پر شبہ تھا۔ وہ عمر اور دعا کی دوستی کی سب سے بڑی حامی تھیں۔ اور اب شوہر اور بیٹے کو چھوڑ کے الیاس احمد سے صلاح و مشورے ہو رہے تھے۔ اس سارے قصے میں اسے ماں کے نیت میں فتور نظر آرہا تھا۔

"میں الیاس کے معذور سالے سے اس کی شادی کروا رہی ہوں۔" الیاس احمد کی حوصلہ افزائی ابھی تازہ تھی۔ وہ شوہر کے سامنے آواز بلند نہیں کر سکتی تھیں لیکن عمیر کو دبا سکتی تھیں۔

"کیوں؟ وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔" وہ خود پر ضبط کرتا کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی ماں سے اتنی تنگ دلی کی توقع نہیں تھی۔

"وہ اس قابل نہیں رہی کہ تم اس بد کردار کی طرف داری کرو' یہی اس کی سزا ہے۔" رابعہ احمد اس کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئیں۔ عمیر نرمی سے بھی ماننے والا نہیں تھا۔

"آپ منصف اعلیٰ ہیں یک طرفہ طور پر' خود کو اس

بدکردار لڑکی کو سزا دینے پر قادر سمجھتی ہیں تو اپنے بیٹے کے لیے بھی سزا تجویز کریں۔ انصاف کا پلڑا پھر ہی برابر ہو گا۔" اس نے بے باکی سے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماتھے پر ناراضی کی لکیریں کھنچ گئیں۔ رابعہ احمد کا اتنا بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر کے اس پر ڈٹ جانا یہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس کہانی میں وہ بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔

"بہتر ہے کہ تم اپنی زبان اور کان بند رکھو۔" رابعہ احمد کو کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ وہ اس کی جذباتی تقریر سے متاثر ہونے والی نہیں تھیں۔

"یہ آپ نہیں ماما جان، آپ کے منہ میں الیاس چاچو کی زبان بول رہی ہے لیکن یاد رکھیے گا میں آپ کو اتنا بڑا گناہ نہیں کرنے دوں گا۔" عمر نے انگلی اٹھا کے جتایا۔

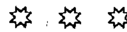
"جسٹ شٹ اپ عمیر۔ پہلے اس نے عمر کو ورغلایا اور اب میں اسے تمہاری صورت میں دوسرا موقع دوں تاکہ تمہیں نشانہ بنائے۔"

عمیر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے ماں کے الفاظ تازیانہ لگے جو اس کے منہ پر مارے گئے تھے۔

"ماما جان! دعا نے مجھے..."

"ایک لفظ مزید نہیں عمیر، اپنی آواز اسی کمرے میں دبا لو۔" انہوں نے سختی سے عمیر کو خاموش کروا دیا۔

"اگر تم نے کوئی ہنگامہ کھڑا کیا یا اپنے پاپا جان کو بتایا کہ دعا کی شادی ایک معذور شخص سے ہو رہی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، آئی سوئیر میں گھر چھوڑ کے چلی جاؤں گی۔" وہ عمر کو دھمکی دے کے ہکا بکا چھوڑ گئیں۔



الیاس احمد، دعا کو اس کی شادی کی انوٹیشن دینے آئے تھے۔ یہ فارملیٹی وہ صرف تبریز ملک کے ڈر سے پوری کر رہے تھے کہ دعا نکاح والے روز شور شرابہ نہ کرے۔ تبریز ملک فوراً انکار کر دیتے۔

دعا کے اتنے روز سے پہنے کپڑے ملگجے ہو گئے تھے، بال بکھرے، چہرہ زرد اور آنکھیں مستقل سوجن زدہ۔

"دعا... دعا میری بیٹی، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" الیاس احمد تڑپ اٹھے تھے۔ وہ صوفے پر دعا کے پاس جا بیٹھے۔

"میں تو اس حادثے کے اگلے روز ہی اسلام آباد چلا گیا تھا۔ ضروری کام میں چند دن لگ گئے۔ مجھے ہر دم اپنی لاڈلی بیٹی کی فکر لگی رہتی، روزانہ مریم سے تمہاری خیریت دریافت کرتا، مگر یہاں تو سب کچھ ہی بدل گیا ہے اور مجھے افسوس ہے میری بیٹی کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ ابھی بھائی جان نے بلا کر بتایا ہے کہ انہوں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ میں نے انہیں منع کرنا چاہا تو بھائی جان ہتھے سے اکھڑ گئے۔ اس رات انہیں اٹیک ہو گیا تھا، اب طبیعت تھوڑی سنبھلی ہے، ڈاکٹرز نے سختی سے ٹینشن دینے سے منع کیا ہے اور ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ دعا کی شادی کریں، اس گناہ گار لڑکی کو، عذاب کو ہمارے سروں پر سے ٹال دیا جائے۔" الیاس احمد آخری فقرہ بولتے روہانسے ہو گئے۔

دعا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس نے گھٹنوں کے گرد بازو کا حلقہ کھول لیا۔ اس کا دل بے یقین تھا لیکن الیاس احمد سب رو رو کے بہت پختہ لہجے میں سب کہہ رہے تھے کہ شک کی گنجائش نہ تھی۔

"پرسوں تمہاری شادی ہے دعا، تم اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاؤ گی، ان کے دلوں سے تم اتر چکی ہو۔ بہت شدید نفرت ہو گئی ہے انہیں تم سے۔"

اس سے دکھ کی شدت سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"نہیں... نہیں، ماموں جان میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتے، وہ مجھے اپنی بیٹی کہتے ہیں اور اولاد سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اتنی بڑی سزا۔ ممانی جان مجھے نوال جیسی بیٹی کہتی ہیں، عمیر کی میں بیسٹ فرینڈ

ہوں' وہ مجھ سے کچھ پوچھے یا تفتیش کیے بغیر کیسے فرد جرم عائد کرسکتے ہیں' میں نے کچھ نہیں کیا میں ماموں جان کو بتاؤں گی' میں گناہ گار نہیں ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

الیاس احمد بھی اٹھ کھڑے ہوئے' دعا کی چپ ٹوٹ گئی تھی اب وہ اپنے لیے اسٹینڈ لینے لگی تھی۔

"میں اپنے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی' ماموں جان ضرور میری بات سنیں گے' وہ یک طرفہ فیصلہ نہیں کرسکتے۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی باہر کو دوڑی' ریاض احمد بھی چونکنے کھڑے تھے۔ ایک جست لگا کے اسے بازو سے دبوچ لیا۔

"رک جاؤ دعا' اس کمرے سے باہر ایک قدم مت نکالنا' بھائی جان کی طبیعت تمہیں دیکھتے ہی بگڑ جائے گی۔" جتنی سختی سے بازو دبوچا تھا اتنی سختی لہجے میں بھی تھی۔

"کک..... کیوں ماموں جان' ایک بار مجھے ان سے مل کے پوچھنے تو دیں۔" دعا ہکلا گئی۔

"دعا..... دعا..... کہاں ہو تم؟" عمیر کی آواز اس کے لیے زنداں میں روشنی کی مانند تھی۔ یہ شخص ہمیشہ سے ہر اچھے برے وقت میں اس کا آسرا تھا۔ وہ اسے کبھی کبھار دل میں نیک فرشتہ کہہ کر مخاطب کرتی اور آج وہ واقعی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ ایک نیک دل فرشتہ ہی ہے۔

"عمیر! عمیر!" وہ حلق کے بل چلائی۔ عمیر اگلے لمحے مجسم اس کے سامنے موجود تھا' قلیل سے وقت میں ساری صورت حال بدل گئی۔ الیاس احمد اور مریم کی رنگت بھی۔ عمیر نے آکے سب کچھ اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ الیاس احمد نے دعا کا بازو چھوڑ دیا۔

"عمیر پلیز..... پلیز مجھے ماموں جان کے پاس لے جاؤ' مجھے انہیں سب سچ بتانا ہے' میں اللہ کی قسم کھاتی ہوں عمیر میں نے کچھ نہیں کیا' میں بدکردار نہیں ہوں' عمر نے مجھ پر الزام لگایا ہے۔"

دعا اس کا بازو جھنجوڑ کے' سینے پر تھپڑ مارتے رو رہی تھی' الیاس احمد کے حواس اڑ گئے۔ عمیر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پاگل ہو گئی ہے یہ' بکواس کیے جا رہی ہے۔" سب سے پہلے مریم کی عقل نے کام کیا۔ الیاس احمد نے بیوی کو دیکھا' اس کی حسیں یکدم متحرک ہو گئیں۔

"چور بھی کبھی چوری کر کے مانا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ تم عمر کے کمرے سے پکڑی گئی ہو۔ بھائی اور بھابھی جان نے خود تم دونوں کی ساری گفتگو سنی ہے۔ ہمیں تمہاری کسی قسم کی صفائی نہیں چاہیے۔"

الیاس احمد نے اسے غصے سے بازو سے دبوچ کے' ایک جھٹکے سے الگ کیا۔ ان کا چہرہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ ان کا بس چلتا تو دعا پر تھپڑوں کی بارش کر دیتے جو ان کی نئی بنائی پلاننگ خراب کرنے والی تھی۔

"پلیز چاچو جان اسے بولنے دیں۔ تاکہ اصل معاملہ تو پتا چلے' آئی تھنک عمر نے ہم سب کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی ہے۔" عمیر کا دل یقین کے گھیراؤ میں آ گیا۔ الیاس احمد کا دل چاہا اس بھتیجے کا قصہ یہیں تمام کر دیں۔

"مریم' تم دعا کو دوسرے روم میں لے جاؤ۔" الیاس احمد نے سنجیدگی سے بیوی کو دیکھا۔ وہ فوراً" سے پیشتر آگے بڑھی اور مچلتی ہوئی دعا کو مضبوطی سے قابو کر لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آنٹی جان' ٹھہریں۔ دعا کو....." وہ آگے بڑھ کر رو کتا رہ گیا۔ دعا بھی چلا رہی تھی۔

"پلیز عمیر! مجھے ماموں جان کے پاس لے جاؤ' میں ان سے معافی مانگ لوں گی' میں سب سچ بولوں گی۔" وہ چلا چلا کر منتیں کر رہی تھی۔ مریم نے اسے ایک جھٹکے سے کمرے میں زور کا دھکا دے کے پھینکا اور دروازہ لاک کر دیا۔

"چاچو جان میں چاہتا ہوں کہ اسے اور عمر کو ایک بار کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔ مجھے شک ہے کہ ابھی بہت کچھ ایسا ہے جو ہم نہیں جانتے۔" اس نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے تحمل سے کیا۔

"دیکھو عمیر بیٹا' دعا اس دن سے خاموش تھی۔ آج تمہاری شہ پاکر' وہ خود کو بچانے اور بے گناہ ثابت کرنے کے لیے چلا رہی ہے۔ وہ کسی ایک کی نرمی کا فائدہ اٹھا کے سب کو مس گائیڈ کرنا چاہ رہی ہے۔ عمر ایک بدقماش اور آوارہ ذہنیت کا ہے تو پھر عقل کو حیرت ہے کہ یہ لڑکی جو شکل سے اتنی معصوم ہے جو عمر کے سائے سے بھی بدکتی تھی۔ رات کے اس پہر' عمر کے بیڈ روم میں کیا کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے اٹھا کے لے کر گیا تھا۔ کاش کہ وہ سب تم نے بھی اپنے کانوں سے سنا ہوتا۔ تو یوں اس کے حامی بن کے نہ کھڑے ہوتے۔ ہم اس گھر کے بڑے ہیں' ہمیں عزت اور شرافت کو بچانے کے لیے جو بہتر لگے گا وہی کریں گے۔"

الیاس احمد نے بات ختم کر کے رخ پھیر لیا۔ وہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ سارا معاملہ ان کی موجودگی میں پیش آگیا ورنہ یہ لڑکا ساری محنت کو زائل کر دینے والا تھا۔ یہی سختی اور اجنبیت اس نے آج ماں کی آنکھوں اور لہجے میں بھی دیکھی تھی۔ لیکن وہ اتنا کمزور مرد نہیں تھا۔ کئی برسوں سے اس لڑکی سے محبت کرتا چلا آرہا تھا۔ اب اسے اپنی خاموش محبت اور دوستی کا حق ادا کرنا تھا۔ فی الحال وہ خاموشی سے نکل آیا۔



رابعہ احمد نے شوہر کو نکاح کی خبر پہنچا دی تھی۔ ریاض احمد کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی۔ رابعہ احمد کو ان کے کسی ردِعمل کی پروا نہیں تھی۔ وہ انہیں مسلسل نظر انداز کیے اپنی روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔ الیاس احمد کی برین واشنگ نے ان کے دل پر کٹھورپن کا خول چڑھا دیا تھا۔ وہ دعا کی شادی کی خواہشمند ضرور تھیں لیکن ایک معذور شخص سے ہرگز نہیں' الیاس احمد ہی اس وقت ان کا واحد آسرا تھا۔ عمیر رحم دلی میں باپ سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ خود کو دعا کے لیے پیش کر دیتا۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

وہ بیڈ روم میں ناشتے کی ٹرے لے کر آئیں تو وہ کوٹ پہن رہے تھے۔

"آفس....." مختصر جواب تھا۔

"مگر کیوں' ڈاکٹرز نے آپ کو کم از کم ایک ماہ کا ریسٹ بتایا ہے۔ آپ عمیر کے کام سے بھی مطمئن ہیں' وہ شام کو ہر پوائنٹ آپ سے ڈسکس کرتا ہے۔ پھر آپ کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔" ان کے لہجے میں مجازی خدا کے لیے وسوسے بولنے لگے۔

ریاض اپنے کاموں میں مصروف کلائی میں گھڑی پہن کے ٹائی باندھنے لگے۔

"میری زندگی کا سکون تمہارے بیٹے نے ختم کر دیا ہے۔ میں بیڈ ریسٹ کروں یا آفس جاؤں' نو ڈیفرینس۔ جو کچھ میرے ساتھ کیا جا رہا ہے' اس پہ صبر کا گھونٹ بھرنے کا یہی طریقہ ہے کہ میں خود کو بزی کر لوں۔"

وہ ٹائی کی گرہ لگا کے' والٹ اور موبائل اٹھا کے آگے بڑھ گئے۔

"ایکسکیوزمی۔" بہت دھیمے سے کہا گیا۔

"اور یہ ناشتہ۔"

رابعہ احمد کی عقل گم' ہونٹوں سے سرگوشی نکلی لیکن تب تک تو ان کے شوہر نامدار جا چکے تھے۔ انہوں نے بے جان ہوتے ہاتھوں سے ٹرے میز پر رکھ دی۔



"آئی ایم سو ہیپی چاچو جان' ہماری کامیابی میں چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔" عمر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

"اور ٹھیک تین دن بعد تمہیں ایک کروڑ مل جائے گے۔" الیاس احمد بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

عمر جتنی بار اپنی اس لاٹری کو دہراتا' اس کے دل کو سکون ملتا' صرف ایک رات باقی تھی وہ کروڑوں کا مالک بن جاتا' اس کے باپ' بھائی اور ماں کو اس کی ذہنیت پر شک تھا' اسے کند ذہن' گدھا اور آوارہ گرد سمجھتے تھے۔ اب وہ سب پر ثابت کرنے والا تھا کہ یہ کھوٹا سکہ

کتنے کام کا تھا۔ انسان کے پاس ہنر یا تعلیم ہو نہ ہو عقل اور موقع کا استعمال کرنے کا فن ضرور ہونا چاہیے۔

"بھتیجے اتنا بھی مت اچھلو کہ حلق میں ہی آ کے اٹک جاؤ۔" الیاس احمد نے اسے تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔

"میں نے ایک فیکٹری دیکھ لی ہے۔ مشینری بھی کافی مناسب ریٹ پر مل رہی ہے' میں چاہ رہا تھا کہ آپ ایک دفعہ سارے معاملات خود بھی دیکھ لیں تاکہ میرے دل کو بھی اطمینان ہو جائے باقی قانونی کاروائی آپ ہی کریں گے۔" عمر نے سارا چارج ان کے سپرد کیا۔

"اوکے' کل کا دن خیر خیریت سے گزر جائے تو پھر میں تم سے ملاقات کے لیے وقت نکالتا ہوں' گڈ بائے۔"

انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ عمر سیٹی کی دھن بجاتا' موبائل جیب میں ڈال کے چل پڑا۔



عمیر آفس کی ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹیکے' آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ریاض احمد نے دروازہ کھولا تو نگاہ بیٹے پر پڑی۔ انہوں نے اس کے انداز پر گہری سانس خارج کی۔

"عمیر....." وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہے تھے۔

"اوں..... ہوں..... جی۔" عمر بے ربط بولتا یکدم سیدھا ہو گیا۔

"پاپا جان آپ' مجھے کال کر دیتے' میں خود لینے آ جاتا۔" وہ باپ کو یہاں پا کر حیران رہ گیا۔

اس نے پھرتی سے اٹھ کے باپ کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔

"میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں' تھک گیا ہوں عمیر' اب سب تمہیں ہی دیکھنا ہے۔" زندگی کی آزمائشوں نے انہیں ہرا دیا تھا۔

"خدا آپ کو سلامتی اور لمبی زندگی دے' میں آپ کے بغیر کچھ نہیں۔" اس کا دل دکھ کے گھیراؤ میں آ گیا۔ اس نے باپ کے دونوں ہاتھ تھام کے بوسہ دیا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ' بالکل سچ۔" انہوں نے سرگوشی کی۔

"جی....." وہ سعادت مندی سے گویا ہوا۔

"تمہاری اس سے بہت گہری اور نزدیکی دوستی تھی۔ تم نے کبھی اس کے اندر چیپ نیس محسوس کی؟"

ان کے منہ سے ہلکی سی سیٹی نما آواز نکلی اور نظریں جھک گئیں۔ دعا کی رہائی اس کی گواہی پر تھی۔ عمیر کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے اپنی پوری زندگی میں کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"وہ ایسی نہیں ہے۔ پھپھو جان نے حدود قیود گھٹی میں گھول کے اسے پلا دی تھیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مجھ تک وہ باکردار تھی۔" اس نے دھیمے پن سے اس کے کردار پر پاکیزگی کی مہر ثبت کر دی۔

"تھی' اب نہیں رہی؟" باپ کا سوال خنجر کی طرح سیدھا اس کے دل میں جا لگا۔

"پاپا جان....." وہ سسک اٹھا۔ "ایسا مت کہیں۔" اس نے التجا کی۔

"کل دعا کی شادی ہے' اس جلد بازی میں سارا ہاتھ تمہاری ماں کا ہے۔ ساری عمر اس عورت کی زبان دعا کو بیٹی' بیٹی پکارتے نہ تھکی اور آج جب واقعی ماں بننے کی باری آئی وہ صرف عمر کی ماں بن گئی' بتاؤ تم بھلا یہ کوئی انصاف ہے۔" انہوں نے عمیر کا بازو زور سے ہلایا۔

وہ نفی میں سر ہلاتا باپ کی حالت زار پر اندر سے پگھل رہا تھا۔ وہ اب بھی ان سے ماں کی شکایت نہیں کر سکا تھا۔

"اس عورت کی آنکھوں اور چہرے پر وہ نفرت رقم ہے جو اس نے پچیس برسوں سے چھپا کے رکھی تھی۔" ریاض احمد کے آنسو نکل پڑے۔

"آپ روئیں مت پاپا جان' میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ حوصلہ رکھیں' ٹینشن لینے سے آپ کی

طبیعت بگڑ جائے گی۔" عمیر نے ان کا ہاتھ تھپکتے تسلی دی۔

"مجھے بولنے دو عمیر! اگر میں نے اپنے جی کا بوجھ ہلکا نہ کیا تو میرا دل بند ہو جائے گا میں مرجاؤں گا۔ مجھے کہہ لینے دو۔" ریاض احمد شدت گریہ سے بولے۔

"پاپا جان۔" عمر نے ان کے ہاتھ پر زور سے دباؤ ڈالا۔

"تمہاری ماں جھوٹ بولنے لگی ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ کوئی سازش کر رہے ہیں۔ مجھ سے کہتی ہے کہ دعا کی شادی اچھی فیملی میں کروا رہی ہوں۔ میں نے ساری معلومات کروالی ہے' وہ الیاس احمد کے معذور اور نفسیاتی مریض سالے سے میری بیٹی کو بیاہ رہی ہے۔"

وہ اپنی بات پوری کرتے زار و زار رونے لگے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پاپا جان اس حادثے سے باخبر تھے۔

"دعا جب چھوٹی سی تھی تبھی میں نے اسے تمہارے لیے سوچ لیا تھا۔" یہ عمیر کے لیے ایک اور بڑا انکشاف تھا۔

"صفیہ آپا کو میں نے مرنے سے ایک دن قبل وعدہ دیا تھا کہ آپ کی بیٹی میرے عمیر کی دلہن بنے گی۔"

اب عمیر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باپ کے گلے لگ کے دھاڑیں مار مار کے روئے۔

"پلیز عمیر' میری دعا' میری بیٹی کو بچالو۔ میں بہت کمزور اور بے ہمت ہوں' تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم اسے زندگی بھر کی تکلیف سے بچالو۔ میرے منہ سے نکلے لفظ بیٹی کی لاج رہنے دو۔ میں روز قیامت اپنے رب اور بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا' پلیز عمیر' مجھے جیتے جی مرنے سے بچالو پلیز۔"

ان کے سارے آنسو عمر کے دل پر گر رہے تھے۔ اس نے باپ کے بندھے ہاتھ تھام لیے' اس کے چہرے پر ایک عزم تھا۔



وہ روتے دھوتے مغموم باپ کو ڈھیروں تسلی دے کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ وہ آفس سے ملحقہ ریسٹ روم میں لیٹا' متوقع صورت حال پر غور کرتا رہا۔ ریاض احمد نے بہت غلط وقت میں حوصلہ چھوڑ دیا تھا۔

وہ انہیں لڑنے کے لیے فورس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور اس پوزیشن میں نہیں تھے۔

موبائل کی بیل نے اس کا ارتکاز توڑا۔ اس کے ماتھے پر جھنجلاہٹ کے بل پڑ گئے۔ اس نے اسکرین نمبر دیکھا نوال کالنگ چمک رہا تھا۔ اس نے سانس لیتے کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو نوال۔"

"ڈو یو نو عمیر بھائی' گھر میں کیا چل رہا ہے۔ ماما جان' الیاس چاچو کے معذور سالے سے دعا کی شادی سزا کے طور پر کروا رہی ہیں۔ کیا واقعی وہ اس سزا کی مستحق ہے۔ کیا وہ اکیلی قصور وار ہے۔ اس کا قصور صرف یہ ہے کہ اسے تحفظ دینے والا ماموں خود لاچار ہو گیا ہے' اس کا قصور اس کی یتیمی ہے۔ میں نے پروٹیسٹ کیا تو ماما مجھے تھریڈ کرنے لگیں۔" نوال رونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمکین پانی ٹھہر گیا۔

"فار گاڈ سیک بھائی! وہ مرجائے گی۔ اگر اولاد کوئی غلط کام کرے تو والدین اسے روکتے' ٹوکتے ہیں یہاں ہماری ماما جان اتنا بڑا گناہ بلکہ ظلم کرنے جا رہی ہیں۔ ہمیں روکنا ہو گا۔ ورنہ اس سب کی ذمہ دار اکیلی ماما نہیں بلکہ میں' آپ اور پاپا بھی ہوں گے' پلیز بھائی اپنی دوست دعا کو بچالیں' آپ اس کی آخری امید ہیں۔ وہ ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ زار و زار رو رہی تھی' عمیر کا دل دہل رہا تھا۔

"میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا نوال' میں بہت اپ سیٹ ہو گیا ہوں۔" عمیر عاجز آگیا تھا۔

"اور مجھے آپ سے ایک سیکرٹ بھی شیئر کرنا تھا بھائی' اس رات....."

جو نوال اسے بتا رہی تھی وہ عمیر کے اوسان خطا کرنے کو کافی تھا۔ نوال کی بات مکمل ہونے تک وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ گیا۔ اب دنیا کی کوئی رکاوٹ اسے نہیں روک سکتی تھی۔



جوسر مشین کی آواز پورے کچن میں گونج رہی تھی۔ مریم کے موبائل کی بیل ہوئی۔ اس نے نمبر پریس کرنے سے قبل مشین بند کی۔

"جی جناب کہیے' اب کیا رہ گیا ہے بتانے والا۔"

مریم بڑے بشاش موڈ میں تھی کیونکہ کل اس کے بھائی کی شادی تھی۔

"مریم! دعا کے کمرے کا چکر لگا لو۔ اس کا خاص دھیان رکھو' پیار سے سمجھاؤ یا مار سے' کل کے دن وہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے قابل نہ رہے۔ ورنہ وہ تمہارا اصول پسند بھائی میری تکہ بوٹی بنا دے گا۔"

الیاس احمد کے لہجے میں فکر تھی۔

"اچھا آپ فون رکھیں' میں اس کے لیے جوس لے کر جا رہی ہوں۔ اسے سمجھا دیتی ہوں اوکے۔"

مریم کہنے کے ساتھ جوس جگ میں انڈیل چکی تھی۔

دعا کارپٹ پر بیٹھی' بیڈ پر بازو پھیلائے ان پر سر رکھے تھی۔

"دعا! میری جان کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھو شاباش' جوس پیو۔"

مریم نے جگ ٹیبل پر رکھا اس کے لہجے میں مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ دعا نے ویران آنکھوں سے ممانی کو دیکھا۔

"ادھر صوفے پر آؤ' نہا کر فریش ہو جاؤ' اب یہ رونا دھونا ختم کرو۔ کل تمہاری شادی ہے۔" اس نے بڑے عام سے لہجے میں اطلاع دیتے اس کے بکھرے بال سمیٹے۔

"ش۔ش۔ش۔۔۔ شادی۔۔۔" اس پر دکھ' صدمے اور حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے لگا کہ شاید سننے یا بولنے میں غلطی ہوئی ہے۔

"ہاں ناں تمہاری شادی۔ لڑکا بہت اچھا ہے تم خوش رہنے کی کوشش کرنا۔" اس نے ذو معنی کہا۔

"واٹ ربش ممانی جان' میری شادی؟ ہرگز نہیں' میں ماموں جان کے پاس جا رہی ہوں۔" وہ غصے سے بولتی یک دم کھڑی ہو گئی۔ مریم نے زور سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ماموں جان بات سننا تو دور' تمہاری شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ تمہاری وجہ سے وہ موت کے دہانے تک پہنچ گئے۔ رابعہ بھابھی کا اعتبار' تم نے اتنی بری طرح توڑا ہے کہ وہ تمہاری شادی میں بھی شرکت نہیں کریں گے' یہ تو ہمارا احسان مانو کہ ہم اپنی ذمہ داری پر تمہاری شادی کروا رہے ہیں۔ ورنہ تم جیسی گھٹیا اور بدکردار کو کون عزت اور نام دیتا ہے۔"

مریم زہر اگلنے لگی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر نفرت کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا' میں ماموں جان کو سب سچ بتاؤں گی وہ میرا اعتبار کریں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" اس نے سختی سے اسے جھنجھوڑا۔

"گھٹیا' ذلیل لڑکی' اس گھر کا کوئی بھی فرد تم سے ملنا نہیں چاہتا نہ ہی کوئی تعلق رکھنا۔ حتیٰ کہ عمیر نے بھی تمہیں دھتکار دیا ہے' اب یہ شادی ہی' تم سے جان چھڑانے کا آخری راستہ ہے۔ اب مزید ایک لفظ نہیں۔ میں ملازمہ کے ہاتھ کپڑے بھجواتی ہوں۔ نہا دھو کے پہن لو اور کل کوئی ہنگامہ مت کھڑا کرنا ورنہ الیاس تمہارا وہ حشر کرے گا کہ زندگی بھر کسی کو شکل نہیں دکھا سکو گی۔"

مریم اسے دھمکیاں دیتی ڈراتی دھمکاتی باہر نکل گئی۔ دعا تھر تھر کانپنے لگی۔ خوف کے مارے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔



وہ نوال کا فون سنتے ہی آفس سے اٹھ گیا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کی گاڑی سیدھی الیاس احمد کے پورچ میں جا رکی۔ گاڑی سے اتر کر' اس نے کوٹ اتار کے پچھلی سیٹ پر پھینکا۔ چہرے پر سنجیدگی کے

ساتھ سختی بھی طاری تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ مریم اپنے کمرے میں شادی کے فنکشن کے لیے جیولری اور شوز کی سلیکشن کر رہی تھی۔ وہ سیدھا دعا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ دروازہ ان لاک تھا۔ دعا ملگجے حلیے میں، بکھرے بال لیے بیڈ کی پائنتی پر مغموم بیٹھی تھی۔

"دعا...." اس نے بہت دنوں بعد اس نام کو پکارا۔

اس کے پژمردہ جسم میں جان دوڑ گئی۔

"عمیر.... عمیر مجھے بچالو عمیر، خدا کے واسطے میری مدد کرو، میرا یقین کرو۔ میں نے کچھ نہیں کیا، میں بدکردار نہیں ہوں، عمر نے مجھ پر الزام لگایا ہے۔"

وہ روتے ہوئے عمیر کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اس شدید حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دعا اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ اس سے چمٹی اپنے آپ کو چھپا رہی تھی۔ یہ شخص اس کے لیے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں جیسا تھا۔

عمیر نے اپنی محبت کے جذبے کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے، اس جذبے کو سینت سینت کر رکھا تھا۔ اسے خود کو سنبھالنا تھا۔

"چلو دعا، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

بمشکل اس کے منہ سے الفاظ نکل پائے۔ اس کے بازو میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ اس کو خود سے الگ کرپاتا۔

"مم.... مجھے بچانے آئے ہو، تم سچ کہہ رہے ہو ناں عمیر، تم مجھے بچالو گے، میرا اعتبار کرو گے۔" وہ اس سے الگ ہو کے، اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ بے یقین تھی۔

"ہاں.... دعا، میں تمہیں بچانے آیا ہوں۔"

اس نے دعا کی آنکھوں میں جھانکا۔ زندگی میں پہلی بار بہت مضبوطی اور استحقاق سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ گھر کی ملازمہ کچن سے نکل رہی تھی۔ اس کی نگاہ لاؤنج میں سے دعا کا ہاتھ پکڑ کے لے جاتے عمیر پر پڑی۔ وہ لمحہ بھر میں معاملہ بھانپ گئی۔

"یہ.... یہ کیا، مریم صاحبہ، مریم صاحبہ۔" وہ آوازیں دینے کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مریم جو کانوں پہ جھمکے لگائے ڈریسنگ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس چیخ و پکار پہ جھمکے ڈریسنگ پر پھینک کے باہر کو لپکی۔

"مریم صاحبہ، وہ عمیر صاحب.... دعا کو۔" خوف اور دوڑنے کی وجہ سے اس کی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔

"کیا وہ دعا کے کمرے میں گیا ہے۔" وہ پوچھتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"وہ دعا بی بی کو ساتھ لے گئے ہیں۔" ملازمہ نے اکھڑی سانس سے بات مکمل کی۔ مریم ایک جھٹکے سے مڑی۔

"کیا....؟" مریم کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

"تم، رابعہ بھابھی کو کال کرو کہ فوراً" پہنچیں۔" ملازمہ کو ہدایت دیتی اس نے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

وہ دعا کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"عمیر...." مریم پورے زور سے چلائی۔ دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔

"جی چاچی جان، مجھے پکارا آپ نے؟" اس نے مڑ کر خاصی معصومیت سے پوچھا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" مریم کی سانس ابھی برابر نہیں ہوئی تھی۔

"کہیں بھی لے جاؤں، آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" اس کی آنکھیں ماتھے پر تھیں۔

"کیا بیوقوفی ہے عمیر، اس کی صبح شادی ہے اور تم۔" مریم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے اس سارے منظر سے غائب کردے۔

"دعا ہمارے گھر میں پلی بڑھی ہے۔ یہ میرے باپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ خود ہی اس کی شادی کروا دیں گے۔" عمیر نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔

"بکواس بند کرو عمیر اور اسے یہیں چھوڑ دو ورنہ اس زبردستی کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔" مریم نے اپنے طور پر خاصی سنگین دھمکی دی۔

"آپ چاہیں جو مرضی کریں، جسے مرضی بلوالیں

لیکن میں دعا کو چھوڑ کے جانے والا نہیں ہوں۔" اس کا انداز دوٹوک تھا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں۔ کیوں؟"

اسے تو غصے سے زیادہ شوہر کا ڈر ستا رہا تھا۔

"کیونکہ صفیہ پھپھو اسے میرے نام پہ چھوڑ کے گئی ہیں۔ اور میں اپنی چیزوں کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا کرتا۔"

اس نے چاچی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اس انکشاف پہ دعا نے جھکا سر اٹھایا۔ اس کی سوجن زدہ آنکھوں اور بوجھل ذہن میں سارے حرف گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"دعا، تم اس کے بہکاوے میں مت آؤ۔ بڑے ماموں پہلے ہی بستر سے لگ گئے ہیں۔ اب انہیں پتا چلا کہ شادی سے ایک روز قبل تم گھر سے بھاگ گئی ہو تو وہ شاید اس ذلت کو سینے میں دبائے مر ہی جائیں، صبح تمہاری شادی ہے۔ اس بیوقوف کی باتوں میں مت آؤ، میرے ساتھ اندر چلو۔" اس نے عمیر کو چھوڑ دعا کو ڈرا دھمکا کے اندر لے جانا چاہا۔

"چاچی جان، میں اسے یہاں سے پاپا کی خواہش اور اجازت سے ہی نکالنے آیا ہوں، سو جسٹ پلیز شٹ یور ماؤتھ، ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ آپ میرے لیے کتنی قابل احترام ہیں۔" اس کے لب و لہجے میں کچھ ایسی عجیب سی سختی تھی کہ مریم کی بولتی واقعی بند ہو گئی۔ اتنے برس اس نے عمیر کا بہت سلجھا اور فرمانبردار روپ دیکھا تھا، اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا اسے تو غصہ بھی شاذو نادر ہی آتا تھا۔

"بیٹھو دعا۔" اس نے ابرو کا اشارہ بھی دیا۔ اور خود اپنے لیے فرنٹ ڈور کھول لیا۔ اگلے لمحے گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔ مریم ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ سب ہاتھ سے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

دعا سر جھکائے رو رہی تھی۔ اسے اس لڑکی کے دکھ پر دکھ تھا۔ اس کے بہت کچھ چھپانے پر شکوہ تھا۔ اسے اپنی اس دوست پر اتنا اعتبار تھا کہ اتنا بڑا حادثہ ہو جانے کے باوجود بھی وہ اسے بے قصور لگتی لیکن اس نے عمیر سے سب کچھ چھپا کے اپنے اور اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اس نے برسوں سے سینت سینت کر رکھے محبت بھرے دل کو توڑ ڈالا تھا۔ اس کے اعتبار کو روندا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا، بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا رونا بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ جب وہ اپنی ماں کی وفات پر روئی تھی تب بھی وہ گھر سے باہر جا بیٹھا تھا۔ وہ اس کی بہت دھیمی اور جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ کا دلدادہ تھا۔ وہ اس ایک مسکراہٹ پر اپنا سب کچھ فدا کر سکتا تھا۔

"پلیز دعا رومت، مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہو رہی۔" وہ اپنی بے بسی زیادہ دیر چھپا نہ پایا۔ دعا کا رونا یکدم رک گیا۔

"ماموں جان کیسے ہیں؟" اس نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کیا۔

"جی رہے ہیں، حالانکہ تم نے ان کی موت کا سامان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" اسے غصہ آنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ دعا بنا پوچھے اسے ساری حقیقت بتا ڈالے، جبکہ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو گھورنے میں لگ گئی، اس نے دو تین دفعہ اس کے جھکے سر کو گھورا۔

"تم نے یہ سب کیوں کیا دعا...؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

اس نے بہت دکھ، حیرت اور بے یقینی سے سر اٹھا کے عمیر کو دیکھا۔ وہ خوش گمان ہو رہی تھی کہ وہ اس کے کردار کی پاکیزگی پر گواہ ہے۔ اسی لیے وہ اسے بچانے آیا ہے۔ اتنے سارے تکلیف دہ دنوں میں پہلی سوچ اس کے جلتے دل پر ٹھنڈی پھوار بن کے برسی تھی۔ لیکن یہ مسرت صرف چند لمحوں کی تھی۔ عمیر کے ایک سوال نے اسے وہ اذیت دی جو عمر کے دھوکے سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ خاموش رہ کر اس کی جان لے لیتا، لیکن یہ نہ پوچھتا۔

"میں اپنے کسی بھی عمل یا کردار کے لیے تمہیں

جواب وہ نہیں ہوں" اس نے اپنی ساری تکلیفوں کا غصہ نکالا۔ وہ اس کے اتنے شدید الفاظ پر ہکا بکا رہ گیا۔

رازداری' دوستی' احترام' اعتبار' نیک خواہشات' یادیں' ان کے مابین بہت کچھ تھا اور اس بہت کچھ نے اسے بھی تکلیف میں مبتلا رکھا تھا۔ دعا کے کورے جواب نے سارے جسم سے جان کھینچ لی۔ اس کا جی چاہا کہ گاڑی کو کسی کنٹینر میں دے مارے۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ دعا کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ وہ اس کا اعتبار' مان تھا۔ اس نے کیسا سوال ڈالا تھا کہ اس کی ذات کے پرخچے اڑ گئے۔ عمیر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا لیکن یہ سوال نہ کرتا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ اس نے اپنی آسیب زدہ سوچوں سے سر اٹھا کے دیکھا۔ اس پر حیرتوں کا منوں وزن آپڑا۔ اس کے سوتیلے باپ اور بھائی کے گھر کی گلی کا پہلا کونا تھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے پار بغیر نظر جھپکائے دیکھ رہی تھی۔ ان گلیوں سے اس کی اچھی' بری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ اسے یہاں کیوں لایا تھا۔

"صرف چند دن حماد کے گھر ٹھہر جاؤ' میرے پیچھے بھی بہت بڑا طوفان آچکا ہوگا۔ اس طوفان کا رخ موڑ دوں تو تمہیں لینے آؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولتا اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

دعا کا جی چاہا کہ اس سنگ دل کو جھنجھوڑ ڈالے' چیخ چیخ کر پوچھے کہ "آخر اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔"

"تمہیں بھی مجھ پر اعتبار نہیں رہا عمیر۔ تمہاری نظر میں بھی' میں بدکردار ٹھہری۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا سارا جسم شدت گریہ سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ عمیر نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے کیے۔ ٹھوڑی کو چھو کے' سرخ اور آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے دل کو کسی نے تیز دھار سے چیر ڈالا۔

"تمہارے ان آنسوؤں کی قسم' میں تمہیں لینے آؤں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' کوئی کچھ بھی کہے لیکن تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں شرعی اور قانونی حقوق کے ساتھ لے جاؤں گا۔" اس کے لہجے سے سچائی اور مضبوطی چھلک رہی تھی۔

دعا کے آنسو رک گئے' سانس تھم گئی۔ آج ان دونوں کی برسوں سے خاموش محبت پر تصدیق کی مہر ثبت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی ہر دعا میں اس شخص کو رب سے مانگا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اتنی اچھی انڈراسٹینڈنگ تھی کہ وہ اپنے دل کا حال مناسب الفاظ میں اس تک پہنچا دیتی لیکن اس کی نسوانی انا آڑے آجاتی۔

"پلیز... پلیز عمیر..."

اس نے بے اختیار پہلی بار اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی اور استحقاق سے پکڑ لیے۔ اس کے لفظ بے ربط اور حلق خشک تھا۔ آنکھوں سے جواب محبت چھلکتا تھا۔

"تمہارے آنسو' مجھے کمزور کر رہے ہیں دعا' مجھے حوصلہ دو تاکہ میں تمہارے لیے لڑ سکوں۔ بہت کڑوا وقت ہے۔ تم میرے حق میں دعا کرنا' ہر کوئی تمہارے خلاف ہے' خدا سے التجا کرو کہ میں بہت جلد اور خوش اسلوبی سے سارے حالات پر قابو پا لوں۔"

عمیر نے اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی۔

"میں نے ہمیشہ خدا سے تمہاری سلامتی اور خیر خیریت ہی مانگی ہے۔" اس سے مزید ضبط نہ ہوا۔ وہ دروازہ کھول کے اتر گئی۔

یہ اظہار کس موڑ پر ہو رہا تھا۔

"اللہ حافظ عمیر..." اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اللہ نگہبان..." اس نے ایک محبت بھری دعا دی۔ اور ونڈ اسکرین سے پار کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگا۔ اس میں قطعاً" حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے اجڑی ہوئی حالت میں اسے خود سے دور ہوتا

دیکھتا۔

دعا اپنے دکھ سے لبریز دل میں محبوب کی پہلی محبت بھری نگاہ کی خواہش لیے پلٹ گئی۔ عمیر نے اس کی پشت دیکھ کے اپنی آنکھوں میں بھری نمی کو زور سے رگڑ ڈالا۔

☆ ☆ ☆

مریم نے الیاس احمد کو کال کر دی۔ وہ آفس سے گھر تک کا پینتیس منٹ کا سفر بیس منٹ میں طے کر کے آ پہنچے۔ رستے میں عمر کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ عمر کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ مریم غصے سے لال پیلی، رابعہ احمد ابھی تک فرمانبردار اور اس سارے معاملے پر خاموش اور بے نیاز بنے بیٹھے بیٹے کی جرأت پر حیران و پریشان تھیں۔ ریاض احمد لاؤنج میں شور شرابے کی آوازیں سن ملازم کے سہارے کمرے سے باہر آ گئے۔

"دیکھ رہے ہیں ناں بھائی جان' اپنے ہونہار اور لائق بیٹے کی کرتوت' اس نے پورے شہر میں مجھے ذلیل و رسوا کروانے کا بندوبست کر دیا ہے۔" الیاس احمد بھائی کو دیکھتے ہی بھڑک گئے۔ عمر نے ایک ناگوار سی نظر باپ پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔

"پلیز الیاس! اس سب میں ریاض احمد کا کیا قصور' تم الٹا غصہ ان پر نہ نکالو۔"

رابعہ احمد کو دیور کا یوں بے جا چڑھائی کرنا سخت برا لگا۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کے شوہر کو بیٹھنے میں مدد دی۔

"یقیناً" بھائی صاحب کے علم میں لائے بغیر اس نے یہ قدم نہیں اٹھایا' اس ڈرپوک نے تو کبھی مکھی بھی نہیں ماری اور میری حراست سے پوری جیتی جاگتی لڑکی لے اڑا۔" الیاس احمد ابھی تک نفی میں سرہلاتے بے یقین تھے۔ ریاض احمد کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن خاموشی میں عافیت تھی۔

"پلیز الیاس بی ہیو یور سیلف' تم آل ریڈی جانتے ہو کہ تمہارے بھائی کی طبیعت ابھی اتنی نہیں سنبھلی کہ ہم انہیں مینٹلی ٹارچر کریں۔" رابعہ احمد بھڑک گئیں۔

"پاپا جان! آپ اٹھیں اپنے روم میں چلیں۔" نوال جو اس غیر متوقع صورت حال پر ایک طرف ڈری سہمی کھڑی تھی ہمت کر کے باپ کی طرف بڑھی۔

"معاف کیجئے گا بھابھی جان' اپنے شوہر کی صحت کا خرابی کا اتنا زیادہ خیال اور جو کل صبح شہر کے دو معزز خاندانوں کی عزت کا جنازہ اٹھے گا' اس کے متعلق کیا رائے ہے' اس کی ذمہ داری اٹھاتی ہیں آپ۔"

مریم کی آنکھیں بھی بدل چکی تھیں۔ وہ بھی لال بھبھوکا چہرہ لیے کھڑی تھی۔

"اگر مجھے عمیر کی نیت یا جرأت پر ذرا سا بھی شک ہوتا تو میں اس لڑکی سیکیورٹی میں کبھی اتنی لاپروائی نہ برتتا۔" الیاس احمد اپنی کوتاہی پر ہاتھ مل رہے تھے۔

"اللہ بے شک بہتر راہ نکالنے والا ہے۔" ریاض احمد نے نوال کا ہاتھ تھپکتے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ان کا دل مطمئن تھا کہ عمیر نے ان کی بیٹی کو ان درندہ صفت لوگوں کے چنگل سے آزاد کرا لیا ہے۔

"وہ گدھا میری کال ریسیو نہیں کر رہا' اس کا وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔" عمر جو بار بار کال ملا رہا تھا موبائل کو زور سے دوسرے ہاتھ پر مارا۔

"آپ لوگ یہاں کھڑے اس کے لوٹنے کا انتظار نہ کریں بلکہ اسے جا کر تلاش کریں میں آپ کو بتا رہی ہوں الیاس' کل میرے بھائی کی بارات نامراد لوٹی تو میں بھی ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی۔" مریم کو اپنی فکر ستا رہی تھی۔ وہ رو دینے کو تھی۔ اس کے ہوش و حواس پہ اپنے با اصول اور سخت گیر بھائی صاحب کا تصور اجاگر ہو رہا تھا۔ اتنی رسوائی کے بعد تو وہ بہن کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔

"کہاں ڈھونڈوں' یہ شہر کیا چھوٹا ہے۔ چل تیری تو لٹیا اس نے ڈبو دی بھتیجے۔" الیاس احمد نے عمر کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔ عمر کا غصہ مزید ابلنے لگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ زمین کی تہوں میں سے عمیر کو اکھاڑ لاتا۔

"بھائی ..." سب سے پہلی نظر نوال کی مرکزی دروازے سے داخل ہوتے عمیر پر پڑی۔ وہ دوڑ کے

سیدھی سینے سے جا لگی، الیاس اور عمر بھی جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھے۔

"ٹھہر جاؤ....." رابعہ احمد کی اونچی پکار نے ان کے قدم روک دیے۔ "میں خود اس سے پوچھتی ہوں۔"

نوال بھائی کے سینے سے چمٹی رو رہی تھی۔ عمیر کے لیے یہ منظر بالکل حیران کن نہیں تھا۔ اس سب کا اسے سامنا کرنا ہی تھا۔ وہ روتی نوال کی پشت سہلا رہا تھا۔

رابعہ احمد نے ایک جھٹکے سے نوال کو زبردستی کھینچ کے پرے دھکیلا اور ایک زور کا تھپڑ بیٹے کے گال پر رسید کیا۔

"جب ہم نے اس لڑکی کو گھر سے نکال دیا تھا تو تم نے اس بدکردار اور بدچلن لڑکی کا ساتھ دینے کی جرأت کیوں کی۔" رابعہ احمد پھنکاریں۔

اسے چاچا اور عمر سے اچھی امید نہیں تھی لیکن رابعہ احمد اتنا جارحانہ رویّہ اختیار کریں گی یہ اس کے گمان میں نہیں تھا۔

"یہ الفاظ آپ اپنے اس بیٹے کے لیے کیوں استعمال نہیں کرتیں، اتنے برسوں سے اس کے کرتوتوں کی پردہ پوشی کرکے، ہمیں بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ اگر میں اور پاپا جان خاموش ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم آپ کے اکاؤنٹس سے اور گھر کے لاکر سے غائب ہونے والے قیمتی زیورات کے چور سے ناواقف ہیں۔ عمر کے پاس اتنی مہنگی ہیوی بائیک کہاں سے آئی۔ نوال کے سمسٹر کی فیس راتوں رات کیسے غائب ہو گئی کون چور ہے اور کس کے تعاون سے یہ سب کرتا ہے۔ اس سے ہم اچھی طرح آگاہ ہیں۔ لیکن تب تو کبھی آپ نے زبان نہیں کھولی۔"

عمیر نے ماں اور بھائی کا کچا چٹھا کھول دیا۔ رابعہ احمد نے گڑبڑا کر نظریں چرائیں۔ لیکن یہ موقع شرمندہ ہونے کا نہیں تھا۔

"اپنی فضول بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ اس بدکردار لڑکی کو کہاں چھپایا ہے۔" رابعہ احمد نے سختی سے کام لیا۔

"بدکردار، بدکردار، بدکردار، آپ اپنے اس بیٹے کے کردار پر روشنی کیوں نہیں ڈالتیں۔ آپ نے پاپا جان سے لاکھوں کی زکوٰۃ گاؤں کے مستحقین کے نام پر بٹور بٹور کے، اس نیہا نامی لڑکی کے منہ میں ٹھونسی جو آپ کے لاڈلے بیٹے کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔" عمیر نے سچ اگلنے کی حد کر دی۔

رابعہ احمد۔ کا رنگ لال پیلا پڑ گیا۔ ان کا جسم بے جان رہ گیا۔ اتنے برسوں سے شوہر کی آنکھوں میں جو دھول جھونک رہی تھیں، وہ چھٹ گئی تھی۔ ریاض احمد کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہے تھے کہ شاید ابھی رابعہ احمد عمیر کو کسی بھی سوال جواب دے کے اسے جھوٹا ثابت کر دیں۔

"عمیر....." عمر سے مزید برداشت نہ ہوا۔ وہ چیختا ہوا بیچ میں کود پڑا۔

"بس....." جواباً عمیر نے بھی چلا کر جواب دیا۔

"آپ میری بھی ماں ہیں ناں، صرف عمر کی تو نہیں دعا کو ہمیشہ بیٹی کہتی آئیں۔ مجھ سے کہتی تھیں، ایک تم ہی ہو جس سے میں اپنے دکھ سکھ سب شیئر کر لیتی ہوں، پھر آپ نے مجھ سے سب کیوں چھپایا۔"

وہ آنکھوں میں نمی لیے ماں کے سامنے سراپا سوال تھا۔ رابعہ احمد کا جوش و ولولہ جھاگ کی مانند بیٹھ چکا تھا۔ لب باہم پیوست ہو گئے تھے۔

"دیکھو عمیر میں بڑے پیار اور شرافت سے پوچھ رہا ہوں کہ دعا کدھر ہے۔ صبح اس کی شادی ہے، ماما کو اپنی ایموشنلز اسٹوریز سنانا بند کرو اور میرے سوال پر توجہ دو۔" عمر سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کڑے تیور لیے آگے بڑھا۔ الیاس احمد خاموش تماشائی بن گئے۔ انہیں مزید کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ عمر خود ہی اپنے حصے کا کام نپٹا لیتا۔

"جسٹ شٹ اپ تم اس معاملے میں اتنے انوالو کیوں ہو رہے ہو۔"

اس کی گندی زبان سے اپنی محبت کا نام سننا بھی

اسے بہت ناگوار گزرا۔ دعا کی گمشدگی کی عدالت میں عمر کی شمولیت اور غصے سے بڑھ بڑھ کے بولنا عمیر پر بہت کچھ عیاں کر رہا تھا۔

"وہ اس شہر سے جا چکی ہے اور جہاں گئی ہے وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اینڈ پلیز کلوز دس ٹاپک۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے جانے لگا۔

"او... ادھر' زیادہ اسمارٹ مت بنو۔ سیدھے سے اس کا ایڈریس بتادو ورنہ مجھے دوسرا طریقہ استعمال کرنا بھی آتا ہے۔" عمر کی آنکھیں خون آشام ہو رہی تھیں۔

"تو پھر دوسرا طریقہ استعمال کرو۔" عمیر نڈر تھا۔

"عمر! اپنے روم میں دفع جاؤ' بلاوجہ کی بحث نہ کرو۔ تمہارا اس میٹر سے کوئی لینا دینا نہیں اور نہ ہی اپنی گندی زبان سے میری معصوم بچی کا ذکر بار بار کرو۔" ریاض احمد کو محفل برخاست کرنے کے لیے بیچ میں کودنا پڑا۔ رابعہ احمد نے معصوم بچی کے الفاظ پر منہ کھول کر شوہر کو دیکھا۔

"تو اس کا مطلب ہے بھائی صاحب کہ آپ عمیر کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اسے سمجھانے کے بجائے عمر کو ڈانٹ رہے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا اور مریم کے بھائی کا شمار پاکستان کے کتنے بڑے انڈسٹریلسٹ میں ہوتا ہے۔ اس کے بھائی کی بارات واپس لوٹ گئی تو کتنی تھو تھو ہوگی' وہ بغیر لحاظ کیے' مجھے جوتے لگائیں گے۔ پلیز میری عزت کا خیال کریں۔" الیاس احمد نے چہرے پر مسکینیت طاری کرلی۔

"تو یہ آپ کا ہیڈک ہے ہمارا نہیں' پلیز ہمارے گھر تماشا کری ایٹ نہ کریں' نوال تم پاپا جان کو روم میں لے جاؤ۔" عمیر کہہ کر آگے بڑھا۔

"عمیر..." عمر حلق کے بل دھاڑا۔

"آخری بار اس لڑکی کا پوچھ رہا ہوں۔" وہ اس کے مقابل آرکا' اس کے ماتھے کی رگ پھڑک رہی تھی۔

"وہ تم لوگوں کی زر خرید کنیز نہیں تھی۔ میرے باپ کی ذمہ داری اور بیٹی تھی۔ اب میرا رستہ مت روکنا۔" عمیر نے انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی۔

"تو تم نہیں مانو گے۔" عمر نے شرٹ اوپر کر کے' جینز میں اڑسا لوڈڈ ریوالور نکالا۔

نوال' رابعہ اور ریاض احمد حق دق رہ گئے۔

"یہ ساری گولیاں میرے سینے میں اتار دو گے تب بھی نہیں بتاؤں گا۔" عمیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہاری طرف میرا بہت سالوں کا حساب نکلتا ہے آج میں سارا چکتا کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کر فائر کھول دیا۔

"عمیر..." پہلی چیخ ریاض احمد کی نکلی۔ رابعہ احمد کی زبان تالو سے چپک گئی۔

"بھائی..." نوال روتی ہوئی بھائی کی طرف لپکی۔

خون آلود عمیر زمین پر گر گیا تھا۔

الیاس احمد کے دل پر ٹھنڈی پھوار برسی۔ مریم کے دل کو لمحہ بھر کا سکون ملا۔ عمیر نے چند گھنٹے قبل کتنی بدتمیزی کی تھی۔ لیکن اگلے پل وہ سرخ خون سے ڈری ہوئی رابعہ احمد سے جا لگی۔

"پ...پانی..." ریاض احمد کی گھٹی ہوئی سی آواز نکلی۔ عمر تڑپتے ہوئے عمیر کو نفرت اور بے حسی سے ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔ عمیر تڑپ رہا تھا۔

"ڈرائیور... ڈرائیور۔" الیاس احمد نے بیزاری سے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ ملازمہ ریاض احمد کے لیے پانی کا گلاس لینے دوڑی۔ نوال زارو زار رو رہی تھی۔



وہ سر جھکائے' نظریں سڑک پر جمائے' سیدھی چلی جا رہی تھی' دوپٹا سر سے کندھے تک ڈھلک گیا تھا۔ بکھرے بال اور آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی تھیں۔

اس کا تھکن زدہ دماغ اس فکر میں تھا کہ وہ حماد بھائی کی تسلی کیسے کروائے گی اگر وہ صاف ستھرے حلیے ایک عدد کپڑوں کے بیگ کے ساتھ ہوتی تو بہ آسانی کوئی بھی جھوٹ گھڑا جا سکتا تھا۔ اگر اس نے ریاض احمد کے گھر کال کر کے کنفرم کرلیا اور رابعہ احمد نے سب اگل دیا تو

پھر وہ کیسے نامحرم اور سوتیلے بھائی کو اپنی پاکدامنی کا یقین دلائے گی۔ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے کن الفاظ کا استعمال کرے گی۔ وہ بہت سنجیدہ، کم گو اور دو ٹوک بات کرنے والا لڑکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد دعا کو اس کا رویہ بہت سرد اور عجیب سا لگتا۔ ماموں کے گھر شفٹ ہونے کے بعد اس نے، ایک بار بھی کال نہیں کی تھی۔ وہ سگے بہن بھائی نہ سہی، اتنے برس ایک گھر میں تو رہے تھے۔ مین گیٹ آنے تک وہ لاتعداد سوچوں میں گھری رہی۔

شاید وہ پوچھے۔ "تمہارے کپڑے اور منہ اتنے گندے کیوں ہیں۔"

کیونکہ وہ انتہائی صفائی پسند تھا۔ یا اس کی حالت پر تڑپ جائے گا۔

"دعا بہنا، تمہارا چہرہ زرد، سوجا ہوا اور آنکھیں سرخ اور روئی ہوئی سی کیوں ہیں، کس نے تمہیں تکلیف دی ہے۔" شاید یہی یا اس سے ملتا جلتا کچھ اور لیکن وہ کیا جواب دے گی جو اس کی تسلی کروا دے۔

اس کی نگاہیں مین گیٹ پر پڑیں اور وہیں ساکت ہو گئیں۔ اس کی منزل آ گئی تھی وہ گیٹ کے سامنے گر کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"اے بی بی، کیوں روتی ہو اور تمہیں کالونی کے اندر کس نے گھسنے دیا ہے۔ تم لوگوں کا داخلہ سختی سے منع ہے۔" وہ چوکیدار تھا جو اس کے رونے کی آواز پر اپنے کیبن سے نکلا تھا اور اس کے حلیے سے اسے فقیرنی سمجھ بیٹھا تھا۔

"انکل، مجھے اندر جانا ہے۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے کھڑی ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

"اے بی بی! اپنی اوقات میں رہو۔ تمہیں سیکیورٹی گارڈ نے روکا نہیں.... کیسے اندر آ گئی ہو۔" چوکیدار اس کی انوکھی فرمائش پر خاصا برہم ہوا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس گھر کے مالک حماد کی بہن ہوں۔" اس نے بڑے استحقاق کے ساتھ اپنا تعارف کروا کے چوکیدار کی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔

"لیکن بیٹی یہ گھر تو ڈاکٹر توقیر حسین کا ہے۔ میں ان کا پرانا ملازم ہوں، وہ دو ماہ قبل ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔" چوکیدار کے تاثرات اس کے رونے پر خاصے نرم پڑ گئے۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ اندھیرا چھا گیا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چوکیدار کی اطلاع اس کے کمزور اعصاب پر بہت بھاری تھی۔

"حماد بھائی.... پلیز حماد بھائی، آپ میرا آخری آسرا ہو۔ میں بہت غیر محفوظ ہوں، میرا سائبان بننے کے لیے کہیں سے بھی آ جاؤ، آپ کو ماما اور پاپا جان کا واسطہ، پلیز حماد بھائی۔" وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بین ڈالنے لگی۔

"اللہ کرے، میں مر جاؤں، مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔" وہ دونوں ہاتھ زور زور سے گیٹ پر مارتی خود کو اذیت دے رہی تھی۔

"ایسا مت کرو بیٹی۔" چوکیدار نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ڈاکٹر صاحب کچھ دیر پہلے ہی ڈیوٹی سے آ کر سویا ہے۔ اگر تمہارے شور سے جاگ گیا تو سخت ناراض ہو گا، کالونی کی سیکیورٹی سے تمہاری کمپلین بھی کر دے گا۔ کوئی تو ہو گا تمہارا دنیا میں، رونے دھونے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے غور کرو۔ کوئی ایسا گھر، جہاں تمہیں پناہ مل سکے۔"

چوکیدار نے اسے عقل کی راہ سجھائی۔ اس کا رونا یکدم تھم گیا۔ اس کی عقل نے پرکھا، وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ وہ آخر کب تک یہاں بیٹھ کے بین ڈالتی، سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تھوک نگلتی، میلے کچیلے دوپٹے سے آنسو صاف کرتی، گرتی پڑتی سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"انکل.... پلیز مجھے ایک کال کروا دیں، میں آپ کی بے حد مشکور ہوں گی۔" اس نے منت کی۔

اس کے ذہن میں صرف ایک ہی رشتہ زندہ تھا جو ہر حال میں اسے محفوظ دیکھنے کا خواہاں تھا۔



آپریشن تھیٹر کے باہر سب خاموشی سے کھڑے

تھے۔ ریاض احمد کے سینے میں بائیں طرف میڈیسن کھانے کے باوجود ہر منٹ بعد درد کی ایک ٹیس اٹھتی، بی پی بھی ہائی تھا۔ لیکن انہیں اپنی جان سے زیادہ بیٹے کی پروا تھی۔

رابعہ احمد بار بار ایک ترحم آمیز نگاہ شوہر پر ڈال لیتیں، ان کا حال احوال پوچھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کوریڈور میں مسلسل چکراتی نوال ہر دس منٹ بعد باپ کے پاس بڑی فکر مندی سے رکتی۔

"آر یو فائن بابا جان۔"

وہ مدھم سا اثبات میں سر ہلا دیتے، رابعہ احمد کے تڑپتے دل کو بھی تھوڑا سکون ملتا۔ انہوں نے نگاہ غلط بھی بیوی پر ڈالنا گوارا نہ کی تھی۔

مریم، رابعہ احمد کے ساتھ لگی بیٹھی اور الیاس احمد دیوار سے سر ٹکائے اس امید پہ کھڑے تھے کہ شاید عمیر کو ہوش آجائے وہ اسے منت واسطہ دے کر دعا کا پتا وغیرہ پوچھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ ایک آس لیے کھڑے تھے۔ تین ڈاکٹر اور ان کے اسسٹنٹ آپریشن تھیٹر سے نکلے تھے۔ ڈاکٹر رضوان سے ان کے گھریلو مراسم تھے۔ نوال ان کی طرف لپکی۔

"انکل! میرے بھائی ٹھیک تو ہیں ناں؟ ان کی گولی نکال دی ہے، ان کی زندگی خطرے سے باہر ہے، ہوش میں کب آئیں گے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"گولی نکال دی گئی ہے، اس کی انتڑیوں کو نقصان پہنچا ہے۔ چند دن اسے مزید ہسپتال میں رہنا ہو گا، آپ کل تک ایک اور بلڈ کی بوتل کا ارینج کر دیں، باقی ان شاءاللہ سب بہتر ہو گا۔" انہوں نے بیٹھے ہوئے ریاض احمد کے کندھے پر ہاتھ دھر کے تسلی دی۔

"تم سب گھر چلے جاؤ صرف نوال میرے پاس ٹھہرے گی۔" ریاض احمد نے ڈاکٹر کے جاتے ہی حکم صادر کر دیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک...." رابعہ احمد نے ڈرتے ہوئے حوصلہ پکڑا۔

"نو آرگیو، چلی جاؤ یہاں سے۔" مناسب الفاظ لیکن لہجے میں چٹانوں کی سی سختی۔ رابعہ احمد پوری جان سے لرز گئیں۔

حکم کی تعمیل میں ہی بہتری تھی۔ الیاس احمد کا جی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ تہس نہس کر دیں وہ چلنے میں سب سے آگے تھے۔

"ہیلو.... رخسانہ باجی میں دعا بول رہی ہوں، عمیر کدھر ہے اس کا نمبر بند مل رہا ہے۔ پلیز رخسانہ باجی میری عمیر سے...." رخسانہ اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی۔

"میری بات غور سے سنو دعا۔" رخسانہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا انداز محتاط تھا۔

"تمہیں یہاں سے بھگانے پر عمیر، عمر اور الیاس احمد کا بہت شدید جھگڑا ہوا ہے۔ عمر نے عمیر صاحب کو گولی مار دی ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔ عمر اور الیاس احمد تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے، بہتر ہے کہ اب یہاں کال مت کرنا، اگر تم الیاس کے قابو میں آگئیں تو وہ فوراً" اس لولے لنگڑے سے تمہارا نکاح پڑھا دے گا۔ اس لیے جہاں ہو، وہیں خاموشی سے چند دن رہو۔ عمیر صحت یاب ہو گا تو میں تمہارا پیغام دے دوں گی وہ خود ہی تم سے رابطہ کر لے گا، خدا حافظ...." ریسیور ٹھک کی آواز سے رکھ دیا گیا۔

اس کے دل و دماغ پر وہی کیفیت، وہی درد، اثر تھا جو وہ کئی روز سے ہر پل سہ رہی تھی۔ وہ کس کس حادثے پر روتی۔

"اب میں کہاں جاؤں؟" موبائل والا ہاتھ نیچے گر گیا۔

"میرا کوئی نہیں بچا۔" وہ موبائل چوکیدار کی طرف بڑھاتے پھر بین ڈالنے لگی۔

اسے عمیر سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ رات ہو رہی تھی اور وہ تنہا ایک غیر مرد کے قریب بے آسرا کھڑی تھی۔ جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھا لیکن سہارا دینے کو نہیں۔

"دیکھو لڑکی۔ اپنے پورے ہوش سے سوچو! کوئی رشتے دار، چاچا، پھپھا، تایا، ماسی کزن تو ہو گا۔" اس نے

سارے رشتے دہرائے جیسے اس کی کم عقلی پر شبہ ہو۔
"میرے والدین فوت ہو گئے ہیں' میرا کوئی بھی نہیں سوائے بھائی کے۔" اس کے سوتیلے باپ کی دو بہنیں تھیں۔ ایک کی تین سال قبل وفات ہو گئی تھی اور دوسری اپنی فیملی کے ساتھ آئرلینڈ مقیم تھی۔ اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ وہ کس کس غم پہ روئے اور کتنا' اس کے آنسو بھی اس کی طرح نڈھال ہو گئے۔
"سیدھی آسمان سے تو نہیں گریں' کوئی دوست وغیرہ تو ہو گا' میں خود ملازم ہوں' میں تمہیں کہاں رکھوں۔" وہ نرم دل شخص اس کی پریشانی کو سر پر سوار کیے بولے جا رہا تھا۔
دوستی کے نام پہ دعا کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کی واحد اسکول و کالج کی دوست' جس کا اس کے گھر میں بھی آنا جانا تھا۔ اس کی بی' ایس سی کے بعد شادی ہو گئی تھی۔ وہ اس کے گھر گئی تھی۔ اسے اس کے گھر کا ایڈریس یاد تھا۔ ایک ننھی سی امید کی کرن جاگی۔
"انکل جی' مجھے تھوڑے سے پیسے دے دیں' میری دوست کا گھر یہاں سے کافی دور ہے۔"
اس نے آخری مدد مانگی۔ اسے یقین تھا کہ یہ در اس پر بند نہیں ہو گا۔ یہ آخری در اس کی باقی کی زندگی کی قسمت لکھنے کا منتظر تھا۔



ڈائننگ ٹیبل بہت محبت اور توجہ سے پکائی گئی تازہ ڈشز سے بھرا پڑا تھا۔
"کھانا اتنا لذیذ ہے کہ میرا ٹیبل سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا۔" احسن نے پیٹ بھر کے کھا کے' باقی کھانے کو ندیدے پن سے دیکھا۔
"میرا روز دل چاہتا ہے کہ میں آپ کے لیے کھانا پکاؤں لیکن آپ مجھے کچن میں ہی نہیں جانے دیتے۔" انعم نے تعریف پر خوش ہونے کے بجائے شکایتی انداز میں منہ بسورا۔
"میرا بریک فاسٹ تم ہی بناتی ہو۔" احسن نے بیوی کے پھولے منہ کو بڑی محبت بھری نظر سے دیکھا۔
"وہ تو بہت ہلکا پھلکا سا ہوتا ہے۔ کبھی سلائس' ایگ اور جسٹ جوس وغیرہ' اس میں کون سی اتنی مشقت کرنا پڑتی ہے۔" انعم ناراض ہوئے جا رہی تھی۔
"میں تمہاری ہی سہولت کے لیے منع کرتا ہوں۔ اتنے نوکر چاکر تمہارے سکون کے لیے رکھے ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنا بیڈ روم خود صاف کرتی ہو۔ میرے کپڑوں کی واشنگ' پریس اور میرے شوز تک تم خود پالش کرتی ہو۔" احسن نے اس کی چوری گنوائی۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔
"وقت کاٹنے کے لیے خود کو مصروف رکھتی ہوں۔" اس نے بے چارگی سے وجہ بتائی۔
"اس فاسٹ ایج میں' خود کو بزی رکھنے کے بہت سے سورسز ہیں' موویز دیکھو' نیٹ سرچنگ ہے' شاپنگ پہ جاؤ' جم جوائن کر لو۔ سیلون کا چکر لگاؤ' ہمارے نیبرز میں اتنی اچھی آنٹی ہیں' ان سے گپ شپ لگاؤ' میں تمہیں ایک سو ایک مشورے دے سکتا ہوں لیکن تم کسی ایک پر بھی عمل نہیں کرنے والیں۔" اب احسن ناراض ہونے لگا۔
"مجھے لگتا ہے احسن کہ میرے اندر ایک دیہاتی عورت بستی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں صبح اٹھ کے ناشتہ بناؤں' برتن دھوؤں' گھر کی صفائی کروں' میرے بہت سارے بچے ہوں' میں ان کے دن بھر کام کروں اور شام کو تھک ہار کے سو جاؤں۔" انعم اپنے خیالوں میں بہت خوب صورت منظر تراش رہی تھی۔ وہ احسن سے اکثر اپنے عجیب و غریب خیالات شیئر کیا کرتی تھی۔
"ڈونٹ مائنڈ انو' تم میں خدا نے ایک کمی رکھی ہے جسے لے کر تم اتنی حساس ہو رہی ہو' بچے صرف دیہاتی عورتوں کے نہیں ہوتے میری جان' جس لوکیشن میں ہم سروائیو کرتے ہیں' اس میں ہم اپنے اردگرد سے زیادہ سوشل نہیں ہیں لیکن بچے ان سب کے گھروں میں بھی ہیں اور جو تم لائف اسٹائل

پورٹریٹ کرتی رہتی ہو' حقیقت میں' تم اس طرح کے ماحول میں دس منٹ بھی گزار نہیں سکتیں۔" احسن نے بہت نرمی سے اسے ساری تفصیل سمجھائی۔ وہ اس کے ذہن کو فریش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"احسن سیریسلی یار! میں کسی گاؤں میں جا کے رہنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی بات پر بضد تھی۔

"اچھا بابا' تمہارے بہت سارے بچے' چھوٹا سا گھر' ڈھیر سارے کام' ویری فیسی نیٹ لیکن اس سارے سیٹ اپ میں' میں تمہارے شوہر کا کردار ہرگز نہیں پلے کروں گا۔" احسن نے ہاتھ اٹھا کے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

"تم احسن' میں تمہارا سر توڑ دوں گی' یو نو ویل تمہاری دوری کی بات' میں مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم صرف اور صرف میرے لیے ہی بنے ہو۔" انعم کے لہجے میں ہٹ دھرمی اور قطعی پن تھا۔

"انعم... انعم..." بہت دور سے' اس کے نام کی مدھم سی پکار پڑ رہی تھی۔ کوئی بہت دور سے چیخ رہا تھا۔

"شاید تمہیں کوئی بلا رہا ہے۔" احسن کی حس تیز تھی۔

"کوئی باہر ہے۔" کہتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ احسن نے بھی اس کی تقلید کی۔

انہوں نے پورچ میں کھڑے ہو کے دیکھا۔ گیٹ کے قریب کوئی عورت کھڑی تھی۔ چوکیدار بازو آگے پھیلائے اسے اندر بڑھنے سے روک رہا تھا۔ جبکہ وہ چوکیدار کو دھکا دے کر ڈاج دے چکی تھی۔ چوکیدار اس کے پیچھے دوڑا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے حمید؟" احسن نے زور سے آواز لگائی۔

"انعم... انعم..." وہ دوڑتی ہوئی چلا رہی تھی۔

"صاحب! یہ عورت خود کو میڈم کی دوست بتاتی ہے اور حلیے سے فقیرنی۔"

"جسٹ شٹ اپ" انعم چلائی۔

اس نے ملگجے لٹے پٹے حلیے والی' دعا کو پہچان لیا تھا۔

وہ اس کے ایک ایک نقش سے واقف تھی۔

"انعم... میں دعا..." وہ دکھ سے اور دوڑنے سے نڈھال' خشک حلق سے بمشکل اپنا تعارف کرواتی زمین پر ڈھے گئی۔

احسن بھی شادی کے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کی حالت پر حیران رہ گیا۔

"دعا میری جان' یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے' کیا ہوا ہے تمہیں؟" انعم روہانسی ہو کر زمین پر بیٹھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"میں... میں' پانی... پانی..." وہ خشک اور پھٹے ہونٹوں پر سوکھی زبان پھیرتی' بے ہوش ہو کے اس کی گود میں گر گئی۔

"انعو اٹھو' اسے اندر لے جائیں' اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ تم خود کو سنبھالو' میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔" احسن اسے ہدایت دیتا اندر ملازمہ کو بلانے چلا گیا جو اندر لے جانے میں انعم کی مدد کر سکے۔



دعا کا بلڈ پریشر ہائی تھا' ڈاکٹر نے انجکشن لگا کے ڈرپ بھی لگائی تھی۔ اس کا جسم آگ سے تپ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے گھنٹہ بھر کے علاج کے بعد ان کو تسلی بخش جواب دیا تھا۔ اس کی حالت پر انعم کو ہول اٹھ رہے تھے۔ احسن اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن وہ رات بھر دوست کے سرہانے سے ٹکی رہی۔ ان دونوں کی سیونتھ کلاس سے ہونے والی دوستی بی' ایس سی تک چلی تھی انعم خاصی بولڈ اور منہ پھٹ تھی۔ دعا کو اس کی دوستی میں بہت اطمینان محسوس ہوا تھا۔ انعم حاکمانہ مزاج کی تھی۔ اسے یہ دبّو قسم کی لڑکی خاصی بہتر لگی تھی۔

"انعم..." احسن نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ دعا کے ساتھ ہی تکیہ رکھ کے لیٹی ہوئی تھی۔

"جی..." اس کی آنکھیں کچی نیند سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"دعا بول رہی ہے' شاید اسے ہوش آرہا ہے۔"

احسن نے دعا کی طرف ابرو سے اشارہ کیا۔

"دعا..." وہ مچل کے اٹھ بیٹھی۔

"آنکھیں کھولو' ہوش میں آؤ۔" انعم نے اس کا گال تھپتھپایا۔ دعا کو لگا کہ گہرے اندھیرے میں اسے کوئی بہت دور سے پکار رہا ہے۔ اس کے جسم پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ اس نے سر دائیں بائیں ہلاتے' لرزتے پپوٹے وا کر دیے۔

"میں کہاں ہوں' امی... امی جان..." وہ ہلکی مدہوشی میں چھت کو گھورے جا رہی تھی۔

"دعا' ادھر دیکھو' میں ہوں انعم۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ۔ یاد کرو میں اسکول اور کالج کی لائف میں کمبائن اسٹڈی کے لیے تمہارے گھر آیا کرتی تھی۔ اور آنٹی ہمارے لیے کتنے مزے کے کٹلس' نوڈلز' پیزا اور اسپیگھیٹی بناتی تھیں' ہم پڑھتے کم اور باتیں زیادہ کرتے تھے' تمہیں سب یاد آ رہا ہے ناں۔" "انعم! امی جان... میری امی جان... مجھے ان کے پاس جانا ہے۔ میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں' میرا کوئی نہیں رہا۔" وہ انعم کے گلے لگ کے زار و زار رونے لگی۔

"دعا پلیز ایسے رو مت' تمہارا بی پی ہائی ہے' حالت بہت خراب ہے تمہاری۔ ڈاکٹر نے ٹینشن لینے سے منع کیا ہے۔ تم چپ کر کے تحمل سے مجھے بتاؤ کیا آنٹی تم سے ناراض ہیں۔" انعم اس کی گفتگو سے یہی اندازہ لگا پائی تھی۔

"نہیں... نہیں تو... میری امی جان مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس ظالم دنیا میں مجھے تنہا کیوں چھوڑ گئیں۔ میرا تو ان کے علاوہ اور کوئی سگا رشتہ بھی نہیں' انہیں مجھ پر رحم نہ آیا' وہ کیوں مجھے اس ظالم دنیا کے حوالے کر کے چلی گئیں... ان کی جگہ میں مر جاتی۔" وہ تڑپ تڑپ کے بین ڈال رہی تھی۔

انعم کو اس زندہ دل اور مخلص عورت کی اتنی جلد موت کا سن کر جھٹکا لگا تھا۔ اس کا دل پسیج گیا' آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ احسن بھی مغموم ہو گیا۔ اس نے انعم کا کندھا ہلایا۔

"یار! بھول گئیں رات ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا' اس صدمے پر رونا اس کی صحت کے لیے مناسب نہیں۔" احسن نے اسے یاد دلایا۔

"پلیز دعا چپ ہو جاؤ' میں ہوں ناں تمہاری دوست تمہارا سہارا..." انعم نے اسے تسلی دی۔

"پلیز انعم! مجھے چند دن اپنے گھر میں پناہ دے دو پھر میں چلی جاؤں گی لیکن فی الوقت میرا کوئی آسرا نہیں۔ میں ہر رشتے سے مایوس و نامراد ہو کے' تمہاری طرف آئی ہوں۔" دعا نے کہتے ہوئے آخر میں ہاتھ جوڑ کے منت کی۔

"ایسی حرکت کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔" انعم نے جلدی سے اس کے جڑے دونوں ہاتھ تھام کے کھول دیے۔

"تم چند دن کیوں' ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہو۔ ہم صرف دو بندے تو ہیں۔ احسن کے آفس جانے کے بعد' میں تنہا اس گھر میں بہت مشکل سے وقت کاٹتی ہوں۔" انعم نے احسن کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔

"انو! تم مجھے اپنی محفوظ چھت دے کے اتنا بڑا احسان کر رہی ہو کہ میں زندگی بھر اس احسان کا بدلہ چکا نہیں پاؤں گی۔" دعا کی آواز پھر سے بھیگنے لگی۔

"تمہارے ایک ماموں بھی تو تھے جن کا..."

"فار گاڈ سیک لیڈیز' آپ اپنی یہ داستان میرے آفس جانے کے بعد کمپلیٹ کر لیجیے گا' ابھی میں لیٹ ہو رہا ہوں اور انو' تم خالی پیٹ اس بے چاری سے سب سن لو گی' اٹھو یار! اچھا اور ہیوی سا ناشتہ لگاؤ۔" احسن نے انہیں وقت کی کمی کا احساس دلا کر اٹھایا ورنہ وہ یہیں دن تمام کرنے والی تھیں۔ انعم خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

"اٹھو دعا' تم شاور لے کر فریش ہو جاؤ' کپڑے چینج کر کے ٹیبل پہ آ جاؤ' ہم تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔" انعم اس کا گال تھپک کے ہدایات دیتی اٹھ گئی۔ دعا کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

رابعہ احمد کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ عشاء کی نماز ادا کر کے مختلف وظیفے اور تسبیحات پڑھتے بیٹے کی زندگی' تندرستی اور سلامتی کی دعائیں رو رو کے مانگتے رات کاٹی تھی۔ اگر اسے ذرا سا بھی کوئی روگ لگ جاتا تو ریاض احمد انہیں زندگی بھر معاف نہیں کرتے۔ پھر وہ ان کا بھی تو بیٹا تھا' چین کسی پل نہیں تھا۔ وہ شوہر کی آنکھوں اور چہرے پر جو پڑھ چکی تھیں' اس کے بعد عافیت' خاموشی سے حکم کے مطابق گھر بیٹھنے میں ہی تھی۔ وہ وہاں ٹھہر نہیں سکتی تھیں' کسی بہانے اسے ایک نظر دیکھنے تو جا سکتی تھیں۔ سو انہوں نے دن چڑھتے ہی سب کے لیے ناشتہ بنا کے ٹفن پیک کر لیا۔

"اختری... اختری..." انہوں نے ملازمہ کو آواز دی جو پل بھر میں حاضر تھی۔

"ناشتہ احتیاط سے گاڑی میں رکھو اور ڈرائیور کو کوارٹر سے بلوالو۔" انہوں نے ناشتے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تب ہی ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر ریاض احمد کا نمبر چمک رہا تھا۔ ان کا دل ڈوب کر ابھرا' ڈرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"خدا خیر کرے۔"

"ہیلو..." بمشکل آواز نکلی۔

"ناشتہ بھجوا دو۔" مختصر سی بات۔

"عمیر کی طبیعت ٹھیک ہے۔" اس سے قبل کہ کال منقطع کر دی جاتی' فٹ سے پوچھ لیا۔

"ہاں..." یک لفظی جواب۔

"آپ نوال کو گھر بھجوا دیں' میں رک جاتی ہوں۔"

"نہیں..." یک لفظی انکار اور فون بند۔ رابعہ احمد کا دل بھر آیا۔

"بی بی جی ناشتہ رکھوا دیا ہے اور ڈرائیور بھی آ رہا ہے۔" ملازمہ واپس آ گئی۔

"جاؤ ڈرائیور سے کہو کہ وہ ہسپتال جا کے ناشتہ دے آئے۔" وہ پژمردگی سے کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"آپ ساتھ نہیں جائیں گی۔" ملازمہ نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"نہیں..." ان کے دل میں بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔



وہ دونوں لاؤنج کے صوفے پر ایک دوسرے کی طرف منہ کیے بیٹھی تھیں۔ دعا نے شروع سے لے کر آخر تک سب سچ بتا دیا تھا۔ عمیر سے اس کی محبت کی بھی وہ واحد راز دار تھی۔ اس نے نہیں بتایا تھا لیکن انعم جیسی تیز طرار لڑکی نے اس کے لہجے اور آنکھوں سے اس محبت کو پڑھ لیا تھا۔

"میں تمہیں کالج لائف میں ہی فورس کرتی تھی دعا کہ تم عمیر سے اپنی فیلنگز شیئر کرو۔" انعم نے اسے ڈپٹا۔

"میری انا آڑے آتی تھی' وہ بھی ہر دم خیال رکھتا' یہ کھالو' یہ پہنو تم پہ سوٹ کرتا ہے۔ یہ سبجیکٹ چوز کرو' اس میں زیادہ مارجن ہے۔ ویک اینڈ پلان کرتے' ڈنر میرے فیورٹ ریسٹورنٹ میں کرتا۔ میرے ہر کام میں' وہ حد سے زیادہ انٹرسٹ لیتا' اس لیے کہ میں صرف دوست تھی۔ وہ بھی تو اظہار میں پہل کر سکتا تھا۔ میں تو اپنی ہر دعا میں اس کا وصل مانگتی رہی اور میرے مقدر میں ہجر لکھ دیا گیا۔" اس نے ہچکی لی۔

"تم آل ریڈی اتنا رو چکی ہو دعا کہ مزید اتنا پھر سے رو لو' تو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہونے والا۔ سب ایک برا خواب سمجھ کے بھول جاؤ اور اپنی آئندہ زندگی میں دل لگاؤ۔" انعم نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"کیسے بھول جاؤں انعم اور کس کس دکھ کو بھول جاؤں' میری چھوٹی سی غلطی نے ماموں کا اعتبار روند ڈالا۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ ممانیاں مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ عمر نے مجھے ذلیل و رسوا کر دیا' میں گھر سے بے گھر ہو گئی' میرا سوتیلا بھائی جسے میری ماں نے سگے بیٹے جتنا چاہا' وہ مجھے بغیر بتائے' پوچھے چھوڑ گیا۔ میں کس دکھ پر روؤں اور کس پر صبر کروں' میں

سوچتی ہوں کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود' میں زندہ کیسے ہوں۔" وہ مایوسی اور بزدلی کی آخری حد پر جا پہنچی تھی۔

"شٹ اپ دعا! ایسا کچھ سوچنا بھی حرام ہے۔ اگر سوسائیڈ کا ارادہ تھا تو وہیں ننھیال میں کر لیتیں لیکن پلیز میرے گھر میں ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا' اینڈ آئی ہوپ کہ تم بھی ایسا کوئی غلط اسٹیپ اٹھا کے' مجھے احسن کے سامنے شرمندہ نہیں کرواؤ گی' پرامس۔"

انعم نے اسے محبت سے ڈانٹتے' اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ اس ڈرپوک لڑکی کے منہ سے خودکشی کا لفظ سن کے واقعی اندر سے سہم گئی تھی۔ دعا نے اپنا ٹھنڈا کپکپاتا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اب ہم دوبارہ اس ٹاپک پہ کبھی بات نہیں کریں گے' خدا نے میری تنہائی دور کرنے کے لیے تمہیں فرشتہ بنا کے بھیجا ہے۔" انعم نے مسکرا کے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ دعا بھی بہت دنوں بعد ہلکا سا مسکرا دی۔

"یہ بات' میں اپنے اور تمہارے لیے کافی کے دو اسٹرانگ سے مگ بنا کے لاتی ہوں۔" انعم اٹھ گئی۔

"کیا تمہیں کافی بنانی آتی ہے۔" دعا نے بڑی معصوم سی حیرانی سے پوچھا۔

"تم ناں...." انعم نے چھوٹا کشن اٹھا کے اس کے سر پر دے مارا۔ اب کے دعا زور سے ہنس دی۔ انعم نے بھی اطمینان بھری سانس لی۔



ریاض احمد سلام پھیر کے انگلیوں پر تسبیح پڑھنے لگے' عمیر اب خطرے سے باہر تھا۔ وہ نوافل ادا کرتے نہ تھکتے۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

"اے اللہ میرے جوان بیٹے کو تندرستی اور شفائے کاملہ عطا فرما' بے شک تو بہت غفور و رحیم ہے۔ میرے بیٹے کی حالت پر رحم فرما دے' بے شک شفا اور بیماری دینے پر تو ہی قادر ہے' میں گناہ گار انسان تجھ سے تیرے کرم کا طلب گار ہوں' میری التجا قبول و منظور فرما لے' منظور فرما لے۔"

انہوں نے دعا کے لیے اٹھائے ہاتھ منہ پر پھیرے اور جائے نماز لپیٹتے اٹھ گئے۔ وہ جائے نماز رکھ کے پلٹے تو عمیر کا جسم حرکت کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"عمیر.... عمیر' پاپا کی جان.... آنکھیں کھولو۔" انہوں نے نرمی سے اس کا گال سہلایا۔ ان کی جان ہتھیلیوں میں آ رکی تھی۔ عمیر نے بھنویں کھینچتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

"پاپا...." وہ خشک ہونٹوں سے بمشکل بول پایا۔

"پاپا کی جان' میں قربان جاؤں اپنے بیٹے پر' پلیز عمیر اب یہ آنکھیں کھول دو' بند مت کرنا' کل سے تمہاری بند آنکھوں کو دیکھ دیکھ کے' میری بوڑھی آنکھیں تھک گئی ہیں۔ میں تمہیں دیکھ کے جیتا ہوں مجھے کمزور مت پڑنے دو عمیر۔" وہ بیٹے کے ہاتھ تھام کے رو دیے۔

"پاپا آپ کے رونے سے' مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔ پلیز چپ ہو جائیں۔" اس نے باپ کی توجہ اپنی حالت زار کی طرف دلائی۔

"تم سے کیوں بولا نہیں جا رہا' کہیں درد ہے' میں ڈاکٹرز کو بلواؤں۔" وہ ایک سانس میں پوچھتے چلے گئے۔

"نہیں' بس آپ روئیں مت۔" اس نے دھیمے لہجے سے بمشکل بولتے ہوئے منت کی۔ ریاض احمد نے اپنے آنسو صاف کر لیے۔

"میں تمہیں بیٹھنے میں مدد دوں' کچھ ہلکا سا کھا لو۔"

"نہیں' ابھی میں تھوڑی دیر سوؤں گا' پھر بعد میں آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔" اسے انجکشنز کی غنودگی ہو رہی تھی۔ اس نے کہہ کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔



عمیر کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ تب ہی ریاض احمد نے نوال کو گھر بھجوا دیا تھا۔ اور وہ بہت تھکی

اور مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ ان کے اصرار پر گھر تھوڑی دیر آرام کرنے آگئی۔ رابعہ احمد کچن میں تھیں۔ اس نے لاؤنج میں کھڑی ملازمہ کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بیگ پھینک کے 'وہ صوفے پر ڈھے سی گئی۔

"السلام علیکم چھوٹی بی بی' عمیر صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟" ملازمہ نے بھی حال پوچھا۔

"وعلیکم السلام' طبیعت اب ٹھیک ہے' آپ میرے لیے چائے کا مگ اور ساتھ میں کچھ بھی کھانے کو لے آئیں' پلیز جلدی' مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے ملازمہ کو آرڈر دیا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی مڑ گئی۔ رابعہ احمد کرسی پر بیٹھیں' میز کی سطح کو گھور رہی تھیں۔

"بی بی جی' فریج میں کچھ فرائی کرنے کو رکھا ہے۔" اس نے اجازت لینا ضروری سمجھا۔

"ہاں ہے' لیکن کیوں' یہاں کون سا کوئی کھانے والا ہے۔" وہ اپنے گرد فکرمندیوں کا جال بچھائے بیٹھی تھیں۔

"جی وہ نوال بی بی آئی ہیں۔ وہی کھانے کو مانگ رہی تھیں۔" ملازمہ کو بھی نوال کے رویے پر حیرت تھی۔

"نوال آئی ہے۔ اپنے کمرے میں ہے' مجھے کیوں نہیں بلایا اس نے۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتی ہوئی کرسی گھسیٹ کے اٹھ گئیں۔ ان کا رخ نوال کے کمرے کی طرف تھا۔

"نوال.... نوال۔" وہ آوازیں دیتی داخل ہوئیں' وہ منہ ہاتھ دھو کے نکل رہی تھی۔

"تم کب آئی ہو نوال' اور تم نے مجھے بلایا بھی نہیں۔" ان کا لہجہ دکھ سے چور تھا۔ وہ تو خود کو صرف عمیر اور ریاض احمد کی مجرم سمجھتی تھیں۔

"میں بہت تھکی ہوئی تھی' اس لیے سیدھی روم میں آگئی۔" وہ ماں کو دیکھے بغیر تولیے سے منہ خشک کر رہی تھی۔

"واٹ' یہ تو کوئی ایکسکیوز نہ ہوا۔" وہ بپھر گئیں۔

"ایکسکیوز ایسے ہی ہوتے ہیں' جو عمر آپ کو دیتا ہے۔ اور آپ پاپا جان کو۔" وہ ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ عمر بیچ میں کہاں سے آگیا؟" وہ حیران ہوئیں۔ اس اوٹ پٹانگ جواب پر۔

"ہاں اس بیچارے معصوم اور بے قصور کا نام میں نے یونہی لے دیا' سوری اگر آپ کو برا لگا۔" نوال نے مڑ کر معافی مانگی۔

"یہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو۔" رابعہ احمد کے دکھ میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

"دعا کے ساتھ آپ نے اس سے زیادہ برا بی ہیو کیا تھا' آپ بھی تو ایک عورت ہیں ماما' پھر آپ نے کتنے حوصلے سے دوسری بے آسرا عورت کو گھر سے بے گھر کر دیا' اسے تو آپ اپنی بیٹی کہتی تھیں' کم از کم اپنے الفاظ ہی کی لاج رکھ لیتیں۔"

نوال نے سچائی کی حد کر دی۔ رابعہ احمد کو اپنی اس پڑھا کو بیٹی سے اتنی حساسیت کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بھی ماں کو کٹہرے میں کھڑا کر لیا تھا۔

"ابھی تم غصے میں ہو' ہم بعد میں اس ٹاپک کو ڈسکس کریں گے' تم بتاؤ عمیر کیسا ہے؟" انہوں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس کے ساتھ الجھنا یا ڈانٹنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس طرح وہ مزید ماں سے بدظن ہوتی۔

"عمیر اب خطرے سے باہر ہے لیکن ماما جان میں غصے میں نہیں اب ہی پورے ہوش میں آئی ہوں۔" وہ ڈٹ گئی۔

"میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ بھجواتی ہوں۔" وہ کہہ کر مزید رکے اور سنے بغیر باہر نکل آئیں۔ بیٹی کی تفتیش اور لہجہ ان کے زخم کو مزید گہرا گھاؤ لگا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

☆ ☆ ☆

مریم نے لینڈ لائن نمبر پر کال کر کے گھر کی خاندانی ملازمہ کو ساری تفصیل مناسب الفاظ میں سمجھا دی تھی۔ اس میں بھائی کے موبائل پر کال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس انکار کے ٹھیک تین گھنٹے بعد آصف کی خودکشی کی خبر اسے مل گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی کلائی کاٹ لی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ بچ نہ سکا۔ مریم پر صدمے اور خوف کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس کا جسم بالکل ساکت اور بت بن گیا۔ اسے ایک معصوم لڑکی پر الزام لگانے اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی سزا مل گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی جلد دعا کی بددعا کی لپیٹ میں آگئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

بندگی یا زندگی

قانتہ رابعہ

"وے چول جیا نہ ہووے۔ یہ کیا بھر کے دیا ہے تم نے میرے کارڈ میں۔ اک وی گانا جنج سواد کا نیں۔ دُر فٹے منہ۔" **حلیماں** نے میموری کارڈ بٹوے میں سے نکال کے گاؤں کے واحد "حاجی اکرم موبائلز" کے ملازم کے منہ پر دے مارا۔

"کیا ہوا باجی! اللہ دی **قسمے** 4 کو اک سے بہترین گانا بھر کے دیا تھا تمہیں۔" حاجی اکرم موبائلز کے ملازم اللہ



دتہ نے کارڈ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے چار کم چالیس گانے سنے ہیں۔ چول جیا نہ ہووے' ایک وی گانا جنج سواد کا نہیں۔ کوئی گانا بے سرا ہے تو کسی کے بول کی ہی سمجھ نہیں آتی۔ اگر کسی کی آواز اچھی ہے تو بول نرے واہیاتی' نری بے غیرتی'۔" حلیماں نے غصے سے کہا۔

"تو پھر تم نے نعتیں یا قوالیاں بھروا لینی تھیں۔" سترہ اٹھارہ سالہ ملازم نے حد کردی۔

"اوئے! چول جیا نہ ہووے تو صاف کہہ 'تیرے پاس اچھے گانے ہیں ہی نہیں۔" حلیماں نے غیرت دلائی۔

"تو تم نے کہہ دینا تھا اچھے گانے بھر دو۔ تم نے خود ہی کہا تھا۔ بھا اللہ دتے! اپنی پسند کے دس بیس گانے ڈال دو۔ میں نے دس بیس کے بجائے پورے چالیس گانے بھرے۔ اب تجھے پسند ہی نہ آئیں تو میں کیا کروں' پنڈ کی ساری کڑیاں ایسے ہی گانے بھروا کے لے جاتی ہیں جنہیں تو پھٹا ڈھول' بے سرا' واہیاتی اور بے غیرتی کہہ رہی ہے۔"

"اچھا چل زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔ میرے پورے چار سو روپے واپس کر اور اپنا کارڈ اپنے پاس رکھ۔" حلیماں نے اکتا کر کہا۔

"اک واری باقی چار گانے بھی سن لو میری بہن۔" اللہ دتے نے التجا بھرے لہجہ میں کہا۔ یہ اس کی مستقل کھلے دل کی مالک گاہک تھی جس نے بھاؤ تاؤ میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ اسے واپس اس طرح بھیجنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"اوئے چول جئے! میری جان نہ کھا' جب چھ چھتیں گانوں نے دل ٹھنڈا نہ کیا تو باقی چار کیا تیر مار لیں گے۔ چل تو کہتا ہے تو سنا' یہ بھی ویسے ہی ہوں گے۔" منہ پھلا کر حلیماں نے کہا۔

"نہیں باجی! خدا دی قسمے 'یہ والے چاروں گانے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ حلیماں نے اس کی طرف دیکھا۔ شرم کے سارے ہی رنگ اس کے چہرے پر تھے۔ اٹکتے اٹکتے اس نے فقرہ مکمل کیا۔

"ایمان سے یہ چاروں گانے ماسی بشیراں کی چھ[illegible] دھی کی پسند کے ہیں۔"

"ہائیں۔ ماسی بشیراں کی چھوٹی دھی یعنی وہ چھٹانک بھر کی دو فٹی شانلاں کی پسند کے؟" حیرانی [illegible] حلیماں کا منہ کھلا رہ گیا۔

"جی باجی جی' بڑی اچھی پسند ہے اس کی۔ جب [illegible] آتی ہے ایک سے ایک بڑھ کے گانا بھرواتی ہے۔" شرماتے ہوئے اللہ دتہ نے کہا۔

"ہائے میں مرگئی۔ وہ شانلاں جو دس بارہ برس [illegible] ہے۔" حلیماں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ایک [illegible] جوش سے اس نے کہا۔

"اچھا تو سناؤ اپنی "اس" کی پسند۔"

ایک سیکنڈ میں اللہ دتہ نے گانا منتخب کیا اور ہینڈ[illegible] فری حلیماں کے حوالے کیے' تیز موسیقی میں گلو[illegible] کی آواز گونجی۔

"میں ہوتی اک مورنی۔ اور تو ہوتا اک مور
جنگل جنگل ناچتی اور یوں کرتی شور
تو۔ میرا تو۔ تو....."

پھس پھس کر کے ہنسی کا فوارہ حلیماں کے حل[illegible] سے برآمد ہوا۔ ہنس ہنس کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

"ہائے وے ماں صدقے' یہ ہے تیری اس [illegible] پسند؟"

اللہ دتے نے ہینڈز فری بے دردی سے کھینچے۔ "بابا معاف کر۔ لے اپنی رقم۔ اور جا۔" سو سو کے [illegible] نوٹ اس نے حلیماں کے آگے پھینکے "اور میری [illegible] چھوڑ۔" اس نے دونوں ہاتھ حلیماں کے آ[illegible] جوڑے۔

حلیماں ٹھٹکی۔ "یہ کیا ہوا؟ اپنی پسند کے چھتیں گانوں کی برائی برداشت کرلی اور اپنی "اس" کے ایک گانے پر رائے پسند نہ آئی۔" وہ چپ کی چپ رہ گئی تصور میں چھم سے بچپن کا سنگی ساتھی منور آگیا۔ منو[illegible] کی ماں بہنیں جتنا مرضی حلیماں کو برا بھلا کہہ لیں ا[illegible]

ے چہرہ پر تو کبھی ایسا جلال نہیں آیا۔ وہ چپ کی چپ رہ
گی' پیسے واپس کر کے اس نے کارڈ مانگ لیا۔

آہستہ سے بولی۔ "اچھا کارڈ دے دو۔"

اللہ دتہ بھی شرمندہ سا ہو گیا۔ "باجی! اگلا گانا اس
ے بھی اچھا ہے' آپ کو پسند نہ آیا تو پیسے بھی دوں گا
اور آپ کی پسند کے گانے بھی بھر دوں گا مفت میں۔"

اب پھر ہینڈ فری حلیماں کے کانوں میں تھے۔

اب موسیقی کان پھاڑنے والی نہیں تھی آواز بھی
لطف تھی۔ چند ہی لمحوں میں سر کا جادو بول رہا تھا۔

"رم جھم رم جھم پڑے پھوار
ترا میرا انت کا پیار
رم جھم رم جھم پڑے پھوار
ترا میرا انت کا پیار"

حلیماں سنتے سنتے ایسی بے سدھ ہوئی کہ ارد گرد کا
ہوش ہی نہ رہا۔ وہ تو مالک دکان حاجی صاحب کی کراری
آواز آئی

"اوئے اللہ دتہ! کوئی دوسرا گاہک تو نہیں
مر گیا۔ تیری مدہوشی دیکھ کے۔"

حلیماں نے ہینڈ فری اتارے اور کارڈ بٹوے میں
رکھ لیا۔ اور مردہ چال سے دکان سے باہر نکل آئی۔

اللہ دتے کے چہرے پر سرور ہی سرور تھا۔ "دیکھا!
میں ناں کہتا تھا' اس کی پسند ہے ہی اچھی۔"

حلیماں کے قدم اسی سُر تال پر ڈھپ ڈھپ چل
رہے تھے جو آواز اس کے کانوں میں تھی۔

رم جھم رم جھم پڑے پھوار
ترا میرا انت کا پیار

اپنی گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے چاچے
قربان علی کے گھر پر نظر ڈالی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا
مطلب ہے چاچی اور گھر والے ویاہ کھا کے واپس آچکے
ہیں بورے وہاڑی سے' اس نے بے سوچے سمجھے گھر
میں قدم رکھ دیا۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی اسے غیر معمولی
خاموشی کا احساس ہوا۔ چاچا گھر پہ ہو نہ ہو گھر میں
بچوں کی خوب رونق لگی رہتی ہے۔ یہ بچے آج کدھر
گئے۔ جھانکتے جھانکتے وہ صحن کی طرف آئی۔

چار پائی پر کھیس اوڑھے کوئی مرد سویا ہوا
تھا۔ حلیماں ٹھٹکی۔ "چاچا قربان علی تو آنکھیں بعد
میں بند کرتا ہے' پہلے اس کے خراٹے پورے محلے میں
سنائی دینے لگتے ہیں۔"

"یہ کون ہے؟"

پھر اس نے خود ہی تکا لگایا۔ ارے یہ منور تو نہیں
آگیا؟ ساتھ ہی تشویش کی لہر دوڑی۔

"اتنی چپ چپاتی تو وہ کبھی نہیں آیا۔ رب خیر
کرے۔" ذرا سی ہمت کر کے اس نے اس کے پاؤں
کی طرف سے کھیس ہٹایا۔ ہاں وہ منور ہی تھا۔ اس کے
سگے چاچا کا پتر۔ اس سے کم از کم نو دس سال بڑا۔

حلیماں کی پیدائش سے پہلے ہی ان دونوں کا رشتہ
یہ کہہ کر طے پا گیا تھا کہ بھا فرمان علی! اگر اللہ نے
تمہیں دھی دی تو میرے منور کی ووہٹی بنے گی۔ یہ فقرہ
پاؤں پاؤں چلنے سے لے کر گڑیا پٹولے کھیلنے' درختوں پر
منور کے ساتھ چڑھنے' گلی ڈنڈا کھیلنے سے منور کے
گیارہویں کلاس میں جانے تک اس نے اتنی تکرار
سے سنا کہ وہ اب شرما کر بیر بہوٹی نہیں بنتی تھی۔

بارھویں کے بعد اسے میڈیکل میں داخلہ ملا۔ چار
چھ ماہ کے بعد اس کا گاؤں کا چکر لگتا۔ وہ اپنے آپ کو
منور علی کی منگیتر نہیں "گھر والی" سمجھتی تھی۔ سگے
چاچے کا بیٹا' بچپن کا سنگی ساتھی' دیوار سے دیوار ملی
ہوئی۔ گاؤں کا کھلا ڈلا ماحول۔ وہ پورے استحقاق کے
ساتھ منور کی گھر آمد پر اس کی پسند کے کھانے بناتی'
اس کے ناز نخرے اٹھاتی۔ وہ زندگی تھا اور حلیماں اس
زندگی کی دھڑکن۔ اس کا ہر خواب "خیال" کا مرکز و
محور منور کی ذات تھی۔ اب تو ویسے ہی ہاؤس جاب
شروع ہو چکی تھی۔ مکمل ہوتے ہی اس نے منور کی
"ووہٹی" بن کر چاچے کے گھر چلے جانا تھا۔

چاچے کا گھر کہنے کو تو ساتھ ہی تھا مگر دونوں گھروں
کے حالات اور معاملات میں زمین آسمان کا فرق
تھا۔ چاچے کے گھر میں شور شرابہ پھوہڑپن کی انتہا

تھی۔ آواز کا خوب استعمال ہوتا کہ گھر بیٹھے سرگوشیاں بھی لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے اعلانات کی طرح سنائی دیتیں۔ خیر اس کے پاؤں کا انگوٹھا ہلانے کی دیر تھی کہ منور نے چہرے پر سے کھیس پیچھے کیا۔

اف!! لال انگارہ آنکھیں۔ حلیماں کے دل کو کچھ ہوا۔

منور نے چارپائی سے پاؤں نیچے اتارے اور ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ "کل رات میرے کلاس فیلو میرا مطلب ہے میرے دوست کی شادی تھی۔" حلیماں نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

اس کے اندر مسلسل الارم بج رہا تھا۔

منور نے گفتگو جاری رکھی۔ "تم نے پوچھا نہیں اس کی شادی کہاں ہوئی؟" منور نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے کسی لڑکی سے ہوئی ہوگی۔" سدا کی منہ پھٹ حلیماں کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔

"بے وقوف! لڑکی سے ہی ہوئی ہے مگر کالج کی سب سے ذہین اسٹوڈنٹ سے۔" منور نے کہا۔ "ان دونوں کی جوڑی بہت سج رہی تھی۔"

حلیماں حیران و ششدر کھڑی تھی۔ یہ پہلے والا چاچے قربان علی کا منور کدھر گیا؟

"تمہارا مطلب کیا ہے یہ کہنے کا۔" اب حلیماں پھر سے پرانی جون میں آچکی تھی۔

منور نے چارپائی سے اتر کے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ "تم گھر چلو۔ میں گھر میں آکر تمہیں اس کا مطلب بھی سمجھاتا ہوں اور اپنا دکھ درد بھی بیان کرتا ہوں۔"

حلیماں بددلی سے گھر واپس آگئی۔ پانچ منٹ، دس منٹ، گھنٹہ، دو گھنٹے یہاں تک کہ رات بیت گئی اور منور اس کے گھر نہ آیا۔ ایک دو دفعہ منڈیر پر چڑھ کر بھی دیکھا مگر گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ اگلی صبح

جب وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی، دروازہ کھلا اور منور اندر داخل ہوا۔ حلیماں کا وجود۔۔۔ برف کا پہاڑ بن گیا۔ اس کا مطلب ہے کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ لیکن وہ دانستہ طور پر خاموش رہی۔

"اللہ کی قسم، میں جو کچھ کہوں گا تم اسے غلط نہ سمجھنا۔ میں بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ سمجھ میں بھی نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

آنسوؤں کا ایک سمندر تھا جسے حلیماں نے پلکوں کی چلمن میں روکا ہوا تھا۔ ایسا تو پچھلے پندرہ سولہ سالوں میں نہیں ہوا۔ کبھی وہ اسے موٹی مجھ (بھینس) کہتا کبھی کالی بلا۔ کبھی پھبتیاں کستا۔ یہ پوچھنے پچھانے والا سلسلہ تو کبھی بھی نہ تھا۔

"بات یہ ہے کہ ابے نے مجھے فون کرکے بلایا ہے کہ شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے مشورہ کرنا ہے۔ میں ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میں بہت اپ سیٹ ہوں۔" منور نے تھیلے سے بلی نکالی۔

حلیماں نے بس نظر اٹھا کر اسے دیکھا کہا کچھ نہیں۔

"اگر تم میری بات کا غلط مطلب نہ لو اور میری پوزیشن پر کھڑی ہو کر سوچو تو تمہیں میرا مسئلہ خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ میں بہت کنفیوز ہوں۔ تمہارے پیدا ہونے سے لے کر اب تک میرے کانوں نے ایک ہی فقرہ سنا کہ تم میری منگ ہو۔ میں نے بھی اس فیصلے کو قبول کیا۔ دل سے میں نے تمہاری چاہت کا احترام کیا۔ لیکن جب مجھے ایف ایم سی کے لیے لاہور شہر جانا پڑا تو مجھے لگا یہ فیصلہ کچھ تکا سا ہے۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا رہا۔ رب نے مجھے ڈاکٹری کے لیے منتخب کرلیا۔ پہلے ڈیڑھ دو سال میں نے اپنی کسی کلاس فیلو کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگ جاتی تھیں۔ کانوں سے دھواں نکلنے لگتا تھا۔

ایک دفعہ کسی ضروری کام سے مجھے اپنی ایک کلاس فیلو سے نوٹس لینا تھے۔ میں نے گفتگو اسٹارٹ لینے کے لیے اسے باجی کہہ کر مخاطب کیا۔"

سوچ نہیں سکتیں کہ یہ لفظ بولنا میری زندگی کا کیسا دشوار کن مرحلہ تھا۔ تیسرے سال میں مجھے اپنے اندر تبدیلیاں لانا پڑیں۔ پھر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ میں نے غیرنصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ اب میں گو کہ بہت اچھا اسٹوڈنٹ ہوں' ہاسٹل ہو یا اسپتال دونوں جگہ مجھے خاصی اہمیت حاصل ہے مگر میں اندر سے بہت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں۔ میں... کیسے بتاؤں کہ بدصورت اور خوب صورت کا جوڑ بن سکتا ہے۔ موٹے اور دبلے کا جوڑ بن سکتا ہے۔ ٹھگنے اور لمبے کا جوڑ بن سکتا ہے لیکن پڑھائی کے اتنے سالوں میں' میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کبھی بھی ان پڑھ جاہل اور پڑھے لکھے کا جوڑ نہیں بن سکتا۔ یہ دونوں پر ظلم ہوگا۔"

منور اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک دم چپ ہوگیا۔ "میں ساری زندگی سولی پر نہیں چڑھنا چاہتا اور تمہیں چڑھانا چاہتا ہوں۔ اب میں تم سے کیسے کہوں کہ تم بہت اچھی ہو' کیئرنگ ہو لیکن میرے لیے ان فٹ ہو۔ میرا مطلب تم سمجھ رہی ہو' وہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ہے۔ گفتگو کا انداز' ڈریسنگ ہر چیز ہی پرفیکٹ۔

میں سوچتا ہوں پریکٹس تو مجھے وہیں کرنی ہے۔ یہاں آکر کرتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا تم وہاں کیسے موو کروگی؟ میرا مطلب ہے تمہیں بولنے کا طریقہ نہیں آتا۔ پرائمری تک تم نے تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑا خراب ہوجائے گا مسئلہ۔ میں یہ نہیں کہتا میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ شادی میں تم سے ہی کروں گا لیکن کسی بھی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر' نرس یا کلاس فیلو کو دیکھ کر ان کا لائف اسٹائل دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ میرا دل ہمیشہ بے ایمان رہے گا میں... شاید تم سے انصاف نہ کرپاؤں' مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

حلیماں نے بہت ہمت کرکے پوچھا۔ "بس یا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟"

"حلیماں! مجھے افسوس ہے تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ میں جب بھی کسی ویل ڈریسڈ یا ویل مینرڈ لڑکی کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خواہش کرتا ہے کہ اسے میری بیوی ہونا چاہیے۔ تمہیں تو علم ہی نہیں وہاں پر تو جیسے کمپیٹیشن میرا مطلب ہے مقابلہ لگا ہوا ہے فیشن اور خوب صورت گفتگو سے دل جیتنے کا۔ دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہیں..."

حلیماں نے انگلی کے اشارے سے اسے ٹوکا۔

"فیصلہ کرنا ہے تو مرد بن کے کرو۔ اب میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ اس لیے کہ میرا دل تمہارے لیے دھڑکتا تھا لیکن جب تمہارے دل میں کھوٹ آگئی تو میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ ساری عمر سولی پر چڑھنا تو دور کی بات تم تو سولی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے کہ اس پر چڑھنے کے لیے پکا ایمان اور حوصلہ چاہیے۔ تم نرس سے شادی کرو یا ڈاکٹرنی سے۔ میں نے تمہارا ورقہ پھاڑ دیا ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ کہنا اب یاد آیا ہے حالانکہ میرے ساتھ تو یہ کئی سالوں سے ہو رہا ہے۔

گاؤں کے ہیڈ ماسٹر سے لے کر گاؤں کے واحد سرکاری ڈنگر ڈاکٹر تک نے مجھے بلانا چاہا۔ کبھی راہ چلتے میری سبز آنکھوں کی جگمگاہٹ پر قصیدے کہے تو کبھی اس نے میری چال کو "مورنی" کی چال قرار دیا۔ گاؤں کے نمبردار کا اکلوتا بیٹا جب تین سال کے بعد انگلینڈ سے آیا تو آتے ہی دل دے بیٹھا تھا۔ لیکن رب سوہنے کی قسم! میں نے تو ان کی طرف تھوکنے کے لیے بھی منہ نہیں کیا' اس لیے کہ میرا دل تمہارے نام پر دھڑکتا تھا۔ میری آنکھیں تمہارے خواب دیکھتی رہیں' میں تو اپنے دل میں کسی اور کا خیال لانا بھی گناہ سمجھتی ہوں' خواہ وہ چودھری یا مربعوں کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔

افسوس!! تم تو مجھ پانچ کلاسیں پڑھی لڑکی جتنا بھی شعور نہیں رکھتے۔" حلیماں کی آواز کپکپائی۔

آنسوؤں نے پلکوں کی جھالر سے نکل کر طوفان مچا دیا تھا۔ شکستہ وجود کو لے کر پاؤں گھسیٹتی وہ اندر کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ ٹھا کر کے بند کردیا۔

منور بھی افسردہ تھا۔ اتنا تو اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ آج حلیماں کے دل کا دروازہ منور کے لیے بند ہو گیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

✲ ✲ ✲

"ماما! اس مرتبہ ہم گاؤں کتنے عرصے کے بعد جا رہے ہیں۔ چھ سالوں کے بعد ناں!" عصمت نے گاڑی ڈرائیور کرتی ماں سے سوال کیا۔

"ہاں میرا خیال ہے اتنا عرصہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اماں کی وفات کے بعد وہاں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" حلیمہ نے نرمی سے جواب دیا۔

"اور اتنی شادیاں آئیں' آپ کے ماموں فوت ہوئے' آپ پہلے تو ہر سال آتی تھیں۔" عصمت جس بات کے پیچھے پڑ جاتی تسلی ہو جانے تک پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ "کیوں ماما؟" بصد اصرار اس نے پوچھا۔

"بیٹے! چھٹیوں میں ہم چشتیاں جاتے ہیں دادا کے پاس' ایک مرتبہ ہم پہاڑی علاقوں کی طرف جاتے ہیں۔ گاؤں میں کوئی ایسا رشتہ یا ایونٹ بھی تو نہیں ہوتا اب۔ پہلے نانا تھے' آپ کی نانو تھیں۔ سال میں دو مرتبہ آنا پڑتا تھا۔ ان کے بعد ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔" بڑی متانت سے حلیمہ نے بیٹی کو مطمئن کرنا چاہا۔

"تو اب بھی نہ جاتیں' اب کیا ایونٹ ہے؟" عصمت نے پوچھا۔ "آپ کے چچا کو فوت ہوئے ڈیڑھ دو مہینے گزر چکے ہیں۔ افسوس اس وقت کیوں نہیں کرنے گئیں۔" عصمت نے جرح کی۔

"بے وقوف! یہ بچوں کی باتیں نہیں ہیں' تمہیں نہیں پتا اس وقت میرے وائیواز چل رہے تھے' کیسے آسکتی تھی میں؟" حلیمہ نے سرزنش کی۔

"نہیں ایک وجہ اور بھی ہے وائیوا کے علاوہ۔" عصمت نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" ڈرائیونگ کرتے ہوئے حلیمہ کے ہاتھ کانپے۔

"آپ نے ایگزامز میں فرسٹ کلاس پوزیشن لی ہے۔ آپ کو شیلڈ بھی ملی ہے' آپ اس نیوز کو وہاں بریک کرنا چاہتی ہوں گی۔" وہ بے حد معصو سے بولی۔

"فضول بات مت کرو۔ تمہیں کس نے کہا یہ؟" گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کر کے حلیمہ نے اس سوال کیا۔

"میری ایف بی پر بات ہوئی ہے نا منور انکل کی سے۔ اس کو منور انکل نے بتایا تھا۔"

"کیا؟" حلیمہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "پلیز' چپ ہو ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔" غصے پر قابو پاتے ہوئے مشکل سے اس نے بس اتنا ہی کہا۔

"سوری ماما۔ میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چا تھی۔ اصل میں منور انکل کی بیٹی نمرہ میری چیٹ فر ہے نا' اس نے بتایا تھا۔"

عصمت باقی سفر میں خاموش رہی۔ خاموش حلیمہ بھی تھی مگر اس خاموشی میں اسے اپنا بلکتا' ماتم اور چیخوں کی صورت میں سنائی دے رہا تھا۔

کیسا کٹھن وقت تھا آج سے سولہ سترہ سال پہ اس کے لیے جب اسے اپنے دل کو سمجھانا پڑا تھا نے سارا معاملہ جان کر اپنے دوست کے بیٹے سے ا کی فوری منگنی کر دی تھی۔ ابا نے پوچھا کچھ نہیں بس بتایا تھا کہ میں اپنے دوست چودھری اکرم کے عثمان سے تمہارا ویاہ کر رہا ہوں۔ ماسٹر عثمان شہر کسی گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتا ہے۔ بہت سیانا شریف لڑکا ہے' اللہ تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے گا بتانے کے بعد ابا نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھا بڑے دل سے دعا دی تھی۔

حلیمہ چپ رہی تھی۔ ابا نے اسے بڑے چاؤ اور سے پالا تھا بچپن میں انگلی پکڑ کے روزانہ شہر جانے سڑک تک پیدل لے کے جاتا تھا۔ بندر کے تما دکھانے میلے میں لے جاتا۔ گود میں بٹھا کر اس بالوں میں کنگھی کرتا۔ آج اس باپ کی محبت جو بھی فیصلہ کیا تھا' اسے قبول تھا۔ اور اگر اس کا ہو والا شوہر بھلے ماسٹر نہ بھی ہوتا تو کون سا وہ انکار کرتا

چاہت کا پہلا دروازہ بند ہوجائے تو باقی سارے کے سارے دروازے ایک ہی طرح کے لگتے ہیں۔

منگنی کے چند مہینوں کے بعد وہ ماسٹر عثمان کی بیوی بن کر شہر منتقل ہوگئی۔ عادات تو ایک چھت کے نیچے چالیس سال رہنے والوں کی' ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بہن بھائیوں کی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں' یہ تو پھر بالکل ہی غیر تھا۔ برادری' قبیلہ' زبان' سب کچھ لیکن ان پڑھ اور جاہل ہونے کا جو دھبہ اس پر لگ چکا تھا' آنے والے دنوں میں اسے مٹانا تھا۔ اسے ماسٹر کو یہ بھی بتانا تھا کہ ان پڑھ ہونا' لولا لنگڑا ہونے کی طرح دائمی کمی نہیں ہے' ایسی کمی ہے۔ جسے دور کیا جاسکتا ہے۔



"انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ خامیاں غالب آجائیں تو برا' اچھائیاں زیادہ ہوں تو نیکو کار کہلاتا ہے۔ ہم سب میں کوئی بھی مکمل اور مثالی انسان نہیں ہے' یہ ہوسکتا ہے کہ زندگی کے کسی ایک پہلو میں تم مجھ سے زیادہ خوبیوں کی مالک ہو اور کچھ میں میں تم سے زیادہ لیکن ہم دونوں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پہ پورے نہیں اتریں گے۔ تمہارے اندر جو کمی ہے اسے میں وسعت قلبی سے برداشت کروں اور جو میرے اندر کمی یا کوتاہی ہو اسے تم ناک منہ چڑھائے بغیر برداشت کرلو۔ زندگی کو آسان بنانے کے لیے یہ بہت کامیاب فارمولا ہے۔" ماسٹر عثمان نے حلیمہ کو پہلی رات ہی کچھ اپنے ذاتی فارمولوں میں سے پہلا فارمولا ذہن نشین کروایا تھا۔ عثمان خود محض بی اے پاس تھا۔ اس کا ایم اے پروگرام شروع ہوچکا تھا۔

ڈرتے جھجکتے حلیمہ نے ماضی کا ہر پہلو ماسٹر عثمان کے سامنے رکھ دیا۔ دل کی بربادی کی داستان سناتے ہوئے آنسو' موتیوں کی طرح جھلمل کررہے تھے۔

"عورت ہو یا مرد ایک چیز کو ہدف بنالے تو میرے خیال میں اس ہدف کو حاصل کرنے میں مرد کہیں پیچھے رہ جاتا ہے اور عورت تمام تر توانائیوں کے ساتھ ہدف وقت سے پہلے حاصل کرلیتی ہے۔ آزما کے دیکھ لو۔ میری طرف سے جس مدد کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔"

اس وسیع القلبی کے بعد عثمان کی ستر ہزار خامیاں بھی ہوتیں تو حلیمہ کو ان خامیوں سمیت وہ قبول تھا۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ گھرداری' پڑھائیاں سب ساتھ جاری رہا۔ جب ان کی بیٹی عصمت پانچویں کا امتحان دے رہی تھی تو حلیمہ بی اے کرکے فارغ ہوچکی تھی۔ اس نے لنگویج کورسز کیے۔ اس نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا۔ اس نے کھانا پکانے کی ترکیبیں سن سن کر کھانا پکانے میں مہارت حاصل کی۔ والدین کے انتقال کے بعد اس نے باپ کی زمینوں کو بیچ کر جہاں اپنا گھر اچھے علاقے میں خرید لیا وہیں پر اپنے گاؤں میں بچیوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کا اسٹاف اور اخراجات سب وہی سنبھال رہی تھی۔

کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ گاؤں جاکر اسے اپنا دکھ یاد آیا ہو۔ ہر جوان اور بوڑھے کے دل میں اس کے لیے عزت تھی' احترام تھا۔ ہاں اس کا اپنا چچا اسے دیکھتا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر روتا۔

"دھیے! میں ہی بدنصیب تھا۔ ہیرے کو نہ پہچان

سکا۔ زور زبردستی کر کے منور سے منوا تو سکتا تھا اس رشتہ کو۔"

پہلی دفعہ یہ سن کر وہ سناٹے میں آ گئی۔ "چچا! رشتے اوپر والا آسمانوں پر طے کرتا ہے' رشتے کبھی زور زبردستی سے طے نہیں کیے جاتے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں دھیے! دو چار دن منہ بناتا خود ہی کھونٹے سے بندھ جاتا۔ تجھے کیا بتاؤں اپنے کیے پر وہ خود کتنا پشیمان ہے۔ پہلے اپنی کلاس کی ڈاکٹرنی سے شادی کی۔ وہ چار مہینے بھی نہ نبھ سکی۔ اس جھلی کو میرے پتر کے کپڑے پہننے' بولنے' چلنے پھرنے' کھانا کھانے سب میں عیب نظر آتے تھے۔ اس کے بعد اس نے ایک نرس سے شادی کی۔ پانچ سال کے بعد وہ نرس دنیا سے چلی گئی۔ اب تیسری مرتبہ اس کی بات پکی کی ہے اس کے ماموں کی بیٹی سونیا سے۔ اب پتا نہیں کیا بنتا ہے میرے پتر کے ساتھ۔" چچا کی آنکھوں سے ستارے گر رہے تھے۔

حلیمہ کانپ گئی۔ "چچا میں نے اس کے مقدر کے لیے کبھی ایسے نہیں چاہا تھا۔" بڑی افسردگی کے ساتھ وہ گھر واپس لوٹی۔

آج چچا اس دنیا میں نہیں منور کی تیسری بیوی بہت لڑاکا عورت ہے۔ جسے بولنے کھانے پینے کی تمیز نہیں۔

منور کی دوسری بیوی سے دو بچیاں ہیں جن کی عصمت سے دوستی ہے۔ حلیمہ نے بھی نہیں چاہا کہ وہ سر اٹھا کر ایسے منور کے سامنے آئے کہ اس کا جھکا سر مزید جھک جائے مگر اس نے اپنی شیلڈز اور ٹرافیوں پہ نظر ڈالی۔ اگر خدا کسی کے سر کو مزید بلند کرنا چاہے تو پھر کیا کیا جائے؟

فخر یا شکر؟

یقیناً" شکر اور وہ صرف چچا کے مرنے کے بعد تعزیت کے لیے ہی نہیں جا رہی تھی بلکہ تہہ دل سے منور کا شکریہ ادا کرنے۔

"اگر منور تم مجھے اپنی بیوی بنا بھی لیتے تو کیا ہوتا' نا تمام حسرتوں کے ساتھ تمہاری زندگی گزرتی پسند کی شادی کر کے گھر لاتے تو مجھ پر خوشیاں حرام ہو جاتیں۔

دونوں کی قیمتی زندگی اسی روگ میں ختم ہو جاتی۔ آج جس مقام پر میں ہوں۔ دیکھو مجھے زندگی کے قیمتی ہونے کا علم ہے۔

میں اس کا ایک ایک لمحہ کشید کرتی ہوں۔

میں اس کے ہر پل سے آخرت کی تیاری کرتی ہوں۔ مجھے اس فیصلے نے رب کے قریب ہی نہیں کیا رب کی معرفت بھی عطا کی ہے۔

اٹھو! تم پر بھی اللہ اسی طرح مہربان ہو سکتا ہے۔ خوشیاں کوئی ڈگریوں سے تو نہیں جڑی ہوتیں۔ زندگی کے مقصد کو خود بھی سمجھو اور اپنی بیوی کو بھی اعتماد میں لو۔ ہمت کے ساتھ' حوصلے کے ساتھ۔" حلیمہ نے تعزیت کے بعد منور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا جس کی کنپٹیوں کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔

جو زندگی کو ہی حاصل سمجھ بیٹھا تھا اور حلیمہ بندگی تک پہنچ گئی تھی۔ جس کا دل زندگی سے کوئی سبق حاصل نہ کر سکا تھا۔ نظر اٹھا کے "بس اچھا" ہی کہہ سکا۔

اور کیا کرتا۔ صحیح تو کہا تھا حلیمہ نے۔ حلیمہ کو ا کامل صرف اور صرف "یکسوئی" کی وجہ سے ملا اس نے منگنی کے ٹوٹنے تک ان پڑھ ہوتے ہو کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھا تھا۔ اس لیے فیض یاب ہوئی۔ اور کامران ٹھہری۔

منور کا قصور یہ تھا کہ رشتہ ناتا اس کا بھی بچپن ہی حلیمہ سے جڑا ہوا تھا مگر وہ نظر کو محفوظ نہ رکھ اس کے دل میں غیر کا خیال آ گیا تھا۔ اس لیے وہ ا کامل تو کجا' رتی بھر ایمان کی حلاوت بھی نہ چکھ سکا مردود ٹھہرا۔

باوقار انداز سے واپس جاتی گاڑی کا دروازہ کھ حلیمہ کو اس نے الوداع کہا۔ دیر سے ہی سہی کے لیے اسے بھی اب یکسو ہونا ہے' اب یہی ایک ہے۔



فرزانہ کھرل

کبھی تم ہجر لکھو تو



"بھئی مان لیا کہ چالیس سال قبل کے کاری گر نور جہاں اور لتا جی کے گانوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چھ مہینوں تک ایک ہی آرڈر پہ کام کرتے ہوں گے۔" وہ کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سیدھی ہوئی اور کن اکھیوں سے تائی کو دیکھا، جنہوں نے اس کی بات پہ گردن فخر سے اکڑائی تھی۔

"ہائے میری کمر ہی سیدھی نہیں ہو رہی۔" اس نے پہلو کے بل جھکتے ہوئے کمر پہ ہاتھ رکھا۔

"اف اس قدر بھاری فرنیچر۔" وہ بیٹھ کے ہانپنے لگی۔ "ایک صوفہ چار بندے مل کے کھسکاتے ہیں، اگر ڈبل بیڈ کی جگہ بدلنی ہو تو پورا محلّہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔" اس نے اپنا اچھا خاصا منہ ممکنہ حد تک ٹیڑھا کیا۔

"برائے مہربانی تھوڑا سا ہٹ کے بیٹھیے، میں کوئی اڑن کھٹولا نہیں جو یہاں سے سیدھا دبئی جائے گا۔" (تمہاری خواہش پہ) وہ جیسے عنبر پہ چڑھ کے بیٹھی تھی جو کہ چالیس سال قبل کا ٹو سیٹر کاؤچ تھا، عنبر کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرا بازو غالباً "آتشی کے بیچ میں سینڈوچ بن چکا تھا۔

"وائے قسمت، تمہارا پہلو آباد ہو ہی چکا ہے۔ (جیسے تمہارا خود تو ارادہ ہی نہیں۔) تو تمہیں تو اٹھ کے دو نفل شکرانے کے پڑھنے چاہییں تھے۔" وہ دانت پیس کے ذرا پرے ہوئی۔

"یہ ہر بات میں دبئی کیوں یاد آ جاتا ہے۔" پروا نے چڑھی پیشانی کے ساتھ عنبر کو سرد نگاہوں سے دیکھا، چہرہ لال بھبھوکا۔ برآمدگی کچن سے ہوئی تھی۔ ہاتھ میں سوا فٹ لمبا چھرا متانت سے پکڑا ہوا تھا۔ عنبر کا خون خشک ہوا۔

"خدارا... خالہ... میں تو... بس یوں ہی..." وہ بے ربطگی سے منمنائی اور چائے کا لرزتا کپ بمشکل قابو کرتی وہاں سے کھسک لی۔ پروا کی سرد مہر آنکھوں کا سامنا ایک کڑا مرحلہ تھا۔

"ہاں تو بات ہو رہی تھی دبئی کے کاری گروں کی۔" (اف یہ آتشی بات بدلنے میں کس قدر ماہر ہے۔) تائی

مکمل ناول



نے سنجیدہ شکل کے ساتھ سوچا۔
"لو دیکھو بھلا" تائی کے فرنیچر کے سامنے تو وہاں کے کاری گر بھی اپنے سابقہ اور موجودہ ہنر میں صفر کا درجہ رکھتے ہیں۔" اور ساتھ کھڑی پروا پہ تائیدی نگاہ ڈالی۔
"تو اور کیا! اب تو ڈیڑھ سال کا بچہ بھی صوفہ تک کھسکا لیتا ہے۔" تائی نے اپنا سونے کی چھ چوڑیوں والا ہاتھ جھلا کر کہا۔
"کچھ زیادہ ہی نہیں ہو گیا۔" آتشی کی آنکھیں باہر کو آئیں۔
"اب تو گتے پہ گتا جوڑ کے پالش تھوپ دیتے ہیں، ساتھ ہی چن چن کے سلک کا کپڑا لگا دیا۔ اب وہ زمانے کہاں رہے۔" تائی نے ایک سرد آہ بھری۔
"یہاں پتا نہیں اب کس زمانے کا ذکر چل رہا ہے، کیونکہ آپ کا تو شادی سے پہلے کا زمانہ بھی خاصا طویل تھا۔" تایا جی منہ پوپلا سا کر کے ہنسے۔
تائی نے انہیں یوں دیکھا جیسے ہر قوم پہلے ہی اوور میں آؤٹ ہو جانے والے اپنے بلے باز کو دیکھتی ہے۔
"ہاں، ہاں میں تو قیام پاکستان سے بھی پہلے کی پیداوار ہوں۔" تائی اب اسٹارٹ لے چکی تھیں۔
"تا بھئی نا، تمہیں تو ہماری ساس صاحبہ نے پالنے میں ہی بیاہ دیا تھا۔" وہ پھر سے ٹھٹھا لگا کر ہنسے۔ "اور ہم آپ کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے خود فیڈر پلایا کرتے تھے۔" اس بات پہ تائی کا پارہ ہائی درجے پہ پہنچا۔
پروا نے انہیں متاسفانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اب وہ دونوں حسب عادت ہتھیار چمکا کے میدان میں کود پڑے تھے۔ جبکہ آتشی کو اب ریفری کا کام انجام دینا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہو گئی تمام گھر کی صفائی ستھرائی۔" عنبر نے اسے آتے دیکھا تو زیر مطالعہ کتاب پہلو میں رکھ دی۔ جواب نہا دھو کے پاپڑوں سے بھری پلیٹ لے کر اس کے مقابل بیٹھ چکی تھی۔
"جی ہاں، صفائی بھی ہو گئی اور لڑائی بھی ہو گئی۔" وہ کھلکھلائی۔ "ابھی ابھی تائی کا تازہ ترین غم چاٹ کے آ رہی ہوں۔" اس نے ایک ساتھ کئی پاپڑ منہ میں رکھے۔
عنبر نے کرچ کرچ کی آواز پہ اچھا خاصا منہ بگاڑا اور اس پہ افسوس بھری نظر ڈالی۔ "چاٹ کے نہیں جاہل لڑکی، بانٹ کے، کوئی آخر تمہاری غلطیاں کہاں تک نکال سکتا ہے۔"
"قسم سے اس قدر ہینڈسم بندہ ہماری اتنی غلطیاں نکالنے کو تیار بیٹھا ہے، مگر آپا مانے تب نا۔ تم اسے بار بار کیوں بھول جاتی ہو ڈیر عنبر۔" وہ اس کے سامنے بیڈ پہ تقریباً" پھیل ہی گئی۔
"ذکر ان کا ہماری محفل میں، پاپڑ جائیں بھاڑ میں۔ تم دیکھو آتشی اس کے ذکر پہ کیسے سنہری ہو رہی ہے، اسے یاد کرنے کو ایک تم ہی کافی ہو۔"
عنبر نے اسے تپ کے دیکھا۔ "میں تو تمہارے انس کو بھی یاد رکھتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں اچھی خاصی شرارت چمکی۔ عنبر نے تلملا کے پہلو بدلا اور کتاب دوبارہ اٹھا لی۔
کل آتشی کی غیر موجودگی میں وچولن نے خالہ اور تائی سے کچھ کھسر پھسر کی تھی، مگر عنبر اسے فی الحال بتانا نہیں چاہتی تھی، جو اس کے سامنے اب ہلکا سا اونگھ رہی تھی۔ اگلے ہی پل عنبر سر پہ دوپٹا اوڑھ کے مؤدب سی ہوئی کہ ظہر کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔
"یہ سب نماز نہ پڑھنے کے ڈرامے ہیں۔" اس نے اونگھتی آتشی کے بازو پہ چٹکی بھری۔ "یقین کرو میں تو اتنی سی بھی گناہ گار نہیں۔" اس نے دو انگلیوں کے بیچ ذرا سا فاصلہ رکھا۔
"تکبر ہے پاگل۔" وہ اسے ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔ "تم ہوتا پکی نمازن تو پانچوں وقت توبہ استغفار کرو۔"
عنبر کے چہرے پہ تاریک سا سایہ لہرا کے رہ گیا تو کیا وہ گناہ گار تھی۔ مگر خدا کی پکار تو صالح اور گناہ گاروں، سب کے لیے ہوتی ہے۔ وہ اسے تاسف سے دیکھتی۔ نماز پڑھنے کی غرض سے اٹھ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آخر تم کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے انس۔" وہ دو تین ماہ بعد بیٹے سے مل رہی تھیں۔ "ذرا اپنی صحت دیکھو۔ کب تک اس کی آس پہ بیٹھے رہو گے۔ پہلے ہی اس کے انتظار میں تم کئی اچھے رشتے گنوا چکے ہو۔" جانے کیوں وہ آج خود کو بولنے پہ اکسا رہی تھیں کہ آخر زچ ہو کر وہ کہہ دے گا جو آپ کا دل کرتا ہے کریں۔ مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ ڈھٹائی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں۔ انس نے بھاپ اڑاتی کافی کا مگ میز کے کنارے پہ ٹکایا۔ اور ہر بار کی طرح ماں کا چہرہ بے یقینی سے دیکھا۔ پتا نہیں ماں اسے چھوڑنے کا مشورہ مجھے کس حوصلے سے دے لیتی ہیں۔

"ماں! عنبر سے میرا رشتہ غالباً آپ نے ہی طے کیا تھا۔" اس ملاقات میں وہ چپ نہیں رہ سکا۔ اسے ماں کو یاد دہانی کرانا پڑی۔

"آج سے کئی سال پہلے میرا دماغ خراب تھا۔ میں جذباتی ہو گئی تھی کہ بیمار بہن کے سامنے اس کی بیٹی کو نہ صرف تمہارے لیے مانگا' بلکہ اس کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی بھی ڈال دی' مگر اب میں ہی تمہیں یہ رشتہ ختم کرنے کو کہہ رہی ہوں۔" ماجدہ کی آنکھیں پانی سے بھر چکی تھیں۔ "کیا میں جانتی تھی کہ وہ بھولی سی لڑکی صرف پندرہ سال کی عمر میں پاکستان شفٹ ہونے جیسا بڑا فیصلہ بھی کر سکتی ہے اور اس کا باپ تو دیکھو' کیسے اپنی چہیتی بیوی کے کہنے پہ اسے اپنے سسرال پھینک آیا۔ مجال ہے جو اس لڑکی نے کبھی پلٹ کر ہماری خبر لی ہو۔" وہ شاید ابھی اور بھی بولنا چاہتی تھیں۔ انس نے انہیں آنکھوں کے کنارے صاف کرتے دیکھا۔

"سچ تو یہ ہے مما کہ ہم ماں' بیٹا دونوں ہی آج بھی اس باغی لڑکی کی محبت میں بری طرح گرفتار ہیں۔" وہ ماں کو بازو کے گھیرے میں لے کر سادگی سے مسکرایا۔

ماجدہ نے اسے تڑپ کے دیکھا۔ "ہرگز نہیں' بلکہ آج کے بعد تو بالکل بھی نہیں' بس میں کہہ رہی ہوں اس کی یادوں سے وابستہ یہ کاٹھ کباڑ باہر نکال کے آگ لگا دو۔" ان کا تیز لہجہ جوش سے عاری تھا۔ انس کا چہرہ سیاہ پڑا۔

اس نے سامنے دیوار پر آویزاں چوکور رگ کو بے چینی سے دیکھا' جس پہ کڑھے رنگ برنگے پھول کپڑا چھوڑ کے اس کے آس پاس آجاتے تھے۔ سانس لینے لگتے تھے۔ بیڈ کے سائڈ ٹیبل پہ دھرا ہاتھ سے بنا مٹی کا ٹیبل لیمپ' جس کی لو سے پھوٹتی ہلکی روشنی تمام رات اسے قدیم شہزادیوں کے قصے سناتی تھی۔ نیند میں جن کے کردار وہ جنگل جنگل ڈھونڈتا تھا اور اس کی وارڈروب کے باہر ٹنگی کپڑے کی بڑی سی گڑیا جس کی آنکھوں کا دھاگا جانے اس لڑکی نے کہاں سے خریدا تھا جو بولتا تھا' جس کے سیاہ حاشیوں کے اندر جانے وہ کیا تلاش کرتا تھا۔ کیا ان چیزوں کے پھینک دینے سے وہ دل سے بھی نکل سکتی تھی جو ان کی زندگیوں سے کسی اچھے وقت کی طرح رخصت ہو چکی تھی۔

اس کی ماں بہت سینئر اور جینئس گائنا کولوجسٹ تھی' ماں' بیٹا اب الگ الگ ملکوں کے باسی تھے۔

"اس مرتبہ پاکستان جاؤں گا تو وہ واپسی پہ میرے ساتھ ہو گی۔" اس نے ماں کے کان میں سرگوشی کی۔

"دودھ کی کٹوری' دودھ میں بتاشا۔

انس جھوٹا باشا۔"

زرد فراک میں گول گول گھومتی بچی۔ وہ منظر جواب محض الوژن تھا۔ انہوں نے رخ موڑ کے بیٹے کا سپاٹ چہرہ ترحم آمیزی سے دیکھا' کہیں سے بازگشت ابھری تھی۔

انس جھوٹا باشا۔



محب وطن چار دن بعد گھر واپس آیا تھا اور اس کا منہ کسی بڑے غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔

"محب کی ملاقات وہاں مودی سے تو نہیں ہو گئی۔" یہ رائے عنبر کی تھی۔

"لو جی' پھر تو مودی کا جوڑ' جوڑ الگ ہو چکا ہو گا' آخر اس نے پاکستانی اور محب وطن کا جو سامنا کر لیا۔" آتشی نے بھی گفتگو میں ٹکڑا لگانا ضروری سمجھا۔

"کچھ منہ سے پھوٹ... تو پتا چلے وہاں تیرے ساتھ کیا ہوا۔ یا پھر یوں ہی ڈرون جیسا منہ بنا کر بیٹھا رہے گا۔" تائی بھنا کر بولیں تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیا بتاؤں اماں کہ آپ کی بہن نے جو میری خاطر مدارت کی ہے' اس میں کچھ بھی خاص بتانے والا نہیں۔" بیٹے نے جل بھن کے شکایت لگائی۔

"چٹورا نہ ہو تو۔" ماں نے سمجھ کے منہ بسورا۔

"بلکہ یہ دیکھیں۔" وہ ماں کے قریب ہوا' پھر اپنے فون کی اسکرین روشن کی' وہاں ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ "آپ کی بہن نے بھی میری کچھ ایسی ہی خدمت کی۔" تائی جیسے بدقت تمام جھکی' میز کے ایک طرف مرد اور عورت بیٹھے تھے۔ دوسری جانب اکیلا مرد' درمیانی ٹیبل پہ برگر' کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس۔

"ہائے توبہ' یہ غازیہ کے کپڑے تو دیکھو' اوئی ماں۔" تائی نے اپنے کھلے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

"یہ تو کینیڈا کے وزیراعظم کی گھر والی ہے۔" عنبر جب خوب ہنس چکی تو بعد میں بتایا۔ "اور اس کے سامنے بلجیم کا وزیراعظم بیٹھا ہے۔"

تائی نے جواباً آنکھیں پھاڑ کے محب کو دیکھا۔

"اف... کہیں مچھلی کا کانٹا تو نہیں گلے میں پھنس گیا۔" پروا کچن سے کیلے تک اٹھا لائی۔

سب انہیں دیکھتے جاتے اور وہ... "پر یہ تینوں کا ہے کو منیا کے گھر (چھوٹی بہن) آئے ہوئے ہیں۔"

"ففف... ہا... اف ہاہا۔" آتش اور عنبر کی آنتیں پیٹ سے باہر آنے کو تھیں۔

"میرا مطلب تھا کہ کراچی سے گئے بھانجے کو" جو ہونے والا داماد بھی تھا۔" آپ کی بہن بس دال' سبزی پہ ٹرخاتی رہی۔" وہ ہنوز پھول کے کپا بنا بیٹھا تھا۔

"جب بلجیم کے وزیراعظم کی خدمت اتنی سی کی ہے تو کراچی کے فارغ انسان کی خاطر تواضع کیا پاکستانی وزیراعظم جتنی ہونی چاہیے تھی۔" آتش بھڑک کے بولی۔

"یہ پاکستانیوں کو ہر وقت پیٹ بھرنے کی فکر کیوں رہتی ہے' وہ اعوان ہو یا دلان۔" انس اسے اکثر چھیڑتا تھا۔

"وزیراعظم کی بیوی کو تو منیا جتنا بھی سلیقہ نہیں۔" تائی کافی توقف کے بعد منہ بگاڑ کے گویا ہوئیں "ارے بھائی' مہمان کی آمد پہ دال سبزی ہی پکا لیتی' مگر نہیں جی' بیٹھے بٹھائے کام والے کو بھگایا ہوگا کہ جا فٹافٹ برگر' بوتل پکڑ لے۔" اور بیٹے کو یوں دیکھا کہ میری بہن تو اس سے کہیں بڑھ کے مہمان نواز ثابت ہوئی ہے۔

ماں کے اس انداز پہ وہ پیر پٹختا وہاں سے غائب ہوا۔

"چھوٹے بڑے سات بچے... اوپر سے اس قدر مہنگائی... کوئی کیا کرے۔" بیٹے کو تاسف سے دیکھا۔

"تمہارے پاکستان میں اب کیا رکھا ہے عنبر۔" اسے پھر انس یاد آیا۔

"میرے پاکستان میں سوائے چند برے لوگوں کے باقی سب کچھ اچھا ہے۔" اس کی سوچ میں روشنی سی کھلی۔ "بس یہاں کے محب الوطنوں کو اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ذرا کم کرنی ہوگی۔"



انار کے جھنڈ کے پیچھے نیم کا موٹا تنا مسلسل ہل رہا تھا۔ ساون کی پہلی بارش کے ساتھ ہی آتش کی فرمائش پہ تایا جی انہیں جھولا ڈلوا دیتے تھے' جس پہ دو افراد ایک ساتھ جھول سکتے تھے۔

"جھجو... جی... اپنے بھائی کو بھیجو... ری کہ ساون آیا۔"

تائی نے بوکھلا کے آواز کی سمت دیکھا۔ "یہ آتش بھی حد کرتی ہے' اگر پروا نے سن لیا تو دونوں برف کا پہاڑ بن کر رہ جائے گی۔" وہ اون کا الجھا گولا ٹیبل پہ پھینک پھانک آواز کی سمت بھاگیں۔

"اس بار ویسے بھی مون سون زیادہ ہونے کی پیش گوئی ہوئی ہے۔ اچھا ہے' آگیا تو چماروں کے ساتھ مل کر تمہاری گلی میں وانہو ہی چلایا کرے گا۔" عنبر جھولا چھوڑتے ہوئے ہلکا سا ہنسی۔

آتش کی آنکھوں میں ایک ناگن نے پھن پھیلایا۔

"اس قدر دل آزاری' اللہ تم سے ضرور پوچھے گا۔" وہ پھنکار کے بولی۔

"میری بچی اس سے تو اللہ پوچھے گا یا نہیں' مگر تجھ سے پروا ابھی آکر پوچھتی ہوگی کہ میرے دیور کو کس رشتے کے تحت بلایا جارہا ہے۔ یہ گیت ذرا دھیمی آواز میں گایا کر۔" (پر ضرورت ہی کیا ہے۔) تائی نے قریب آکر اس کا کان کھینچا۔

آتشی نے اناروں پہ بیٹھی سفید بلبل کو آزردگی سے دیکھا' پھر ایک بھیگی نگاہ تائی پہ ڈالی۔ "آپا کیوں چاہتی ہیں کہ آتشی سفید بلبل کی مانند ہوجائے۔" اور شہتوت کی شاخوں میں گھسی عنبر ایک جھٹکے سے مڑی' اس نے موم سون کو آتشی کی آنکھوں میں گھرتے دیکھا۔ تائی جھولے پہ اس کے ساتھ ٹکیں اور جھولے سے لپٹی موتیے کی بیل پہ ہاتھ رکھا۔

"تو اس کا دھیان چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔" پھر اس کے دامن سے آنسو جھاڑے۔

آتشی کا وجود اوس میں ڈھلا۔ "چھوڑ تو دیا ہے۔" وہ دھیرج سے گویا ہوئی۔ "بس ذرا سا یاد کرلیتی ہوں۔"

عنبر نے اسے بلبلا کے دیکھا۔ وہ ایک کانٹا چبھنے جیسی بات تھی۔ آتشی کا اوس میں بھیگا وجود ٹرانسپیرنٹ ہوا۔ عنبر نے اس میں سے خود کو گزرتے محسوس کیا۔ وہ کسی وارث کی طرح آتشی کے اس جملے میں حصہ دار ہوئی۔ اور اس کے آنسوؤں میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ تائی نے اسے غور سے دیکھا' اس کے رخساروں پہ یاد کی خوشبو باسی نہیں تھی۔ جو اناروں کی مہک اور چنبیلی کی مہک کو مات دے رہی تھی۔

"میں اس کی یاد کو پاس پھٹکنے بھی نہیں دوں گی' مگر آپا کچھ بتائے تو سہی کہ اس گھر میں اس کے ساتھ کیا برا ہوا تھا کہ گوہر بھائی اور وہ اس قدر اجنبی ہوگئے۔ نہ تعلق توڑا نہ کبھی جوڑنے کی کوشش کی۔ کسی کو چھوڑنے کی بھی تو کوئی وجہ ہونی چاہیے نا تائی امی۔"

بلبل نے اڑ کے عنبر کو اپنی جگہ پہ بٹھایا جو آتشی کے جملے پہ سفید لٹھا ہوئی تھی۔

"وجہ ٹھوس نہ ہو تو کون پیچھے ہٹتا ہے۔" اس حیران

بلبل کا وجود انار کے درخت سمیت اڑا تھا۔ ان دونوں کے سر پہ ٹھک سے کچھ لگا' دو تین طوطے نیم کے درخت پہ کچے پکے امرود کھا رہے تھے اور نمولیوں کی گٹھلی ان کے سروں پہ پھینک کے انہیں اداسی کے موسم سے باہر لے آئے' اب تائی اسے کیا بتاتیں کہ وہ راز تو اس نے اپنے اماں باوا کے سامنے بھی نہیں اگلا تھا' جانے کیوں اپنا گھر چھوڑ کے چلی آئی' اب اس کے خالی وجود میں اکثر اونٹوں کے گلوں میں پڑنے والی ٹلیاں آواز دیتی تھیں۔ بات سالوں بعد بھی تائی کے اون کے گولے کی مانند تھی' ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں۔ عنبر نے ٹیبل پہ دھرا الجھا گولا دیکھ کے ایک یخ ٹھنڈی آہ بھری تھی۔



وہ انڈین تھی کرسچن' یہودی یا پھر بدھست' ان دونوں بہنوں نے عمر کے کسی بھی حصے میں اسے کسی بھی مذہب کی عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بس وہ ان دونوں کی خدمت گزار تھی اور اللہ کے حکم سے وہی انہیں پال رہی تھی۔ اور اللہ ہی جانے وہ دونوں اسے کہاں سے ملی تھیں یا اس نے انہیں کسی چوراہے سے اٹھایا تھا' مگر شعور کی دنیا سے لے کر آج تک وہ ان کے ساتھ تھی۔

گہری سانولی پتلے نقوش کی مالک وہ عورت..... جسے وہ دونوں مام اور مقامی لوگ لنڈا کے نام سے جانتے تھے۔ وہ چھریرے بدن کی سرو قد عورت تھی' وہ تینوں ہالینڈ کے ایک پسماندہ علاقے میں دو کمروں کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں۔ اس نے بڑی کا نام ماجدہ اور چھوٹی کا فاطمہ رکھا تھا۔ وہ ہفتے میں انہیں دوبار اسلامک سینٹر لے کر جاتی تھی۔ جب تک وہ دونوں کلاس لیتی رہتیں' وہ نگاہیں جھکائے دوزانو ہو کر کچھ فاصلے پر بیٹھی رہتی تھی۔ لنڈا نے ان کے اسلامی نام کیوں رکھے' وہ انہیں اسلام کی تعلیم کیوں دلوا رہی تھی۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کا کام بس اس کے دکھائے ہوئے راستے پہ چلنا تھا۔ فاطمہ اور ماجدہ...

مشرق اور مغرب کے فرق جیسا مزاج رکھتی تھیں۔
ماجدہ تعلیم میں بھی فاطمہ سے کہیں آگے تھی۔ لنڈا ایک شوز فیکٹری میں کام کرتی تھی اور شام کو وہ ایک کیسینو میں بطور ویٹر کام کرتی تھی۔

ماجدہ نے پندرہ سال کا ہوتے ہی اس کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا تھا۔ وہ بھی شوز فیکٹری میں بطور سیلز گرل کام کرتی تھی۔ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی، جب وہ اسلامک سینٹر میں تلاوت کرتی تو ایک سماں سا بندھ جاتا۔ وہیں اس کی ملاقات حنان رحیم سے ہوئی۔ جس کا ہالینڈ میں اپنا کاروبار تھا۔ اس لڑکی کو ایک دو سال پرکھنے کے بعد سترہ سالہ ماجدہ کو حنان رحیم نے پروپوز کردیا تھا۔

"میں اگلے سال چالیس کا ہوجاؤں گا۔ میں کوئی پارسا آدمی نہیں، مگر میں خواہ مخواہ بھی کسی عورت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگا۔ ایک دو سال پہلے میں گناہوں سے تائب ہوچکا ہوں۔ مجھے تم جیسی پارسا لڑکی کی تلاش تھی۔ تم لنڈا کی بیٹی ہو۔ تمہارا یہ تعارف بھی میرے لیے معتبر ہے۔ اگر تم انکار کردوگی تو بھی دوبارہ سامنا ہونے پہ تم مجھے مکمل اجنبی پاؤگی۔" بات مکمل کرنے کے بعد وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔

ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا۔ وہ چھ جگہ کام کرتی، پھر بھی میڈیکل کی تعلیم ایک خواب ہی رہتا۔

"جب تک میں مکمل ڈاکٹر نہیں بن جاؤں گی تمہارے بچے اس وقت تک پیدا نہیں کروں گی۔ اب باقی باتیں تمہیں لنڈا سے کرنی چاہئیں۔"

حنان رحیم نے اس کی یہ شرط منظور کرلی تھی۔

ٹھیک ایک ماہ کے بعد ہالینڈ کا پسماندہ علاقہ چھوڑ کے مسز حنان ایک بہتر علاقے میں بہت بڑے گھر کی مالکہ بن چکی تھی اور ایک لگژری اور خوب صورت زندگی اس کی منتظر تھی، جہاں رہ کر اسے اپنے خوابوں کو مکمل کرنا تھا۔ لنڈا کی تربیت میں کوئی فرق نہیں تھا، پھر کیوں ایک کندن بن گئی اور دوسری......



"ایک، ایک نقش کمال کا۔" اس نے شہادت کی انگلی سے آنکھیں، ناک اور پھر اپنے ہونٹ چھوئے۔ "پھر نظر اتارنے کو دو تل بھی لگادیے۔ مگر...... ہائے...... رے قسمت...... جو لوگ بھی مجھے دیکھ کے جاتے ہیں، اس سے اگلے دن انکار کا پیغام آجاتا ہے۔" اس کے ہاتھ میں بڑا سا آئینہ تھا، جس میں وہ خود سے مخاطب تھی۔ وہ مایوس اور دلگرفتہ تھی۔

عنبر نے اسے دانت پہ دانت جما کے گھورا "کہ بجو جی! اگر میں آج ہی راز اگل دوں تو کل ہی گلی میں بینڈ باجے بج رہے ہوں۔"

"آتشی! تم کیوں خالہ کو پریشان کرتی ہو۔ کل بھی اچھے خاصے لوگ آئے تھے۔" اس وقت عنبر کے چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی۔ "جب جانتی ہو کہ تمہارے چاہنے سے تمہاری تقدیر نہیں بدلے گی تو پھر ہر فیصلہ اللہ پہ چھوڑ دو۔"

آتشی نے اسے بے کلی سے دیکھا۔ "اور عنبر بن جاؤں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ شیشہ، ٹیبل پہ رکھا اور منہ پھلا کے کھڑکی کے پار جھانکا۔ ساتھ والے گھر میں نگاہ گئی۔ بزمی صاحب کی بیگم بلی کے پیالے میں دودھ ڈال رہی تھیں۔

"تم خود کو اللہ کے مقابل کیوں لے آتی ہو پاگل۔ میں یوں نہیں ہونے دوں گی۔ میں ووں نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میری، میری چھوڑدو آتشی، آخر کار ہوگا وہی جو وہ چاہے گا۔ خود ایک طرف ہوجاؤ اور خود کو اس کی رضا کے حوالے کردو۔" وہ بھی اب اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اور وہی کچھ دیکھ رہی تھی جو وہ دیکھ رہی تھی۔ بلی کے چھوٹے، چھوٹے بچے جنہیں مسز بزمی نرمی سے اٹھا کر ایک ٹوکری میں رکھ رہی تھیں۔

"کیا خالہ تمہارا برا چاہیں گی؟" عنبر کی آواز انتہائی مدھم تھی۔

"کیا اس نے اپنے لیے کچھ اچھا چاہا؟" اس نے عنبر کے سوال پہ ترنت سوال کیا۔

"کون سی عورت اپنا گھر نہیں بسانا چاہے گی۔" وہ ذرا توقف کے بعد ہم کلام ہوئی۔ "اس کے ساتھ وہاں کچھ برا تجربہ ہوا ہوگا۔"

"تو پھر ہمیں بتائے تو سہی۔" پروا پچھلے پانچ منٹوں سے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"میں نے اپنا گھر نہیں بسانا چاہا تھا۔" دل تو چاہا چیخ کے کہے۔ وہ یہ سچ آج بہن کے منہ پہ مارنا چاہتی تھی۔

"اور وہاں میرے دل کے ساتھ بہت برا ہوا تھا۔" وہ لب بھینچ کے پلٹی۔

"بعض باتیں اس قدر بھاری ہوتی ہیں کہ ہم اپنے پیاروں کو رازدار بنا کر ان سے وہ بوجھ اٹھوانا ہی نہیں چاہتے۔" اس کے قدم عنبر کی آواز نے جکڑ لیے۔

اس نے پروا کے خیالات کی ترجمانی کیا خوب کی تھی۔ اک بے قراری نے دل پہ ہاتھ سا رکھا تھا۔ وہ دبے پاؤں ہی واپس ہولی۔



دس مرلے پہ محیط محب منزل کے مالک و مختار صرف باسط محب ہی نہیں اور نہ ہی وہ اپنی ایک عدد بیوی اور اکلوتے بیٹے محب وطن کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کی دو بھتیجیاں پروین اور آسی بمعہ اپنی بھانجی عنبر عنایت کے ساتھ محب منزل کی مکین ہیں۔ ان کی بڑی بہن فاخرہ اپنے شوہر کے ساتھ ہالینڈ میں رہتی ہے۔ آج سے دس سال پہلے جب محب منزل کو آخری بار گہرا فیروزی رنگ کروایا گیا تھا تو اس کے سبز کھوچ چوڑے گیٹ سے ان کے بڑے بھائی اکبر عیب نے اپنی دوسری لاڈلی بیٹی پروا کا ڈولہ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اپنے تئیں انہوں نے ایک اچھے خوش حال گھرانے میں بیٹی بیاہی تھی، جانے کیوں اس کا دل سسرال میں نہیں لگتا تھا جو مہینے میں چوبیس دن میکے میں گزارتی، بھیگی آنکھیں کھوئی کھوئی سی پروا، ماں کے دل میں ہزاروں اندیشے سر ابھارنے لگے۔

گوہر نہ صرف اچھی جاب پہ تھا، بلکہ شکل و صورت کا بھی اچھا تھا۔

"ایک جیٹھ... تین دیور، سسر... اور اماں کا ایک یتیم بھانجا... مردوں سے بھرے گھر میں مجھے وحشت ہوتی ہے۔" ایک دن ماں نے کھل کے بات کی، اپنے واہمے اس کے سامنے رکھے... تو بیٹی کا جواب اور جواز سن کے جو ہنسنا شروع کیا تو جانے کتنی دیر ہنستی رہی۔ بیٹی سر جھکا کے بیٹھی سنتی رہی۔

"لو پاگل نہ ہو تو... وہ سب ہمیشہ تھوڑی تمہاری ذمہ داری رہیں گے۔ آنے والے وقت میں سب کے گھر آباد ہوتے جائیں گے۔" اماں کیسی متلون مزاج کی تھیں۔ مشکل سے مشکل بات بھی مسکرا کے سنتیں۔ مسئلہ جتنا بھی گمبھیر ہوتا، تھوڑی دیر خاموشی سے سوچنے کے بعد اتنا آسان حل نکال لیتیں کہ عقل حیران رہ جاتی۔ اگر کسی سے کچھ برا بھی ہو جاتا تو سمجھانے کا انداز ایسا دل نشین کہ اگلے بندے کے ذہن و دل کا میلا کپڑا دھل دھلا کے چمک اٹھتا۔

شادی کے دو سال بعد راز کھلا کہ فاخرہ کا شوہر پہلے سے شادی شدہ تھا۔ وہ بھی جب فاخرہ ہالینڈ گئی تو۔

"اماں اس کی بیٹی بھی ہے۔" فون پہ رو، رو کے بتایا۔ "اور اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" ساتھ ہی مشورہ بھی مانگا۔

"صبر... کہنا آسان... عملاً" مشکل، مگر نتیجہ حسب خواہش..." سو فیصد وہ ترتیب کے لحاظ سے ایک جملہ بھی نہیں تھا۔ نہ بیٹی کو پچکارا۔ نہ رونا دھونا بند کرنے جیسی میٹھی ہدایت۔ صرف دس، گیارہ الفاظ... بیٹی پہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور ماں کو دیکھو... قریب بیٹھی پروا نے کلبلا کے سوچا تھا۔

"عنایت کی قسمت میں دو نکاح تھے، سو ہونے ہی تھے۔ دکھ دودھ کی طرح ہوتا ہے، آنسوؤں کا پانی ملاتی جاؤ گی تو بڑھتا جائے گا، پی لو گی تو ختم۔" ماں نے آخری بات کی اور فون بند کر دیا۔

"یہ شخص تمہاری پسند تھا۔ اسے تم ہمارے سامنے لائی تھیں نا۔" ماں نے فاخرہ کو کچھ سمجھایا نہ باپ نے کچھ طعنہ دیا۔ دکھ اب کس منہ سے ہمارے

سامنے روتی ہو۔" جو آخری بات ہونے تک ان سے یہ سب سننے کی توقع کررہی تھی۔ خلاف توقع ماں' باپ کے نرم لہجوں نے اس کی روح تک شانت کردی۔

ماں کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے تمام آنسو پی لیے تھے اور دکھ ہر گزرتے دن کے ساتھ ختم ہوتا چلا گیا۔ اور شاید وہ پروا کی خاموشی کا معمہ بھی حل کرہی لیتے جو زندگی ان سے وفا کرتی۔ دونوں میاں' بیوی کوہاٹ سے واپس آرہے تھے۔ (جہاں اماں کا میکہ تھا۔) وین ایک گہری کھائی میں گر گئی اور کوئی مسافر بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان ہی دنوں فاخرہ پاکستان آئی تو ساتھ اس کی سوتیلی بیٹی بھی تھی۔

"کیا گھر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جہاں کم از کم عورتیں سارا دن گھر میں رہتی ہیں۔" وہ پورا ہفتہ حیران ہوتی رہی تھی اور پھر وہ گاہے بہ گاہے فاخرہ کے ساتھ آنے لگی۔

وہ سادہ مزاج کی خوش اخلاق بچی تھی۔ وہ لوگوں کی برائیاں نہیں ڈھونڈتی تھی' بس اس کی نظران کی اچھائیوں کی متلاشی تھی۔ اس کی سوچ پاکستان کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ وہ ہر بار یہاں کی روایت و اقدار کسی خوب صورت یاد کی طرح دل میں بسا کے لے جاتی تھی۔



ماں' باپ کی اچانک موت کے بعد پروا جیسے محب منزل کی ہی مکین بن چکی تھی۔ اس وقت آئی فرسٹ ائیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

"کب تک یہاں بیٹھی رہوگی۔ تین ماہ ہوچکے' اب تمہیں گھر جانا چاہیے پروا۔" اس دن بھی گوہر' ماں کے ساتھ اسے لینے آیا تھا۔ تو تائی نے مناسب الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ تائی اور تایا کے سمجھانے بجھانے پہ ان کے ساتھ چلی گئی تھی' مگر کچھ دنوں کے بعد ہی وہ شوہر سے الگ گھر میں رہنے کا مطالبہ کرنے لگی۔ جو متحیر سا ہوکے اس خواہش پہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"مگر کیوں..." کافی دیر بعد کچھ بولنے کے قابل ہوا۔ تو صرف اتنا پوچھا۔ "مجھے اتنے مردوں کے ساتھ رہنے کی عادت نہیں۔" وہ اب شوہر سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ سواس نے ہلکے لہجے میں شوہر کے سامنے ایک پہاڑ جیسی بات کی تھی کہ وہ ایک بار پھر سابقہ کیفیت کا شکار ہوا۔

"تم جانتی ہو' بڑے بھائی کی ٹانگ میں شدید نقص کے باعث وہ کوئی کام کاج نہیں کرسکتے۔ زیادہ سے زیادہ آرام کرنا ان کی مجبوری ہے۔ جس طرح اس نقص کی وجہ سے اب اکیلے زندگی جینا بھی ان کی مجبوری ہے۔ میرے تینوں چھوٹے بھائی ابھی پڑھ رہے ہیں۔ میرے ماں' باپ ان سب کا میں اللہ کے بعد واحد سہارا ہوں۔ اس گھر کو چلانا میری ذمہ داری ہے فی الحال... ساغری اے کررہا ہے۔ چند سالوں بعد وہ مجھ سے بھی اچھی پوسٹ پر ہوگا' پھر ہوسکتا ہے' میں تمہاری خواہش پہ سر جھکادوں۔ مگر اس وقت..." اس نے قطعیت سے نفی میں سرہلایا تھا۔ "ناممکن... اگر تمہیں گھر کی ذمہ داری کا مسئلہ ہے تو ایک کام والی اور رکھ لیتے ہیں۔" اس نے دوستانہ انداز میں بات کی اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"میرا مسئلہ ان میں سے کوئی بھی نہیں۔" وہ بے بسی سے جیسے ہار کے بولی تھی۔

"تو پھر..." وہ آستین کے بٹن کھولتے ہوئے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔

"میرا مسئلہ اشہب ہے گوہر! اشہب غفار۔"

گوہر کے سینے پہ دھرے ہاتھ ساکن ہوئے۔ وہ مدھم آواز میں پرت در پرت شوہر کے سامنے خود کو کھولتی چلی گئی تھی کہ اس گھر میں اس نے یہ ایک سال کس طرح آندھیوں کی زد میں رہ کر گزارا ہے' یہ صرف وہی جانتی ہے۔ گوہر کی آنکھوں میں بے یقینی تھی یا بدگمانی' وہ سمجھ نہیں سکی۔ بس اس کی آنکھیں ساکن اور ہاتھ گریبان تو کبھی آستین کے بٹن... کھولنے اور بند کرنے میں مصروف... وہ اس کی بیوی تھی جو کسی دوست کی طرح اسے اپنا رازدار بنارہی تھی۔ وہ اسے

شبہات میں مبتلا نہیں کر رہی تھی۔ وہ اپنے راستے ہموار کر کے اس کی راہیں کھوٹی کر رہی تھی۔ وہ خود اللہ اور شوہر کے سامنے سرخرو ہو کر سامنے بیٹھے شخص کو تاریک کنویں میں دھکا دے چکی تھی۔ وہ اس کے اس گھر سے چلے جانے کے بعد بھی اس تاریک کنویں میں مہینوں ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا۔ بات تو اس نے روح کی کی تھی، جسم کا تو کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ کبھی اس کے ہاتھ میں ننھی سی روشنی بھی چمٹ جاتی تھی۔ مگر یہ تو اس رشتے کی توہین ہے کہ بیوی شوہر سے کہے.... میرا دل.... اف.... وہ پھر سے تاریکی میں بھٹکنے لگتا۔ بات تو دل کی تھی جو شیشے کی مانند ہوتا ہے اور جس میں اللہ رہتا ہے، جس میں عبادت ہوتی ہے۔ وہ لحہ بھر کو پھر سے روشنی کا ہاتھ تھام لیتا۔ وہ کم ظرف مرد ہی نکلا۔ کبھی پلٹ کے محب منزل نہ آیا۔

اس کی ماں اور بھائیوں نے حتیٰ کہ سسر نے بھی کئی چکر لگائے، مگر وہ نہ آیا، جس کا ہاتھ پکڑ کے وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ عورت اس قدر اعلا ظرف کیوں ہے۔ وہ شوہر کا راز جان کر بھی کسی اندھے کنویں کا سفر نہیں کرتی۔ بات روح کی ہو.... دل کی.... یا پھر جسم کی.... مگر مرد.... وہ روشنی کا ہاتھ بھی جھٹک دیتا ہے۔ وہ ستاروں سے آگے کے جہاں بھی زمین کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہے۔ وہ اس عورت کی روح کے اندر بجتی بانسری کے سروں پہ سر دھننے کی بجائے نگاہ بانسری بجانے والے کی انگلیوں پہ کیوں رکھتا ہے؟



ابھی ہم اس وقت میں ہی ہیں جب پروا واپس محب منزل آ گئی تھی۔ اس کی چپ میں کوئی ایک سکھ بھی نہیں تھا۔ وہاں سب جانتے تھے، مگر اس کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سو تایا اور تائی نے اب اپنی نگاہوں سے بھی پوچھ گچھ کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔

کچھ عرصہ تک گوتم بدھ کے آسن لینے کے بعد پروا نے کچن کا کام اپنے سر لے لیا تھا۔ گھر کا باقی کام کاج پہلے ہی ملازمہ کرتی تھی۔ کرکٹ کی شوقین تائی اماں اب ایل سی ڈی کے سامنے ہی ٹکی رہتی تھی۔

حسب معمول موسم وقت کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے کہ ایک شام بنا اطلاع کیے فاخرہ، شوہر اور بیٹی سمیت محب منزل آ گئی۔

"اس کی ماں کو دنیا سے گئے چھ ماہ ہو چکے۔ میں اور عنایت اپنی اپنی جاب پہ چلے جاتے ہیں۔ اسکول سے آنے کے بعد گھر میں بولائی پھرتی ہے۔ اس کی خالہ بلجیم میں ہوتی ہے اور خالہ زاد گھر میں اکیلا.... کچھ بولتی ہی نہیں، سوائے ایک بات کے.... مجھے اب پاکستان میں رہنا ہے۔ ہم اس کا ماہانہ خرچ بھیجا کریں گے۔ اس کی نسبت بھی خالہ زاد سے طے ہے۔" (یعنی مستقبل کی بھی فکر چھوڑیں۔) دوسرے.... چوتھے اور پانچویں دن بھی فاخرہ کسی رٹو طوطے کی طرح یہ سب دہراتی رہی تو چھٹے روز باسط محب کو فاخرہ کی التجا اور پندرہ سالہ عنبر کی معصوم شکل پہ ترس آ ہی گیا۔

"اگر میری بھی بیٹی ہوتی تو بالکل تمہاری طرح ہوتی۔" انہوں نے بچی کی پیشانی چوم کے کہا۔ باسط محب کے فیصلہ سنانے کے بعد ایک ہفتے سے ماش کی طرح اینٹھی خواتین کے دل بھی نرم پڑ گئے۔

"آپ کا یہ احسان بھلانے والا نہیں۔" وقت رخصت عنایت صاحب نے بس ایک جملہ بولنے کی زحمت کی اور پر تکلف انداز میں دو انگلیاں عنبر کے سر پہ ٹکائیں۔

خالہ بس فون پہ ہی بات کرتی تھی اور اس کا خالہ زاد سال میں ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔

پروا کا دیور مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگا لیتا تھا اور اسے سمجھانے کی بھی کوشش کرتا کہ "خطرے کی بو سونگھ لیں بھابی! میری ماں بھائی کے لیے دوبارہ سے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں، اماں کے اندر اب اتنی توانائی نہیں کہ گھر سنبھال سکیں۔ بھائی کو دوسری شادی کی خوشی نہیں، شوق بھی نہیں، بلکہ مجبوری ہے۔" بھابی کا سر جھکا رہتا.... اور دیور کی کھلی آنکھیں اس منفرد نام والی لڑکی کی متلاشی رہتیں۔

اس نے خطرے کی بو سونگھی تھی یا نہیں.... مگر

بہن اور دیور کے وجود سے پھوٹتی دلچسپی کی بو ضرور سونگھ لی تھی۔ ساغر کی آمد پہ اس کا چہرا ہزار رنگ چھلکانے لگتا تھا۔

"جس سے رشتہ تھا جب وہ نہیں آتا تو تم بھی مت آیا کرو۔" اس کا سپاٹ لہجہ اجنبیت سے بھرپور تھا۔

وہ عزت نفس سے عاری نہیں تھا۔ کبھی پلٹ کے محب منزل دوبارہ نہ آیا۔ بعد میں انہوں نے اڑتی پڑتی خبر سنی تھی کہ گوہر کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ پرملال بھی ہوئی۔ اس دن اس نے زندگی کے سود و زیاں کا حساب کیا... تو پتا چلا کہ زیاں صرف اس کے حصے میں آیا تھا۔ اس کی فیلنگز' اس کا کرب جب تک زبان پہ نہیں آیا تھا' انمول تھا' بارش کے پانی کی طرح۔ آسمانوں کو چھوتی ہوا کی طرح... اپنی نادانی میں جب شوہر کے سامنے بھید کھول دیا تھا تو اس کے وہی جذبات شوہر کو آندھیوں میں اڑتے میلے پھولوں کی طرح محسوس ہوئے تھے۔ وہ ایک انتہائی نادان عورت ثابت ہوئی تھی۔



لنڈا نے دونوں کی تربیت ایک جیسی کی تھی پھر فاطمہ میں اس قدر بے باکی کہاں سے آگئی تھی۔ لنڈا نے اس پہ چند دن نظر رکھی اور اس کے معمولات جان کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ ڈرنک کرنے لگی تھی اور وہ ایسی کمپنی کے ساتھ بھی ہوتی جو نشہ بھی کرتے تھے۔ چند روز بعد اس نے یہ سارا قصہ ماجدہ کے سامنے کھولا۔ جسے سن کر اس کی کیفیت بھی لنڈا سے مختلف نہیں تھی۔

"مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی لنڈا۔" مام کی التجا اس نے نرمی سے ٹھکرا دی تھی۔ "میرا دھیان پڑھائی سے ہٹ جائے گا اور حنان صرف چار دن میں ہی اس کی اصلیت سے واقف ہو جائے گا۔ سوچو ہم دونوں کی کیا عزت رہ جائے گی۔" وہ ماجدہ سے مایوس ہونے کے بعد... محسوس کر رہی تھی کہ فاطمہ احساس کمتری کا شکار ہو چکی ہے اور ڈھیر سارا سوچنے کے بعد اس نے فاطمہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

لنڈا کی باتیں سن کر وہ جیسے ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔



"آپی! ذرا بھاگ کے آنا۔ عمران خان نے ایک اور آؤٹ کر دیا ہے۔" چھوٹے بھائی خالد کی پکار پہ وہ دو' دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ گردن سے لپٹا دوپٹا آگے پیچھے پھیلایا... کہ ابا جی بھی میچ دیکھ رہے تھے۔ باقی دس کھلاڑی عمران کو گھیرے ہوئے تھے۔ (کاش ان میں سے ایک میں بھی ہوتی۔) وہ ابھی پھسکڑا مار کے کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔

"ثمینہ ذرا کچن میں جا کے سالن دیکھنا' کہیں جل ہی نہ جائے۔" نماز پڑھتی ماں نے کمرے سے صدا لگائی۔

"ہم بھی تو چھت پہ کپڑے پھیلا کے آئی ہوں اور اب اک نیا کام۔" بڑبڑاتے ہوئے اٹھی۔ "جس دن میچ ہوتا ہے اس دن آپ کو میرا نام خوب یاد رہتا ہے اور شازیہ کا بھول جاتا ہے۔" چھوٹی بہن کو جی بھر کے گھورا... جس نے فوراً" ہونٹ گول مول کر کے اسے چڑایا۔

"میچ کب نہیں ہوتا۔" ماں نے اندر آکر بیٹی اور شوہر پہ ایک جتاتی نگاہ ڈالی... مگر وہاں کسے پروا تھی۔

"لو... ادھر میں فارغ ہو کر بیٹھتی ہوں تم ادھر کھانے یا چائے کا وقفہ ہو جاتا ہے۔" ثمینہ نے لٹکے منہ کے ساتھ شکوہ کیا۔

جوں ہی ٹک ٹک کی آواز قریب آئی۔ ابا مستعدی سے کھڑے ہوئے۔ شازیہ نے آگے بڑھ کر دادی کے ہاتھ سے چھڑی پکڑی اور انہیں ابا کے ساتھ بٹھا دیا۔ ٹی وی پہ پہلا نغمہ نشر ہوا۔

کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں۔

پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا۔

گھر میں بلقیس خانم کی آواز گونجنے لگی۔ میز پہ کھانا چنا جا رہا تھا۔ برتنوں کی کھٹ پٹ' چاولوں کی مہک۔

"حاجی صاحب! کوئی میچ کی خیر خبر سنائیں۔" گلی سے پھل والے نے ہانک لگا کر پوچھا۔ ان دنوں میں ٹی

ٹی وی بیٹھکوں میں چلا کرتے تھے۔

"قیامت بابا! خیر ہی ہوگی۔ اپنے عمران نے چار وکٹیں گرا دی ہیں۔" ابا کی خوش باش آواز دور تک گئی۔

"واہ بھئی واہ! ایسی میٹھی خبر۔ منی بیٹا ذرا اماں جی کے لیے کیلا پکڑ لینا۔" پھل والے کا لہجہ سرشاری سے بھرپور تھا۔ سولہ سالہ منی بھاگ کے گلی میں پہنچی۔ دادی کے چہرے پہ تشکر کا احساس ابھرا۔ پھل والے کو منہ بھر کے دعا دی۔

"ارے نیک بخت! دیکھ لو، ناہید اختر کا نغمہ آرہا ہے۔" شوہر کی پکار میں محبت ہی محبت تھی۔

"میرے روٹھے صنم تجھے میری قسم، نہ جانا دل توڑ کے۔ ہو، ہو نہ جانا دل توڑ کے۔" نیک بخت مسکراتی ہوئی جلوہ افروز ہوئی۔

"سنا ہے میچ میں وقفہ چل رہا ہے۔" نکڑ والی خالہ بھی آن پہنچیں۔ ان کے گھر ٹی وی نہیں تھا۔ سو یہاں آکر نغمے دیکھنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ "کیا دیدہ زیب ساڑھی ہے اور اس پہ من موہنی ناہید اختر کی دلفریب ادائیں۔" وہاں تمام خواتین کھوسی گئی تھیں۔

"بھئی! اب تو اپنے طارق عزیز کو بھی شادی کر لینی چاہیے۔" (نیلام گھر والے)

ثمینہ، دادی کی بات پہ منہ ہی منہ میں خوب ہنسی۔

"ناہید اختر کو دیکھتے ہی انہیں طارق عزیز کیوں یاد آجاتا ہے۔" وہ شازیہ کے کان میں گھسی۔

"اوں۔۔۔ ہنہ۔۔۔" دادی نے کڑی نگاہ سے گھورا۔

"کیا لڑکیاں کان میں گھسر پھسر کرتی بھلی لگتی ہیں۔ آئے گئے کا دھیان رکھا کرو۔" وہ دونوں فوراً" مئودب ہوئیں۔ نغمہ ختم ہوا۔

"اب نور جہاں آئے گی۔" نکڑ والی خالہ نے کہا اور دم سادھ کے بیٹھ گئیں۔

"چلو اچھا ہوا تم بھول گئے۔"

"لو بھئی آگئی نور جہاں۔" آس پڑوس کی بیٹھکوں سے بھی ٹی وی کا والیوم اونچا ہوا۔

"اک بھول ہی تھا میرا پیار او۔۔۔ ساجناں۔"

وہاں ایک ماحول سا بن گیا تھا۔ کیا سادگی تھی، کھانوں کی خوشبو کے ساتھ۔ ہر گھر سے محبت اور امن کی مہک بھی پھوٹ رہی تھی۔

"میں نہ سمجھوگی بانو رے نیناں، دیکھ رہے تھے سپنے۔"

"تائی امی۔۔۔ تائی امی۔۔۔ اٹھیں تو۔۔۔" یہ آواز تو آتشی کی تھی۔ ہڑبڑا کے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"مگر وہ گھر۔۔۔ وہ بہن، بھائی۔۔۔ اور وہ نور جہاں کا نغمہ۔۔۔" ہاتھوں سے آنکھیں مسل کے ادھر ادھر دیکھا۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی تھیں۔ یا پھر خیالوں میں وہ اس زمانے میں پہنچی ہوئی تھیں۔ جو بھی تھا وہ سب فسوں ٹوٹنے کا انہیں ملال سا ہوا۔ کس قدر اچھا وقت تھا۔ آتشی ان کی کھوئی کھوئی طبیعت پہ حیران ہوئی۔

"میچ کے وقفوں میں اب کہاں نغمے گونجتے ہیں، ادھر وقفہ ہوا ادھر پانچ چھ مسٹنڈے پینٹ کوٹ کس کے معصوم کھلاڑیوں کے لتے لینے آجاتے ہیں۔ اوپر سے ہر دوسرے پل خانہ خراب کرنے جیسی بریکنگ نیوز۔۔۔ اچھا بھلا خواب دیکھ رہی تھی۔" وہ پھر سے بڑبڑائیں۔

"اف۔۔۔ تائی چھوڑیں بھی۔۔۔ اور دیکھیں ہمارے کرکٹرز کا وزیراعظم ہاؤس میں کیا شاندار استقبال ہوا ہے۔ آپ کو یہ تقریب دکھانے کے لیے تو اٹھایا ہے۔" تائی کا ملال ایل سی ڈی پہ نظر ڈالتے ہی دھواں بن کے اڑا۔

"جمیلہ ذرا بھاگ کے ایک کپ چائے تو بنالا۔" تائی کی فرمائش پہ شو دیکھتی جمیلہ اچھی خاصی بدمزا ہوئی۔

"میں پہلے پاکستان کا صدر تو دیکھ لوں، پھر ہی یہاں سے ہلوں گی۔" وہ ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔

"پھر تو تجھے لامحدود مدت تک یہاں بیٹھنا پڑے گا۔" اندر آتے محب نے اس کا بے زار چہرہ تپ کے دیکھا۔

تائی نے جمیلہ پہ صدمے بھری نگاہ ڈالی۔ "تو نے اب تک اپنے ملک کا صدر نہیں دیکھا۔"

"پاکستان کا سب سے فارغ انسان۔" آتشی نے اپنی گول' مول سی ناک چڑھائی۔ "ایک تو' تو پہلے ہی ریٹنگ رینگ کے کام کرتی ہے۔ صدر صاحب کو دیکھ کے تجھے اور نیستی چڑھ جاتی ہے۔ جاشاباش' سب کے لیے چائے لے کر آؤ ہم ان کے آنے کی دعا مانگتے ہیں۔" اب ان سب کی کھی کھی شروع ہو چکی تھی۔

جمیلہ منہ بسورتی کھڑی ہوئی۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پہ واپس مڑی۔ "اگر وہ کوئی کام کاج نہیں کرتا تو اس کا روٹی' چولہا کیسے چلتا ہے۔"

"اف بھولی جمیلہ۔" آتشی اور عنبر کی کھی کھی اور بلند ہوئی۔ اب محب وطن جمیلہ کو بتا رہا تھا کہ اس کا چولہا چوکا جلانے کے لیے ہمارے وزیراعظم صاحب کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' جنہیں سن کے جمیلہ کا چہرا یرقان زدہ ہو چکا تھا۔



ایمسٹرڈیم کی وہ سہ پہر اپنے اندر ہلکی سی تمازت سمیٹے ہوئے تھی جو آج بھی اسے بھلی لگ رہی تھی۔ وہ جانے کتنی دیر سے سنگی بینچ پہ بیٹھا تھا اور وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھا۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ اپنا گھر' یہ شہر اور ملک تک چھوڑ کے چلی گئی۔ اس کے اوپر اونچے چھدرے درخت کے چند خشک پتے گرے۔ کیا کوئی باپ اپنی اولاد سے اس قدر دوری بھی بلاجواز برت سکتا ہے۔ اسے عنایت انکل سے یہ شکایت ہمیشہ رہتی تھی اور اکثر وہ اس کا اظہار کر بھی دیتا تو ان کے چہرے پہ ایک ٹھنڈا سا موسم جیسے ٹھہر سا جاتا اور وہ بس پھیکا سا مسکرا کے سر جھکا لیتے تھے۔ اس نے سامنے ایستادہ بلند عمارت کو آج بھی ویسی ہی نگاہوں سے دیکھا۔ جانے وہ سرمئی تھی یا نٹیالی..... وہ آج بھی یہ فرق نہیں جان سکا تھا۔ گول احاطے کے گرد اس بل کھاتے تالاب میں آج بھی سفید بطخیں تیرنا پسند کرتی تھیں۔ اس کے حواسوں کو آج سے آٹھ سال پہلے کے وقت نے دھیرے سے چھوا' جب وہ آخری بار اس کے ساتھ اسی جگہ پہ کھڑا تھا۔ اس دن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ بتائی جانے والی یہ آخری سہ پہر ایمسٹرڈیم میں پھر کبھی سنہرا پن لے کر نہیں اترے گی۔

"کیا آنٹی کے بعد میں اور مما تمہارا دھیان نہیں رکھتے عنبر۔" وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ بینچ چھوڑ کر تالاب کے کنارے تک آئی تھی اور وہ اس کے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ ان دنوں وہ بہت روتی تھی۔ بات بہ بات۔

"خالہ یہاں بہت کم آتی ہیں۔" اس نے سر اٹھائے بنا ایک سچی بات کی تھی۔

"اور میں..... میں تو روز تمہارے گھر جاتا ہوں۔"

"مگر فاخرہ آنٹی کہتی ہیں کہ مجھے تم سے اب یوں نہیں ملنا چاہیے۔" اس نے ایک اور سچی بات کی۔ انس نے سر جھکا کے تالاب کا نیلا پانی دیکھا۔

"انس وہاں بارش کا ہونا ابر رحمت کہا جاتا ہے۔ وہاں عورتیں تمام دن گھر کے مردوں کے لیے کام کرتی ہیں' پھر ان کا انتظار کرتی ہیں۔"

"مگر وہاں عورتیں جاب بھی تو کرتی ہوں گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔

"مگر اس گھر میں کوئی عورت جاب نہیں کرتی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

یادوں کے کئی خوب صورت پل پُر تمازت ہوا نے گرہ سے کھول کر اس کی آنکھوں میں جھونکے تھے۔

"وہاں گندم کی خوشبو روٹی سے پھوٹتی ہے اور وہاں ایک محب وطن بھی ہے۔" اس کی مسکراہٹ میں جگنو چمکے تھے۔

"اچھا!" وہ پورا اس کی طرف گھوما۔

"مگر میں نے تو سنا کہ اسے دنیا سے گئے اک زمانہ ہو گیا۔" انس نے آنکھیں پھیلا کے کہا۔

"ہائے اللہ! خدا نہ کرے۔ وہ تو زندہ ہے اور باسط انکل کا بیٹا ہے۔" اس نے انس پہ گلہ آمیز نگاہ ڈالی۔

"مگر میں نے تو سن رکھا ہے کہ پاکستان میں ایک ہی محب وطن تھا' جس نے وہ ملک بنایا تھا۔"

"ایسا نہیں ہے انس۔ وہاں پہ جب ایک ساتھ بے شمار اذانوں کی آواز ابھرتی ہے تو بہت بھلی لگتی ہے اور

گھر کے تقریباً" تمام افراد نماز کے لیے کام کاج چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر آتشی۔۔۔" وہ خوشی سے چہکی۔

"اچھا چھوڑو بھی۔" وہ ہمیشہ کی طرح پاکستان کے ذکر سے چڑ کے اسے ٹوک گیا۔ "تم یہاں میری زندگی کی سب اچھی چیزیں مجھ سے لے سکتی ہو۔" اس نے فراخدلی سے آفر کی۔

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ وہ سامنے ایکسپو سینٹر بھی میرا۔" انس کا منہ کھلا۔ "اور یہ گول احاطہ بھی۔۔۔"

"مگر یہ دونوں چیزیں میری نہیں ہیں عنبر۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن تم جب کمانے لگو گے تو مجھے خرید کے دے دینا۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تھے اور اس کی پونی ٹیل ایک پنڈولم کی طرح جھولی تھی۔

اس لمحے وہ اس پہ اپنا سب کچھ نثار کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے ایک اور چیز بھی چاہیے انس۔" وہ اس کے قریب ہوئی اور اس کا ہاتھ تھاما۔ "جب تم امیر ترین ہو جاؤ گے تو۔۔۔" وہ کچھ متامل ہوئی۔

"تو۔۔۔؟" اس نے بے صبری سے دہرایا۔

"تو مجھے۔۔۔ تم کیا پاکستان خرید کردے سکو گے؟"

انس کے حلق میں جیسے ایک بھاری پتھر اٹکا تھا۔

اف۔۔۔ اف۔۔۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ کسی راہ گیر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا۔ وہ تمام یادیں اڑ کے ہوا کی مٹھی میں پناہ گزین ہوئیں، اس کی مما کی کال تھی۔

"کیا تم ایکسپو سینٹر کے سامنے گول احاطے میں ہو۔" رسمی حال احوال کے بعد ماں کا سوال حسب معمول تھا۔ جسے سننے کے بعد اس نے گہرا سانس لیا تھا۔ آج اس کا پُرتمازت سانس اک عجب سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سب ہی رنگ اتار کے شہر کا۔

✲ ✲ ✲

"اس گھر میں رہنے والی دونوں خواتین کا ایک صدی تک تو مجھے کوئی ارادہ نہیں لگتا کہ وہ اپنی شادی کے چاول بوریوں سے باہر آنے دیں گی۔ تو اماں میرا ہی کچھ کریں۔" آج اس نے تمام شرم بالائے طاق رکھ کر زبان کھول ہی لی تھی۔ "اب تو تیس سے بھی اوپر جارہا ہوں۔" محب وطن سر جھکائے جیسے کسی جرم کا اعتراف کررہا تھا۔ (وہ شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔)

"ارے کچھ شرم لحاظ کر محب! کنواری لڑکیوں کے ہوتے گھر میں تیری دلہن لے کر آجاؤں۔ ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے۔" تائی سرخ چہرے کے ساتھ جیسے گرج کے بولی تھیں۔

عنبر کا اوپر کا سانس اوپر تو نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کچھ ایسا ہی حال آتشی کا بھی تھا۔

"اس لیے تو تیری خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی سے تیری نسبت طے کی ہے۔ جب تک لڑکیاں اپنے گھر کی ہوں گی تب تک وہ بھی چودہ جماعتیں پڑھ چکی ہو گی۔"

عنبر کی آنکھوں میں نمی اتری۔ "میں ان کی کون ہوں۔" دل پہ ایک کھردرا کانٹوں بھرا ہاتھ سا پڑا کہ تائی ہمیشہ لفظ لڑکیاں استعمال کرتی تھی۔ فاخرہ کی سوتیلی بیٹی جسے یہاں سگوں سے بڑھ کر چاہا جارہا تھا۔ بھلا ایسا کہاں ہوتا تھا اور کسی دوسرے ملک میں تو بالکل بھی نہیں۔ اس قدر باروایت لوگ اور اس قدر اقدار پسندی کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشیاں تک پس پشت۔ اس کے اعصاب پہ منوں برف گری۔ آتشی تو ان کی اپنی تھی، مگر وہ کس حساب سے انہیں کسی آزمائش میں ڈال کے بیٹھی تھی۔ تائی کی بات نے اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

"اور پھر تم کون سا ٹک کر کہیں کام کرتے ہو۔ بلکہ دیگر محب وطنوں کی طرح اس ملک پہ حکومت کرنے کے خواب ہی دیکھتے ہو۔" تائی نے بیٹے کی خواہش سن کے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔

"فکر مت کرو محب۔۔۔ میں اب اس گھر میں زیادہ دیر ٹکنے والی نہیں۔" وہ بے فکری سے بولی اور آم

چومنے کا سلسلہ دوبارہ بحال کیا۔ "اب زخمی بلبل کی طرح تو مت گھورو۔" اسے اپنی جانب گھورتا دیکھ کر وہ ترنخ کے بولی۔ "بلکہ چلو میرے ساتھ ٹیرس پہ آج سبز بزمی کے جامنوں کا ذائقہ پھر سے چکھتے ہیں۔" وہ ٹوکری پرے کھسکا کر نہ صرف خود اٹھی' بلکہ اسے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گئی۔

عنبر اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ تو کیا واقعی آتشی نے کوئی فیصلہ کرلیا تھا۔

رات دیر تک ہونے والی بارش میں وہ بھیگتی رہی تھی اور بارش کی بوندوں سے پھوٹتی اس کے آنسوؤں کی مہک عنبر نے خود محسوس کی تھی۔

انس اور اس کی محبت کسی بھی بل کھاتی ڈگر پہ نہیں چل رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک کو پسپائی اختیار کرنا تھی اور منزل سامنے تھی' مگر آتشی... بہن اور بہنوئی کی جامد خاموشی کے باوجود ساغر اور اس کی محبت حقیقت تو تھی نا۔ آگے کیونکر بڑھا جائے اور کس بنا پہ۔

اب ایک ہی نقطے پہ سوچتے دو خاندان شاید قیامت تک کے لیے پیچھے ہٹ چکے تھے۔

پروا کا سسر فوت ہوا تو وہ ان کے ساتھ گئی تھی۔ ایک امید سی بندھی تھی کہ شاید اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے اور وہاں سے آتے وقت خیال سا گزرا تھا کہ کیا خبر گوہر بھائی جاتی بیوی کا ہاتھ پکڑ کے روک لیں' لیکن وہ ایک ٹھنڈی سی نظر ڈال کے راہ سے ہٹ گئے تھے۔ اس دن پروا نے سسرال میں سارا وقت گوہر کی دوسری بیوی کے ساتھ گزارا تھا اور عنبر سمیت وہاں موجود تمام خواتین کی آنکھوں میں حیرت کا ایک بھرا ہوا سمندر تھا۔ اس دن عنبر کو محسوس ہوا تھا کہ اس نے پروا کے گونگے راز کو بولتے دیکھ لیا تھا۔ بھید کا کوئی سرا بصارت کے پردے پہ ہیولہ نما سا لہرایا تھا۔

دروازے کے سامنے کافی رش تھا تو محب گاڑی ذرا فاصلے پہ لیے کھڑا تھا۔ آگے تائی' پیچھے عنبر اور ان دونوں کے پیچھے پروا تھی۔ اس کی چال میں واضح لنگڑاہٹ تھی۔ وہ ایک پاؤں پہ زور دے کے چلتا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کے ٹھٹکا تھا۔ عنبر نے اس کی حیران پھیلی آنکھوں میں ایک ساتھ چاروں موسم گھٹتے دیکھے تھے۔ وہ رک چکا تھا۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی' لمحہ بھر کو ہی سہی مگر وہ کیوں ٹھہرا تھا' اس کی نظروں میں بے قراری تیر رہی تھی۔ پگھل رہی تھی' جیسے فریز کی ہوئی چیز کمی چھوڑ کے پگھلتی ہے۔ وہ اس کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ عنبر نے یوں ہی پیچھے مڑ کے دیکھا اور وہ ششدر رہ گئی۔

برسوں کی خاموشی پروا کی آنکھوں میں ترنخ سی گئی تھی۔ اس سے ان متحیر آنکھوں میں ایک گونگا راز سرگوشی کررہا تھا۔ ہجوم جوں ہی چھٹا' وہ آگے بڑھ آئی تھیں' مگر وہ شخص کتنی دیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔ عنبر نے اسے بیک ویو مرر میں اوجھل ہونے تک دیکھا تھا اور دیکھتی تو وہ بھی رہی تھی جو پانی کی بوند کی صورت اس کے ساتھ سمٹ کے بیٹھی تھی۔



لنڈا کی باتیں سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

"میں... اور ماجدہ کی زندگی پہ رشک کروں؟" وہ تنفر سے ہنسی اور انگلی سینے پہ جما کے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "وہ ایک قید خانے میں رہ رہی ہے مام!" وہ تیز تنفس کے ساتھ بولی۔

آج کل اس کی ڈریسنگ بھی قابل اعتراض ہوتی تھی۔ اس کے برعکس لنڈا گھٹنوں کو چھوتا اسکرٹ پہنتی تھی۔

"تمہارے دین میں یہی قید خانہ اور ایک باکردار شوہر عزت کا سمبل ہوتا ہے فاطمہ! اور تم اسے قید خانہ کہہ رہی ہو۔"

"تو کس نے کہا تھا ہمیں اس دین سے روشناس کراؤ۔" وہ اس کی بات کاٹ کے ترنت بولی تھی کہ لنڈا کے خنک وجود میں سناٹا چھا گیا۔

"میں زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں اور جو میں چاہتی ہوں وہ میں اپنے طریقے سے حاصل کروں گی' نہ کہ آپ کے بتائے ہوئے راستوں پہ چل کے۔" وہ لنڈا کے کانوں میں آگ جھونک کے دوبارہ باہر جانے لگی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر۔۔۔" یہ چار لفظ اس قدر سرد لہجے میں کہے گئے تھے' وہ آگے نہ بڑھ سکی۔

"آج سے میرا نام فاطمہ ہوا اور تمہارا۔" وہ مڑی' وہ چونکی کہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ "میں نے تم دونوں بہنوں کے نام بہترین ناموں سے چن کر رکھے تھے۔ جنہیں لیتے ہوئے نگاہیں مؤدب اور زبان مغرور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ محض دنیاوی زندگی میں لذت ڈھونڈنا پسند کرتے ہیں' پھر وہ اس نام کا غرور کھو دیتے ہیں۔ جب تم روز حشر بھی اس نام سے پکاری جاؤ گی تو تمہارا سر غرور سے اٹھا ہوا ہو گا اور چہرہ چمک رہا ہو گا۔" لنڈا بہت انوکھے انداز سے مسکرائی۔

پہلے تو وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کیا۔ پھر ہنسی نے قہقہوں کی شکل اختیار کی۔ لنڈا کا چہرا اس کی اس حرکت سے تاریک ہوا۔ "میں تمہیں دودھ کا یا خون کا واسطہ دے کر نہیں روک سکتی۔ اس لیے میں تمہیں تمہارے نام کا واسطہ دے کر روکنا چاہتی ہوں' اور اگر تباہی کا راستہ چن رہی ہو تو پھر تمہیں بنا اس نام کے یہاں سے جانا ہو گا۔" لنڈا کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں بے بسی تھی۔

وہ دو قدم آگے بڑھی لنڈا کا کندھا تھپتھپایا۔ "تم پانی پیو اور آرام کرو۔" اس کی آنکھوں میں باغیانہ چمک تھی۔ وہ اسے گم صم چھوڑ کے چلی گئی۔ جانے پھر وہ کہاں گئی۔ برسوں بعد لوٹی تو بالکل گم صم تھی۔ بالکل اسی کیفیت میں۔ جس میں وہ لنڈا کو چھوڑ کے گئی تھی۔ مگر آج اس کا استقبال گھر کی وحشتوں اور خاموشیوں نے کیا تھا۔ لنڈا نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پھر وہ خود کو فاطمہ کہلوانا پسند کرتی تھی۔ چھ ماہ پہلے وہ بیمار ہو گئی تھی۔ ساجدہ نے اس کی بہت خدمت کی۔ اس نے ساجدہ کے گھر میں ہی دم توڑا تھا۔ اس نے یہ گھر اس لیے نہیں بیچا تھا کہ ایک دن تمہیں یہاں آنا تھا۔" اس کی بڑوسن شلٹ نے تمام باتوں کے بعد ایک خط اس کی طرف بڑھایا۔

"یہاں سے روانگی کے وقت لنڈا نے دیا تھا۔"



"آپ جس شخص سے آتشی کا رشتہ طے کرنے لگی ہیں' کیا وہ ساغر سے اچھا ہو سکتا ہے۔" محب کی آواز میں شکوہ تھا۔ دکھ تھا' اذیت تھی۔ ساغر اس کا نہ صرف ہم عمر تھا' بلکہ اس کا بہت اچھا دوست بھی تھا۔ وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

"یہ سب اس کی رضامندی سے ہو رہا ہے۔ اس نے ہاں کی ہے تو بات آگے بڑھی ہے' ورنہ اب تک۔۔۔" وہ لب کچل کے خاموش ہوئی۔ اور دونوں ہاتھوں پہ سر گرا کے بیٹھ گئی۔

"سوچ لو بیٹا! دل کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ آتشی کے وجود سے یہ رنگ اڑ جائے گا اور باقی کی زندگی وہ کیا کرے گی۔" تائی کی آواز اداسی کے بھنور میں الجھی ہوئی تھی۔ "پھر رنگریز بھی بچھڑ جاتے ہیں۔ ہوا صرف ہوا رہ جاتی ہے' ٹھنڈی اور تپش زدہ۔۔۔ ہوا سے خوشبو کشید کرنے والے زمانے پھر سانس نہیں لیتے' وہ مہک چھوٹ جاتی ہے۔"

"میں یہ سب جانتی ہوں تائی امی!" وہ کہہ نہیں سکی۔ مگر سر ایک جھٹکے سے اٹھا کے انہیں دیکھا ضرور تھا۔ اور بولنا بھی ضروری تھا۔

"دنیا کیا سوچے گی' بڑی بہن کو گھر بسانا تو نہ آیا' برسوں سے میکے میں بیٹھی ہے اور اب چھوٹی کو اسی گھر میں کون سے خوشیوں کے نئے جہان دریافت کرنے بھیج دیا ہے۔" اس کے وجود میں جیسے آگ کا جنگل اگ آیا تھا' اپنا ہی کہا ہر لفظ اک شعلے کی مانند جسم سلگا رہا تھا۔

عنبر جو تائی سے سوئیٹر بننا سیکھ رہی تھی۔ کتنے ہی دانے سلائی سے باہر نکلے۔ دل بے طرح دھڑکا۔ ابھی تائی کی آواز ابھرے گی' محب کی یا پھر اندر آتے تایا جی کی تو۔۔۔

"بسا لیا ہوتا نا۔۔۔ کیوں نہ بسایا۔۔۔ ساغر وہاں سی اے کے بعد دبئی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے عہدے پہ تھا۔ اتنا اچھا رشتہ تو آج ہاتھ سے نہ جاتا۔"

عنبر کے چہرے پہ ہوائیاں اڑیں۔ کتنے پل گزر گئے وہاں ایک جامد خاموشی کا راج تھا۔ وہ اس قدر وضع دار

لوگ تھے کہ کبھی طعنہ نہ دیا۔ (طعنہ دینے والوں کے لیے بربادی جو ہے۔) باوقار..... دین کی سمجھ بوجھ سے بہرہ ور..... اسلام میں جبر نہیں۔ کوئی ملنے ملانے والا صلح کے لیے مشورہ دیتا تو تایا کا جواب سن کر نرم پڑ جاتا۔

"پھر دوسری شادی تو گوہر نے کی ہے۔ پروا نے آج تک خلع کے متعلق بھی نہیں سوچا۔ بیٹی کیا انسانیت کے دائرے سے باہر ہے۔ عزت نفس اس کے لیے نہیں۔ شوہر سمجھے نہ سمجھے۔ ریوڑ کی طرح سسرالی دہلیز سے باندھ دو۔"

تایا جی کیسے پروا کے محافظ بن جاتے تھے۔ کیا دنیا میں ایسا کہیں ہوتا ہے۔ یہ ہے پاکستانی معاشرہ اور پاکستان میں صرف محب منزل میں ہی تو زندگی کا یہ رخ نہیں ہوگا۔ کئی خاندان اس طرح کی مثبت سوچ کے مالک ہوں گے جو گھر واپس آئی بیٹی کی عزت نفس پہ کوڑے نہیں برساتے ہوں گے۔ ان کا مان' ان کی ڈھال ہوں گے۔ وہ یہاں کی ہر اچھی بات انس سے شیئر کرتی تھی۔ اکثر وہ خاموشی سے سنتا رہتا' مگر کبھی جرح پہ بھی اتر آتا۔ جیسے کہ آج.....

"مگر آتشی نے کیوں ہاں کہہ دی۔" وہ بھی سن کے پریشان ہو گیا تھا۔

"تو پھر کیا کرے۔ یہ معاملہ آگے دیوار اور پیچھے آگ جیسا ہے۔" عنبر کی باتوں سے اب بردباری جھلکتی تھی۔

✡ ✡ ✡

ہوا کی باس جیسا تھا۔ کرن کی آنچ جیسا تھا سنہری دھوپ جیسا تھا' خیال یار جیسا تھا وہ جیسا بھی تھا آتشی نے اس سے کبھی ظاہرا" یا چھپ کر ملاقاتیں نہیں کی تھیں۔ نہ ہی رات' رات بھر وہ اس سے فون پہ گپیں ہانکتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ کتھئی تھا یا بھورا۔ اسے یہ تک یاد نہیں تھا۔ وہ باتونی تھا یا کم گو۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ رنگ' موسم' دھوپ' چھاؤں میں سے اس کی پسند کیا تھی' وہ اس بھید سے بھی بے خبر تھی۔ مگر وہ ہمیشہ اس کی یاد میں رہا۔ دل نے ہمیشہ اسے محسوس کیا اور وہ اس کی زندگی میں بھی شامل ہونا چاہتی تھی' مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟

کبھی عید' بقرعید..... اس کی برتھ ڈے یا نئے سال کے حوالے سے وہ چند خوب صورت الفاظ اسے میسج ضرور کرتا تھا۔ تو وہ بھی جوابا" سیم ٹو یو جیسے تین لفظ سینڈ کر دیتی تھی۔ وہ اس کی عزت کرتا تھا' اگر محب منزل سے امید کا سورج کبھی ابھرنے کا امکان ہوتا تو وہ جون کی دھوپ میں بھی ننگے پاؤں چلا آتا۔ نہ کبھی وہ دن آیا' نہ کبھی اس نے پیش رفت کی۔ مگر ساغر کے اندر پنپنے والی محبت کی خوشبو اس کا اپنا گھرانا بھی محسوس کرتا تھا۔ گوہر اور پروا کی زبان پہ لگے قفل کی چابیاں کھوجنے کی کوشش دونوں خاندانوں نے بس ایک حد تک کی تھی اور پھر جیسے تم اپنے گھر خوش ہم اپنے.....

آتشی کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ ایک جان لیوا سی بے چینی وجود کے اندر سرائیت کر گئی تھی۔ عنبر شاید انس سے بات کر رہی تھی۔ اس نے تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کھولی' آج بہت حبس تھا۔ مسز رمزی آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ عنبر اور اسے ہوا کی دوش پہ پرانی موسیقی اسی گھر سے سننا نصیب ہوتی تھی۔

"یہ آسمان' یہ بادل' یہ روشنی' یہ ہوا.....

"ہر ایک چیز ہے اپنی جگہ ٹھکانے پہ....."

یہ آواز یقینا" رفیع کی تھی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دونوں ہنس ہنس کے دہری ہوتیں۔ (اچھا تو پرانے وقتوں میں ایسی شاعری ہوتی تھی۔) مگر آج یہ گیت دل کو چھو رہا تھا۔

"تو پاس ہو کے نہ ہو' پھر بھی تو مقابل ہے۔"

"تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے۔"

مگر وہ تو دبے پاؤں اس کی زندگی سے نکل رہا تھا۔ کیا تھا اگر آپا میری خاطر گوہر بھائی سے صلح کر لیتیں۔ اس نے بے تحاشا بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑا۔

نیچے انار کے جھنڈ کے پاس کھڑے محب وطن نے

اسے زخمی نگاہ سے گھورا تھا۔ وہ فون پہ کسی سے بات کررہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ محب کس قسم کی حماقت کا مرتکب ہورہا تھا۔ آج کل بے کلی اور بے قراری محب منزل میں برستے ساون میں بھی رقص کرتی نظر آتی تھی۔



"میری بیٹی!"

"میں نے اپنی پچھلی زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں کبھی زندگی میں اپنا مذہب تبدیل کروں گی' میرا دل کہتا تھا کہ تم دونوں کا تعلق مسلم گھرانے سے ہے۔ مجھے یہ حق نہیں تھا کہ میں تمہاری شناخت' تمہارا مذہب' تم لوگوں سے چھین لیتی۔ یہ انسانیت کی توہین تھی' میں لنڈا جو انسانیت کا راگ الاپتی تھی' پرچار کرتی تھی اور میں نے بعد میں جانا کہ اس مذہب میں تو پرچار ہی انسانیت اور اخلاقیات کا ہے۔ ہاں تو جب تم دونوں میرے پاس آئیں تو سب سے پہلے مشکل مرحلہ تم دونوں کے ناموں کا تھا اور میں اس دن زندگی میں پہلی بار اسلامک سینٹر گئی۔ میرے اندر ایک جھجک تھی' میں اندر جاکے دروازے کے پاس ہی رک گئی۔ سامنے بیٹھا وہ شخص مجھے دیکھ کے مسکرایا۔

"آگے آؤ۔۔۔ یہ دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"مجھے دو نام بتائیے جو اسلام میں سب سے خاص اور معتبر خواتین کے تھے۔ پھر مجھے ان ناموں کے معنی و مطلب بھی بتائیے۔" میری پوری بات سن کے وہ دوبارہ مسکرایا۔ پھر وہ مجھ پہ ان دو ناموں کی بابت سب کچھ واضح کرتا گیا اور میں پرسکون ہوتی گئی۔

"جب یہ بولنا شروع کریں تو انہیں یہ پڑھایا کرنا۔ ہم اسے کلمہ کہتے ہیں۔" اس نے مجھے کاغذ پہ کچھ لکھ کے دیا۔

"آپ ایک بار پڑھیں۔" میں نے درخواست کی۔ وہ پڑھتا گیا۔ میں ساتھ ساتھ دہراتی گئی' نہ کچھ اور ہدایت' نہ کوئی مزید مشورہ۔ کیا یہ مذہب اس قدر آسان ہے' وہاں سے اٹھتے وقت میں حیران تھی۔ جب تم دونوں تین سال کی ہوئیں تو میں اسی مفتی صاحب کی ہدایت کے مطابق تم دونوں کو دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے اسلامک سینٹر لے جانے لگی تھی۔ میں نے وہاں اللہ کی آخری کتاب ہدایت کو پہلے عربی میں سنا۔ پھر میں نے تم دونوں کے ساتھ اسے باترجمہ سنا' پھر میں نے اسے تم دونوں کے ساتھ ہی تفہیم و تفسیر سے سنا۔ دنیا کے کسی اور مذہب میں کیا اس قدر آسانیاں ہیں' کیا اس قدر ایک معاشرتی زندگی کا مکمل نظام ہے۔ محرم رشتوں کا احترام' نامحرم رشتوں سے فاصلہ برتنا۔ ہر رشتے میں عورت کا تقدس۔۔۔ انصاف کا مکمل نمونہ کہ کوئی بھی انسان دنیا میں دھتکارا نہ جائے۔ اس قدر چھوٹ کہ ایک بار توبہ کرلو۔ سب معاف۔ میں آہستہ آہستہ اس مذہب کی گرویدہ ہوتی جارہی تھی۔ شیطان کا ذکر بھی اسی کتاب میں تھا کہ وہ صریحاً" انسان کا دشمن ہے۔ شیطان کا چہرا' اس کا کردار' اس کا کام سیدھی راہ سے بھٹکانا یہ ہمیں ہمارے اللہ نے ہی بتایا ہے۔ کیا شیطان ہم سے گفتگو کرتا ہے۔ کیا کرسکتا ہے۔ کبھی کرپائے گا' نہیں' ناممکن' مگر مالک کائنات' ہم سے ہمکلام ہے۔ بس وہ کتاب ہدایت اٹھاؤ اور اسے پڑھو' وہ ہم سے مخاطب ہے۔" اے بندے" اف۔۔۔ کیا یہ بات رونگٹے کھڑے کرنے والی نہیں۔ جو اس ساتویں آسمان پہ بیٹھا ہے اور ہم سے مخاطب ہے۔" اے میرے بندے" کہیں کچھ فاصلہ ہے۔ مانگ جو ہم سے چاہیے۔ عزت' دولت' شہرت' دین' دنیا' ہدایت' ہاں ہدایت' شرط مانگنا ہے' یعنی چوائس' ماجدہ نے اللہ سے ہدایت مانگی۔ اسے عزت' دولت' شہرت' دین دنیا' سب مل گیا' یہ اس کی چوائس تھی۔ میں اب فاطمہ ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ میں حیران ہوتی ہوں اور میں حیران ہوں۔ کہ اس کتاب ہدایت کو باترجمہ پڑھنے والے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس پہ اتاری گئی آخری کتاب ہدایت پہ فخر کرنے والے۔ اپنے نبی کی شان میں بے ادبی کرنے والوں کی جان لینے والے اور اپنی جان دینے والے۔ اخلاقیات کے

دائرے سے اور انسانیت کے دائرے سے کیوں کر باہر ہو جاتے ہیں کہ اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی دو الفاظ کے اندر پورا اسلام سمیٹ دیا ہے۔ عبادت کے لیے کیا فرشتے کم تھے۔ انسان کیسے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے زندگی مشکل کر دیتا ہے' جیسے تم نے اپنے اور میرے ساتھ کیا۔" وہ خط اب آدھا بھیگ چکا تھا۔

"وہ کیوں کہ شرابی اور زانی ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں میری بیٹی۔ بات تربیت کی ہے۔ نہ تعلیم کی ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کہتا ہے مجھ سے مانگ تو بات ہدایت مانگنے کی بات ہے۔ بات چوائس کی ہے۔ میں نے تم دونوں کی تعلیم و تربیت ایک جیسی اور ایک جیسے ماحول میں کی تھی تو پھر بات چوائس پہ ختم ہوئی۔

تمہارے لیے دعاگو (فاطمہ)

✡ ✡ ✡

آتشی کے کارڈ تک چھپ کے آچکے تھے۔ تائی اور پروا کے دن شاپنگ کرتے تمام ہونے لگے تھے۔ اور تائی کا جو وقت گھر پہ گزرتا تو اپنے جہیز کی چیزوں سے بیڈ شیٹس' کشن اور تکیوں کے غلاف پیتل کے برتن وہ ان میں سب سے عمدہ چیزیں کھنگال کر ایک طرف کرتی جاتیں اور ان چیزوں کو چھو' چھو کے آتشی کس قدر خوش ہوتی تھی اور دکھ اس کے دل میں لوٹ پوٹ ہوتا تھا۔

"جب خود کو اس کی رضا کے سپرد کر دیا ہے تو آنسو بہانا اب بے ایمانی ہے۔" وہ عنبر کی نم نگاہوں کے آگے ہاتھ لہرا کے کہتی۔

اس مرتبہ محب منزل کو سفید رنگ میں رنگا جارہا تھا۔ "مہندی کا فنکشن گھر پہ ہی ہوگا۔" تایا کے فیصلے کے بعد آج وہ اور عنبر' پروا کے ساتھ مل کے صحن کے جھاڑ جھنکار کی صفائی کر رہی تھیں۔

"ارے یہ کیا... یہاں تو بلبل گھونسلہ بنا رہی تھی۔" عنبر نے بے یقینی سے دو گھنی شاخوں پہ اڑسے چند تنکے دیکھے۔ "مطلب بلبل یہاں سے کہیں اور کوچ کر چکی تھی۔" عنبر اداس ہوئی۔ "مگر اسے یہاں کیا مسئلہ تھا؟" پروا نے ان شاخوں پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

"وہ مغرور بلبل اپنے سفید پیراہن پہ کیا کم اتراتی تھی۔" آتشی جھاڑو جمیلہ کے سامنے پھینک کے شہتوت کے پرانے درخت کو اب تک رہی تھی۔

"تو ہم کون سا اس کے سفید پر سرخ... زرد یا پھر آتشیں رنگ میں رنگنے لگے تھے۔" اس کی بات عنبر کے ذرا جو پلے پڑی ہو۔ وہ گردن اٹھائے ابھی تک خالی شاخوں پہ نگاہ ٹکائے اداس تھی۔ پروا کا دل الہامی حالت میں دھڑکا... کیونکہ اب... اس نے شاید کوئی موٹا شہتوت تاڑ لیا تھا۔ پروا نے سانس روک لی... اس کا غرور مٹی میں ملنے والا تھا کہ آتشی بھی تو رنگ چھوڑنے والی تھی۔ اس نے شہتوت توڑا ضرور' مگر عنبر کی طرف اچھال کے اندر بھاگ گئی۔ عنبر پتھر ہوئی اور پروا کے چہرے پہ زرد' جامنی' کالا ایک ساتھ کئی رنگ جم گئے تھے۔

پروا برسوں پہلے پربت بن گئی تھی' مگر کیوں... وہ جانتی تھی یا وہ جانتا تھا۔ اللہ پھر اس کا خاوند... مگر چڑیا جیسی آتشی کے پر رنگ کیوں جھاڑنے لگے تھے' وجہ وہ سب جانتے تھے۔

بسا اوقات وجہ کا سمجھ میں آنا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔

✡ ✡ ✡

وہ کافی کشادہ' مگر مصروف بازار تھا' جس کے دونوں اطراف دکانیں بھی کافی کشادہ تھیں۔ جن میں زیادہ تر دکانیں زیورات کی تھیں۔ آج محب وطن اسے شادی کا گفٹ دلانے لایا تھا۔ اس نے کہا اور وہ تیار ہو گئی' نہ جرح... نہ سوال... اب اس نے زندگی سے میری' میری خارج کر دیا تھا۔

"اب کچھ لے کے بھی دو یا پھر یوں ہی مجھے گھماتے رہو گے۔" کتنی دیر کے مٹرگشت کے بعد وہ جھنجلا کے بولی تھی۔

"آتش! اگر میں تمہارے سامنے ایک چوائس رکھوں تو..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کے اسے بغور دیکھا۔

"اس کے لیے ہمیں دکان کے اندر تو جانا ہو گا نا۔" اس نے قریبی دکان کا شیشے کا دروازہ دھکیلنا چاہا۔

محب نے اس کا بازو پکڑ کے جیسے اندر جانے سے اسے باز رکھا۔ یہ ایک چوک تھا اور یہاں قدرے سکون تھا۔ وہ رکا۔

"اگر یہاں ساغر آجائے؟" آتش کے دل نے کئی دھڑکنیں مس کیں۔ "اور وہ تمہیں کہے کہ میرے ساتھ چلو۔" اس کا دل تڑپ کے کٹ کے دھڑکا۔ "تو تمہاری چوائس کیا ہو گی؟"

وہ ہنسی اور اس نے محب کو غیر سنجیدگی سے دیکھا... مگر محب سنجیدہ تھا۔

"میں تمہارا بھائی ہوں آتش... کیا میں تمہارا نکاح پڑھوا کر اس کے ساتھ نہیں کر سکتا۔" ابھی تک محب کے چہرے پہ وہی تلخ و ترش سنجیدگی تھی۔ آتش کے جسم سے جان جیسے نکلنے لگی تھی۔ وہ ٹھہر گئی، پھر اس نے محب کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جو محبت ہوتی ہے، اس کی چوائس کبھی ذلت نہیں ہو سکتی محب۔" وہ شاہانہ انداز سے مسکرائی۔ "اور ساغر کا جواب بھی یہ ہی ہو گا۔" وہ بے نیازی سے کہتی اس سے دو قدم آگے بڑھی۔

کل وہ سن چکا تھا۔ اس نے یہ چوائس اس کے سامنے بھی رکھی تھی اور اس کا جواب بھی یہ ہی تھا۔

"پھر جو گھر سے بھاگ کے شادیاں کرتے ہیں، کیا نہیں محبت نہیں ہوتی؟" اس نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں۔" ساغر نے اسے جیسے دکھ سے دیکھا تھا۔ "ان میں انسانیت نہیں ہوتی۔ وہ اخلاقی پستی کا شکار ہوتے ہیں اور ہمارا ان سے نہ مقابلہ ہے، نہ کچھ لینا دینا ہے۔ اخلاقی عروج اور اخلاقی زوال یہ دو راستے ٹرین کی پٹڑیوں کی طرح ساتھ، ساتھ چلتے ہیں، بات صرف چوائس کی ہے۔" وہ پورے وقار کے ساتھ مسکرایا۔

اس کے وجیہہ چہرے کی مسکراہٹ میں اخلاقی عروج... عروج پہ تھا۔



"محب! اگر تمہاری جیب خالی تھی تو پھر یہاں لانے کا مقصد۔" وہ اس کے ساتھ چھوٹے قدموں سے چلتی اس مصروف بازار کے وسط میں ایک جدید اور مہنگے ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ساون کے بادل یوں گھر، گھر کے آرہے تھے کہ شام سے قبل ہی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ باہر کی نسبت وہ ریسٹورنٹ اندر سے زیادہ فرنشڈ اور خوب صورت تھا۔ زرد فانوسوں کی روشنی ماحول کو جگمگا رہی تھی۔ محب اسے نسبتاً" کونے والی میز کی طرف لے آیا۔ اس نے اطراف میں اچٹتی سی نگاہ دوڑائی اور پرس میز پہ رکھا اور خود پورے اعتماد سے کرسی پہ پھیل کے بیٹھی۔

"ویسے یہ جگہ ڈیٹ مارنے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔" وہ سامنے بیٹھے محب کو دیکھ کے مسکرائی۔

محب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور ساتھ ہی اٹھا۔ "میں تمہارے لیے کچھ لے آتا ہوں۔"

اس نے مڑ کے محب کو دیکھنے کے بجائے اپنا پرس چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ "اس لڑکے کا کچھ پتا نہیں، ہو سکتا ہے، بل بھی مجھے ہی دینا پڑے۔" اس نے پرس کھولا۔ اندر کچھ نوٹ تھے، وہ مطمئن ہوئی۔ کوئی آہستہ سے اس کے مقابل بیٹھا۔ وہ خوشبو محب کے پرفیوم کی نہیں تھی۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا، وہ چکرا کے رہ گئی۔

اف... یہ محب، اسے کم از کم یہاں پانی تو رکھ کے جانا چاہیے تھا نا۔ تاکہ اس صحرائی پوزیشن میں بندہ اپنے سوکھے حلق اور خشک ہونٹوں کو ہی تر کر سکتا۔

پورے پانچ سالوں بعد آتش نے اسے دیکھا تھا، وہ بھی اک نظر... اور اب نظریں گود میں دھرے اپنے ہی ہاتھوں پہ جمی تھیں۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ یہ میری ہتھیلی کی پشت پہ تل کب پھوٹا اور شاید میں کمزور ہو گئی ہوں۔ ہاتھوں پہ نیلی رگیں اب نظر آنے لگی ہیں اور میرے ہاتھ پہ یہ... ابھی تو ہاتھوں پہ ریسرچ شروع

ہوئی تھی۔

"آتش!" کسی نے بے حد نرم اور بھاری آواز میں پکارا۔

گھبرا کے سر اٹھایا' دوسری نظر سامنے پڑی۔ پھر ادھر ادھر' کون آتش' سر بے طرح گھوم رہا تھا۔ اب ایسی بھی بدحواسی کیا۔ پتا نہیں اس کا نام ساغر تھا۔ اس کی آنکھیں یا پھر اس کا وجود۔۔۔ آج ساغر سے سامنا ہوگا۔ جو پتا ہوتا تو بلبل کے چھوڑے دو' تین تنکے ہی ساتھ لے آتی۔ (ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہی بہت) مسز بزمی نے کیسے کیسے پرانے گیت رٹوا دیے تھے۔

"گو یہ کوئی مہذب طریقہ نہیں۔" وہ دوبارہ ہم کلام ہوا۔ (کسی کو سامنے بٹھا کے یوں ٹکٹکی باندھ کے دیکھنا واقعی) اس نے دل تھام کے سوچا۔ "مگر میں آخری بار تم سے ملنا چاہتا تھا۔" اس کا نپا تلا لہجہ چشم کی اوس جیسا تھا جو دلوں میں ہجر ہونے سے پھوٹتی تھی۔ آخری بار تو دنیا سے جانے والوں کا دیدار کیا جاتا ہے۔ باقی تو کچھ بھی آخری نہیں۔ وہ سوچ کے رہ گئی۔ اور جی کڑا کر کے اسے دوبارہ دیکھنا چاہا۔

یہ تو ناانصافی ہوئی' ادھر ادھر بھی تو دیکھو' تاکہ میں بھی تمہیں دیکھ سکوں۔ نظر اٹھاتے ہی جھک گئی۔

"کسی ایک ہی چہرے کا اچھا لگنا وہ بھی سالوں تک یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور عقل اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔" وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ نگاہ میز پہ یا اس کے ہاتھوں پہ ٹکا کر۔ اس کی آنکھیں ہلکی سیاہ تھیں۔ وہ بات کرتے ہوئے بھی نظر کا دھوکا لگ رہا تھا اور دلکشی سے مسکراتے ہوئے وہ اس کی آدھی جان نکال چکا تھا۔ یہ آج سے پانچ سال پہلے والا ساغر تو نہیں تھا جو اسے جھینپ کے دیکھتا تھا' ہاں مگر انا پرست اور خوددار آج بھی اتنا ہی تھا۔ تب ہی ویٹر نے ان کی میز پہ پانی رکھا اور اس نے کس قدر بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ لبوں میں مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتا رہا۔

اف۔۔۔ سسی ایسے ہی تو صحراؤں میں رُل کے نہیں مرگئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے پنوں کے ساتھ کسی ایسے ہی ریسٹورنٹ میں آخری ملاقات کی ہوگی اور وہ ایسے ہی سامنے بیٹھا مسکراتا رہا ہوگا۔

"آپ کو مجھ سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔" اس نے پہلی بات کی' وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کے۔

وہ پیچھے ہوا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے بس آنکھوں سے پوچھا کہ "کیوں۔۔۔؟"

"کہ اب میں ہیر کی طرح چیخیں مار' مار کے ڈولی چڑھوں گی۔" سوچا ضرور' مگر کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اب یہ آنکھیں محبت کی لوک داستانیں میرے وجود پہ رقم کر رہی ہیں' یہ مجھے محبت سکھا رہی ہیں۔ تمہاری مسکراہٹ میری روایتوں میں دراڑ ڈالنے جیسی ہے۔ اب میرا دل بھی زلیخا کی گلی میں ستانے کو چاہے گا۔ پُنوں میں نا۔۔۔ سکھ لی ہے ہونگ بلوچاں والی (اونٹوں کو موڑنے والی آواز) اب صحراؤں کا سفر کرنا میری خواہشوں میں ہوگا۔ وہ اب اس احساس سے نکل چکا تھا۔ جسے بس حواس چھوتے ہیں۔ وہ اب خیال یار جیسا بھی نہیں رہا تھا کہ وہ مجسم سامنے تھا۔

"ساغر میں۔۔۔" وہ بات بڑھا نہ سکی۔ ہکلا کے لب بھینچ کے خاموش ہوئی۔ وہ ایک دم سیدھا ہوا' منتظر ہوا۔

"نہیں۔۔۔ میں اس ملاقات کے لیے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے اٹھتے ہوئے اس شخص پہ ایک آخری الوداعی نگاہ ڈالی۔ جس کے وجود میں سکون لرز کر رہ گیا تھا اور ہلکی سی لرزش بھی اکثر بڑے شگاف ڈال دیتی ہے۔ وہ آج کرن کی آنچ جیسا نہیں لگ رہا تھا۔ جھلسانے والے سورج میں ڈھل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماجدہ اس کی خبر پاتے ہی ملنے چلی آئی تھی۔ اس کی گود میں دو سال کا بیٹا بھی تھا۔ وہ متحیر ہوئی۔ تو کیا وہ سالوں بعد واپس آئی تھی۔ ماجدہ نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ کسی عبادت گاہ سے اٹھ کے نہیں آئی تھی مگر اس کی بہن اس پہ نثار ہوئے جا رہی تھی۔

جیسی زندگی گزار کے آئی تھی، دھتکارے جانے کے قابل تھی، مگر اس کے بہنوئی نے اس کے سر پہ عزت سے ہاتھ رکھا تھا۔ اللہ ہمیں معاف کرے۔ فاطمہ۔" ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ یہ نہیں کہا کہ خدا تمہیں معاف کرے۔ وہ شل رہ گئی تھی۔ نیکوکاروں کو تو غرور ہوتا ہے۔ وہ بدکار تھی اور وہ اسے سر آنکھوں پہ بٹھا رہے تھے، توبہ کرو اور نجات پاؤ... توبہ کرو اور بخشے جاؤ گے، بشرطیکہ وہ گناہ دوبارہ مت کرو۔ انہوں نے اسے معاف کردیا تھا۔ یہ ہی اسلام تھا۔ یہ ہی انسانیت کا تقاضا تھا۔ دھتکاری جاتی تو پھر بھٹک جاتی، اپنالی گئی تھی تو اپنے لیے رب سے ہدایت مانگ رہی تھی۔

"عنایت میرا اچھا دوست ہے۔ اس نے یہاں میرے ساتھ ہی بزنس اسٹارٹ کیا ہے، یعنی میرا شیئر ہولڈر ہے۔ وہ تم سے نیشنلٹی کے لیے شادی کرنا چاہتا ہے، مگر دوسری شادی کے بعد بھی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔" بہنوئی نے نرم لہجے میں قائل کیا۔

وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ عنایت اتنا جانتا تھا کہ وہ ماجدہ کی چھوٹی بہن ہے۔ گوری رنگت کی نرم نازک سی فاطمہ میں اسے بس رشتے کی حد تک دلچسپی تھی۔

"میں پاکستان میں کسی لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ شادی کے بعد اسے اپنے ساتھ یہاں رکھوں گا۔" شادی کے بعد اس نے پہلی بات ہی یہ کی تھی۔ فاطمہ کو اب صرف عزت چاہیے تھی۔ باقی باتیں اس کے لیے بے معنی تھیں۔



یہ راتوں رات آتشی مٹی کا پہاڑ کیوں بن گئی تھی۔ ایک سوندھا کچا پہاڑ جیسے کوئی اس پر سے پاؤں رکھ کے گزر گیا تھا۔ وہ اب ذرا ذرا سا جھڑ رہی تھی۔ وہ سوندھا پن اس کے گیلے وجود سے اڑ رہا تھا، اس میں ایسی کون سی بستی آباد ہوگئی تھی۔ جس کے پل پل بدلتے موسم سمجھ سے باہر تھے۔ کبھی تیز بارش، کبھی دھوپ... کبھی ہلکی کن من... عنبر اسے دیکھتی اور نظر ہٹا نہیں پاتی تھی۔

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

"یہ مسز بزمی بھی نا۔" عنبر نے کروٹیں بدلتی آتشی پہ اک نگاہ ڈالی۔

"آج پھر مسز بزمی نے پورے گھر کی صفائی کروائی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں سے ... کوئی خالی یا بھری بوتل ملی ہوگی۔" (کہ اس کا مرحوم شوہر بلا کا مے نوش تھا۔) عنبر نے ہنستے ہوئے بستر چھوڑا۔ اور نیم وا کھڑکی کے تمام پٹ وا کیے۔ کمرے میں ملگجی سی روشنی کے ساتھ ہلکی ہوا بھی دبے پاؤں اندر آئی۔ اس نے کھڑکی کے چوکھٹے پہ کہنیاں ٹکائیں۔

"کرکے... توبہ توڑ ڈالی جائے گی۔" وہ مسکراتی غزل آتشی کو جیسے چڑا رہی تھی۔ کروٹیں بدلنے کا سلسلہ ترک کرتی وہ اٹھی اور ننگے پاؤں چلتی کھڑکی تک آئی۔ وہ کھڑکی تین پٹ والی تھی۔ اس نے درمیانے چوکھٹے پہ ہاتھ رکھا اور کھلے پٹ سے ٹیک لگائی۔ پھر مکمل چاند کو دیکھ کے چور کی طرح نظر موڑی۔

"تمہیں پتا ہے کل محب نے کیا، کیا؟" اس نے جان بوجھ کے توقف برتا۔ "کیا؟" عنبر ذرا سا پیچھے ہوئی۔

"اس نے سالوں بعد ان دو افراد کو ایک دوسرے کے روبرو کردیا کہ کبھی جن کے لیے ایک دوسرے کی جھلک دیکھ لینا بھی غنیمت تھا۔" وہ چھوٹے سے نقرئی قہقہے کے ساتھ بولی۔

عنبر نے اسے ہڑبڑا کے دیکھا۔ یہ آواز اگر آتشی کی تھی تو وہ کیا کہہ رہی تھی۔

"تو... پھر... پھر؟" عنبر نے بے تابانہ پوچھا، اس کی آواز واقعی کانپ رہی تھی۔

"پھر کیا؟" وہ لب سکیڑ کے مسکرائی۔ "اس نے کہا۔ میں تمہیں سوچتا تھا۔ (میں بھی) تم بہت یاد آتی تھیں۔ (تم بھی) ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ (بالکل بھی نہیں) ہمارے ساتھ غلط ہو رہا ہے۔ (بالکل) اب میں

تمہارے لیے مر رہا ہوں۔ (میں بھی) میں تو یہ زندگی تمہارے ساتھ بتانا چاہتا تھا۔ (میں بھی) ہم سے وابستہ یہ رشتے خود پسند ہیں، خود غرض، ظالم اور سفاک ہیں۔ (واقعی) آتشی یہ زندگی تمہارے بغیر کھنڈر ہوگی، بوجھ ہوگی، موت ہوگی۔" (میری بھی) وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور تادیر ہنستی رہی۔

"یا اللہ! آتشی کو کسی دیوانے نے تو نہیں چھو لیا۔" عنبر نے اسے ہول کے دیکھا۔

"دو محبت کرنے والے برسوں بعد وہ بھی آخری بار مل رہے تھے۔ ہونا اور بولنا تو ایسے ہی چاہیے تھا نا۔" اس نے ہنسی روک کے عنبر سے تائید چاہی۔ "مگر افسوس اس کے لبوں سے کوئی گوہر کوئی پروا خاندان.... دکھ، تکلیف، کوئی وعدہ وعید.... اس طرح کا کوئی ایک لفظ ادا نہیں ہوا۔ لو بھلا یہ کہاں کی محبت ہوئی۔ مجال ہے جو اس نے ہجر کاٹنے کا کوئی ایک گر بھی میرے پلو سے باندھا ہو۔" عنبر نے اسے کسی غیر ماورائی چیز کی طرح دیکھا۔ "اس سے ملنے سے قبل محب نے مجھے بھٹکانا چاہا تھا۔ میں نے کہا توبہ کرو.... استغفار.... اور پچیس منٹ کی ملاقات کے بعد میں نے اپنی توبہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔" وہ پھر سے ہنسنے لگی۔

"آتشی! تجھے کون سے جن نے چھو لیا ہے۔ یہ تیرے اندر کون بول رہا ہے؟" وہ ڈر کے مارے شل سی کھڑی رہ گئی۔

"اس نے صرف ایک جملہ بولا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا چند لمحوں کے لیے مسکرایا بھی تھا۔ وہ آنچ دیتی آنکھیں۔ یہ مات دیتی مسکراہٹ، وہ حواس چھینتی خوشبو۔

کل شب میں ننگے پاؤں محب
کے کمرے تک گئی۔ پھر میں نے اس کے بند دروازے کو چھوا۔ میں کون سا بھاگ کے جا رہی تھی۔ محب کو مجھے رخصت کرنا تھا۔ یہاں سب کے سامنے تو محب کو جوابدہ ہونا تھا، وہ بھاگی نہیں۔ اسے میں نے خود رخصت کیا ہے، سن لو، سب کے سب۔" وہ بت بنی عنبر کو نہیں دیکھ رہی تھی جیسے وہ وہاں تنہا تھی۔

"اس شخص کے لیے توبہ توڑنا تو بنتا تھا نا۔ مگر وہ آنکھیں بہت باوقار تھیں۔ اس ساقی کی خواہش میں پوری زندگی تو نہیں تھی۔ بس مجھے آخری بار دیکھنے کی ایک معصوم سی خواہش.... مگر عورت کیا چاہتی ہے، اپنے محبوب سے کیا چاہتی ہے۔ میں نے خود سے سوال کیا۔ اس کی گفتگو بس ایک جملہ تھا۔ ہدایت کا راستہ تو میں چھوڑنے لگی تھی، نیت تو میری ڈگمگائی تھی۔ تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بس آخری بار.... وہ شفاف لہجہ میرے اندر ابھرا۔ میں نے محب کے دروازے سے ہاتھ اٹھا لیے اور وہاں تک پھیلائے جہاں تک ممکن تھا۔ میں نے خواہش کا دائرہ توڑ دیا۔ میرے وجود میں توبہ پھر سے سانس لینے لگی۔ میری نظر اپنے وجود پہ لکھی ان لوک داستانوں پہ پڑی جو مجھ پہ سے مٹ رہی تھیں۔

محبت کیا ہے؟ کچے گھڑے کا پانی میں گھل کے فنا ہو جانا اور کنارے پہ کھڑے شخص کو فنا کر دینا۔ ہیر سیال کی دہلیز کے پار کسی جوگی کے کاسے کا ٹوٹ جانا محبت ہے۔ پنوں کا اونٹوں کو موڑنے کی آواز سیکھ لینا محبت ہے، جو مڑتے نہیں۔ ایک فنا ہونے والی شے محبت ہے اور توبہ.... بقا ہے، ہدایت کا راستہ دکھانے والی شے ہے۔ میں محبت کی چوائس ٹھکرا کے واپس آگئی تھی۔" اب کے اس نے چاند کو ایک غرور کے ساتھ دیکھا۔

کیا عنبر کے پاس کھڑی لڑکی ایک ٹھنڈی روح تھی۔

عنبر کا کانپتا وجود دھیرے دھیرے کسی اندھیرے میں اتر رہا تھا۔



"میں پاکستان جا رہا ہوں مما۔" اس کی آواز میں ایک محسوس کی جانے والی خوشی تھی اور دوسری طرف ایک ٹھہری ہوئی خاموشی.... کتنے ہی لمحے گزر گئے۔

"کیا ہمیشہ کے لیے؟" آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ ہلکی سی خفگی تھی۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" اس نے محتاط انداز اپنایا اور سیل اپنے دونوں ہاتھ میں لیا۔

"دو دن بعد آنٹی کی شادی ہے' اس کے بعد... کیا اس بار بھی اکیلے واپس آؤ گے۔" اس نے اپنے اندر گہری سانس اتار کے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے کھڑکی سے باہر اک نظر ڈالی۔

ہالینڈ میں موسم بدل رہا تھا۔ وہ ایسا ملک تھا جو آف سیزن میں پوری دنیا میں پھول سپلائی کرتا تھا۔ "مگر اس لڑکی کا کہنا تھا کہ مجھے آف سیزن میں پھول نہیں چاہئیں۔ مجھے انس چاہیے' وہ بھی اس ملک میں جہاں لوگ سمجھتے ہیں کہ اب پھول نہیں کھلتے' صرف بارود کی خوشبو ہوتی ہے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اس کی ماں کی آواز بجھی ہوئی تھی۔ "اس کے لیے میری طرف سے بھی کچھ خرید لینا۔" وہ ڈسٹرب تھی۔ اس کی آواز میں نمی تھی۔ انس چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہا تھا۔ وہ دونوں عورتیں اسے بے حد عزیز تھیں' مگر وہ دونوں بے حد ڈھیٹ بھی تھیں۔



آواز دے کے ہمیں تم بلاؤ
محبت میں اتنا نہ ہم کو ستاؤ

گیت کی ٹون اور بول بتا رہے تھے کہ آج مسز برزی اداس ہیں۔ وہ بے اولاد تھیں' مگر اکیلی نہیں تھیں۔ انہوں نے گھر میں مختلف پرندے' بلیاں اور خرگوش پال رکھے تھے۔

"یہ مسز برزی کا سی ڈی پلیئر جب چلتا ہے تو کب بتاتا ہے کہ یادوں کے زنگ آلود بھاری دروازے کہاں کہاں نہ کھل جاتے ہوں گے۔" پروا کی سانس سے ایک ہوک سی ابھری۔ آج وہ سب بڑے کمرے میں تھے۔ تائی نے اپنے سامنے مختلف چیزوں کے دو ڈھیر لگا رکھے تھے۔

"ایک تمہارا..." پہلا اشارہ عنبر کی طرف کیا۔ "جس پہ چاہے ہاتھ رکھ دو۔" وہ مبہوت ہوئی۔ اس کے جسم نے حیرت کا جھٹکا کھایا۔ اس قدر محبتیں۔

"تائی امی میں اتنی محبتوں کے قابل نہیں تھی۔" آنسو روانی سے بہنے لگے۔

"پگلی نہ ہو تو۔" تائی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "اللہ کو یہ سب سننا پسند نہیں۔ انسان جب خود کو کمتر سمجھتا ہے تو اس کے ناشکرے بندوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فلاں کو دے دیا۔ ڈھمکاں کو عطا کر دیا اور مجھے اتنا کم... اور جب خود کو برتر سمجھتا ہے تو تکبر میں پکڑا جاتا ہے کہ دیکھا' میں اسی قابل تھا' جو مجھے اوروں سے بڑھ کے مل رہا ہے۔ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ کون کس قابل ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ کم پہ بھی شکر گزار... زیادہ پہ بھی شکر گزار کہ اللہ کو اپنے بندے میں یہ وصف سب سے زیادہ پسند ہے۔" انہوں نے اس لڑکی کے آنسو صاف کیے جو ان کی زندگیوں میں ایک ان سنی داستان تھی۔ جہاں سے اس نے چاہا سنا دی۔ نہ ابتدا سے انہیں دلچسپی تھی' نہ انتہا کا تجسس تھا۔ جس کا باپ بھی اس کی زندگی میں مخل ہونا پسند نہیں کرتا تھا یا وہ اسے مخل ہونے نہیں دیتی تھی۔



"اس کے بعد تمہارے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنا آسان ہوگا انس!" وہ اتفاقاً ادھر سے گزری تھی اور اس نے عنبر کا وہ ادھورا جملہ سنا تھا... کہ اس کے پاؤں ان الفاظ نے جکڑ لیے۔ اس نے آزردگی کے ساتھ سر جھٹکا۔

"آسانی بس بے خبری میں ہے۔ آگہی زندگی کو مشکل ترین کر دیتی ہے۔"

وہ ایک دم اس کے سامنے آئی۔ "میں نہیں جانتی تمہارا راز کیا ہے' وہ بات کس کی ہے' مگر دل وہ جگہ ہے جہاں صرف اللہ جھانک سکتا ہے۔ بے وقوفی میں ہم عورتوں کا کوئی ثانی نہیں ہے عنبر۔" اس نے عنبر کے ٹھنڈے رخسار پہ ہاتھ رکھا۔ "مردوں بات کرتا ہے۔ ہاں تو تھا ... کسی سے افیئر... افیئر ایک ماڈرن ایجاد

(تعلقات کی) افیئر۔۔۔ بس ایک بات۔۔۔ وہ کبھی راز نہیں دیتا کہ میں کسی عورت سے محبت کرتا تھا۔ (محبت ایک بھید) مگر عورت افیئر کو توہین گردانتی ہے۔ میرا تو کسی سے بھی افیئر نہیں چلا۔ میں تو فلاں شخص سے محبت کرتی تھی۔ (وہ راز عیاں کردیتی ہے۔)" عنبر کی آنکھوں سے بہنے والا پانی بھی ٹھنڈا ٹھار تھا۔ اور اس کا لہجہ جیسے برف کے گولے گر رہے ہوں۔ وہ مر رہی تھی۔ وہ تکلیف میں تھی اس نے اکھڑتی سانسوں کے ساتھ پاپا کو دیکھا۔

"میرے دل پہ اک بوجھ ہے عنایت۔" جیسے وہ اپنی ہمت مجتمع کر رہی تھی۔ "مجھے معاف کردینا میں نے اس سے محبت کی تھی۔ مگر اس نے میرے وجود سے دولت کمائی تھی۔" اس کے منہ سے یہ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔ "عنبر۔۔۔ تمہاری۔۔۔ بیٹی نہیں ہے۔" مما کے منہ سے یہ الفاظ کانپ سے گئے تھے۔

دروازے کے پار کھڑی تیرہ سالہ عنبر کا وجود پوری شدت سے کانپا تھا۔ پھر میں نے خالہ کو دیوانوں کی طرح گھر میں گھستے دیکھا۔ میرا باپ میری ماں کی بے جان کھلی آنکھوں کو بے یقینی سے تک رہا تھا، پھر خالہ نے ہی مما کی کھلی آنکھیں بند کی تھیں اور میرا پاپا کے ساتھ رشتہ ایک پل میں خواب ہوگیا۔ اس کے بعد پاپا مجھے عبادت کرتا دیکھتے تو ان کی آنکھوں کا تاثر بہت عجیب ہوتا۔ پھر خود بخود مجھ سے وہ فیصلہ ہوگیا، جس کی بنا پہ مجھے انس اور خالہ کو چھوڑنا پڑا۔ وہاں ایک گمبھیر خاموشی تھی، جس میں صرف عنبر کی ہچکیاں بول رہی تھیں، پروا نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بھلے وہ تم سے نفرت کرتا ہو، مگر عنایت بھائی یہ راز کبھی کسی پر عیاں نہیں کریں گے۔" مرد اس پردہ پوشی کی حکمت کبھی نہیں سمجھ سکتا اور اللہ اس بات پہ مسکراتا ہے کہ بے شک میں ہی علیم خبیر ہوں۔ عنبر کی ہچکیاں یکلخت تھم گئیں۔ "فاطمہ کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ ایک انسان کے سامنے دم آخر اپنا بھرم توڑتی اور دنیا سے جاتے وقت تم سے تمہارا سب سے عظیم رشتہ چھین لیتی۔ اسے اللہ تعالیٰ کا سامنا توکل اور معافی کے گمان کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ ایک انسان بھلا دوسرے کو کیا معاف کرتا اور اب جیسے عنبر عنایت کو کوئی حق نہیں کہ وہ انس حنان کو فیصلے کے دوراہے پہ کھڑا کردے۔ دلوں میں جھانکنے کا اختیار سوائے اس خدائے برتر کے کسی کو نہیں۔" وہ جیسے ہانپ کے خاموش ہوئی تھی۔ پھر عنبر کا آنسوؤں سے دھلا چہرا دیکھا۔

"اور۔۔۔ اور جیسے پروا محب کو حق نہیں تھا کہ وہ اشہب غفار کا بھید اس شخص کے سامنے کھول دیتی جو اس کا دنیا میں سب سے بڑا سہارا تھا۔" پروا کا بے کل وجود کسی ڈھلان پہ جمع ہونے والے پانی کی مانند قطرہ قطرہ بکھر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اشہب غفار اس کے لیے ہمیشہ خلا کے وسط تک دیکھے جانے والی بارش کی طرح رہا۔ جو جانے کون سے درختوں کی چوٹیوں پر برستی تھی۔ ستمبر کی دھوپ جیسا شخص، جانے وہ کیوں اسے سوچنے لگی تھی۔ وہ یونی ورسٹی کے پہلے دن سے اسے دیکھتی تھی، چھپ چھپ کے، مڑ مڑ کے، اس قدر سادہ سا حلیہ اور غور سے دیکھو تو اس قدر خاص۔۔۔ وہ اردگرد سے بے نیاز پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کبھی چلتے کو، کبھی کھڑے کو چپکے سے دیکھتی رہتی۔ اس کے سادہ، مگر مسکراتے چہرے پہ ہمہ وقت تیکھی سی مسکراہٹ دمکتی رہتی۔ عجب بے نیاز، بے پروا سا شخص تھا، جانے وہ مسکراتا ہوا اچھا لگتا تھا، بات کرتا ہوا یا پھر خاموش بیٹھا ہوا۔ یونی میں دو سال گزارنے کے بعد بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ بس وہ نظر آجاتا تو وہ اسے دیکھے جاتی، اتنا کہ اس کی محویت اس کی دوستوں نے بھانپ لی۔

ایک دن لائبریری میں اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے الصفرہ نے پروا کو سنبھلنے کا موقع دیے بنا اسے اشہب کے مقابل بٹھا دیا۔ "پروا کو آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" وہ ہونق حواس باختہ سی دور جاتی

...ستوں کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے
...امنے بیٹھی اس لڑکی کو انتہائی دلچسپی سے دیکھا، جس
...کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی سورج مکھی کا پھول بن جاتی
...تھیں اور اب جس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا،
...نگاہ ملنے پہ کچھ اور ہراساں ہوئی۔
"وہ... میں مم... مجھے تو کک... کچھ بھی نہیں
...ملنا۔" پسینے سے تر چہرہ گھبرایا ہوا تھا۔
"تو یہاں تک آنے کا مقصد؟" مصنوعی خفگی سے
...چڑھا کے پوچھا۔
اس کا حلق خشک ہوا، بدقت لب وا کیے، مگر آواز
...گلے میں ہی کہیں دم توڑ چکی تھی۔ وہ اس ہراس زدہ
...ٹ سی لڑکی کو یوں نروس دیکھ کے متعجب ہوا۔ جو
...گلے ہی پل کرسی چھوڑ کر بھاگ لی تھی۔ گروہ باوقار
...تو پروا اس سے بھی دو قدم آگے۔ وہ بے نیاز تھا تو وہ
...بے نیاز ترین ثابت ہوئی۔ وہ خود کو شان دار سمجھتا تھا تو
...بھی کم تر نہیں تھی۔ وہ ہنوز اجنبی رہے اور وقت آگے
...سرکتا رہا۔ یہ ان کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ ایک دن
...کے نوٹس کینٹین میں رہ گئے تھے جو دوسرے دن
...نے کینٹین کاؤنٹر سے وصول کیے جنہیں وہ پڑھتے
...تے چونکی۔ قدرے خالی پیج کے کونے پہ خوب
...رت ہینڈ رائٹنگ میں تحریر تھا۔
...ہ چاند بن کے میرے بام تک ہی آجائے
...ماری آنکھوں میں اک شام سی مسلسل ہے
...ارے یہ تو اشہب کی ہینڈ رائٹنگ ہے۔" اگلے
...وز تک اس کی دوستوں نے یہ بتا کر اس پہ حیرت
...اڑ توڑے تھے۔
...ی وہ حد سے زیادہ لاپروا بندہ اور کچھ عجب نہیں تھا
...و اس طرح سے دلی جذبات اس پہ آگاہ کر گیا تھا۔
...ول ہر نئے دن نیا رنگ اوڑھ کے دھڑکتا۔ لہٰذا
...ٹمنٹ کے نسبتاً سنسان برآمدے میں وہ تیز تیز
...جا رہی تھی کہ گرد آلود آندھی کے بعد اب بادل
...کو تیار تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے
...ہو لیا تھا۔ قدموں کی تیزی سست پڑی۔ گردن

موڑ کے دیکھا۔
"اف خدایا!" مگر رکی نہیں۔
"ان سے ملنا... ان سے بات کرنا انہیں دیکھنا کیا بہت ضروری ہوتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو ٹھہرا۔ پروا نے اسے دیکھا۔ "جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔"

اسے شانزہ آوازیں دے رہی تھی۔ وہ پیچھے کھڑا رہ گیا۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر اس دن کے بعد وہ جیسے خواب ہو گیا تھا۔ وہ شام آنکھوں والا اشہب غفار جانے کہاں گم ہوا کہ کوئی خیر خبر تک نہ لی۔ ان کے امتحان بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن انفصو نے اسے فون پہ بتایا کہ اس نے اس کے ایک قریبی دوست سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اشہب کا بارش والے دن زبردست ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ انفصو کی ادھوری معلومات نے اس کا پورا وجود منجمد کر دیا تھا اور جب زندگی میں پروا نے دوبارہ اسے دیکھا تو بے رحم تقدیر اور سنگ دل وقت سے وہ رو رو کے شکوہ کناں ہوئی تھی۔



اس معروف بازار میں بم دھماکے کی بریکنگ نیوز آ رہی تھی، جہاں سہ پہر کو آتشی پارلر گئی تھی، تائی اور محب نے اسے پارلر چھوڑ کے انس کو لینے ایئرپورٹ چلے جانا تھا، گھر سے نکلتے وقت ان کے درمیان ہی طے ہوا تھا، دھماکے کی خبر کے بعد پروا کے حواس مکمل طور پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ تایا کا بھی حال اس سے مختلف نہیں تھا اور عنبر ان دونوں کو سنبھالتے ہوئے خود ہلکان ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے تک تائی اور محب، انس کے ساتھ گھر بھی آ گئے، جہاں اس خبر کے بعد صف ماتم بچھی تھی۔

آج رات کو مہندی کا فنکشن تھا۔ آتشی کے سسرال میں سے چند خواتین شام سے قبل مہندی کا جوڑا دینے آئی تھیں۔ تب تک وہ پارلر جا چکی تھی۔ اس کا پارلر جانا ان کے علم میں تھا۔ اب وقتاً فوقتاً وہاں سے بھی سب آ جا رہے تھے۔

انس کے سامنے عنبر کی نگاہ شرمندگی کے مارے جھکی ہوئی تھی۔ جیسے وہ نظر ملائے گی اور وہ کہے گا۔ "یہ ہے تمہارا آئیڈیل ملک، تم اس پاکستان سے محبت کرتی ہو۔"

محب نے اپنے دوستوں کے ساتھ پورا بازار چھان مارا تھا۔ بم میں زیادہ بھاری مواد استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ سو جانی نقصان کم اور زخمی زیادہ تھے۔ انہوں نے آس پاس کے تمام اسپتال تک کھنگال ڈالے، مگر آتشی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ جب وہ بازار گئے تو پارلر بند تھا۔ دھماکے کے بعد بھگدڑ کی صورت جس کا منہ جس طرف اٹھا وہ جان بچانے کی فکر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ محب پو پھٹنے کے بعد گھر لوٹا، دکھ، شکستگی اور مایوسی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

آتشی کے سسرال میں سے آئے لوگ تو چلے گئے تھے، مگر ان کے یہاں سے تمام رات فون کالز آتی رہیں۔ اگر وہ رات ان گھر والوں کے لیے طویل ترین اور بھیانک تھی تو دن کا سورج بھی اپنے ساتھ کئی ہولناکیاں اور انہونیاں لے کر ابھرا تھا۔

"کم از کم لاش ہی مل جاتی تو تسلی ہو جاتی۔" یہ کوئی آتشی کی سسرالی عورت تھی۔

مسز بزمی نے جو گھر سے ان کے لیے چائے لے کر آئی تھیں، اس عورت کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔ "لاش کیوں ملتی، وہ زخمی ہو یا جیسی بھی حالت میں ہو.... اللہ کرے زندہ سلامت ہو۔" ابھی بات ان کے منہ میں تھی کہ دو خواتین کے ساتھ لنگڑاتی ہوئی آتشی نے گھر میں قدم رکھا۔ جسے دیکھ کر وہاں موجود افراد کا دل اپنی اپنی سوچ کے حساب سے دھڑکا تھا۔ آتشی کو سامنے زندہ سلامت دیکھ کر محب منزل کے سب ہی افراد نے بے پایاں مسرت اور شکر گزاری کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔

"پتا نہیں رات کن لوگوں میں گزار کے آئی ہے۔" کچھ خواتین نے ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کی جو وہاں موجود باقی خواتین نے بہ آسانی سن لی تھی۔

"رات کو اس قدر خراب صورت حال تھی کہ گھر سے نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔" آتشی کے ساتھ آئی خواتین نے اہل خانہ کے ساتھ معذرت کی۔ "یہ پیاری سی لڑکی ہمارے گھر کا دروازہ کھلا پا کر اندر آگئی تھی۔" تایا، تائی اور پروانے ان کا بے حد و بے حساب شکریہ ادا کیا۔

"ایک فون ہی کر دیا ہوتا کہ خیریت سے ہوں۔" ساس نے تنک کے کہا۔ ان کا انداز سراسر تنک آمیز تھا۔ آتشی نے انہیں بوکھلا کے دیکھا۔

"اس بازار کا ٹرانسفارمر جہاں تھا اس کے قریب ہی دھماکا ہوا تھا۔ وہاں تو میرے آنے تک بجلی بحال نہیں ہوئی تھی۔" وہ ان کے مشکوک اندازوں سے روہانسی ہو رہی تھی۔

"تو موبائل کیسے چارج ہوتے، میرا اپنا بیگ پارلر میں رہ گیا تھا۔" اس نے چہرا موڑ کے پہلو بدلتی پروا کو دیکھا۔

"اللہ ہی جانے ان گھپ اندھیروں میں کیا ہوتا رہا ہوگا۔" ساس نے اٹھتے اٹھتے ان سب کے حواسوں پہ الفاظ کے بم گرائے۔

جو جس حالت میں تھا وہیں ساکت ہوا اور ابھی ان سب کا سکتہ ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ ادھر سے انکار کا پیغام آگیا۔ معذرت کے ساتھ کہ لڑکا کسی طور نہیں مان رہا۔ لڑکی پوری رات گھر سے غائب رہی ہے۔ ہم اعتبار کر بھی لیں تو دنیا کا منہ بند کروانے کی کسی میں ہمت نہیں۔

کیا ہی تلوار کا وار کاری ہوتا ہوگا۔ بعض اوقات زبانوں کی تیز چھریاں بھی دم نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔



آج کا دن تو بارات کا تھا۔ شادی والا گھر کیسے اجڑ کے رہ گیا تھا۔ آج مسز بزمی کا سی ڈی پلیئر بند تھا۔ آتشی نے کئی بار صابن سے ہاتھ دھوئے، مگر مہندی کسی طور

نہ اتری۔

"اب بس کرو۔ کیا زخمی کرو گی۔" عنبر نے اپنی ول سوں بند کر کے اسے ٹوکا۔ تب ہی ان کا بند گیٹ ور سے دھڑ دھڑایا گیا جو جان بوجھ کے محب نے بند کر دیا تھا۔

"جتنے منہ' اتنی باتیں۔" عنبر نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اسے یقین نہیں آیا وہ سن سی کھڑی رہ گئی۔ سے یوں گومگو کیفیت میں دیکھ کر آتشی بھی اس کے یب آئی اور ان مہمانوں کو دیکھ کے دنگ رہ گئی۔

"لیجیے! ایک ان کی کسر رہ گئی تھی۔"

اس کے لہو میں ابال سا اٹھا۔ "مجھے شادی ٹوٹنے کا وا اتنا نہیں جتنا لوگوں کے رویوں سے ہو رہا ہے۔ کوئی را اعتبار کیوں نہیں کر رہا۔" اس نے گیلی آنکھوں ے ساتھ کھڑکی کا پٹ زور سے چھوڑا۔

"اب آپا کے سسرال والے بچی کچی توانائی چوسنے آئے ہوں گے کہ بہو کا خاندان اس قدر بڑے سانحے کا شکار ہو چکا ہے۔" وہ رندھی آواز کے ساتھ تڑخ کے لی۔

"تو ان کا رشتہ کون سا ادھر ختم ہو چکا ہے۔ اچھا کیا آگئے۔" عنبر نے اس کا دھواں دھواں چہرا دکھ سے یکھا۔

"محب بے چارے کو کیا دہرا وقت پڑا ہوا ہے۔ ب انس کو پتا نہیں کہاں لیے پھر رہا ہوگا۔" اس کے صور میں انس کی آنکھوں کا لکھا لہرایا۔

"یہاں چراغ جلا کے دکھاؤ عنبر بی بی' دیکھا! شادی کا گھر اسی بارود کی نذر ہو گیا جو پاکستان کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

"عنبر میری جان' ذرا نیچے آنا۔" اگر یہ تائی کی آواز ہے تو اس میں چینی کس نے گھول دی۔ ابھی تو وہ سر پٹی باندھ کے اوندھی پڑی تھیں۔ ہو سکتا ہے انس آ گیا ہو۔ وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی' اس وقت سیڑھیاں اترنا اسے جوکھم سے لگ رہا تھا۔



"وہ خواتین بھی ساتھ آئی تھیں اور لڑکی بھی' کہہ رہی ہے کہ مجھے آنچ تک نہیں آئی' بس پیر میں مروڑ آگیا تھا۔" تائی کے مطمئن لہجے میں صفائی دینا مقصود نہیں تھا' بس وہ وضاحت کر رہی تھیں۔

"ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کہ جھوٹ بولنا اس خاندان کا شیوہ ہے' نہ فطرت۔" گوہر نے سر جھکا کے بیٹھی پروا پہ گہری نگاہ ڈالی۔ جو ان کے یہاں چلے آنے کا مقصد جان کے بالکل شل تھی۔

"خدانا خواستہ ہمارے لیے تمام صورت حال قابل قبول تھی۔" پروا کی ساس نے نہایت عاجزی سے تایا کے سامنے اپنا سوال دوبارہ دہرایا اور انہیں آس بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تو کب سے آتشی کی طلب گار تھی' مگر..." وہ کچھ متامل ہوئیں۔ "گوہر نے دوسری شادی کر کے مجھے یہاں آنے کے قابل کب چھوڑا تھا۔"

گوہر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اب سالوں بیت گئے تھے' ملال مٹتے مٹتے مٹ گیا۔ اس کا اور پروا کا رشتہ کورے کاغذ پہ گرے آنسو کی مانند تھا' جو سوکھ گیا' ذرا سا کاغذ دھبا نما سا سمٹ گیا۔ باقی تمام صاف کا صاف۔

"تو پھر کل بارات ان شاء اللہ طے شدہ وقت کے مطابق آنی چاہیے۔" تایا نے پہلے پروا کے چہرے کو تادیر پڑھا' جہاں مفاہمت کے رنگ تھے۔ صلح کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی خوب صورت پیشانی پہ رضامندی کا سائن روشن تھا۔ پھر اپنا فیصلہ ان پہ واضح کیا۔

عنبر نے خوشی کے مارے منہ پہ ہاتھ رکھ کے اپنی چیخ کو روکا' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہ خبر اڑ کے آتشی کو سنا آئے۔ "اللہ نے اسے تمہاری قسمت میں لکھ دیا تھا۔ وہ تمہیں ملنا ہی تھا تو تم توبہ پر قائم رہ کے بھی اسے جیت گئی ہو۔ توبہ توڑ کے اس کے پیچھے جاتیں تو تم جیت کے ہار جاتیں۔"



"دیکھ لو یہ ہے میرا پاکستان اور یہاں کے لوگ۔"
اس نے انس کو اترائی نظروں سے دیکھا۔ "یہاں صرف بارود کی خوشبو نہیں' یہاں اب بھی پھول کھلتے ہیں' یہاں صرف دہلیزیں گرتی ہی نہیں کہ گلاب رکھنے والے اور چراغ رکھنے والے انہیں نئے سرے سے تعمیر بھی کروا لیتے ہیں' تم باہر والے سمجھتے ہو کہ پاکستان میں اب بارش نہیں ہوتی۔ یہاں آج بھی بارش سے قبل کوئل بولتی ہے۔ گھروں کے صحن میں موسیقی گونجتی ہے۔ مسجدیں اب بھی آباد ہیں اور شہر چلتے پھرتے ہجوم سے بھرے پڑے ہیں۔ دلہنوں کی ہتھیلیاں ابھی تک یہاں مہندی سے سجتی ہیں' یہاں ساغر کے خاندان جیسے اور بھی خاندان ہیں جو خواب دیکھتی آنکھوں کو پانی نہیں' بلکہ تعبیر دیتے ہیں۔ یہاں برے لوگ کم اور اچھے زیادہ ہیں انس۔" وہ اٹھلا کے اور اترا کے بولی۔

"مجھے یہاں سے صرف ایک اچھی لڑکی چاہیے۔"
وہ اسے یوں اتراتا دیکھ کے مسکرایا اور اسے ٹوک کے بیچ میں بولا۔

"وہ راز کیا تھا عنبر!" اسے ایک دم یاد آیا تو مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا۔ وہ بس اک پل کو سٹپٹائی۔
"وہ اچھا وہ... ہمارے نیم کے درخت سے بلبل ہجرت کر گئی تھی۔ میں نے پرسوں دیکھا تو پورے گھونسلے سمیت موجود تھی۔" وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔ انس نے اسے تیکھی نظر سے گھورا۔
"دیکھو تو دلہن آرہی ہے۔" وہ پرجوش سی ہو کر بولی۔

دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے اور گنگ رہ گئے کہ چوبیس گھنٹوں میں ساغر نے اس قدر شاندار انتظامات کیے تھے۔ اگر اس کے پاس چوبیس دن ہوتے تو اس اہتمام و انتظام کی نوعیت کیا ہوتی؟ اس قدر دلکشی و رعنائی کے دگنے تگنے لوازمات کیا ہوتے' وہ بس آسمان سے تارے توڑ کے نہیں لا سکا تھا۔
آتشی' آتشیں رنگ کے بیش قیمت لباس میں کسی داستان کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی' بس توبہ تڑوانے والی نگاہوں کی وارفتگی و محبت اسے حسن بخش رہی تھی' جو خوشی ساغر محسوس کر رہا تھا۔ اس احساس کو قائم رکھنے کی شرط لفظ خوشی' اگر آسمانوں اور جہانوں پہ لکھنا ہوتا تو وہ قیامت تک قلم تھام کے لکھتا رہتا۔
"دیکھو جب لڑکی دلہن بنتی ہے تو کس قدر اچھی لگتی ہے۔" انس اسے بھیڑ میں ڈھونڈتا دوبارہ اس تک آ پہنچا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ جھینپ کے مسکرائی۔
"اب تمہارا کیا خیال ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے چہرے پہ نگاہ جما کے کھڑا تھا۔
"مجھے رونمائی میں پاکستان چاہیے۔"
اف اس کے لہجے میں کس قدر لاڈ اور مان تھا۔ وہ چونکا۔ وہ متعجب ہوا۔ پھر وہ مسکرایا۔ جیسے ابھی ابھی زندگی اس کے خون میں دوڑی ہو۔
"بارات لے کر پاکستان ضرور آؤں گا اور اس بلبل کو ضرور حیران کروں گا کہ دیکھو یہ لڑکی راتوں رات ہجرت کے لیے آمادہ ہو گئی۔ اور کیا خبر کبھی اپنے گھونسلے سمیت دوبارہ یہاں موجود ہو۔"
وہ حیران ہوئی' سمندر جتنا یا پھر اس کرۂ ارض جتنا پھر جہانوں کے پانی جتنا اور دوسرے پل وہ اتنا ہی خوش ہوئی کہ انس نے اس کی خواہش' اس کے خواب کا مان نہیں توڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

دلہن کی رخصتی کے بعد وہاں کوئی ایک مہمان بھی نہیں تھا۔ عنبر نے اسے ایک سنسان سڑک کا موڑ مڑتے دیکھا۔ شوریدہ ہوا پاگل ہو رہی تھی۔ نرم کچے' ہرے پتے تک اس کی شوریدگی کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ تایا' تائی اور محب گھر جا چکے تھے۔ وہ اور انس میرج ہال کے لان کی طرف چلے آئے۔ جہاں باجوں کے ساتھ ایک اور بارات آرہی تھی' آج وہ اس میرج ہال کی تمام شادیاں اٹینڈ کر کے ہی جانا

نے اس کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ اس نے اس سنسان راہ پہ اک الجھی نظر ڈالی' شکر کہ انس دوسری جانب متوجہ تھا اور اس کی توجہ کس طرف تھی؟

☆ ☆ ☆

کبھی تم ہجر لکھو تو
ہوا کے ہاتھ پہ لکھنا
یا گیلی ریت پہ لکھنا
تلاطم خیز موجیں
جس کو چھو کے بے نشاں کر دیں

آج پروا اتنی بے کل کیوں تھی' اسے درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کا گمان ہو رہا تھا' وہ اس بند گلی کے سرے پر لکڑی کے بینچ پہ کسی سنگی مجسمے کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ اسی ایک احساس کی مانند دوسرے کنارے پہ ٹک گئی۔

تمہیں وہ شور اپنے تک ہی
بس محدود رکھنا ہے
جو دل کے آسمانوں پہ
کسی رت چہچہاتا تھا۔
کبھی تم ہجر لکھو تو
سمندر پہ بھلے لکھ دو

"کیوں پروا؟ خود پہ اس قدر ظلم کیوں کیا۔ مجھ پہ ذرا سا رحم ہی کھایا ہوتا۔" اس کا وجود اگرچہ بے حال تھا۔ مگر آواز اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس نے بے زاری سے نظر اٹھائی۔ مگر وہ آج بھی اتنا ہی بے نیاز تھا۔

"تمہاری آنکھوں میں زندگی کی تمام حسرتیں دم توڑ چکی تھیں۔ پھر میں اسی گھر میں تمہارے سامنے زندگی' ظلم کیسے کھیل سکتی تھی۔" اس کی آواز میں نمی تھی۔ "بہت دیر بعد جانا کہ مجھے یہ ہجر اس آئینے پہ ہی لکھنا چاہیے تھا' جسے میرا شوہر دیکھ کے سجتا اور سنورتا تھا کہ ان الفاظ نے اس کا سنگھار بھی بگاڑ دیا' مگر جب وہ پھر سے آباد ہو گیا تو مجھے کوئی پچھتاوا کبھی محسوس نہیں ہوا۔ اشہب' میں مجبور تھی' مجھے وہ گھر ہر حال میں چھوڑنا تھا کہ سورج مکھی سورج کو دیکھ بنا نہیں رہ سکتا۔" ٹپ ٹپ کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرے۔

کبھی تم ہجر لکھو تو
ہوا کی باس پہ لکھنا
سنہری دھوپ پہ لکھنا

"میں گوہر سے کیوں خلع لیتی۔ میں تمہیں اس گلٹ کے ساتھ زندگی کیسے گزارنے دیتی کہ تم اب کبھی کسی بھی عورت کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتے۔"

"بانو قدسیہ کا کہنا تھا کہ عورت کی محبت کو سمجھنا پاتال کی تہ کو چھونے جیسا ہوتا ہے۔ وہ اس سے یہ راز چھپا کے بیٹھی تھی اور وہ کیا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ یہ بھید برسوں سے جانتا تھا۔ ایک جان لیوا سی اذیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔

"تم اب بھی واپس آنا چاہو تو... میں اپنا ٹھکانا بدل لوں گا۔" وہ آواز دھیمی تھی کہ کان لگا کر سننا پڑتی' مگر اس میں موجود حزن شوریدہ تھا۔

اس نے اچانک نظر اٹھائی تھی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے وہ چہرا دیکھنے کی عادت جو تھی۔ مگر سامنے بیٹھے مرد کو وہ چہرا دیکھنے کی آج بھی صرف حسرت تھی۔

"نہیں... اب نہیں' اشہب۔" ان آنکھوں میں آج بھی گہری شام تھی۔ "ان کو دیکھنا' ان سے بات کرنا' ان سے ملنا کیا ضروری ہوتا ہے۔ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔" وہ مبہم سا مسکرائی اور وہ مبہم سا ہنسا۔

پروا محب آج بھی عجیب تھی' وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنے راستے پہ ہو لی۔ وہ وہیں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پنوں بلوچ کا اونٹوں کو موڑنے کی آواز سیکھ لینا ہی محبت ہے' جو مڑے نہیں۔



ثمو اس کے پاس بیٹھی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے رگڑ کر گرمائش پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایجاب و قبول کے لیے آئے مرد حضرات کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ ملاحہ نے بہن کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو وہ کسمسا کر گہری سانس بھرتی حواس میں لوٹی۔ ثمو نے گلاس تھام کر مہر کے لبوں سے لگایا تو اس پیاسوں کی طرح کئی گھونٹ بھر لیے۔

تائی جان سکون کا سانس لیتی اس تمام عرصے میں پہلی بار کرسی پر بیٹھیں۔

"حوصلہ کرو میری جان! کانٹوں پر چلنا ہو تو پیروں سے زیادہ دل مضبوط ہونا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر ارادہ ہمت دینا تو پھر اللہ کے ذمہ ہے نا" ثمو چچی کا لہجہ نرم اور نمکین اوس سے ڈھکا ہوا سا لگتا تھا۔ مہاہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنی برباد ہوتی زندگی کا دکھ ٹوٹ کر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ بلک اٹھی۔

"میں ہی کیوں چچی جان؟ کس گناہ کی پاداش میں یہ آزمائش اتری میرے اوپر۔"

"آزمائشیں گناہ کی پاداش میں نہیں بلکہ بندے اور اللہ کے تعلق کو آزمانے کے لیے اتاری جاتی ہیں مہر! اور اگر ہم سکھ اور خوشیاں بٹورتے وقت اللہ سے یہ سوال نہیں کرتے کہ "میں ہی کیوں" تو غم اور آزمائش کے وقت بھی نہیں کرنا چاہیے" مہاہ کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ مگر وہ کچھ بولی نہ تھی۔

"صبر تو اب آتے آتے ہی آئے گا نا!" سائرہ چچی نے مصنوعی دکھ سے آہ بھری۔

عفت سحر طاہر



"صبر کی شروعات آپ کر لو تو باقی کا صبر اللہ آپ کو دے دیتا ہے سائرہ۔ مگر شرط ہے کہ آزمائش کے پہلے مرحلے میں صبر کیا جائے۔ واویلا کرنے کے بعد تقدیر کے ہاتھوں خود کو بے بس مان کر چپ ہو نا صبر نہیں کہلاتا۔ وہ آپ کی مجبوری ہے۔" ثمو کا لہجہ ٹھہرا ہوا سا تھا۔

کمرے میں اب صرف مہاہ کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ اب صبر کے سوا اور کوئی چارہ باقی تھا کیا؟



نمیر کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ سومیہ کے لب و لہجے کا تلخی بھرا طنز کسی بھالے کی طرح سیدھا دل میں کھب گیا۔ اس کا وجود بدلے کی آگ میں بھڑ بھڑ جل رہا تھا۔ اسی لیے سومیہ کا بھرپور طنز اس کے زخموں پر چابک کی طرح پڑا اور تمام زخم پھر سے رسنے لگے۔

"موحد آفندی....." اس کی آنکھوں میں ضبط و برداشت کی خفیف سی سرخی اتر آئی۔ اسے یکلخت ہی بہت کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"تمہیں میری ضد اور انتقام کی اس جنگ کے بیچ نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ آفندی ہاؤس والوں کی اور میری انا کا کھیل تھا۔ تمہیں خود کو اور مجھے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ یہ نمیر وقار کی جنگ تھی اسے میں تنہا لڑتا۔ میں

سولھویں قسط



تمہیں اپنے مقابل بھی نہیں چاہتا تھا۔"
کمرے میں اے سی کب سے بند تھا۔ حبس زوروں پر تھا۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ اس پار ساون کی بارش موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ ہوا کی تیزی کے ساتھ بارش کی پھوار اس کے تپتے چہرے اور وجود سے ٹکرائی تو لمحہ بھر کے لیے اس نے آنکھیں موندلیں۔ سکون کی لہر نے اندر ابلتے آتش فشاں پر جیسے چھینٹا سا مارا ہو۔
"اور مہواہ آفندی.... اس کے لیے تمہیں بالکل بھی اسٹینڈ نہیں لینا چاہیے تھا موحد! اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ صدیقہ بیگم کی بیٹی ہے۔ مانا کہ وہ بے قصور ہے مگر میں بھی تو صرف زر نگار کا بیٹا ہونے کی سزا کاٹ رہا ہوں۔"
وہ جی بھر کر موحد کے اس اقدام پر شاکی ہوا۔ اور اس نئی افتاد سے نمٹنے کے لیے ذہن تیزی سے دوڑا رہا تھا۔
"مہواہ کو جتنی جلدی ممکن ہو سکے موحد کی زندگی سے نکالنا...." اس نے ایک اور ٹارگٹ سیٹ کیا تھا۔

مہواہ کی طبیعت سنبھلی تو اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے۔ وہ خوب صورت کامدانی جوڑا اسے کسی غلاظت کی طرح جسم سے لپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ثمو چچی کی تمام تر وضاحتوں کے باوجود ایک گناہ کا احساس کچوکے لگا رہا تھا۔
کسی کے نکاح میں ہونے کے باوجود گردش حیات نے اسے ایک اور زبردستی کے نکاح پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ رو کر گڑگڑا کر اللہ سے اس ناکردہ گناہ کی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگنے کو ہاتھ اٹھائے تو بس رو رو کر معافی ہی مانگتی رہی۔ اور کوئی حرف دعا یاد ہی نہ آیا۔ صدیقہ بیگم کمرے میں آئیں تب بھی اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ مگر کیا کرتیں بیٹی کی زندگی کو تباہ ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔
اکثر مائیں اپنے بچوں کی محبت میں انتہائی غلط قدم اٹھالیا کرتی ہیں.... وہ کام بھی کر جاتی ہیں جس کے کرنے کی اجازت اللہ نے نہیں دی ہوتی۔ یہ محبت نہیں صریحاً "جذباتیت" ہے۔ اور بے جا جذباتیت کسی ثواب کے زمرے میں نہیں آتی۔
"اب بس کرو یہ رونا پیٹنا۔ شکر کرو اللہ نے تمہیں ان لڑکیوں میں سے بنایا ہے جن کے ساتھ اگر کچھ برا ہوتا ہے تو پھر اس کی تلافی بھی ہو جاتی ہے۔" مہواہ نے دکھ کی شدید کیفیت میں گھرتے ہوئے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔
"میں مقام شکر پر کھڑی ہوں اور مجھے پتا بھی نہیں.... بہت خوب امی۔" اس نے رندھی آواز میں بہ مشکل کہا تو لہجہ دکھ اور تکلیف سے بوجھل تھا۔ آنسو تھے کہ جھر جھر آنکھوں سے بہتے اور وہ کسی ناراض بچی کی طرح انہیں ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کرتی جاتی۔
"مقام شکر نہیں تو اور کیا ہے مہو! کھڑے ہونے کے لیے پھر سے زمین کا مل جانا خوش نصیبی ہی ہوا کرتی ہے۔ گرے ہوئے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھیں تو یہ گرنے والے کی خوش قسمتی ہے۔ اب بس تم خود کو سنبھالو اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرو۔" انہوں نے اسے سمجھانے کے لیے لہجہ نرم ہی رکھا۔
"یہ آنکھ تو اب مارے شرم کے اٹھے گی ہی نہیں۔ کسی سے آنکھ ملانا تو دور کی بات ہے امی۔" وہ پر اذیت لہجے میں بولی تو ایک نوکیلا بھالا سا ان کے دل میں کھب گیا۔ ان کی کون سی لمبی چوڑی اولاد تھی' لے دے کر یہی دو بیٹیاں۔ اور قسمت نے کیسا ناک کردار کیا کہ نشانہ ان کا دل بنا۔
"ہک ہاہ' بدلہ ہی لینا تھا اس بے حمیت شخص نے تو سائرہ کی بیٹیاں بھی تو تھیں۔ میرے کلیجے پر ہی ہاتھ ڈالنا تھا ماں باپ کی طرح اس نے بھی۔" ان کی بات سن کر مہواہ نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔
"آپ کو پتا ہے بیٹی کا دکھ کتنا بڑا ہوتا ہے پھر بھی آپ دوسروں کی بیٹی کے لیے وہی تکلیف مانگ رہی ہیں امی۔"
"تزئین کا کیا ہے وہ تو خوشی خوشی نکاح کروالیتی۔ اس موئے نمیر اور پھر موحد سے بھی۔ یہ تم ہی ہو جو رو رو کر

آدھی ہوئی جا رہی ہو۔"

"گناہ در گناہ کا بھی کوئی ثواب ہوا کرتا ہے؟ ہاہ... مجھے نہیں پتا تھا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"شکر کرو کہ ثمرو نے سب کچھ جان کر بھی موحد کے لیے تمہارا رشتہ مانگ لیا۔ تم یہ نہیں سوچتیں کہ کل کلاں وہ ذلیل شخص نہ لوٹا تو زمانے کو کیا منہ دکھائیں گے ہم۔"

"یہی تو ہمارا المیہ ہے امی۔ زمانے کو دکھانے کے لیے ہمیں ہر عیب سے پاک منہ چاہیے اور اللہ کے لیے گناہوں سے لتھڑا ہوا منہ بھی چلے گا۔ اسی لیے تو عذاب مسلط ہیں ہم پر" اس نے تلخی سے کہا۔ تو صدیقہ بیگم کو ندامت سی محسوس ہوئی مگر یہ پل بھر ہی کا احساس تھا۔

"مصیبتیں اگر اللہ ڈالتا ہے تو ان کا حل بھی وہی سجھاتا ہے مہو۔"

"اللہ کی دل میں اتاری بات اور شیطانی وسوسے میں فرق کرنا آجائے تو ہماری زندگیاں ہی نہ بدل جائیں۔" وہ ان کی سوچ کے انداز پر آزردہ تھی۔

"اچھا اب اس قنوطیت کے دورے سے باہر آجاؤ۔ اور یہ کپڑے کیوں بدل لیے تم نے؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"اس لباس سے اچھا آج مجھے کفن لگتا امی۔" اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"بکواس مت کرو۔" ان کا دل دہلا۔ "اللہ کا شکر ادا کرو مہو۔ اس نے مشکل دی تو ساتھ آسانی بھی دے دی۔" ان کی اپنی ہی سوچ تھی۔ مہواہ کا سر دکھنے لگا۔ تائی جان اور آغا جان کی سوچ کو تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اب اس پتھر سے مزید سر نہیں پھوڑ سکتی تھی۔

"ذرا سا حوصلہ پکڑتیں تو آج تمہاری رخصتی ہو جاتی اور میری ٹینشن بھی دور ہوتی۔" انہوں نے غیر متوقع بات کی تو مہواہ کی آنکھیں پھیلیں۔

"آغا جان کا تو پتا ہی ہے تمہیں۔" انہوں نے ساتھ ہی جتا بھی دیا۔ کہ یہ بولنے یا اعتراض کرنے کا مقام نہیں۔ مگر آزمائشوں سے گزرے ہوؤں کے دل اکثر دکھے ہوئے ہی ہوتے ہیں۔

"موحد میرے لیے صرف دروازے کی ایک "اوٹ" ہے امی۔ آغا جان کے مزید غلط فیصلوں سے چھپنے کی اوٹ۔ اسے میرے لیے دروازہ مت سمجھیں کہ میں عمر بھر کے لیے اس میں سے اندر داخل ہو کر زندگی کے مزے لینا شروع کر دوں گی۔" مہواہ نے اس قدر سرد اور قطعی لہجے میں کہا تھا کہ وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔



"مہو کی طبیعت کیسی ہے اب؟" آغا جان نے ثمرو سے پوچھا تو وہ اچھی طرح ان کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے محتاط انداز میں بولیں۔

"کچھ بہتر ہے پہلے سے۔ میں نے خود ہی ریسٹ کرنے کو کہا ہے۔"

"ہوں..." انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "جتنی جلدی ہو سکے رخصت کرواؤ اسے۔ ذہن بٹے گا تو طبیعت بھی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی اس کی۔"

"جی بہت بہتر۔" ثمرو نے لب بھینچ لیے جیسے بہت کچھ کہنے سے خود کو روک لیا ہو۔

"موحد کہاں ہے؟" ان کو خیال آیا۔

"کمرے میں ہوگا۔ میں تو ابھی بھائی کے پاس سے آرہی ہوں۔"

"اسے بھیجو ذرا میرے پاس" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تو ثمرو گہری سانس بھرتی موحد کے

کمرے میں چلی آئیں۔ کھڑکیوں پر پردے گرائے اندھیرا کیے۔ اے سی کی کولنگ میں ڈوبے کمرے کی وحشت پل بھر میں ہی ثمرہ کے حواس پر طاری ہونے لگی تو انہوں نے گھبرا کر ہاتھ مارتے ہوئے لائٹ جلا دی۔ بستر خالی دیکھ کر وہ پلٹیں تو اسے آرام کرسی پر آنکھیں موندے جھولتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ روشنی ہوئی تو وہ کرسی ہلانا روک کر آنکھیں کھولے ان کو دیکھنے لگا۔

"ڈرا دیا تم نے تو... اتنا اندھیرا کر کے کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ باہر اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور تم نے کھڑکیوں کے پردے تک گرا رکھے ہیں۔ اے سی کی کولنگ اللہ کے بنائے ٹھنڈے موسم کا مقابلہ کر سکتی ہے بھلا۔" اے سی بند کر کے انہوں نے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے اور کھڑکی کھول دی۔ تیز بارش اب ہلکی ہلکی بوندا باندی میں بدل چکی تھی۔ مسلسل بولنے کا ایک مقصد شاید کمرے میں چھائی اداس خاموشی کو توڑنا بھی تھا۔ وہ پلٹ کر اس کے بستر کے کنارے ٹک گئیں۔

"آغا جان رخصتی کی بات کر رہے ہیں۔" وہ مجرمانہ انداز میں گویا ہوئیں تو موحد کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی۔

"ہم آپس میں ڈراما کر سکتے ہیں مگر ان کے سامنے نہیں۔" ثمرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو کروالیں رخصتی۔ یہ ڈراما بھی کیوں روکنا۔" وہ بے حد ترشی سے کہتا ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھا تو وہ تیزی سے آگے پیچھے جھولنے لگی۔ ثمرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ سب تمہاری رضامندی سے ہوا ہے موحد!" انہوں نے جتایا۔ "اور میرا مقصد صرف مہپاہ کو آغا جان کی غلط فیصلے سے بچانا ہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا ماما! آپ آگے بھی جو جی میں آئے وہی کریں۔" وہ خفا تھا۔ بے حد خفا۔ مگر ثمرہ کو یہ اجازت بہت بھلی لگی۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے۔ یہ ناکام عاشقوں جیسا جوگ لے کر کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ بس میرے کہے پر لبیک کہتے جاؤ۔" وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

"زندگی مذاق نہیں ہوتی۔"

"یہی بات مہر کے لیے بھی سوچ لو۔ اس کی زندگی کو تو سب نے ہی مذاق سمجھ لیا ہے۔" وہ رسان سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں تو موحد نے لب بھینچ لیے۔ پھر دفعتاً ان کے راستے میں آ گیا۔

"مان لیا کہ اس کی زندگی کا مذاق بنایا گیا۔ نمیر نے اپنی دشمنی نبھائی۔ آغا جان نے اپنی انا کو سرخرو کیا۔ مگر آپ نے موحد آفندی کو ان سب کی لائن میں کیوں کھڑا کر دیا؟" وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔ ثمرہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر تھام کر ذرا سا نیچے جھکایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"کیوں کہ میرا موحد ان سب کی طرح اس کی زندگی کو امتحان نہیں بنائے گا۔ مہر کے ساتھ کچھ برا نہیں کرے گا۔ کیوں کہ اس کے سینے میں موحد کا دل ہے نمیر آفندی کا نہیں۔" بہت نرمی سے کہتی وہ اس کا گال تھپتھپاتی کمرے سے نکل گئیں۔ موحد کے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ وہ ثمرہ کے بہت مان سے کہے لفظوں کا مطلب اچھے سے سمجھنے کے باوجود ان میں چکر پھیریاں کھا رہا تھا۔ وہ کبھی بھی مہپاہ آفندی نام کی اس آزمائش کو اپنے سر پر لادنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر وقت اور حالات اسے ہر طرف سے دھکیل کر اسی سمت لا رہے تھے۔ جہاں وہ اور مہپاہ مقابل تھے۔



وہ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا مگر اندر لگی آگ سرد ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ وہ لاکھ دل پر پہرے بٹھاتا۔ لاکھ مہپاہ کی یاد کو رد کرتا مگر دل پلٹ پلٹ کر مہپاہ کی بے وفائی کا سوگ منائے جاتا۔ جواب صحیح معنوں میں پرائی ہو گئی تھی۔ طلال کو یقین نہ آتا تھا۔ وہ گہری سیاہ پلکوں اور گلابی رنگت والی لڑکی جو اس کی بات سننے کے دوران بہت معصومیت بھرے اشتیاق سے اس کی صورت دیکھا کرتی تھی۔ جس نے ہمیشہ ہی اس کے جذبوں کو پذیرائی بخشی تھی۔ اس نے کبھی طلال کو محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ راہ محبت کا تنہا مسافر ہے اور راستے میں ہی کہیں کوئی موڑ مڑ گئی۔ اس نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیا۔

بھلا آگ کو آگ کی مدد سے بجھایا جا سکتا ہے؟ کمرے میں داخل ہوتی تزئین کا اندر موجود دھویں سے سانس الٹا۔ تو وہ بے اختیار کھانسنے لگی۔ ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ لرزا اور چائے پرچ میں چھلک گئی۔

"اللہ!" اس نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر پٹخ کر کھڑکیوں کے شیشے پرے ہٹائے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تیزی سے کمرے کی کثافت دور کر گیا۔

"تم کس غم کو غلط کر رہے ہو سگریٹ پھونک پھونک کر؟" اس کی حالت نے تزئین کو نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کرنے پر مجبور کر دیا۔ طلال نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے حیرت انگیز طور پر آرام سے بولا۔

"جب جانتی ہو تو بار بار پوچھنے کا کیا فائدہ؟" تزئین کے تو پیروں تلے جیسے کسی نے جلتے کوئلے بچھا دیے ہوں۔ یعنی اب وہ مدافعانہ انداز چھوڑ کر اس کے سامنے اقرار کیا کرے گا۔

"ایک شادی شدہ لڑکی کی یادوں کو سینے سے لگا کر تم محض اپنی زندگی تباہ کرو گے۔ اسے تمہاری اس "وفاداری" سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"ہو سکتا ہے وہ کبھی لوٹ ہی آئے۔ کم از کم انتظار میں کوئی تو موجود ہو۔" طلال کا لب و لہجہ معتدل تھا جیسے تزئین کا دل جلانے کی قسم کھائی ہو۔

"بے فکر رہو۔ اس بار اس کے ہاتھ جو ہیرا لگا ہے وہ کم از کم بھی کروڑپتی ہے۔ وہ واپس نہیں آنے والی۔ تمہارا انتظار انتظار ہی رہے گا ان شاء اللہ۔" وہ طنزیہ بولی تو طلال کے چہرے کے عضلات تن سے گئے۔ وہ جتنے بھی تحمل اور ٹھنڈے پن کا مظاہرہ کرتا تزئین کی شعلہ بیانی اسے جلا کر خاک کر ڈالتی تھی۔

"تم یہ سب بکواس سنانے آئی ہو مجھے؟" وہ بھنچے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں تو چائے لے کر اپنے شوہر کے پاس آئی تھی' یہاں ایک ناکام عاشق مل گیا تو کیا یہ بکواس کرنا میرا حق نہیں بنتا؟" وہ ترنت بولی۔ طلال اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھا۔ چائے کا کپ اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ تزئین کا دل لرز سا گیا۔

"تم جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو تاعمر ناکام زندگی گزارتی ہیں جنہیں اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ شوہر کے دل پر راج کیسے کیا جاتا ہے۔ جو شوہر کے ماضی کو نہ بھولتی ہیں اور نہ اسے بھولنے دیتی ہیں۔ تو پھر ٹھیک ہے گزارو ایسے ہی زندگی۔ میں تو ویسے ہی سزا کاٹ رہا ہوں۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور دروازہ کھول کر یوں کھڑا ہوا جیسے اسے دفع ہو جانے کا کہہ رہا ہو۔ تزئین دندناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ طلال نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور بستر پر گر سا گیا۔

"یا اللہ محبت کرنے کی سزا... آخر کب تلک؟" پیٹ بھرا ہوا ہو تو محبت سے محرومی زندگی کی دوسری تلخ حقیقت ہے۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ اور افسوس کہ اس نے جلد بازی میں شریک سفر بھی ایسا چنا جو اس کے زخموں

پر پچھاوے رکھنے کے بجائے روزانہ کی بنیاد پر ان زخموں کو کرید تا رہتا تھا۔ وہ ماضی کو بھلاتا بھی تو کیسے؟ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ عشق حقیقی ہو یا مجازی دونوں میں ہی شرک کی کہیں گنجائش نہیں۔۔۔ مہوہ کی بے وفائی کے بعد اس نے بھی تو وہی کیا جو مہو نے۔۔۔ بلکہ مہو سے پہلے ہی شادی رچالی اور شرک کی سزا بہت سخت ہوا کرتی ہے بے شک۔ وہ مضمحل سا ان گنت سوچوں کے حصار میں گم تھا۔

تزئین نے لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تو ماما نے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے ٹی وی کی آواز بند کر دی۔ چند لمحے وہ یونہی آنسو بہاتی رہی پھر گویا پھٹ پڑی۔

"آپ کبھی بھی مجھ سے رونے کی وجہ مت پوچھیے گا؟ آپ بھی اپنے بیٹے کی طرح صرف تماشا ہی دیکھ سکتی ہیں۔" یہ بدتمیزی کی انتہا تھی۔ لیکن وہ تزئین کے انداز میں اسے جواب دینا نہیں چاہتی تھیں۔ سو ذرا تحمل ہی کا مظاہرہ کیا۔

"تم لوگوں کی آوازیں کمرے سے باہر تک آتی ہیں تزئین! کیوں کہ بدقسمتی سے وہ ساؤنڈ پروف کمرہ نہیں ہے۔"

"تو پھر سمجھاتی کیوں نہیں اسے آپ۔" وہ اسی درشتی سے بول رہی تھی۔ ماما نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اسے نہیں۔۔۔ تمہیں سمجھائے جانے کی ضرورت ہے تزئین۔" تزئین تلملا اٹھی۔

"ایک تو میں نے آپ لوگوں کی عزت بچا کر احسان کیا۔ اس شادی کے لیے ہامی بھرلی۔ اوپر سے یہ صلہ مل رہا ہے مجھے۔ طعنے تشنے جھڑکیاں۔" ماما نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"میں تو کیا اس گھر کے نوکر بھی اس لب و لہجے سے واقف ہو گئے ہیں جس میں تم اپنے شوہر سے مخاطب ہوتی ہو۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں تو تزئین بل کھا کر رہ گئی۔

"اور جہاں تک بات ہے شادی کا احسان کرنے کی تو طلال کو کبھی بھی رشتوں کی کمی نہیں تھی تزئین۔ اب یہ بات تم خود سوچو کہ تم نے اس قدر افراتفری کے پروپوزل پر ہامی کیسے بھرلی۔۔۔ کیا محض ہم پر احسان کرنے کے لیے؟"

"آپ بھی اسی کی ماں ہیں اسی کی حمایت کریں گی نا۔ وہ ادھر محبوبہ کی یاد میں سگریٹ پھونک رہا ہے ادھر آپ بہو کو تیلی دکھا رہی ہیں۔" وہ بدتمیزی کی حد تک اتر آئی۔

"ایک کامیاب بیوی وہ ہوتی ہے جو اپنے حسن سلوک سے شوہر کو ماضی بھلانے پر مجبور کر دے تزئین۔ جس طرح تم پلٹ پلٹ کر اسے ماضی کی طرف دھکیلتی ہو وہ کبھی بھی نہ تو اس فیز سے نکلے گا اور نہ ہی کبھی تمہارا ہو گا۔" وہ سرد مہری سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہاں۔۔۔ آپ بددعا نہیں دیں گی تو اور کون دے گا۔ آپ کے تو دل کو ٹھنڈک ہے کہ آپ کا بیٹا کم از کم آپ کے تو ہاتھ میں ہے۔" تزئین نے زہر خندہ لہجے میں کہا تھا۔

"اپنے رویے پر غور کرو تزئین۔ اگر طلال سے محبت ہے تو اپنے اطوار بدل لو۔ اس پر اعتماد کرو اور اسے ایک بار سے کھڑے ہونے کا موقع اور وقت دو۔ اب کی بار اگر اسے گرانے کا باعث تم بنیں تو وہ زندگی بھر اٹھ نہیں پائے گا۔" وہ کہہ کر چلی گئی تھیں۔ تزئین پیچھے جلتی کڑھتی سلگنے کو اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

"ہونہہ۔۔۔ میری جگہ اپنی بیٹی ہوتی تو پھر دیکھتی ایسا لیکچر کیسے دیتی ہیں۔"



ناشتے کی میز پر وہ جان بوجھ کر کافی دیر سے پہنچی تو اندازہ تھا کہ سب ناشتے سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ وہ کسی کا

بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب تو کبھی بھی نہیں۔ وائے قسمت کہ ابھی وہ وہاں کھڑی ناشتے کا مینیو سوچ ہی رہی تھی کہ تزئین صبح صبح ہی آدھمکی۔ چچی جان بیٹی کی سُتی شکل دیکھ کر دل ہی دل میں خیر کی دعا مانگتی اس کے گلے لگیں۔

"ناشتا کرو گی؟ طلال چھوڑ کر گیا ہے کیا؟" انہوں نے محتاط انداز میں "سن گن" لینا چاہی۔ مگر وہ بہت بے زار سی تھی۔

"ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔ اور صرف چائے پیوں گی۔ سر درد سے پھٹ رہا ہے۔" وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ مہواہ اسے نظر انداز کرتی ناشتا بنانے کے لیے کچن میں چلی آئی۔ اب مجبوراً "تزئین کے لیے بھی چائے اسی کو بنانا تھی۔ چچی جان تو وہیں بیٹھ کر بیٹی کے کانوں میں پر تشویش انداز میں کھسر پھسر کرنے لگی تھیں۔ پہلے ہی سے بے زار کن اور دل گرفتہ کیفیت کا شکار مہواہ صبح صبح تزئین کو دیکھ کر مزید کوفت زدہ ہو رہی تھی۔ اسی لیے انڈا تلنے کا ارادہ ملتوی کر کے بہت بے دلی سے اپنے لیے دو توس ٹوسٹر میں ڈال کر سینکے اور ہلکی سی جیم کی تہہ لگا کر پلیٹ میں رکھ لیے۔ دو مگوں میں چائے ڈالی اور ٹرے اٹھا کر باہر چلی آئی تو وہاں موحد کو چچی اور تزئین کے ساتھ براجمان دیکھ کر وہ عجیب خجل سی کیفیت کا شکار ہوئی۔ مگر جب موحد اس پر بس اچٹتی سنجیدہ سی نظر ڈال کر تزئین کی طرف متوجہ ہو گیا تب وہ بھی خود کو مضبوط ظاہر کرتی آگے چلی آئی اور ٹرے میز پر رکھتے ہوئے چائے کا ایک کپ تزئین کے آگے رکھا۔ اور خود ناشتا کرنے کی غرض سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھنے ہی والی تھی کہ بری طرح ٹھٹک گئی۔ ناشتے کی ٹرے موحد نے یوں اپنی طرف گھسیٹی جیسے وہ اسی کے لیے لائی ہو۔ اور توس کا ٹکڑا دانتوں سے توڑ کر چباتے ہوئے ناگواری سے بولا۔

"انڈا تو بنا لیتیں کم از کم..... سوکھے توس گلے میں پھنستے ہیں میرے۔" مہواہ کا جی چاہا اسے کوئی کرارا سا جواب دے (خوامخواہ کا شوہر بنا ہوا تھا وہ 'ہونہہ') مگر چچی جان اور تزئین کی موجودگی میں کچھ کہہ کر وہ ان کے ہاتھ مزید جگ ہنسائی کا سامان نہیں تھمانا چاہتی تھی۔ سو دانتوں پر دانت جمائی بیٹھ گئی۔

"میرا تو اب اس گھر میں واپس جانے کا دل ہی نہیں کرتا۔" تزئین نے ایک دم سے موشگافی کی تو انداز بگڑا ہوا تھا۔

"بے وقوف ہو تم۔ بجائے اس کے کہ ان موصوف کا دماغ ٹھکانے لگاؤ تم اسے کھلی چھٹی دے کر چلی آئیں۔" موحد نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے تاسف سے تزئین کی بے وقوفی کا ماتم بھی کیا۔

"دماغ..... ہونہہ" تزئین نے تیز نظر پہلے موحد پر ڈالی اور پھر پھسلتی..... نگاہ مہواہ پر ڈالتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"جس دماغ میں ایک ہی چہرہ اور پرانی یادیں بھری پڑی ہوں' اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش میں مجھے خود ٹھکانے لگنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"چائے پیو۔ پھر آرام سے بات کرتے ہیں" چچی جان کو بیٹی کی بد زبانی کا اچھی طرح علم تھا۔ تادیبی انداز میں کہا تو ان کی نظروں میں تنبیہ بھی تھی۔ مگر تزئین تو تپتا سلگتا دل لے کر آئی تھی۔ اب جبکہ ہدف سامنے مل گیا تھا تو وہ بھلا کیوں چوکتی۔ مہواہ کو نظر کی گرفت میں رکھتے ہوئے طنزیہ بولی۔

"آرام تو اب ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے رخصت ہو گیا امی۔ عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ جو ہیرا سمجھ کر جلتا کوئلہ ہاتھ میں لے لیا۔ مصنوعی چمک نے للچا دیا تھا مجھے۔ اور ادھر لوگوں کی لاٹری پر لاٹری نکل رہی ہے۔ پہلے طلال اور اب موحد آفندی۔" مہواہ کی برداشت ختم ہو گئی۔

"شٹ اپ تزئین۔ اپنی ناکام ـــــ زندگی کا ملبہ مجھ پر مت گراؤ۔ یہ تمہاری دلی خواہش اور قطعی ذاتی فیصلہ تھا۔ اور نفس کے طمع کو مٹانے کے لیے جو خواہشات پوری کی جائیں' ان کا تاوان بھرنے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے۔" وہ سرد مہری سے کہتی اٹھ گئی۔ درحقیقت تزئین کی اس گھٹیا بات سے دل کے مضراب پر بہت اوچھا ہاتھ پڑا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ضبط سے لال چہرہ لیے کچن میں چلی گئی۔ حق دق بیٹھی تزئین جیسے حواس میں لوٹی۔

"دیکھ رہی ہیں آپ اس کی زبان کے جوہر؟" سلگ کر چچی جان سے شکایت کی۔ چائے کا مگ خالی کرکے رکھتے موحد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ وہ گونگی ہے؟"

"میرا گھر تباہ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے۔ طلال کے دل و دماغ پر اسی کا نام نقش ہے۔" وہ ہذیانی کیفیت کا شکار ہونے لگی۔ موحد کی مسکراہٹ سمٹی۔

"یہ تم سے طلال نے کہا ہے؟"

"ہروقت خاموش رہنا۔ سوچوں میں گم۔ سب سے کٹے ہوئے۔ اس کا اور کیا مطلب ہوا موحد آفندی؟ میں بے وقوف نہیں ہوں سب سمجھتی ہوں۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔

"ٹھوکر کھائے ہوؤں کو سنبھلنے کا موقع اور وقت دینا چاہیے تزئین۔" موحد نے سنجیدگی سے کہا (اور واقعی کیا صحیح کہا تھا)

"ہونہہ! تو تم نے کیوں نہ موقع دیا اسے سنبھلنے کا۔ اپنی دفعہ تو فوراً "کمّے بازی پر اتر آئے تھے۔" وہ طنزیہ بولی۔

"وہ اور بات تھی۔ ایک بندہ ہمارے گھر کی عورتوں کی ریسپکٹ نہیں کرے گا تو میں اسے ہر بار ایسے ہی بھاؤں گا۔" موحد کا انداز اٹل تھا۔ پھر کرسی کھسکا کر اٹھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں بولا۔

"اپنی زندگی بے سروپا باتوں کے پیچھے برباد مت کرو تزئین۔ وہ شخص مہواہ کے نصیب سے نکل چکا ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ اسے اپنے آپ میں ڈھالنا اب تمہاری ذمہ داری ہے ناکہ بار بار اسے پرانے تعلق کے طعنے دینا۔"

"کسی خوش فہمی میں تم بھی نہ رہنا۔۔۔ نمیر آفندی شب خون نہ مارتا تو مہواہ اسی طلال کی ہوتی۔ صرف مجبوری اسے طلال کو چھوڑنا پڑا اور یہ بات سب جانتے ہیں۔ تو کیا مہواہ بھول چکی ہے اپنی پہلی محبت کو؟" وہ بگڑ کر تیز لہجے میں بولی۔

"اس بات کی فکر تو نمیر آفندی کو ہونی چاہیے۔" وہ جاتے ہوئے لاپروائی سے کہہ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد متحیر سی تزئین ہارے تجسس کے ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ کیا کہانی چل رہی ہے ادھر۔ بیوی اس کی ہے اور فرق نمیر آفندی کو پڑنا چاہیے۔"

"آغا جان کی ضد نبھائی ہے۔ بس مہو نے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ بس آغا جان کا منہ بند کرنے کے لیے کھیل کھیلا ہے ثمو نے ان کے ساتھ مل کر۔"

"تو کیا رخصتی ابھی تک نہیں ہوئی؟" تزئین کا منہ کھلا۔

"طبیعت کی خرابی کا بہانہ چلا آرہا ہے ایک ہفتے سے۔ نہ صدیقہ بھابھی کو فرق پڑ رہا ہے اور نہ ثمو کو۔ اس کا کیا مطلب ہوا بھلا؟" وہ اس کی طرف جھک کر سرگوشیانہ رازداری سے بولیں۔

"اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ محض آغا جان کی ضد سے چھٹکارا پانے کے لیے مہو راضی ہوئی ہے اس نکاح پر۔

یعنی اگر کل کو نمیر اسے طلاق دے دے تو یہ پھر سے طلال کی نظر میں مظلوم بن سکتی ہے۔" تزئین کو جھٹکا لگا۔ طلال نوید تو اب اس کے دل کی ضد بن چکا تھا۔

"اتنی دور کی مت سوچو۔" چچی جان نے اسے گھر کا۔

"میں خود بات کروں گی آغا جان سے۔" تزئین نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ چچی جان نے اسے منع بھی کیا مگر شادی شدہ ہونے کے بعد تو وہ جیسے اور نڈر ہو گئی تھی۔ سر جھٹک کر چائے کے گھونٹ بھرتی آغا جان کے سامنے بولنے والے متاثر کن ڈائیلاگ سوچنے لگی۔



تزئین کا آنا مہواہ کو کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں ناشتا کرنے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا بھی ملاحہ کے ہاتھ کمرے میں ہی منگوا لیا۔ صبح والی منہ ماری کے بعد فی الحال تو تزئین کی شکل دیکھنے کو اس کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے طلال پر بھی افسوس ہوا۔ جلد بازی میں وہ اپنی زندگی کا بہت غلط فیصلہ کر گیا تھا۔ اور اب اسے نبھا بھی نہیں پا رہا تھا۔ مہواہ کے ساتھ۔ قسمت نے کھیل کھیلا تو وہ طلال سے کنارہ کر گئی مگر طلال نے تو

فوراً" کی بنیاد پر تزئین کو پروپوز کر کے اس کی بے وفائی کا گویا جواب دیا تھا۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ تزئین کا کوئی بھی شک و شبہ درست نہ تھا۔ یہ دل اب طلال نوید کے نام پر پہلے جیسی بے ترتیبی سے نہیں دھڑکتا تھا۔ درحقیقت زندگی نے اتنے جھٹکے دیے تھے کہ ماضی کی تمام یادیں گڈمڈ ہو کر ناقابل شناخت لگنے لگی تھیں۔ کبھی طلال کے سنگ زندگی گزارنا زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوا کرتا تھا اور اب نمیر آفندی سے چھٹکارا پانا زندگی کا مقصد نظر آتا تھا۔ سچ تو یہ ہے دکھ وہی سب سے بڑا ہوتا ہے، جو حاضر وقت میں آپ کی جان کو لگا ہوا ہو۔ اور طلال تو اس ساری بھاگ دوڑ میں کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب تو بس وہ ہر وقت نمیر سے چھٹکارے کی تراکیب سوچتی رہتی تھی۔

"تم نے کیا تماشا بنا لیا ہے۔ کس سے چھپ کر کمرے میں گھسی بیٹھی ہو؟" رات کے کھانے کے وقت تائی جان مہواہ پر برس پڑی تھیں۔

"ایسا کوئی فخر بھی نہیں ہے میرے پاس کہ جا کر ڈھٹائی سے سب کے درمیان بیٹھ جاؤں۔" وہ تکلیف وہ حد تک تلخ ہوتی جا رہی تھی۔

"مگر جان بوجھ کر ایسا کوئی گناہ بھی نہیں کیا کہ سب سے چھپ کر بیٹھنا پڑے۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھو مہواہ۔" تائی جان اسے کوئی چھوٹ دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"چلو اٹھو اور سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ اس طرح کنارہ کشی کرو گی تو آغا جان پھر سے تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔" ان کی بات میں وزن تھا۔ مہواہ کو ان کا کہا ماننا ہی پڑا اور اسی لیے وہ کھانے کی میز پر قدرے سائیڈ پر ملاحہ کے ساتھ بیٹھی اور شکر کیا کہ بنا کسی بدمزگی کے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران کھانا کھا لیا گیا۔ یہ تو کھانے کے بعد جب مرد اٹھ کر لاؤنج میں چلے گئے۔ اور چائے کا دور چلا۔ خواتین نے چائے ڈائننگ پر ہی لگالی۔ تب مہو کا سکون غارت ہوا۔ وہ بھی تزئین کی بات پر۔

"پھر مہو کی باقاعدہ رخصتی کب کروا رہی ہیں آپ؟" وہ ثمو چچی سے مخاطب تھی۔ مہواہ کی انگلیوں کی گرفت کپ کے ہینڈل پر مزید سخت ہو گئی۔

"رخصتی بس ہوئی سمجھو۔ گھر ہی کی تو بات ہے۔" انہوں نے مسکرا کر بات سمیٹی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ گھر کی بات ہے تو کیا اب یہ دونوں شادی کے بعد بھی اپنے اپنے پورشنز میں رہیں گے؟" تزئین کو اعتراض ہوا۔ ثمو نے بے آرامی سے پہلو بدلا۔

"مہو کی طبیعت خراب تھی بس اسی لیے رکے رہے" تائی جان نے بھی ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے تزئین! شادی ہو گئی ہے تو رخصتی بھی ہو جائے گی۔" مہواہ کی آنکھوں میں ضبط کا گلابی پن اور لہجہ سخت تھا۔

"مجھے مسئلہ یہ ہے کہ تم کسی سائیڈ لگو تو طلال بھی تمہاری طرف سے بددل ہو کر میری زندگی میں لوٹے۔" وہ منہ پھٹ تو تھی ہی۔ مگر اس قدر تکلیف دہ حد تک ہو گی یہ مہواہ نے سوچا نہیں تھا۔ زرد پڑتی رنگت لیے چند ثانیوں تک تو وہ جواب دینے سے بھی معذور رہ گئی۔

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو تزئین! اگر طلال اور تمہارے مابین کوئی مسئلہ ہے تو وہ تم دونوں خود حل کرو۔ مہر کو الزام مت دو۔" ثمو نے کسی کے بھی بولنے سے پہلے تزئین کو جھڑک دیا۔

"ان کا ماضی ایک حقیقت ہے آنٹی" تزئین برا مان گئی۔

"حال ماضی سے زیادہ ویلیو ایبل (قابل قدر) ہوتا ہے تزئین! اور مہواہ کا "حال" موحد آفندی ہے یہ مت بھولو۔ دوسرا یہ کہ مجھے خود بھی یہ بات پسند نہیں کہ تم میری بہو کا نام کسی اور کے معاملے میں لو۔" انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر قطعی انداز میں کہا تو تزئین ہونق سی ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ثمو کو ماضی کی اپنی منہ پھٹ بہو اتنی جلدی اتنی عزیز ہو جائے گی کہ وہ اس کی حمایت میں یوں ٹکا تو ڑ جواب دینے پر اتر آئیں گی۔ سائرہ نے تاسف سے بیٹی کو دیکھا۔ جو منہ کھولنے سے پہلے کم ہی سوچتی تھی۔

"تم طلال کی طرف دھیان دو تزئین! اتنے مختصر سے عرصے میں کئی بار بگڑ چکی تم لوگوں کے بیچ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" تائی جان کا میٹھا اور بہت کڑوا تھا۔ تزئین بہت اچھی طرح سمجھی اور حوصلے سے پی بھی گئی۔ مگر رات گئے وہ ساری شکایتیں طلال اور مہواہ کے حوالے سے اپنے تحفظات کے نکات آغا جان کے کانوں میں انڈیل کر اسٹڈی سے باہر نکلی تو شاد و آباد تھی۔



"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اب مجھ سے کیا مسئلہ ہو رہا ہے۔ میرے بارے میں آغا جان کو مشورے دینے والی تم کون ہوتی ہو؟" مہواہ کے لیے اب تزئین سے نمٹنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ورنہ تو اس نے یہی سوچ رکھا تھا کہ جتنے دن وہ آفندی ہاؤس میں رہے گی اس کے منہ نہیں لگنا۔ مگر ابھی جب تائی جان نے آغا جان کا پیغام اس تک پہنچایا کہ انہوں نے اب فوری طور پر مہو کی رخصتی کا عندیہ دیا ہے تو وہ بھڑک کر تزئین کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اطمینان سے لیٹی موبائل کی اسکرین پر انگلی چلا رہی تھی۔ مہواہ کی بات سن کر پیشانی پر ناگواری کی شکنیں لیے اٹھ بیٹھی۔

"یہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی مسئلہ ہے مہواہ! تم ہماری زندگیوں سے نکلی ہی کب ہو۔" مہواہ کی قوت گویائی لمحہ بھر کو سلب ہوئی۔

"اور اب اگر طلال کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم یہ رخصتی نہیں چاہتیں تو پھر شاید جو بھی کرے وہ کم ہو گا۔"

"تم اپنے مسائل کو اپنی ذات کے ذریعے حل کرو۔ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر مت چلاؤ۔" مہواہ سختی سے بولی۔ پھر اسے جتایا۔

"میرے اور طلال کے بیچ اگر کچھ ہوتا تو وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے فوری طور پر تمہیں پروپوز نہ کرتا۔ بلکہ میرے پلٹنے کا انتظار کرتا۔"

"وہ اب بھی یہی کررہا ہے۔" تزئین پھٹ پڑی۔

"کیونکہ تمہیں اس کو ہینڈل کرنا نہیں آرہا۔" مہواہ نے طنز کیا۔

"ہاں.... اس کا ریموٹ جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔" تزئین کون سا کم تھی۔

"مجھے اب طلال میں کوئی دلچسپی نہیں تزئین۔" وہ بہت ضبط سے بولی۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری زندگی کن مسائل سے دوچار ہے۔ میں نے خود اپنی مرضی سے طلال کو چھوڑا تھا۔ چاہتی تو جس طرح اب موحد کے ساتھ نکاح کروالیا اس وقت طلال سے ہی کروالیتی۔ مگر میں الحمد للہ صحیح اور غلط کے بارے اچھی طرح جانتی ہوں۔"

(جس کے پاؤں میں "حال" کا "کانٹا" چبھ رہا ہو' وہ ماضی کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؟) مہواہ کا دل اندر ہی اندر کرلایا۔

تزئین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ہاں.... تو موحد کے ساتھ نکاح کیا ہے پھر؟"

"وہ میرا مسئلہ ہے.... تم اپنے ذہن کا گند صاف کرلو بس۔ طلال نوید کو میں اپنی زندگی سے بہت پہلے الگ کرچکی ہوں۔ پہلے مجبوری میں.... لیکن تم سے شادی کے بعد تو یہ دل بہ راضی و رضا اس سے دستبردار ہوگیا تھا۔" مہواہ نے بہت تحمل سے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھی۔

"مگر اس کے دل پر سے تمہارا سایہ ابھی تک نہیں گیا۔" تزئین تلخی سے بولی۔

"یہ تمہارا قصور ہے تزئین نہ کہ میرا۔ وہ بیوی ہی کیا جو اپنے شوہر کے دل پر اپنا نقش نہ چڑھا سکے۔" مہواہ نے طنز کیا۔

"چہ.... خوب۔ یعنی تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا کہ تمہاری وجہ سے میرا گھر تباہ ہورہا ہے۔" تزئین بہت جلد آپے سے باہر ہوجاتی تھی۔ بات کو اپنے رخ سے سمجھ کر فیصلے صادر کرنے والی۔ جلد باز۔

مہواہ نے آنکھیں موند کر بے بسی سے گہری سانس بھری۔ پھر اسے دیکھ کر تیوری چڑھا کر بولی۔

"جو بکواس میں نے کی ہے نا۔ اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہی ہے کہ مجھے اب طلال نوید میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تمہارے دل کی "چور خواہش" تھا۔ اللہ نے اسے تمہارے نام کردیا۔ میرے لیے جو بہتر تھا وہ مجھے مل گیا۔ اب برائے مہربانی تم دونوں میاں بیوی اپنی زندگی کو سنبھالو نہ کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگیں اڑانے کی کوشش کرتے رہو۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اور اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے زور سے دروازہ بند کیا۔ پیچھے تزئین کا چہرہ ضبط سے لال ہورہا تھا۔



اب مہواہ جتنا بھی واویلا مچاتی' ہوتا وہی جو آغا جان طے کرچکے تھے۔ شام سے پہلے پہلے اس کے کپڑے اور ضروریات کا سارا سامان نہ صرف موحد کے کمرے میں شفٹ کردیا گیا بلکہ اس کی رخصتی کا عندیہ بھی سب کو دے دیا گیا۔ مہواہ سن ہوگئی تھی۔ جیسے کسی بھی احتجاج اور اعتراض سے قاصر ہوگئی ہو۔ ذہن کچھ بھی سوچنے سے معذور تھا اور جس طرح تائی جان نے لاؤنج میں آکر مسکراتے ہوئے ملاحہ کو دیکھ کر ہاتھ جھاڑے' وہ منظر مہواہ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا تھا۔ خود ملاحہ کا دل ماں کی اس شقی القلبی پر دکھا' سو دکھا مہواہ اسی وقت تن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جو

فیصلہ پل صراط پر چلنے کے مترادف لگ رہا تھا وہ اسی ایک پل میں طے پا گیا۔

"بہت خوب امی۔۔۔ تو آج سے میں آپ کے لیے پرائی ہو گئی۔ ایک بار' ایک مستقل ٹینشن تھی جو آپ کے سر سے اتر گئی۔۔۔ مگر یہ ضرور یاد رکھیے گا کہ یہ آپ کا اور آغا جان کا کیا تھا جو میں بھگت رہی ہوں۔ کیونکہ آزمائش ہمیشہ مال اور اولاد کی طرف سے آیا کرتی ہے۔" آنسوؤں سے بھیگے لہجے میں کہتی وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ تائی جان کو منجمد اور ملاحہ کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر وہاں سے ثمو چچی کے پورشن میں چلی آئی۔ اور یہ موحد کا کمرہ تھا۔۔۔ اس کے قدم ٹھٹکے۔۔۔ جسے اب اس کا مسکن بنا دیا گیا تھا۔

"یا اللہ میں نے نہیں۔۔۔ یہ سب میری قسمت میں تُو نے لکھا ہے۔ میں تو بس اپنا کردار نبھا رہی ہوں بلکہ نبھانے پر مجبور کر دی گئی ہوں۔ اب میری حفاظت کرنے والا صرف تُو ہے۔" وہ دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

اس نے کئی بار کا دیکھا ہوا کمرہ تھا مگر اب وہاں مہاہ کی کئی چیزیں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے تکلیف سے آنکھیں موند لیں۔ زندگی اس قدر "سخت" بھی ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو بہت نازک احساسات کی مالک تھی۔ زندگی کو پھولوں کی سیج سمجھنے والی۔ مگر اب ایک دم ہی کانٹوں بھری روش پر نکل آئی تو صرف پیر ہی نہیں پورا وجود زخمی بلکہ لیرولیر ہو گیا تھا۔ ثمو نے موحد کو کمرے کے باہر ہی روک لیا۔

"جی خاتون! فرمایئے؟" وہ مسکرا دیا۔

"آغا جان نے مہاہ کو رخصت کر دیا ہے۔" ثمو کی بات پر اس کو جھٹکا سا لگا۔ ایک دم مسکراہٹ گم ہوئی۔

"کس کے ساتھ؟" بے اختیار ہی پوچھ لیا تو انہوں نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔

"تمہارے روم میں شفٹ کر دیا ہے اسے۔"

"واٹ۔۔۔؟" یہ موحد کے اعصاب کے لیے دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔

"وہ بہت کچھ سہہ چکی ہے موحد! اب آگے کی زندگی تمہاری ذہانت اور سوچ پر ڈیپینڈ کرتی ہے۔ اسے مزید ہرٹ مت ہونے دینا۔" ثمو نے امید بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جہاں بیزاری چھا چکی تھی۔

"بے فکر رہیں آپ۔ وہ محترمہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ زبان درازی کے مظاہرے تو ماضی قریب میں آپ دیکھ ہی چکی ہیں۔ اور آپ کا بیٹا تو دنیا کا آخری مرد ہوتا تب بھی انہیں قبول نہیں تھا۔"

"فضول باتیں مت کرو موحد! تم اس کے نہ چاہتے بھی وہ پہلے شخص بن گئے ہو جسے اس نے قبول کیا ہے۔ اور جو میں کہہ رہی ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔" انہوں نے سختی سے ڈپٹا۔ تو وہ اکتا کر بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب مجھے میرے کمرے میں جانے کی اجازت ملے گی یا نہیں۔ تھکا ہوا آیا ہوں۔"

وہ گہری سانس بھرتی وہاں سے ہٹ گئیں۔ موحد لب بھینچے اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اندر لیڈیز پرفیوم کی پھیلی ہوئی دلکش مگر انجان سی مہک قوت شامہ سے ٹکرا کر اس کے حواسوں کو بیدار کر گئی۔ اسی وقت موحد آفندی کو شدت سے احساس ہو گیا کہ قدرت اسے ایک کڑے امتحان میں ڈال چکی تھی۔



وہ بہت مضمحل اور ہاری ہوئی کیفیت میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی سرنیہوڑائے۔ گویا زندگی کے بے ثباتی پر غور کر رہی ہو۔ کبیر بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھ آیا۔ سیاہ جوتوں میں مقید مردانہ پیر نظروں کی گرفت میں آئے تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟" نگاہ کا انداز چاہے بدلا ہو مگر لب و لہجے کے احترام میں قطعاً "کوئی فرق

نہیں آیا تھا۔ وہ تشویش بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
ملاحہ نے آزردگی سے اسے دیکھا۔ "ہارنے والے ایسے ہی بیٹھا کرتے ہیں کبیر! خاموش اور سر جھکا کر۔"
"ہار جیت کا فیصلہ وقت کرتا ہے ملاحہ بی بی۔۔۔ ہو سکتا ہے جسے آپ ہار سمجھ رہی ہوں وہ جیت کی پہلی سیڑھی ہو۔" کبیر کا انداز تسلی دینے والا تھا۔
ملاحہ استہزائیہ مسکرا دی۔ "کوئی زندگی کی بازی ہار گیا کبیر صاحب۔۔۔ اور آپ خوش گمانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔"
"بہتری کرنے والی اللہ کی ذات ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ "ہو جانے" کا افسوس کیا کرنا۔ اس سے اچھا ہے کہ آگے کی بہتری کے لیے کوشش کی جائے۔" وہ اپنی مخصوص نرمی سے کہہ رہا تھا۔
ملاحہ گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہاری باتوں کے بل پر سوچا جائے تو زندگی کتنی آسان ہے خان۔"
"زندگی ویسی ہی بن جاتی ہے جیسا آپ اسے سمجھتے ہیں۔ اپنے گمان اچھے کرلیں بس۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔
ملاحہ نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی۔ "تمہاری زندگی تو بہت آسان ہوگی پھر۔"
کبیر نے بے اختیار گہری سانس بھری۔ وہ بھول رہا تھا کہ اس کے سامنے ملاحہ آفندی بیٹھی تھی کوئی عام لڑکی نہیں۔ مگر پھر خود کو سنبھالتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"پہلے تو نہیں تھی مگر اب بہت آسان لگنے لگی ہے۔"
ملاحہ کا دل الگ تان پر دھڑکا۔ "اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟"
وہ چاہتی تو اس سوال کو جانے دیتی مگر محبوب کے ہر جواب میں ہزار معنی ہوتے ہیں اور ان ہزار معنوں میں سے اپنے من پسند مطالب اخذ کرنے کا الگ ہی نشہ ہے۔ کبیر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
"جب سے یہ دل خوش گمانیوں میں گھرا ہے' آگے کی منزل بہت آسان لگنے لگی ہے۔"
ملاحہ سے ان آنکھوں کے شربتی کانچ سے نگاہ ملانا مشکل ہونے لگا۔ لیکن زندگی کو گزشتہ کچھ عرصے میں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔
"میں بھی اس سب کو بہت آسان سمجھتی تھی کبیر۔۔۔ مگر آپی کو دیکھ کر ہمت ختم ہوگئی۔" اس نے تھک کر ستون سے ٹیک لگالی۔
"دو قدم کنارہ رہ جائے اور یک بہ یک آکر موجیں گھیر لیں۔۔۔ اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھا ہے میں نے۔"
"اللہ نے ان کے لیے بھی بہت اچھے فیصلے لکھے ہوں گے' مجھے یقین ہے۔"
"محبت کا کھو جانا۔۔۔ مسلسل آزمائش کا شکار رہنا۔۔۔ اچھے فیصلے کب ظاہر ہوں گے کبیر؟"
"اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے ملاحہ بی بی۔ وہ صبر کریں گی تو پھل بہت اچھا ملے گا۔" وہ خلوص سے بولا۔
اس کے بعد ایک خاموشی دونوں کے درمیان ٹھہر گئی۔ وہ دونوں ہی چپ تھے جیسے دونوں ہی اس خاموشی کو توڑنا نہ چاہتے ہوں۔ پھر کسی خواب کے حصار میں گھری ملاحہ کی آواز ابھری۔
"اور ہم۔۔۔؟" اس کا سوال آدھا تھا۔ مگر معنی پورے رکھتا تھا۔
کبیر نے اس کے ملیح چہرے پر نظر ڈالی۔ آزردگی میں وہ بچوں کی طرح خوف زدہ اور معصوم نظر آتی تھی۔
"ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ اسے دیکھ کر تو اب دل ویسے ہی ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ ملاحہ نے اسے ہلکا

سا گھور کر دیکھا۔
"یہ تسلی ہے یا مجھے ڈرا رہے ہو کبیر؟"
وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ پھر ذو معنی انداز میں بولا۔ "یہ دعا ہے ملاحہ بی بی۔۔۔ ورد ہے حرف تسلی ہے۔"
ملاحہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ "بس تم کبھی پلٹنا مت کبیر۔۔۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔"
"قول دیا ہے ملاحہ آفندی۔۔۔ اور مرد قول نہیں ہارا کرتے۔" کبیر کا لہجہ بہت سنجیدہ اور اٹل تھا۔ ملاحہ کا دل تو اس کے انداز تخاطب پر ہی دھڑک دھڑک گیا۔
"زندگی کی بساط پر آپ کو نہ جیتا تو کیا خاک جیے۔" وہ اس کے تمتماتے چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لیے ملائمت سے کہہ رہا تھا۔ اور ملاحہ۔۔۔ وہ تو ہواؤں میں تھی گویا۔ کبیر نے ذرا سا جھک کر اس کے آگے سر خم کیا تو وہ کھل کر مسکرا دی۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جو انیکسی کی طرز پر باقی گھر سے الگ تھا۔



وہ تولیے سے تھپتھپا کر چہرہ خشک کرتی واش روم سے نکلی تو موحد کو ایزی چیئر پر جھولتے پایا۔ مہماہ کی نظروں میں یہ ایک گھٹیا ترین صورت حال تھی کہ آپ ایک شخص کو ماضی میں بار بار نیچا دکھاتے رہے ہوں۔ اسے اس کی اوقات بتاتے رہے ہوں اور اب ایک دم سے اس کے کمرے کے شراکت دار بن کر آجائیں۔ اسے دیکھ کر کرسی کی حرکت رک گئی۔ (اور ساتھ ہی گویا مہماہ کی دھڑکن بھی) وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہماہ کا دل اچھل کر حلق تک آیا۔ اب وہ مہماہ کے مقابل کھڑا تھا۔
"کسی کے واش روم میں گھس کر اتنا ٹائم لگانا ایٹی کیٹس کے خلاف ہے بائی دا وے۔" وہ جتانے والے انداز میں بولا تو مہماہ کی آنکھیں ذہنی جھٹکے کے تحت ایک دم سے پوری کھل گئیں۔
"اور میں پوچھ سکتا ہوں کہ ویسے تو بڑی بڑی باتیں کرتی ہو تو یہ رخصتی کیوں ہونے دی تم نے؟" وہ طنز کر رہا تھا۔
"مجبوری تھی کہ ساری عمر کے لیے بے ہوش نہیں رہ سکتی تھی۔" وہ لفظوں کو چبا کر بولی۔
چند لمحے اس کی بات پر گویا غور کرنے کے بعد گہری سانس بھر کر وہ بولا۔ "ہاں۔۔۔ یہ بھی ہے"
مہماہ اس کی بات اور انداز پر کڑھ کر رہ گئی۔
وہ اپنے کپڑے لیے واش روم کی طرف جا رہا تھا۔ مہماہ بیڈ کے کنارے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ پھر کچھ سوچ کر فی الفور اٹھی اور کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا رخ ثمو کے کمرے کی طرف تھا۔ اسی وقت موحد کا بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا موبائل بج اٹھا۔ موبائل کی سیاہ اسکرین پوری آب و تاب سے روشن تھی۔ اور اس پر نمیر آفندی کالنگ کے الفاظ دکھائی دے رہے تھے۔
"جس نے جو گیم کھیلنا تھا کھیل لیا۔ مگر میں اصلیت جانتی ہی نہیں مانتی بھی ہوں چچی جان کہ موحد سے پہلے میں نمیر آفندی کے نکاح میں ہوں اور میں اپنی عزت نفس کو مرنے نہیں دوں گی۔" تیز سانسوں کے درمیان وہ ان کے کمرے میں کھڑی تلخی سے کہہ رہی تھی۔
ثمو نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ "کیا ہو گیا مہو۔۔۔ موحد نے کچھ الٹا سیدھا کہا ہے کیا؟"
"اس نے کچھ نہیں کہا چچی جان۔ بس میں موحد کے کمرے میں نہیں رہوں گی۔" اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ تو اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھ کر ثمو نے فوراً آگے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا اور اس کا رخسار چوم کر محبت سے بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ بالکل صحیح کہہ رہی ہو تم۔ اور آج سے تم میرے پاس رہو گی میرے کمرے میں۔ اس پر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

مہاہ کے ذہن میں موجود تمام لمبے لمبے اقتباسات یک لخت اڑ گئے۔ ثمو نے تو اسے بحث کا کوئی موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ان سے لپٹ کر آنسو بہانے لگی۔ کم از کم کوئی تو تھا جو اس کی تکلیف کو سمجھتا تھا۔ اور ثمو سوچ رہی تھیں کہ اگر مہاہ کو پتا چل جائے کہ وہ بھی نمیر آفندی کے اس کھیل سے واقف تھیں تو وہ کیا قیامت مچائے گی؟ وہ آہ بھر کر رہ گئیں۔

موحد واش روم سے باہر نکلا تو اس کا موبائل بج بج کر اب خاموش ہو چکا تھا۔ اسے پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ مہاہ اس کے کمرے میں نہیں تھی۔ اور یہ صورت حال اس کے لیے بھی اطمینان کا باعث بنی۔ مہاہ کا اس کمرے میں موجود رہنا دونوں کے لیے ہی ناقابل قبول فیصلہ تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر مسڈ کالز چیک کیں۔

"نمیر آفندی۔!!" اس کی پیشانی پر شکنیں پھیلیں۔ تین چار مسڈ کالز آچکی تھیں۔

"اسے کیا تکلیف ہوئی جو اتنی کالز کرتا رہا ہے؟" وہ زیر لب ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے اسی نمبر پر کال بیک کرنے لگا۔ دوسری ہی بیل پر کال اٹینڈ کرلی گئی۔

"جی فرمائیے نمیر آفندی صاحب۔۔۔ ایسی کیا ایمرجنسی آن پڑی تھی جو کال پر کال کرنے کی ضرورت پیش آگئی وہ بھی اس صورت میں کہ میں نے تمہیں انتہائی ضرورت کے بنا کال کرنے سے منع کر رکھا ہے۔" وہ چبا چبا کر تلخی سے پوچھ رہا تھا۔ پھر دوسری طرف کی بات سن کر اس نے آنکھیں موند کر گہری سانس بھری۔ اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔ مگر اس سے زیادہ کی مجھ سے توقع مت رکھنا۔ میں تمہارا کانٹیکٹ نمبر بلاک لسٹ میں شامل کر رہا ہوں۔ آئندہ مجھ سے جو بھی بات کرنی ہو وہ آفس میں آکر کرنا۔" اس نے اگلی بات سنے بغیر لائن کاٹ دی۔ اور موبائل بستر پر اچھال دیا۔

"اس نمیر آفندی کا کھیل بھی جان کا وبال بنتا جا رہا ہے۔" زیر لب ناگواری سے خود کلامی کرتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش پھیرتا غائب دماغی کی کیفیت میں تھا۔ اوپر سے مہاہ کی رخصتی کی ٹینشن۔۔۔ وہ سوچ چکا تھا کہ مہاہ کو ثمو کے کمرے میں شفٹ ہونے کا کہہ دے گا۔ اس کا خود کو کسی بھی قسم کے امتحان میں ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ناشتا کر کے آفس کے لیے نکلا تو ایک حیران کن منظر نے اس کے قدم ٹھٹکا دیے۔

بہت نرمی سے مسکرا کر کچھ کہتی ملاحہ۔۔۔ کالج جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی اور دروازہ کھول کر کھڑا کبیر۔ ابھی فرزین اندر سے آئی نہیں تھی شاید۔ موحد آفندی کے لیے اس سارے منظر میں حیرت کی بات کبیر خان کی مسکراہٹ اور ملاحہ کے لیے مکمل توجہ بھرے تاثرات بنے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کبیر خان گھر کی خواتین کے سامنے نظر اٹھا کر بات نہیں کیا کرتا۔ تو پھر یہاں نیا کیا تھا؟ لمحے بھر میں ہی اس کے ذہن میں کلک ہوا۔ جو تعلق اور وابستگی ان دونوں کے مابین دکھائی دے رہی تھی وہ موحد آفندی سمجھ گیا تھا۔ کھنکھار کر آگے بڑھتا وہ دونوں کو چونکا کر گیا تھا۔ کبیر خان کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دے کر بے نیازی سے سن گلاسز آنکھوں پر لگاتے ہوئے ان کے پاس سے گزر کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔



وہ ایک ہفتہ آفندی ہاؤس میں رہی اور اس دوران طلال نے ایک بار بھی فون کرکے اس کی خیریت معلوم نہ کی تھی۔ تنگ آکر سائرہ چچی نے خود ہی اسے احساس دلایا۔

"بیوقوفی مت کرو تزئین۔ جو گھوڑا پہلے ہی باگیں تڑانے کے درپے ہے تم اسے کھلا چھوڑ آئی ہو میری بچی۔ گھر قسمت سے نہیں عقل سے بنا کرتے ہیں۔" اور وہ ان کی بات اچھی طرح سمجھ گئی تب ہی ڈھیٹوں کی طرح خود ہی ڈرائیور کو فون کرکے بلالیا۔

دل میں طلال کی طرف سے شکوہ بھی تھا۔ گھر پہنچی تو ماما ہمیشہ کی طرح اپنی مخصوص سنجیدگی سے ملیں۔ اس کا احوال پوچھا اور اس کے گھر والوں کی خیریت بھی دریافت کی۔ تزئین بھی نارمل انداز میں ان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ پھر چینج کرنے کا کہہ کر بیگ اٹھائے کمرے میں چلی آئی۔

اے سی چلا کر وہ خود کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر باہر نکلی تو موبائل لیے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

"ہم.... پتا تو چلے محترم طلال صاحب کس مصروفیت میں بزی ہیں۔" اس نے طلال کو کال ملائی تھی۔ اپنے گھر اور کمرے کی ملکیت کے احساس سے موڈ قدرتی طور پر خود ہی اچھا ہو گیا تھا۔ ورنہ آتے ہوئے تو دل میں اس کی طرف سے شدید غبار بھرا ہوا تھا۔ بیل بج بج کر لائن خود بخود منقطع ہو گئی.... دوبار' تین بار' چار بار.... تزئین نے اس کے دونوں موبائل نمبرز چیک کرلیے۔ بیل جا رہی تھی فون بزی بھی نہیں تھا مگر وہ باوجود اس کا نمبر دیکھنے کے کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ اس کا بی پی ہائی ہونے کو تھا۔ اب ظاہر ہے وہ دونوں موبائل فون آفس میں رکھ کر تو کہیں باہر نہیں جاسکتا تھا۔ تنگ آکر کچھ سوچتے ہوئے اس نے آفس کا لینڈ لائن نمبر ملایا تو وہ بزی جا رہا تھا۔

"اوہ.... تو گویا لینڈ لائن پر مصروف ہیں جناب۔" اس کو قدرے حوصلہ ہوا۔ مگر پھر بھی اس نے طلال کے پی اے کا نمبر ملالیا۔

"مسز طلال بول رہی ہوں.... طلال کہاں ہیں اس وقت؟ وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہے میری۔" بہت بارعب انداز میں پوچھا۔

اس کی پہلے بھی کئی بار طلال کے پی اے سے بات ہو چکی تھی۔ اگر کبھی طلال کال اٹینڈ نہ کرتا تو وہ پی اے کو کال کرکے طلال کی مصروفیت کنفرم کر لیتی تھی۔ باتونی سا بندہ تھا۔ ایک سوال کے جواب میں چار باتیں بتا دیتا تھا۔ دوسرے یہ کہ تزئین کی کسی کلاس فیلو کا کزن تھا تو تزئین ہی نے طلال سے نوکری کی سفارش کرکے اسے پی اے رکھوایا تھا۔ اور اسے باتوں ہی باتوں میں پابند بھی کر دیا تھا کہ تزئین جو بات پوچھے اسے بالکل صحیح معلومات دینا اس کا پہلا کام ہے۔ اور یہ بات پی اے سے بڑھ کر اور کون جان سکتا ہے کہ صاحب سے زیادہ صاحب کی بیوی "صاحب" ہوا کرتی ہے۔ تزئین اس کی مصروفیات کی انفارمیشن اس کے پی اے سے گاہے بگاہے لیتی رہتی ہے یہ بات طلال کو جس روز پتا چلتی اس روز کوئی نہ کوئی قیامت ضرور اٹھنی تھی۔

"جی میڈم.... وہ اس لیے کہ اس وقت وہ دوسری لینڈ لائن پر ضروری بات میں مصروف ہیں۔ اسی وجہ سے موبائل کی کال اٹینڈ نہیں کر رہے ہوں گے۔ مگر آپ فکر مت کریں۔ ان کی کال ختم ہوتے ہی میں آپ کا میسج ان تک پہنچادوں گا۔" اس نے حسب عادت لمبی بات کی تھی۔

"خیر.... ایک آدھ میسج تو بندہ کال کے دوران بھی کر ہی سکتا ہے اپنی مجبوری بتانے کے لیے۔" تزئین کی تیوری کے بلوں میں اضافہ ہوا۔

"جی میڈم۔ آپ درست فرما رہی ہیں۔" وہ مؤدبانہ بولا۔ وہ جانتا تھا میڈم کی ہاں میں ہاں ملانے میں ہی بہتری

ہے۔
"کس کا فون سن رہے ہیں بائے داوے؟" اس نے یوں ہی فون بند کرنے سے پہلے بر سبیل تذکرہ پوچھ لیا۔
"کسی مہواہ آفندی کی کال آئی تھی میڈم۔ ان ہی سے بات کر رہے ہیں۔ یہ انفارمیشن صرف آپ کے لیے ہے میڈم ورنہ کسی کو کالز انفارمیشن دینے کی اجازت نہیں مجھے۔" وہ اسے کالر کا نام بتانے کے بعد لجاجت سے کہہ رہا تھا۔
تزئین کو چار سو چالیس وولٹ سے بھی زیادہ بڑا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بے اختیار فون بند کر دیا۔
"مہواہ.... ؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ وہ اپنی شکی فطرت سے مجبور ہو کر بے شک طلال پر مہواہ کے حوالے سے الزام تراشی کرتی رہتی تھی۔ ان کے ماضی کا تعلق تزئین کے دل میں پھانس بن کر اٹکا ہوا تھا مگر یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مہو اور طلال ابھی بھی رابطے میں ہو سکتے ہیں۔ وہ بے جان سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔
"آئی کانٹ بلیو.... (میں یقین نہیں کر سکتی)۔
ابھی کل ہی تو مہو بھاری بھرکم باتیں کر کے اس کی غلط فہمیاں دور کر رہی تھی اور کتنی سچی بھی لگ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دو نکاح کروا کر بھی وہ ابھی تک طلال کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ تزئین کی رگوں میں شرارے دوڑنے لگے۔



"تم میری خاطر ایک بار.... صرف ایک بار طلال سے بات کر لو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی مہو۔ تزئین کا گھر خراب ہو رہا ہے۔" سائرہ چچی تو گویا تزئین کے گھر سے نکلتے ہی مہواہ کے سر ہو گئی تھیں۔ وہ بے یقینی بھرے تحیر سے انہیں دیکھنے لگی۔
"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے مگر طلال کو پتا نہیں کیا خوش فہمی ہے کہ وہ ابھی تک تمہارے پلٹنے کے انتظار میں ہے۔ اس کی یہ خوش فہمی ختم کر دو بس تو تمہاری بہن سکون کی زندگی گزار سکے۔" وہ بڑی عاجزی سے کہہ رہی تھیں۔
"چچی جان.... میں بھلا کیسے بات کر سکتی ہوں اس سے.... اور اتنا کچھ ہو جانے کے بعد اب طلال سے اس طرح فیور لوں گی تو کیا اس کی خوش فہمی اور نہیں بڑھے گی؟ اور بالفرض وہ میری بات مان بھی لیتا ہے تو کیا اس "سفارش" پر تزئین کا پارہ نہیں چڑھے گا؟"
"اس بے وقوف لڑکی کو کون بتائے گا۔ تم بس میری بات کی لاج رکھ لو بیٹا۔ ایک بے بنیاد بات کے پیچھے روز روز گھر چھوڑ کر آنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں دونوں اپنا گھر خراب نہ کر لیں۔" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔ مہواہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔
انہوں نے پیار اور مان بھرے انداز میں اس کی ٹھوڑی کو چھوا تو گہری سانس بھرتے ہوئے مہواہ نے طلال کو کال کر ہی دی.... دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔
"موبائل پر تو تمہارا نمبر آ جائے گا۔ کبھی تزئین کی نظر پڑ گئی تو.... یہ آفس کا نمبر ہے طلال کے" چچی جان نے ایک پرچی اس کی طرف بڑھائی تو وہ ان کی احتیاط پر اش اش کر اٹھی۔
آدمی اپنے بچاؤ کے لیے ساری ذہانت لڑا لیا کرتا ہے۔ کہیں کوئی سقم نہیں رہنے دینا چاہتا۔ مگر ہوتا تو وہی کرتا ہے جو میرے رب کی چاہت ہے اس کے "کن" کے آگے سب کے پلانز فیل ہو جاتے ہیں۔ اس نے چچی جان کے سامنے ہی بات کی تھی۔

”زہے نصیب۔۔۔“ اس کی آواز پہچانتے ہی طلال بے یقین ہوا۔
”تزئین گھر واپس چلی گئی ہے طلال۔۔۔ اب کوشش کرو کہ ماضی کو بھلا کر تم بھی اپنی زندگی کو بہتر طریقے سے شروع کرو۔ اس طرح روز روز کی ناراضیوں سے ہمارے گھر میں بھی ٹینشن پھیلتی ہے۔“
”میری زندگی کا ہر خواب تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم تھا مہر۔۔۔ نئی زندگی شروع کرنا تو بے وفاؤں کا کام ہوا کرتا ہے۔“ وہ جذباتی ہوا۔ مہر کو غصہ آیا۔
”تو پھر لعنت بھیجو مجھ پر اور اپنا گھر خراب ہونے سے بچاؤ۔ میری زندگی میں تمہاری اب کوئی جگہ نہیں ہے طلال۔ تم تزئین کو اپنی مرضی سے اپنا چکے ہو تو بہتر یہی ہو گا کہ میری طرف سے ہر غلط فہمی اور خوش فہمی دور کر کے اپنی زندگی شروع کرو۔“ وہ سرد مہری سے صفاچٹ انداز میں بولتی ہوئی۔ لمحہ بھر کو رکی تو دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔
”مجھے امید ہے کہ آئندہ مجھے تمہاری یہ خوش فہمی سننے کو نہیں ملے گی کہ تم ابھی بھی میرے لوٹنے کے انتظار میں ہو۔۔۔ کیونکہ لوٹنے والے تو چھوڑ کر جایا ہی نہیں کرتے مسٹر طلال۔۔۔ میں نے اصل محبت موحد آفندی ہی سے کی ہے اور تب ہی آج ہم ایک ساتھ ہیں۔“ وہ بہت بے دردی سے نشتر پر نشتر اس کے سینے میں اتارتی رہی اور سائرہ چچی کے دل میں ٹھنڈ پڑتی گئی۔ وہ اب مہاہ کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھیں۔
”یا اللہ۔۔۔“ ان کے جانے کے بعد وہ سر ہاتھوں میں تھامتی بستر پر گر گئی۔ تو آنکھیں نم ہونے لگیں۔ طلال کے ساتھ پہلے ہی کم زیادتی ہوئی تھی جواب یہ اور ظلم۔۔۔ یہ نشتر۔۔۔ اف!! کچھ بھی تھا محبت تو مہاہ نے بھی اس سے ہی کی تھی۔

تعلق بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی ہو جائے

محبت سے وہ پہلا مسکرانا یاد رہتا ہے

وہ اپنی زندگی کے اس قدر غیر یقینی موڑ پر خود بھی ششدر تھی۔ ایسے مستقبل کے خواب تو اس نے کبھی بھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ خاموشی سے آنسو بہائے گئی کہ ایک یہی اس کے اختیار میں تھا۔ سائرہ چچی کی باتوں میں آکر طلال سے رابطہ کرنا اسے کتنا مہنگا پڑنے والا تھا' یہ ابھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔
اس کا موبائل مسلسل بجتا جا رہا تھا۔ نیا کمرہ اور اجنبی ماحول ہونے کی وجہ سے رات گئے نیند آتی تھی۔ اسی لیے مہاہ ابھی تک سو رہی تھی۔ ثمرہ بتی جلائے بنا اٹھ کر ناشتے کے لیے چلی گئیں۔ مگر کچھ دیر بعد ہی اس کا موبائل مسلسل بجنے لگا۔ اس نے یونہی نیند میں ہی سوئے جاگے ذہن کے ساتھ موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔
”ہیلو۔۔۔“
”نئی زندگی کی یہ صبح بھی مبارک ہو۔۔۔“ ایک بالکل انجان آواز سے زیادہ الفاظ کا چناؤ مہاہ کی آنکھیں کھولنے کا باعث بنا۔
”کون۔۔۔ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟“
”مجھے تو تم ہی سے بات کرنی ہے۔۔۔ تم بتاؤ' نمیر آفندی کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟“
مہاہ کا دل کنپٹیوں میں دھڑکا۔ ”کک کون نمیر آفندی؟“
”تمہارا پہلا اور اصلی شوہر۔ دوسرا نکاح کرتے ہی بھول گئیں کیا؟“ دوسری طرف سے سفاکی سے کہا گیا تو مہاہ کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تہمینہ چوہدری

شام کے مسافر

شام‘ دھند کی چادر بس اوڑھنے ہی والی تھی۔ صبح کا تھکا ماندہ شاہ خاور اب اپنی مسافت تمام کیے کسی اور دیس سدھارنے کی تیاری میں مگن تھا اور چاند اور تارے اپنے سفر کا آغاز کررہے تھے۔ آسمان اور زمین کے بیچ دھند کی گھمن گھیریاں چل رہی تھیں۔ جب وہ اپنے پنڈ کی طرف آنے والی آخری بس سے اترا تھا۔

اتنے سالوں میں بھی گاؤں کا منظر نہیں بدلا تھا۔ گھنے درختوں سے گھرے اڈے پر جا بجا دکانیں کھلی تھیں‘ وگرنہ تو سرشام ہی بند ہوجاتی تھیں۔ اس نے گہرا سانس بھر کر مٹی کی دھیمی دھیمی خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا۔ سڑک سے سیدھا سپاٹ راستہ گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ درختوں سے گھری پگڈنڈی پر اس نے آہستگی سے قدم بڑھائے تھے۔ راستہ طویل تھا اور وہ سست رو۔



ذہن پر ماضی کے خیالات کی شورش تھی۔ ایک کے بعد ایک منظر نہاں خانوں سے نکل کر کسی ریل کی طرح اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔



"تم فون کیوں نہیں اٹھاتیں، کسی دن میں تمہیں ہی اٹھا کر لے جاؤں گا۔" دیوار سے برآمد ہوتے سر نے بڑی ناراضی سے جتایا تھا۔

ثمن کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ دیوار سے جھانکتے سر کو اس نے بڑی درشتی سے گھورا تھا۔ وہ دیوار کے اس پار دیکھنے کے لیے اسٹول کا سہارا لیتی تھی، مگر وہاں کھڑے "انڈر ٹیکر" کو کسی اسٹول کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ویسے ہی پورا "عالم چنا" تھا۔ ان دونوں کے گھروں کی دیواریں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

مین گیٹ کا دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ ڈیوڑھی کے اطراف میں بیٹھک اور ایک کمرہ تھا، جبکہ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر دائیں طرف دو کمرے، بائیں طرف سرخ ٹائلوں سے مزین واش روم اور کچن تھا۔ سامنے بھی ایک قطار میں تین کمرے تھے، جن کے ساتھ سے ہی سیڑھیاں اوپر چھت کی طرف جاتی تھیں۔ کچن اور واش روم کے ساتھ تھوڑی سی جگہ بچتی تھی جو ادھر ادھر کی سن گن کے لیے تھی۔ یعنی وہ بھی یہاں پر اسٹول رکھ کر دوسری طرف والوں کے گھر "در آمدات برآمدات" کرتی تھی اور وہ بھی ایسے ہی، کیونکہ باقی سارا گھر تو تقریباً کمروں سے گھرا ہوا تھا، صرف وسط میں صحن بچتا تھا جو مختلف چھوٹے بڑے گملوں سے سجایا گیا تھا۔

"میری مرضی، میں جب دل کرے اٹھاؤں۔" ثمن کی بے نیازی پر نہال جل کر کباب ہو گیا تھا۔ "ویسے بھی میں مصروف تھی۔" شان بے نیازی سے اس نے ایک وجہ پیش کی۔

"تمہاری مرضی اور مصروفیت نہیں چلے گی میرے سامنے۔" وہ بھنا گیا۔

چند لمحے غصے سے اسے گھورنے کے بعد وہ دیوار سے ہٹ گیا تھا۔ ثمن بھی کچن میں واپس آ گئی تھی۔ اسے اپنا کام مکمل کرنا تھا۔ کسی بھی وقت دادا اور عباس کی سواری آتی ہوگی۔ اس کے ماں، باپ کی ناگہانی موت کے بعد دادا نے ہی انہیں پالا تھا، اور انہیں کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کسی نے بڑے زور سے پٹخا۔ وہ چپاتیاں لپیٹ رہی تھی، جب عباس غصے سے اندر آیا۔

"سنبھال لے دادے کو...." ثمن کی نظریں سوالیہ تھیں، مگر اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ غصے سے دہاڑا تھا۔ اس نے دہل کر اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا تھا۔

"کیا ہوا دادا جان کو؟" فطری فکر لہجے میں گھلی تھی۔

"دادے کو تو شاید کچھ نہ ہو، مگر مجھے ضرور ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔" وہ بے حد غصے میں تھا۔ "آج پھر اپنے "دادے" کو ہمسایوں کی "دادی" کے ساتھ "الطاف فروٹ چاٹ" پر فروٹ چاٹ کھاتے اور لاڈیاں "کرتے پکڑا ہے۔" وہ لفظ "لاڈیاں" پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

"یا اللہ! میں سمجھی پتا نہیں کیا ہو گیا۔" اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"میرے دوست میرا کتنا مذاق اڑاتے ہیں، تمہیں کیا پتا۔ ہمارا دادا اس عمر میں ہمارے منہ پر کالک مل رہا ہے۔" دکھی شکوہ... بے بس لہجہ....

وہ صحن میں پڑی لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تو تم مان کیوں نہیں جاتے۔" وہ بھی اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"اس عمر میں اب دادا دوسری شادی کریں گے۔" وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کی دماغی حالت پر شک ہوا ہو۔

"پچھلی عمر کی پہلی محبت ہے دادا کی۔" وہ بھی دوبدو بولی تھی۔

نہ جانے وہ کس پر پڑ گئی تھی۔ اپنے خاندان کے باقی ماندہ افراد سے یکسر مختلف۔۔۔ محبت سے گندھی مٹی سے بنی۔۔۔ جذبوں سے بھرپور۔۔۔ وہ کسی کا دل نہیں توڑتی تھی، چاہے کوئی ستر سال کا ہو یا سات سال کا۔۔۔ وہ سب کے لیے ایک جیسا سوچتی تھی۔ زمانے کی اونچ نیچ سے یکسر مبرا ہو کر۔ وہ دل کی پروا کرتی تھی، رواجوں کی نہیں، وہ گھن لگی فرسودہ رسموں کو پنپنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اگر تو اپنی اولین چاہت کو لے کر دادا جان کے سامنے آتا اور وہ انکار کر دیتے" پھر تیرے دل پر کیا بیتتی؟ محبت عمر کی قید سے آزاد ہوتی ہے عباس! ہم نے ساری زندگی دادا جان کو سلگتے دیکھا ہے محبت کسی گھن لگی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر انہیں ختم کرتی رہی ہے۔ اگر قدرت انہیں موقع دے رہی ہے تو تم بھی اپنا دل تھوڑا وسیع کر لو۔ امی، ابا کے بعد جیسے دادا جان نے ہمیں پالا ہے، یہ محض ان ہی کا ظرف تھا۔ اگر ہم ان کی محبت کا قرض ان کی محبت ان کی جھولی میں ڈال کر چکا سکتے ہیں تو کیوں نہیں۔"

حالانکہ وہ دو سال وہ اس سے بڑا تھا، مگر سبیکا (سیانی) وہ بن بیٹھی تھی اور بڑی تفصیل سے اسے سمجھا رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اسے منانے کا جتن کر رہی تھی۔

"دادی کو بھی تو آسرے کی ضرورت ہے۔ تمہیں پتا ہے، جو حالات ہیں انہال کے گھر کے۔ وہ تو شکر کریں گے دادی سے جان چھوٹی۔ اگر اس عمر میں اپنی کچی عمر کی محبت کو پالینے کا مزا وہ چکھ لیں تو آخر کیا مضائقہ ہے؟"

عمرو عیار کی زنبیل میں دلیلیں بے شمار تھیں۔ جسے وہ یکے بعد دیگرے نکال کر اس کے سامنے رکھتی جا رہی تھی۔

"بس تم رہنے دو۔۔۔ میری اور دادا کی عمر میں فرق ہے۔ اگر اس عمر میں اپنی محبت کے لیے میں کچھ کروں گا تو لوگ چند دن باتیں کر کے چپ کر جائیں گے، مگر دادے کی شادی کو ——— نہ جانے کیسے کیسے گندے القابات سے نوازیں گے۔"

وہ لاکھ سیانی ہی سہی، عمرو عیار سہی، مگر وہ دنیا میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ بڑا ہی سفاک تجزیہ کر کے اس کے سامنے دھر دیا تھا۔ چند لمحے وہ لاجواب سی ہو گئی تھی، مگر پھر اپنی کمان سنبھال لی۔ توپوں کا رخ ایک بار پھر سے مخالف کی جانب تھا۔

"لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ وقت گواہ ہے کہ لوگوں نے نہ تو بادشاہ وقت کو معاف کیا، نہ ہی پیغمبروں کو، تو پھر ایسے لوگوں کی کیا پروا کرنی۔" اس نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر اٹھ گیا تھا۔

کھانا تیار تھا، وہ اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی، مگر وہ کھائے بغیر ہی چلا گیا تھا اپنے کمرے میں۔

گرمی اب بڑھنے لگی تھی۔ بھوک تو اس سیانی نے ماردی تھی، اور اب وہ صرف سونا چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں گھسا، دادا جان مین گیٹ سے ڈیوڑھی میں ایسے داخل ہوئے جیسے اسی سے چھپ کر دروازے کے باہر بیٹھے ہوں، کسی نو عمر عاشق کی طرح، جسے اس کے باپ نے پکڑ لیا ہو۔ جھینپے جھینپے سے۔ شرمائے لہرائے۔۔۔ کسی الھڑ نوجوان کی طرح۔

"ہائیں!" اس کے جانے اور ان کے آنے کے صحیح صحیح وقت پر حیرانی سے بڑبڑائی پھر سر جھٹک کر بولی۔

"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟ صبح بھی آپ نے تھوڑا سا ہی کھایا تھا۔" کچھ بھی جتائے بغیر نرم و ملائم لہجہ۔۔۔ حالانکہ انہیں یقین واثق تھا کہ عباس نے ایک کی اپنی طرف سے دس لگا کر رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کیا ہو گا۔

"جیتی رہو۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی تھی۔ "رشتوں کا مان رکھنے کا ہنر بھی وہ سوہنا رب کسی کسی کو ہی دیتا ہے۔" وہ ہاتھ دھو کر کسی فرماں بردار بچے کی طرف پلاسٹک کی میز چارپائی کے سامنے رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ یہ پیپل کا درخت بھی نعمت ہی تھا رب کا۔ جو صحن کے عین وسط میں کس

طمطراق سے کھڑا تھا۔ اسے بھی اب اس گھر کے ہر فرد سے انسیت سی ہونے لگی تھی۔
وہ کھانا لینے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اے لڑکی! سنو!" انہال نے دیوار پر سے جھانکا تھا۔
گرمیوں میں تو یوں لگتا تھا جیسے رات کے بعد ڈائریکٹ ہی دوپہر ہو جاتی ہے۔ سورج غصے سے آگ برساتا رہتا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر پھر سو جاتی تھی اور پھر اپنی مرضی سے ہی اٹھتی تھی۔ دادا جان کا اپنا اسٹور تھا۔ گاؤں کا اکلوتا اسٹور جہاں سے ہر چیز مل جاتی تھی۔ عباس یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا۔ وہ اپنی چھٹی پر جاتا تھا۔ دادا جان زیادہ تر اسٹور پر ہی بیٹھتے تھے۔ زمینیں ٹھیکے پر دی ہوئی تھیں۔ ان سے ہی گھر کا اچھا خاصا خرچا نکل آتا تھا۔ غرض کہ گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔
عباس ناشتا کرتا نہیں تھا اور دادا جان واپس آکر کرتے تھے۔ اس نے ڈبل روٹی کے دو سلائس سینکے۔ انڈا تلا' ایک کپ چائے بنا کر بڑے اہتمام سے ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہی تھی کہ وہ باؤلا' رنگ میں بھنگ ڈالنے آدھمکا۔
"کیا ہے؟" بڑا ہی پھاڑ کھانے والا انداز تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔
"شہر جا رہا ہوں۔ کچھ چاہیے ہو تو بتاؤ۔" اس نے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا اسے کیا منگوانا تھا۔ وہ چپ چاپ اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پرچی اور پیسے تھے اور شام گہری ہونے سے پہلے وہ لوٹ بھی آیا تھا۔
"یہ پکڑو اپنے رسالے۔" اس نے شاپر الٹ کر سارے رسالے دیکھے تھے۔ پورے تھے' وگرنہ وہ اس کی دی گئی پرچی میں سے کچھ نہ کچھ چھوڑ ہی آتا تھا۔
بھی بہانا ہوتا کہ شعاع پہلی تک آجاتا ہے نا' میں لیٹ ہو گیا۔" بولتے ہوئے لہجہ بڑا ہی مسکین بنا لیتا۔ اسے ترس آجاتا۔ ویسے بھی ثمن کے دل میں اس کے لیے محبت اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات تھے۔ ان جذبوں میں محبت کتنی تھی اور ہمدردی کتنی..... محبت کی مقدار زیادہ تھی یا ہمدردی کے نمبر زیادہ تھے۔ وہ اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ یہ جاننے میں ابھی کچھ دن لگنے تھے۔

☆ ☆ ☆

انہال کے ابا کو ملا کر تین بھائی تھے۔ اس کے ابا بڑے ہی متلون مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی بزنس میں پیسہ ضائع کرتے' کبھی کسی اور سمت..... کبھی بھینسوں کا باڑا..... کبھی ایجنٹ بن کر گھر دکھانے لگتے۔ کبھی دکان کھول لیتے..... کبھی مارکیٹ سے شیئرز اور اللہ گواہ تھا کہ کاروبار کبھی انہیں کرنا ہی نہیں آیا۔ محض پیسہ ہی ضائع کیا جب بھی کیا۔ انہال کی اماں برے وقتوں میں ہی طلاق لے کر کسی اور دیس جا بسی تھیں۔ ابا نے اپنا حصہ بھی بیچ کر کھا ڈالا تھا۔ نشے کی ایسی لت لگی کہ جان سے ہاتھ دھوئے۔
انہال کو دادی نے پالا تھا۔ دونوں جس گھر میں رہ رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا کب سے اس مکان کو خالی کرنے کا الٹی میٹم دے چکا تھا۔ مگر جاتے بھی تو کہاں؟ انہال پڑھا لکھا' بے روزگار تھا اور نوکری ڈھونڈنے میں اس کی دلچسپی صفر اوپر سے کاوشیں نہ ہونے کے برابر' اب کوئی پلیٹ میں تھوڑی رکھ کر نوکری دے گا۔
اس لیے محبت' غصہ' دکھ' ہمدردی' ملے جلے جذبات تھے اس کے لیے۔
"سنو!" اسے محسوس ہوا آج پہلی دفعہ وہ کچھ کہتے ہوئے جھجکا تھا۔
"بولو....." رسالے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے مصروف انداز میں اس نے ہنکارا بھرا تھا۔
"تم اپنے دادا کو سمجھاؤ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"کیا سمجھاؤں؟" ثمن نے رسالے الٹنا پلٹنا بند کر دیے تھے۔
"اچھا نہیں لگتا جیسے وہ میری دادی کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔" بے چارا ایک اور راویتوں کا مارا ہوا نفس۔۔۔
"تمہارے پاس کوئی پکی نوکری اور رہنے کا ٹھکانا ہے؟" ثمن نے بڑا ہی غیر متوقع سوال پوچھا تھا۔
"کیوں؟" اس کے ابرو تن گئے تھے۔ سوال گندم۔۔۔ جواب چنا۔
"تمہارے چچا نے گھر خالی کرنے کا فائنل الٹی میٹم دے رکھا ہے نا‘ تو دادی کو لے کر کہاں جاؤ گے اور تمہارے چچا سے کوئی بعید نہیں کہ دادی کو دارالامان ہی نہ چھوڑ آئیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ جیسے اس وقت اس سے زیادہ اہم موضوع اور کوئی نہ تھا۔
اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تہی داماں تھا ہر طرف سے‘ ہر لحاظ سے وہ۔
"یہ کوئی طوفانی عشق والی عمر نہیں‘ دادا جان کی اور نہ ہی دادی کی۔ وہ اپنے ماضی سے چند پل چرانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان فرسودہ روایات نے ان سے چھین لیے تھے۔ کل ان کے باپ‘ دادا ان کے سامنے تن کر کھڑے تھے‘ آج ان کے بچے۔ اس عمر میں انہیں کسی ساتھی‘ غم گسار کی ضرورت ہے انہال! اور اگر وہ شادی کر بھی لیں تو کیا مضائقہ ہے؟" وہ تفصیل سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
وہ کچھ ثانیے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ "اب یہ عمر ہے ان کی؟ بال بچے دار ہیں یار۔" وہ جھنجلا کر رو دینے کو تھا۔
"تمہارے دونوں چچاؤں کو تو کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے تنک کر کہا تھا۔
عباس اور انہال دونوں کو سمجھانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا‘ مگر اب اس نے یہ بیڑہ اٹھالیا تھا تو نجام تو دینا ہی تھا بہر حال۔
"وہ تو بے غیرت ہو گئے ہیں۔" وہ غصے سے چیخا
"نہیں بس دادی سے جان چھڑانی ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے ان کا۔" وہ بے بس سا ہوا تھا۔
"کسی قیمت پر نہیں۔" اس نے اپنی سوچ کو خود ہی جھٹک کر آہستگی سے دہرایا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔
اداسی ثمن کے اندر تک در آئی تھی۔ ثواب کے پیمانے مشکل۔۔۔ گناہ کے بے حد آسان۔۔۔ رسموں‘ رواجوں کی بڑی بڑی زنجیریں ہر ایک کے پیروں میں تھیں۔ کیا خوب کہا تھا روسو نے۔ اسے یاد آیا تھا۔ اس نے زیر لب دہرایا۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے‘ مگر ہر طرف بیڑیوں میں ہے۔"
ان کے گرد بھی زمانے کی ان دیکھی بیڑیاں تھیں۔
کیا تھا اگر دادا جان کے ابا اجازت دے دیتے تو ایک دل پچاس سال تک ہجر کی آگ میں نہ جھلستا اور اب اگر قدرت نے ایک موقع دیا تھا تو ان کی جگہ ان کے بچوں نے سنبھال لی تھی۔
وہ دروازے پر کنڈی چڑھا کر گاؤں سے باہر نکل آئی تھی۔ رخ گاؤں کے باہر سبک خرامی سے بہتی نہر کی طرف تھا۔ وہ جب بھی حد درجہ غمگین ہوتی‘ ہمیشہ وہیں آتی تھی۔ مگر اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔
دادا جان نہر کنارے بیٹھے‘ جانے کس سوچ میں کھوئے‘ چھوٹے چھوٹے پتھر نہر میں پھینکتے جا رہے تھے۔ وہ چپ چاپ جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔
"عباس بالکل میرے ابا جیسا ہے۔" اس کی آہٹ پر چونک کر اسے دیکھا تھا‘ پھر آہستگی سے بولے تھے‘ جیسے خود سے مخاطب ہوں۔
"آپ نے دادی سے شادی کیوں نہیں کی؟" اس نے دھیمے سُروں میں استفسار کیا تھا۔
"میرا ابا نہیں مانا تھا۔" عجیب سا درد گھل گیا تھا ان کے لہجے میں۔
"آپ بغاوت کر دیتے۔"
"گیارہ بہکیں تھیں ہماری۔۔۔ اونچا شملہ اور جب وہ

میرے پاؤں میں رکھا گیا تو مانو میں اندر ہی اندر مر گیا تھا۔ مر تو میں اسی دن گیا تھا۔ یہ تو لاش ہے میرے ارمانوں کی جو میں اب تک ڈھو رہا ہوں۔ پر اب ڈھوتے ڈھوتے تھک گیا ہوں۔ اسے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ اپنے پتروں کی ٹھکرائی ہوئی۔ میں نے سوچا آخری پڑاتے میں یہ تو کہہ سکوں گا کہ چل دیر سے ہی سہی کچھ درد کم ضرور ہوئے تھے۔ جس کا ساتھ نہ ہونے نے عمر بھر نارسائی میں جلائے رکھا' اس کی موجودگی کو چند دن محسوس کر سکوں گا۔" انہوں نے کہتے کہتے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اسے نہیں پتا تھا' وہ بھی رو رہی تھی۔

"میری طرف سے اجازت ہے۔" وہ جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑا' انہیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا نہر کنارے آپہنچا تھا۔

"کیا سچ؟" وہ خوشی سے فاختہ کی طرح چہکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

دادا جان کے بوڑھے چہرے پر بے حساب خوشی لہرائی تھی۔

"ہاں سچ۔" اسی کے انداز میں وہ بولا تھا۔ "پر اک گل اے۔" اس نے ہاتھ سوچنے کے انداز سے انداز میں اپنی ٹھوڑی پر جمایا تھا۔

"ایک ستر سالہ بوڑھے نے اپنی پچاس سالہ پرانی معشوقہ سے بیاہ کر لیا۔ ناظرین! یہ انوکھا واقعہ صرف ہمارے نیوز چینل پر....."

وہ اور دادا دونوں ہنس دیے۔



جس دن دادی نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اسی دن شام کو چپکے سے وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کے گھر چھوڑ کر جانے کے پورے تین دن' تین گھنٹے بعد ثمن کو یہ الہام ہوا تھا کہ دراصل وہ ہمدردی تو تھی ہی نہیں سرے سے.... وہ تو محبت تھی۔ آہستگی سے اس کے وجود کے اندر پنپتی ہوئی۔

نفرت اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نفرت اور غصہ آندھی کی طرح ہوتا ہے' طوفان ہوتا ہے' ایک سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتا ہے' سب کچھ تہس نہس کر جاتا ہے اور پھر اسی طرح گزر جاتا ہے۔ پھر سوائے غصے کے باقیات کے' اور کچھ نہیں دکھائی پڑتا۔ ریت کی طرح سب بیٹھ جاتا ہے.... مگر.... محبت یوں ذات کا حصار کرتی ہے کہ جب انسان کو پتا چلتا ہے وہ چاروں شانے چت ہو چکا ہوتا ہے۔ محبت آہستگی سے یوں حاوی ہوتی ہے کہ جنون' دیوانگی' طلب' نفرت' غصہ سب جیسے بھربھری مٹی ثابت ہوتے ہیں جہاں انسان دو پل کے لیے سانس لینے کو رکتا ہے۔ وہیں پاؤں پسارے بیٹھ جاتی ہے۔ یوں ذات کا احاطہ کرتی ہے کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا۔ اس نے بھی ساڑھے تین سال جانے والے کا انتظار کیا تھا۔

"کسی دن تو جانے والے لوٹ ہی آئیں گے نا۔ اور ویسے بھی جانے والوں کو کسی نہ کسی دن لوٹ کے آنا ہی پڑتا ہے۔" وہ سر شام ہی گرل کی ریلنگ سے ٹیک لگائے دیوار کے اس کونے کو دیکھنے میں محو تھی جو کبھی آباد ہوتا تھا۔ تب ہی دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے بددلی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مسکراتا ہوا لمحہ بالکل پاس کھڑا تھا۔ وہ سُن سی ہو گئی تھی۔

"میں حقیقت ہوں ثمن۔" اس کی آواز نے آہستگی سے اس کی ذات کے گرد باندھا تھا۔

"بڑی چالاک ہو تم۔" وہ فسوں خیز لہجہ۔ "تمہاری محبت نے کہیں کا نہ چھوڑا' واپس وہیں لے آئی جہاں اس کا ٹھکانا تھا۔" گدلا گدلا ٹمیالا ٹمیالا' آسمان پھر سے اجلا اجلا' نیلا نیلا رنگ اوڑھنے لگا تھا۔

"تم نے شادی نہیں کی؟" وہ شرارت سے پُر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"سوچا تھا جس دن عمر نے تیس کا ہندسہ عبور کیا' وہ میرا آخری دن ہوگا انتظار کا۔" پرانی والی ثمن لوٹ آئی تھی۔ لہجے میں جلترنگ جھلکنے لگے تھے۔ محبت نے آگے بڑھ کر سب کچھ فتح کر لیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اگر محبت لوٹ آئے تو کچھ ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ پھر سے رخت سفر نہ باندھ سکے۔

☆



بیگم فیروزہ کے انداز و اطوار مثالی تھے۔ ان کے سلیقے اور رہن سہن سے لے کر ان کے اثر و رسوخ اور کھرے کھوٹے کی پہچان تک کے چرچے ہوتے تھے۔ پھر بھی تعجب کی بات تھی کہ ان کی سب سے خاص صفت، جس کے بغیر ان کی باقی تمام صفات بنا خوشبو کے پھول کی مانند ہو جاتی تھیں۔ کبھی ذکر محفل نہیں بنی تھی اور وہ صفت بلاشبہ ان کی تیز سے تیز نظر تھی۔ وہ نظروں سے بڑے بڑے کام لے لیتی تھیں جو اگر زبان اور ہاتھ سے لیے جاتے تو ان پر انگلی اٹھنے کا باعث بن جاتے۔ نظر کا کیا ہے وہ نہ دلیل ہے۔ نہ ثبوت۔ اس کی بنا پر کون انہیں مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا۔

شکل و صورت میں وہ اوسط درجے کی تھیں مگر پہننے اوڑھنے کا جو ڈھنگ انہوں نے پایا تھا۔ اس کے باعث شہزادیاں بھی ان کے آگے گھٹنے ٹیکتی تھیں۔ شوہر کی اچھی آمدنی ان کا کمال نہیں تھا۔ لیکن اس آمدنی کو صحیح طریقہ خرچ کر کے رکھ رکھاؤ کا جو معیار بیگم فیروزہ نے قائم کیا۔ اس نے انہیں کھاتے پیتے لوگوں کی فہرست سے نکال کر رئیسوں کی قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔ گھر چلانے کے لیے ملازم تھے۔ بچوں کی نگہداشت کے لیے چھان پھٹک کر آیا رکھی ہوئی تھی۔ خانساماں اتنا وفادار تھا کہ مانو گھر کا فرد ہے۔ پھر بیگم فیروزہ کے ٹھاٹھ باٹ میں کمی کیونکر آتی۔

سنعیہ عمیر

حسن نگاہ

جن کے نصیب میں صوفے پر بیٹھ کر حکم دینا لکھا ہے۔ ان کے انداز میں جتنی بھی سختی ہو، ان کے لہجوں میں نہیں چھلکتی۔ چولہے کی تپش سے دور رہنے کے باعث ان کا مزاج ٹھنڈا ہونا بھی فطری تھا۔

لیکن اکثر ان کا یہ مزاج سرد بھی پڑ جاتا تھا۔ یہ بھی اسی فطرت کا نتیجہ تھا۔ جس نے انہیں امیر غریب کی تفریق گھول کر پلائی تھی اور وہ اس کے ہاتھوں بھی مجبور تھیں۔

کچھ صوفیانہ طبیعت لوگ اس فطرت کے گھوڑے کو زیر کرنے کو جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر بیگم فیروزہ نے حیثیت کے پجاری بننے کو ہی وتیرہ بنا ڈالا۔ وہ رشتہ دار جن کا مال و دولت اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز اپنے سے ہیچ لگتا' انہیں دیکھ کر وہ نگاہوں میں ایسی بے اعتنائی بھرتیں کہ سلام کے بعد دوسری بات کرنے کی اگلے میں ہمت ہی نہ ہوتی۔

ایک دفعہ ایک دور کی عزیزہ اپنی بیٹی کے ساتھ ملنے آ گئیں۔ شوہر کی زندگی میں وہ خاتون بھی اچھی خاصی امیر تھیں۔ لیکن تب بھی ان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ اس لیے وہ بیگم فیروزہ کے معیار پر کبھی پوری نہیں اُتریں۔ اب ان کی بیٹی نے بیگم فیروزہ کے قریب ہی گھر لیا تھا تو رشتہ داری کے ناتے ملنے چلی آئیں۔ بیگم فیروزہ نے پوری ملاقات میں ساری توجہ ان کی کھاتی پیتی امیر بیٹی پر ہی رکھی۔ ان خاتون پر ایک نگاہ نہ ڈالی' مانو وہ وہاں ہیں ہی نہیں۔ وہ بیٹی بھی بیگم فیروزہ کی زبان سے ڈائمنڈ جیولری کے قصے سن کر ایسی گئی کہ بیگم صاحبہ کے لاکھ دعوت دینے پر بھی دوبارہ نہ پلٹی۔ پھر بھی بیگم فیروزہ نے اپنی روش نہ بدلی۔

شوہر کے رشتہ داروں کی آمد تو کم ہی عورتوں کی حلق سے اُترتی ہے۔ اس لیے جیٹھانی کے کم صورت سادہ طبیعت لڑکے بیگم فیروزہ کی آنکھوں میں جچتے نہیں تھے۔ وہ بچے بنا باپ کے پروان چڑھ رہے تھے اور چچا میں باپ کی صورت دیکھتے تھے۔ بیگم فیروزہ نے اپنی پسند ناپسند کی آنکھ مچولی جاری رکھی۔ خود رعب دار چچی بنی رہیں لیکن شوہر کو باپ صفت چچا بننے سے بھی نہ روک پائیں۔ رشتوں میں لگے پیوند زیادہ تر غروب آفتاب کے بعد کے سرمئی آسمان کے سائے تلے رہتے ہیں۔ جو تب تک نظر نہیں آتے جب تک ان پر غور نہ کیا جائے۔ اس لیے ان کی زندگیاں بھی گزرتی رہیں۔ یہ تو جب ان کی جیٹھانی نے اپنے لڑکے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا تو مزاجوں کا فرق واضح ہو گیا۔ بیگم فیروزہ اتنی نادان نہ تھیں۔ چند سالوں سے ٹھانی کا مزاج بھانپ رہی تھیں اور اپنے گھر کا ماحول اس صورت حال کے لیے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ شوہر کے ساتھ ہر خوشی غمی میں جیٹھانی کے گھر ضرور جاتیں اور واپسی پر موسم کا حال احوال بیان کرتے ذکر کر دیتیں کہ بھابھی کے لڑکے جائے کی چسکی لگاتے ہیں تو آواز آتی ہے۔ اکثر ہی ان کے ٹھٹھے لگانے کے بھونڈے انداز کو زیر موضوع لاتیں اور کبھی کچھ نہ ملتا تو ان کی شکلیں اور عادتیں ان کے سامنے ہی اپنے ملازموں سے ملانے لگتیں۔

جیٹھانی کے سب سے ہونہار بیٹے اسد کی تو ویسے ہی انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے خوب مٹی پلید کر رکھی تھی۔ اسد ہونہار تھا تو جذباتی بھی تھا۔ انداز میں کھلنڈرا پن تھا۔ دوستوں کے ساتھ گھومتا' سینما جا کر فلمیں دیکھتا' سیاسی جلسوں میں بھی شرکت کر آتا پھر سونے پر سہاگا اس کی نوکری بھی شہر سے سینکڑوں میل دور لگی۔ جیٹھانی کو تو اپنی تربیت پر یقین تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اپنے بچوں کی بلائیں لیتیں۔ بیگم فیروزہ کے پاس اس کا بھی توڑ تھا۔

ایک روز شوہر سے کہنے لگیں۔ "آپ کی بھابھی آج اسد کو کچھ زیادہ ہی یاد کر رہی تھیں۔ خدا جانے وہاں جا کر ماں کو فون کرتا بھی ہے کہ نہیں۔"

"بیٹا ہے' ماں یاد تو کرے گی ہی بھابھی بتا رہی تھیں کہ اسد نے گاڑی بھی لے لی ہے۔" ہونہار بھتیجے کے ذکر پر ان کے شوہر کا سینہ فخر سے پھولنے ہی والا تھا کہ بیگم فیروزہ نے سوئی کی نوک جیسا تیز جملہ کہہ کر ساری ہوا نکال دی۔

"فضول خرچ تو ہمیشہ سے تھا۔ ساری جمع پونجی ادھر ہی لگا دی ہو گی۔ ماں کی ہتھیلی پر دھیلا نہیں رکھتا ہو گا۔" اس لیے جب رشتے کا باقاعدہ ذکر چل نکلا تو اس کا انکار ان کے شوہر کے منہ سے ایسا نکلا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا کہ اس فیصلے میں بیگم فیروزہ کا کتنا ہاتھ کار فرما رہا ہے۔ پھر جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی بھی بہت اچھی جگہ شادی ہو گئی اور اسد کو بھی پڑھی لکھی' خوش شکل بیوی مل گئی۔

ایسے موقعوں پر دنیا یہ بھی دیکھ لیتی ہے۔ اس

رتبے کا مان اور انداز پر فخر ایک طرف بیگم فیروزہ اتنے چھوٹے دل کی بھی نہ تھیں کہ کسی کی مدد کرتے ہوئے جان جائے۔ اسد کی شادی کے انتظامات میں انہوں نے بیٹھانی کی ہر طرح مدد کی۔ زیور، کپڑا، جدید ڈھنگ کا بنایا کہ لوگ اش اش کر اٹھے۔ خود بیگم فیروزہ نے جب تیکھے نقوش والی نازک سی دلہن کو دیکھا تو نظریں نہ ہٹا سکیں۔ سچ تھا نصیب سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

وہ اسد جس کی کم صورتی کے ذکر کو وہ دہرا دہرا کر بدصورتی کے قصے میں تبدیل کردیتی تھیں اس کو اس قدر حسین اور تمیزدار بیوی ملی کہ اس کی اگلی نسل پیدا ہوئی تو گول مٹول گوری چٹی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ فیشن کے مطابق پڑھی لکھی اور اسمارٹ بھی ہوگئی۔



اسد کی بات گزرے موسموں کے قصے کی طرح یاد ماضی بن گئی تو ان کی نند کا بیٹا عماذ ان ہی کے شہر میں پڑھنے آگیا۔ اس کی رہائش ہاسٹل میں تھی۔ ہاسٹل پڑھنے آگیا۔ وہ ویک اینڈ اور دوسرے موقعوں پر باقاعدہ ماموں سے ملنے آتا۔ بیگم فیروزہ کے اپنے بچے بھی ان کی طرح تمیز تہذیب والے تھے۔ بس کم عمری کا تقاضا تھا کہ سب سے ہنس کر ملتے اور دوستی بڑھا لیتے۔ خاندان میں ایک بار پھر سرگوشیاں ہونے لگیں کہ بیگم فیروزہ درمیانی بیٹی ضرور عماذ کے ساتھ منسوب کردیں گی۔ مگر بیگم فیروزہ انگلی پکڑاتی تھیں تو دھیان رکھتی تھیں کوئی ہاتھ پکڑنے کی جرات نہ کر بیٹھے۔ ایک روز ظہرانے پر سب جمع تھے۔ عماذ بھی یونیورسٹی کی کوئی بات سنجیدگی سے سنا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس نے کوفتوں سے بھرے ڈونگے کو پلیٹ کے قریب کیا اور ایک کوفتہ پلیٹ میں ڈالا پھر دوسرا کوفتہ چمچ میں بھرا ہی تھا کہ بیگم فیروزہ کی گردن تن گئی عماذ نے دوسرا کوفتہ ڈونگے سے نکالا، وہاں بیگم فیروزہ نے گردن آگے کرکے ڈونگے میں جھانکا عماذ چمچ پلیٹ تک لے جانے لگا تو بیگم فیروزہ بھی گردن لہراتے ہوئے چمچ کا تعاقب کرنے لگیں۔ عماذ نے کوفتہ پلیٹ میں ڈال لیا اور بیگم فیروزہ نے پلیٹ سے دو انچ دور رک کر پلیٹ کو ایسا گھورا کہ معجزہ ہی تھا جو شوربا دوبارہ ابلنے نہیں لگا۔ عماذ ڈونگے کا چمچ ہاتھ میں پکڑے شرمندگی سے پسینے پسینے ہوگیا اور فوراً ایک کوفتہ پلیٹ سے نکال کر واپس ڈونگے میں ڈال دیا۔ بیگم فیروزہ واپس کرسی پر سکون سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگیں۔ بھئی نظروں سے کام لینا تو کوئی ان سے سیکھے۔

اپنی نگاہوں سے اپنی ناپسندیدگی وہ بارہا واضح کرچکی تھیں۔ پھر بھی بھائی کی محبت میں نند نے رشتہ بھجوایا۔ اس بار بیگم فیروزہ کو اپنی بات منوانے میں کچھ زیادہ دشواری ہوئی لیکن آخر سکہ ان ہی کا چلا۔ ایسی باتوں سے زندگی نہیں رکتی۔ یہ قصہ بھی تمام ہوا تو ان کی نند عماذ کے لیے ایک خوبرو ڈاکٹر بہو لے آئیں۔



زندگی ان کی بھی گزرتی رہی۔ بڑی بیٹی بال بچے دار اور خوش باش تھی۔ دوسری کو شان سے بیاہ کر کینیڈا رخصت کیا اور تیسری کے لیے رشتے کی تلاش جاری رکھی۔ جو چلتی رہی اور کئی سال تک جاری و ساری رہی۔ دن بہ دن معیار بڑھتے بڑھتے بیگم فیروزہ کا معیار اتنا بلند ہوگیا تھا کہ کوئی رشتہ نہ بھاتا تھا۔ حتیٰ کہ بیٹے کی شادی بھی کردی اور دادی بھی بن گئیں۔ لڑکوں کے لیے چھان پھٹک کرکے لڑکی ڈھونڈنے والی ماؤں کی تو پھر دال گل جاتی ہے۔ لیکن لڑکیوں کی مائیں بروقت فیصلہ نہ کریں اور محض انا میں آکر مناسب رشتوں کو معمولی کہہ کر ٹھکرا دیں تو چھان پھٹک کرنے کے بعد جوتیاں گھسانے کی نوبت آجاتی ہے۔

لیکن بیگم فیروزہ اتنی جلدی گھبرانے والوں میں سے نہیں تھیں۔ ان کی اصل آزمائش تو تب سر پر آئی جب کینیڈا والی بیٹی کی بیوگی کی خبر آئی۔ دو چار سال تو ان کے خاندان پر یوں گزرے جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ کر مسل دیا ہو پھر ہوش آنے لگا تو اس صورت حال کا سنہری پہلو دکھنے لگا۔

بیٹی بیوہ تھی مگر ایک ترقی یافتہ ملک میں تھی۔ جہاں کے قانون کے مطابق سسرال والوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی شوہر کی ساری جائیداد کی مالک بن گئی تھی۔

خوشحال تھی اور خود کفیل بھی۔ سال میں ایک دفعہ بیگم فیروزہ بھی بیٹی کے پاس چکر لگا آتیں اور چھوٹی بیٹی تو مہینوں بہن کے پاس رہتی۔ بیگم فیروزہ تو مطمئن تھیں پر ان کے شوہر رہے دقیانوسی آدمی اِن کا زاویہ نگاہ ہی اور تھا۔ انہیں تو بال بچے، شوہر، گھرداری کے بنا اپنی بیٹیاں اُجڑی ہوئی ہی نظر آتی تھیں۔

اب تو ریٹائر بھی ہو گئے تھے۔ فارغ بیٹھتے تو ماضی کے فیصلوں کی جمع جوڑ کرنے لگتے۔ ان کے پچھتاووں کی آہیں بیگم فیروزہ کو طعنوں کے نشتر لگتے۔ وہ سمجھتیں کہ ان ہی کو سنانے کے غرض سے برے فیصلوں کی زبانی فہرست بنائی جاتی ہے اس لیے کڑوے گھونٹ پی پی کر رہ جاتیں۔

ایسے ہی کسی روز بڑے دنوں بعد اسد کی آمد ہوئی۔ شکل و صورت اور انداز میں عمر کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ویسے ہی جھک جھک کر چچا سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن سوٹ بوٹ پہنے وہ کہیں سے گلیوں میں آوارہ گردی کرنے والے اس لڑکے سے میل نہیں کھاتا تھا جس کو بیگم فیروزہ ناپسند کرتی تھیں۔ بہت دیر تو وہ صرف اسے دیکھے ہی گئیں جیسے نظروں کو دھوکا ہو رہا ہو۔ پھر اپنی نظروں کو پرکھنے کے لیے ایک اور نگاہ ڈالتیں تو یقین سا ہونے لگتا کہ واقعی اسد اس قدر باوقار ہو گیا ہے۔ دیکھ دیکھ کر ان کی نظریں تھکیں تو کان میں آوازیں پڑیں۔ اسد حال ہی میں یورپ سے ٹریننگ لے کر آیا تھا اور اپنی سیاحت کے قصے چچا کو یوں سنا رہا تھا جیسے کبھی پہلے ان سے رمضان اور کرکٹ کی باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے چچا بھی ایسے محو ہو رہے تھے جیسے اس کے شریک سفر رہے ہوں۔

اس پوری نشست میں ایک بیگم فیروزہ ہی تھیں جو سر سے پیر تک تلملا رہی تھیں۔

"اپنی امی کی زندگی میں ہو آتے۔ ان کے لیے بھی کچھ تحفہ لے آتے خوش ہو جاتیں۔ ان کو تو حسرت ہی رہی کہ تمہاری کمائی سے کچھ ملے۔ تمہارے چچا بھی اس بات پر بڑے خفا رہتے تھے۔"

عین نشانے پر تیر چھوڑ کر بیگم فیروزہ چپ ہو گئیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسد اپنی کمائی کی پائی پائی ماں کی ہتھیلی پر رکھتا تھا لیکن بیگم فیروزہ نے سالوں شو کے کانوں میں اسد کے خلاف مواد انڈیلا تھا اور اب ان کی عمر کا تقاضا بھی تھا وہ ہر وقت پشیمانی اور غصے میں رہتے تھے۔ اب بیگم فیروزہ نے اس انداز میں بات کی کہ انہیں لگا جیسے مرحومہ بھابھی کے دکھوں کا ازال کرنے کا بار ان ہی کے کندھوں پر آ گیا ہے۔

"ویسے اسد! تم نے اچھا نہیں کیا۔ میری بھابھی بےچاری روتی رہیں تمہاری یاد میں اور تم نے ماں کو جد ہی کر ڈالا خود سے۔" بس ایک جملے سے شروع ہو والا قصہ غصے میں لپٹ کر ایسا فسانہ بنا کہ اسد کو لفظو سے چیر گیا۔

در حقیقت ان کے ذہن میں اپنا جرم بول رہا تھا ک کبھی بھابھی کو کم حیثیت جان کر رشتے سے انکار کیا تھا۔ اسد اپنی صفائی میں کچھ بولتا تو اپنی مرحومہ بھابھی کی دل آزاری کا ملزم بھی اس کو ٹھہرا دیتے حالانکہ دنیا جانتی تھی کہ بھابھی کے بیٹے کو داماد نہ بنا کر ٹھکرانے والے خود تھے پھر بڑی عمر کے جھلے پن اور بے لگام طبیعت۔ مخلص بھتیجے کے ایسے لتے لیے کہ وہ بھی بوکھلا ہی گیا ک آخر چچا کو ہو کیا گیا۔

اسد چند سال پہلے دوبارہ اسی شہر میں واپس آ تھا۔ اور چچا چچی سے باقاعدگی سے ملاقات ہونے لگ تھی۔ شروع میں تو بیگم فیروزہ تفریح کے غرض سے شوہر کے ساتھ جاتیں اور اسد کی بیوی کو بھی شہر کے اچھے بازاروں کے راستے سمجھاتیں، فون پر باقاعد سلام دعا ہوتی اور اپنے گھریلو ٹوٹکوں سے خوب فیض یاب کرتیں۔ پھر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا وہ اپ پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہیں۔ اسد کا سجا سجایا گھر، ادب آداب والی اولاد اور شاہانہ رہن سہن ان کے شوہر ک

مرعوب کیے جا رہا تھا۔ اس لیے فوراً" راہ پلٹی۔ اسد کی حیثیت تب بدلے گی جب بیگم فیروزہ اسے کسی لائق سمجھیں گی اور بیگم فیروزہ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا پھر تو یہ معمول بن گیا۔ اسد اور اس کی بیوی آتے تو وہ کوئی ایسا منفی جملہ بول کر شوہر کو بھڑکا دیتیں کہ ساری نشست وہ اسد کو لعن طعن ہی کرتے رہتے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے آنا ہی چھوڑ دیا۔

بیگم فیروزہ کے پاس اس پر توجہ دینے کا وقت نہ تھا۔ ان کی اپنی زندگی نئی کروٹیں بدل رہی تھی۔



آخر انہیں اپنی چھوٹی لڑکی کے لیے اپنے معیار کا رشتہ مل ہی گیا تھا۔ خوب کماؤ اور کھاتا پیتا داماد ڈھونڈا تھا جس کی کوٹھی اتنی شاندار تھی کہ جانے والا گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتا تھا۔ خاندان بھی پڑھا لکھا تھا۔ کئی رشتہ دار امریکہ میں مقیم تھے۔ ہونے والے داماد کا بڑا بیٹا بھی امریکہ پڑھنے جا چکا تھا۔ دو چار سال بعد چھوٹا بیٹا بھی چلا جائے گا۔ بس بیٹی تھی باپ کی خوب لاڈلی لیکن لڑکیوں نے اگلے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ بچوں سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ پہلی بیوی کو فوت ہوئے بھی کئی سال ہو گئے تھے۔ اس لیے مناسب سمجھ کر رشتہ طے پایا اور شادی ہو گئی۔

بیگم فیروزہ کی طبیعت میں صرف خود پسندی ہی نہیں تھی، خود اعتمادی بھی تھی۔ ان کی بیٹی نے بہت ذمہ داری سے اپنی نئی شادی شدہ زندگی اور اس کی ذمہ داریاں قبول کیں اور ایسے نظر آنے لگی کہ بچوں کی حقیقی ماں ہو۔ بیگم فیروزہ بھی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئیں۔ ان کی تیز نظر دنیا و مافیہا کے بے شمار زاویوں کو دیکھ لینے کے بعد اب جن نظاروں کا سامنا کر رہی تھی وہ ان سے ناآشنا تھیں۔

وہ دل کی بات نگاہوں میں چھلکنے سے روک نہیں پاتی تھیں۔ بلاشبہ نگاہوں سے دل کا حال کہنے کی روایت انہوں نے دانستہ قائم کی تھی تاکہ ناپسندیدہ لوگوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے زبان کو زحمت نہ ہو۔ مگر اب اس عادت کو کئی موقعوں پر بدلنا بھی پڑتا تھا۔ سوتیلے نواسے نواسیوں کو دیکھ کر جبراً" نگاہوں میں حقیقی نانی سی شفقت لاتیں۔ آدھے گنجے سر والے داماد سے ملاقات کرتے ہوئے والہانہ پن آنکھوں میں سمونے کی جستجو کرتیں پھر بھی اکثر چوک ہو جاتی۔ اب کچھ ان کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی تھی۔ چار بچوں کی ماں تھیں۔ پوتے پوتیوں والی تھیں پھر بھی بڑھاپے کے باعث تنہائی نے آگھیرا تھا۔

پہلے صرف پسند کے لوگوں سے بات کرتی تھیں۔ اب تو بات کرنا ہی ناپسند ہونے لگا تھا۔ خاموش رہتی تھیں تو سوچ میں پڑ جاتی تھیں کہ اتنے خاندان کے باوجود انہیں تنہائی محسوس ہوتی ہے تو ان کی بے اولاد جوان بچیاں کتنی تنہا ہوں گی۔ نگاہوں کا زاویہ بدلا تو صحت گرنے لگی۔ ان کی خیریت پوچھنے کے لیے روز کوئی نہ کوئی آجاتا۔ ان میں وہ سسرالی رشتہ دار بھی آئے جن کے آنے پر وہ خانساماں کو کہہ دیا کرتی تھیں کہ صاحب اگر کہیں بھی تو چائے نہ بنانا بس شربت پلا دینا کہیں یہ روزانہ نہ آنے لگیں۔

اتوار کی ایک صبح عماد اور اس کی بیگم کی بھی آمد ہوئی۔ انہوں نے چند روز پہلے ہی اپنی بڑی بیٹی کی بات طے کی تھی۔ اب چلے آئے کہ ماموں ممانی کا حال بھی پوچھ لیں گے اور بزرگوں کی دعائیں بھی لے لیں گے۔ چوڑے فریم والی عینک اور چند ایک سفید بالوں والا عماد اپنی ازلی میٹھی مسکراہٹ سجائے بیگم کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوا۔

اس کی بیگم کے دھیمے انداز اور نزاکت سے واضح تھا کہ شوہر نے بہت محبت اور احترام سے اسے رکھا ہے۔ دونوں کے پیچھے ان کی کم عمر خوب صورت بیٹی تھی۔ جس کے حسین چہرے پر نئی نئی نسبت طے ہونے کی دمک دیدنی تھی۔ اوپر سے اس کی تعلیمی قابلیت اور شخصیت کی اٹھان اس قدر جاذب نظر تھی کہ اس کی خوب صورتی سے بڑھ کر نظر آرہی تھی۔ وہ ایک بے ضرر سی خوش باش فیملی تھی اور بس مگر بیگم فیروزہ کو ان میں آئینہ نظر آنے لگا۔

یہ تو وہ لوگ تھے جن کو انہوں نے کبھی کسی قابل نہیں سمجھا تھا۔ آج وہ معاشرے کے اہم رکن کیسے بن گئے تھے۔ یہ تو اللہ نے رعایا کی صورت بنائے تھے۔ جن کا واحد مقصد اپنی ملکہ کے حکم بجالانا تھا۔ وقت کیسے پلٹا کہ وہ برابری کی سطح پر کھڑے تھے اور اب ان سے بھی بلند ہو رہے تھے۔

بیگم فیروزہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وقت نے انہیں کئی درس دیے تھے۔ اپنے فیصلوں میں کھوٹ دیکھ کر ان کی خود اعتمادی کو دھچکے لگ چکے تھے۔ ان کے دھتکارے لوگوں کو جب دنیا نے احترام سے سر پر بٹھا لیا تو ان کے غرور میں بھی دراڑیں آئی تھیں۔ اس روز قسمت اپنی ساری سفاکی دکھائی۔ اس منظر کو دیکھ کر ان کی نظر نے شکست کھائی تھی۔ وہ پتھرائی نگاہوں سے گنگ بیٹھی رہیں۔ ان سے نہ نظر ہٹائی گئی نہ ہی ایک لفظ بولا گیا۔ زندگی انہیں آئینہ دکھا رہی تھی اور اب ان میں نظریں پھیرنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ وہ تو عماذ کے نوالے گنتی تھیں اور اب نوبت اس کی آگئی تھی کہ اس جیسا کامیاب بزنس مین خود ان کے گھر آیا تو اعزاز محسوس ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"میں نے خاندان میں کوئی رشتہ نہیں کیا مگر میرا کوئی کم عمر بیٹا ہوتا تو آپ کی بیٹی کو اس کے لیے مانگ لیتی۔" وہ جملہ کیا تھا پھوار تھی جو سالوں کی بدسلوکی پر شرمندگی کی طرح برسی تھی۔ بڑی بڑی غلطیوں کا ازالہ ایک جملے سے ہو جاتا ہے اور وہ ایک جملہ بھی عماذ کے دل کو موم کر گیا تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد بھی بیگم فیروزہ سامنے کا منظر ان دیکھا کر رہی تھیں۔ وقت نے انہیں موقع دیا تھا کہ اپنے اندر کا منظر دیکھیں اور وہ اندر کا منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔ ندامت کے آنسو سالوں کا غرور آنکھوں سے بہانے لگے۔

"بیگم! میں نے اس زندگی میں کسی کا کچھ نہیں لیا۔ مگر مجھے لگتا ہے میں اسد کا قرض دار ہوں' میں اس پر ناحق غصہ کرتا رہا۔" گردن ان کے شوہر کی بھی جھکی ہوئی تھی۔

"اس کو فون کرلیں جتنا بھی بڑا افسر بن گیا ہو' ماں کے فون پر دوڑا چلا آئے گا۔" کچھ اسد کا خلوص تھا کچھ اپنی اہمیت پر زعم جو قائل تھیں کہ ان کے بلاوے کو انکار نہ ہوگا۔ انہوں نے تمام عمر اپنے رویوں سے دوسروں کو نیچا کیا تھا۔ جس کا نتیجہ تھا کہ تمام عمر جھک جھک کر دوسروں کو دیکھا اب وقت آگیا تھا کہ اپنی اصلاح کریں۔ لوگوں کو اپنی نظروں میں اٹھنے دیں تاکہ نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھ سکیں۔

اس سے پہلے کہ وہ فون کر کے اسد کو دعوت دیتے' فون خود بج اٹھا۔ اسد کا بلاوا آچکا تھا۔ اسے الوداع کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ خالق حقیقی کے بلانے پر سب چھوڑ چھاڑ چلا بھی گیا تھا۔

"اپنے ہاتھوں تینوں بیٹیاں بیاہ گیا۔ وقت پر فارغ ہوا' بہت اچھا ہوا۔" جنازے کے بعد کسی رشتہ دار خاتون کے تبصرے پر بیگم فیروزہ اور ان کے شوہر ٹھٹک سے گئے۔ اس معاملے میں بھی اگر ان کا اسد سے موازنہ ہوتا تو وہ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود چھوٹے نظر آئے ______ بیگم فیروزہ تو اسد سے ہونے والی اپنی آخری ملاقات یاد کر کے زمین میں گڑنے لگیں لفظوں کی برچھی سے اس کی کھال ادھیڑی تھی اور معافی کا مرہم رکھنے کی مہلت نہ ملی تھی۔

بیگم فیروزہ نے شرمندگی سے نظر جھکالی۔ اب بقیہ زندگی جب جب ان کے شوہر نے اسد سے متعلق پچھتاوؤں اور زیادتیوں کا ذکر کرنا تھا۔ انہیں مرحوم کے احترام میں زبان کو سی کر نظریں ہی جھکانی تھیں۔





یہ سوچ کر ملال گزرتا نہیں کوئی
اس شہر میں کسی پہ بھی مرتا نہیں کوئی

ایسے میں ہو کسی سے ملاقات کس طرح
ملتا ہے راہ میں تو ٹھہرتا نہیں کوئی

کتنے ہی لوگ ٹوٹتے دیکھے ہیں عشق میں
لیکن میری طرح تو بکھرتا نہیں کوئی

کچھ تو کسی سے ترکِ تعلق کا ہے سبب
وعدے سے بے سبب تو مکرتا نہیں کوئی

خاور یہ کس گمان میں غم خوار ہیں مرے
کچھ دن سے اس کا ذکر ہی کرتا نہیں کوئی

رحمان خاور

"یاد"

کبھی کبھی کوئی یاد
کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر
ایسے دستک دیتی ہے
شام کو جیسے تارا نکلے
صبح کو جیسے پھول
جیسے دھیرے دھیرے زمین پر
روشنیوں کا نزول
جیسے روتے روتے اچانک
ہنس دے کوئی ملول
کبھی کبھی کوئی یاد، کوئی بہت پرانی یاد
دل کے دروازے پر ایسے دستک
دیتی ہے

عبیداللہ علیم

اِدارہ

اِس ماہ کی مسکراہٹیں

ستم ظریفی

ایک امریکی اسکول کی بہترین ٹیچر نے اپنی کلاس کو بتایا۔

”لڑکیو! جب میں نوعمر تھی تو سوچا کرتی تھی کہ بہترین گلوکارہ بنوں گی۔ چنانچہ میں اپنا زیادہ وقت پیانو کے پاس گزارتی اور رات دن گانے گاتی رہتی، لیکن ایک دن میرے ڈیڈی نے پیانو چھین کر کہیں چھپا دیا اور میرے ہاتھ میں کتابیں تھما دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے گانے کا ریاض ختم کرنا پڑا اور اپنی ساری توجہ تعلیم پر صرف کرنا پڑی۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں آج کیا ہوں؟“

لڑکیوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ ”ہمارے اسکول کی سب سے اچھی ٹیچر۔“

”نہیں۔“ ٹیچر نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”شہر کی سب سے خراب گلوکارہ۔“

فرض منصبی

ایک آدمی نے گڑھا کھودا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آدمی آیا اور اس نے گڑھے میں مٹی ڈال کر اسے بند کر دیا۔ اس طرح کئی بار پہلے آدمی نے گڑھا کھودا۔ دوسرے نے اسے بھر دیا۔ ایک آدمی کافی دیر سے ان کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے قریب جا کر ان سے معاملہ پوچھا۔

ایک آدمی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں سرکاری ملازم ہیں۔ ہمارا تیسرا ساتھی آج چھٹی پر ہے۔ جسے ان گڑھوں میں پودا لگانا تھا۔ وہ نہیں آیا تو کیا ہم بھی اپنی ڈیوٹی انجام نہ دیں۔“

تفریح

ایک سفری سیلز مین کاروباری دورے پر تھا۔ راستے میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔

”یہاں کوئی سینما ہے۔“

”نہیں۔“ دیہاتی نے جواب دیا۔

”کوئی پارک، تھیٹر وغیرہ جہاں جا کر آدمی کچھ تفریح کر سکے۔“

”نہیں جناب!“ دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔

”حیرت ہے۔۔۔ پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو۔“ سفری سیلز مین نے پوچھا۔

”بس جی! وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی شہری بابو آکر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ بس یہی ہماری تفریح ہے۔“

بے چارگی

کسی مطلوب مفرور آدمی کے ایک مکان میں رات ٹھہرنے کی اطلاع ملنے پر وہاں پولیس پہنچی۔ افسر تفتیش نے مطلوبہ مکان پر پہنچ کر دستک دی۔

مالک مکان دروازے پر آیا تو پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”کل اس مکان میں کتنے افراد سوئے تھے؟“

مالک مکان نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ ”جناب والا! کل رات ہمارے گھر میں ایک بھی فرد نہیں سو

سکا۔ میری بیوی درد قولنج کے مارے رات بھر تڑپتی رہی۔ پرسوں کھیلتے ہوئے میرے بیٹے کے پاؤں میں چوٹ آگئی تھی۔ وہ تمام رات درد سے کراہتا رہا۔ بیٹی کو آشوب چشم تھا۔ اس لیے اس نے ساری رات جاگ کر گزاری۔ میرے خسر عابد و زاہد ہیں۔ انہوں نے تمام رات عبادت میں گزار دی اور مجھے تو ہمیشہ سے بے خوابی کی شکایت ہے' کروٹیں بدلتے ہوئے صبح ہو جاتی ہے۔"

بدذوق

نوبیاہتا جوڑا ہنی مون منانے کراچی سے شمالی علاقہ جات کی طرف گیا۔ ایک دلفریب مقام پر دلہن بے اختیار بول اٹھی۔ "واہ! کیا خوب صورت' خوب ناک نظارہ ہے۔" دولہا نے ادھر ادھر دیکھا اور منہ بنا کے بولا۔ "ایسی کون سی خاص بات ہے یہاں؟ اس جھیل' سبزے اور آبشار کو ہٹا دو تو بالکل اپنے کراچی جیسی جگہ ہے۔"

اعتراف

ایک افسر نے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے ماتحت سے کہا۔ "انور میاں! میں اکثر بلاوجہ تمہیں ڈانٹتا رہتا ہوں۔ لیکن تم جواب میں ہمیشہ مسکرا کر معذرت کرلیتے ہو۔ یا اپنی کوئی غلطی تسلیم کرلیتے ہو۔ جو تم نے نہیں کی ہوتی۔ آج میں یہ بات سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

انور میاں کا چہرا کھل اٹھا اور وہ جلدی سے بولے۔ "سر! میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ حسن سلوک سے کمینے سے کمینہ انسان بھی موم ہو جاتا ہے۔ واقعی انہوں نے سچ کہا تھا۔"

شکار کا شوق

ایک صاحب کسی زمانے میں ماہر شکاری رہ چکے تھے۔ مگر بڑھاپے میں کئی برسوں سے پہیوں والی کرسی پر ادھر ادھر جاتے تھے۔ اس عالم میں بھی یہ خواہش انہیں بے قرار رکھتی تھی کہ صرف ایک بار وہ کسی ریچھ کو اپنی بندوق کا نشانہ بنائیں۔

ایک روز ان کے دونوں پوتے ان کا دل رکھنے کے لیے ان کی کرسی کو دھکیلتے ہوئے بڑے میاں کو کئی میل دور گھنے جنگل میں لے گئے۔

اچانک ان کا سامنا ایک بڑے ریچھ سے ہوگیا۔ جوں ہی ریچھ نے انہیں دیکھا' وہ ان کی طرف لپکا۔ دونوں پوتے چیختے چلاتے گھر کی جانب بھاگے اور گھر پہنچ کر سارا ماجرا اپنی والدہ کو سنایا۔

"غضب خدا کا۔۔۔ دادا جان کو ریچھ نے مار ڈالا۔"

"چلانا بند کرو۔ تمہارے دادا تم لوگوں کے آنے سے دس منٹ پہلے ہی گھر پہنچ چکے ہیں۔" ماں نے غصے سے کہا۔

قابل دید

کراچی کے ایک دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک کی آواز ویسے ہی اونچی تھی اور جب وہ فون پر کسی سے ناراض ہوتے یا بحث میں الجھتے تو اور بھی زیادہ زور سے چلانے لگتے تھے۔

ایک روز وہ اسی طرح چلا رہے تھے کہ آواز جنرل مینجر کے کمرے تک پہنچ گئی۔ جی ایم نے چپراسی کو بلایا اور پوچھا۔ "یہ کون صاحب چلا رہے ہیں۔"

"سر یہ عابد خان صاحب ہیں' لاہور میں اپنے بہنوئی فہیم فاروقی سے بات کر رہے ہیں۔" چپراسی نے بتایا۔

"تو کم بخت عقل استعمال کیوں نہیں کرتا؟ آخر ہم نے فون کس لیے لگوائے ہیں۔" جی ایم غصے سے بولے۔



شگفتہ جاہ

حسب حال اقوال زریں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا کام افضل ہے؟" (یعنی ثواب میں سب سے بڑھ کر ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نماز اپنے وقت پر پڑھنا"

میں نے کہا "پھر کون سا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ماں باپ سے نیکی کرنا (یعنی ان کو خوش اور راضی رکھنا اور ان کے ساتھ احسان کرنا اور ان کے دوستوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا)

میں نے کہا "پھر کون سا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا"

پھر میں نے زیادہ پوچھنا چھوڑ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایت کرکے۔ (تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بار نہ گزرے۔)

عبرت ناک،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ انہیں اس وقت تک موت نہ آئے جب تک وہ خود موت کی خواہش نہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی روح نکالنے کا ارادہ فرمایا تو ایک بوڑھے کی شکل میں موت کے فرشتے کو بھیجا۔

ابراہیم علیہ السلام کے پاس اناج بہت تھا۔ ایک روز جب وہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے تو ایک بوڑھا آدمی چلتا ہوا آیا آپ نے اس کے سامنے کھانا پیش کیا۔ وہ بوڑھا آدمی جب منہ میں لقمہ ڈالنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو ہاتھ چوکنے کی وجہ سے کھانا ناک، آنکھ، کان میں جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس بوڑھے کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔

"اے بوڑھے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

اس نے کہا "بڑھاپے کی وجہ سے ہے"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا "تمہاری عمر کتنی ہے؟"

جب بوڑھے نے عمر بتائی تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سے صرف دو سال زیادہ تھی۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

"میرے اور تمہارے درمیان صرف دو سال کا فرق ہے۔ جب میں تمہاری عمر کو پہنچوں گا تو میں بھی تمہاری طرح کا ہو جاؤں گا۔ اے اللہ! اس حالت کے آنے سے پہلے مجھے موت دے دے۔"

وہ بوڑھا کھڑا ہوا جو درحقیقت موت کا فرشتہ تھا، اور اس نے ابراہیم علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔

اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر دو سو سال تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک سو پچھتر سال تھی۔

قیامت کا خوف،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے کہا کہ "اگر آپ کسی شخص کو زندہ کریں جس نے کشتی نوح علیہ السلام کو دیکھا ہو تو ہم اس سے کشتی کے متعلق سوال کریں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ماننے والوں کے ہمراہ چلے یہاں تک کہ ایک نشیبی علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور کہا۔

"یہ حام بن نوح علیہ السلام کی قبر ہے۔" اس کے بعد انہوں نے اس نشیبی جگہ پر اپنا عصا مارا اور کہا۔

"اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا۔"

یہ کہتے ہی وہ نشیبی علاقہ پھٹا اور اس میں سے ایک بوڑھا شخص اپنے سر سے مٹی جھاڑتے ہوئے اُٹھا۔ عیسٰی علیہ السلام نے ان سے پوچھا۔

"تمہارا انتقال بڑھاپے کی عمر میں ہوا تھا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں میرا انتقال تو جوانی میں ہوا تھا۔ میں نے یہ گمان کیا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اس خوف سے میرے بال سفید ہو گئے۔"

اخلاق،

- دل کی صفائی تمام نیکیوں کا حاصل ہے، اس کے علاوہ سب دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔
- حسد، حرص اور غصہ ان تینوں پر قابو پا کر ہی اچھائی حاصل کی جا سکتی ہے۔
- محبت کا رشتہ دل سے ہے۔ وہ ظاہری محبت بے سود ہے جس کا تعلق دل سے نہ ہو۔
- بدلہ لینے والا صرف ایک دن کے لیے خوش ہو سکتا ہے لیکن جو درگزر کر دیتا ہے اس کی خوشی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔
- بڑے لوگ وہی ہیں جو ہمیشہ دوسروں کو نقصان پہنچانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

(پہلی صدی میں لکھی گئی تامل کتاب کرل سے)

عمدگی،

مشہور مجسمہ ساز مائیکل اینجلو ایک مجسمے پر کئی دن سے کام کر رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بار بار دیر تک کام کر رہا تھا۔

ایک دیکھنے والے نے سوچا کہ وہ غیر اہم کام کر رہا ہے۔ اس نے مائیکل اینجلو سے پوچھا۔

"وہ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے؟"

مائیکل اینجلو نے جواب دیا۔ "کاملیت چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اُبھرتی ہے اور کاملیت کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔"

لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی کام آپ نے کتنی دیر میں کیا تھا لیکن یہ یاد رکھتے ہیں کہ آپ نے اسے عمدگی سے کیا تھا۔

(شوکیسپڑا)

تجربات کا نچوڑ،

- کاموں کو التوا میں ڈالنے کی عادت کام کرنے سے زیادہ تھکا دیتی ہے۔
- کامیابی عمل سے جڑی ہوتی ہے۔ کامیاب لوگ حرکت میں رہتے ہیں۔ وہ غلطیاں کرتے ہیں لیکن میدان نہیں چھوڑتے۔

(ہلٹن)

- ہتھوڑا شیشے کو چور چور کر دیتا ہے۔ لیکن لوہے کو ایک کارآمد چیز میں ڈھال دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم لوہا ہیں یا شیشہ۔

(روسی کہاوت)

حسد،

اگر کیکڑوں کو ایک کھلے صندوق میں ڈال دیا جائے تو وہ باہر نہیں نکلتے، صندوق کے اندر ہی رہتے ہیں۔ کیکڑے آسانی سے رینگ کر صندوق سے باہر آ سکتے ہیں اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ ان کی ذہنیت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی کیکڑا اوپر چڑھنے لگتا ہے تو دوسرے اسے نیچے کھینچ لیتے ہیں۔ اس طرح کوئی بھی کیکڑا صندوق سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ سب آزاد ہو سکتے ہیں لیکن ان کا انجام کھلے صندوق کے اندر ہی مر جانا ہوتا ہے۔ حسد کرنے والے لوگوں کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ زندگی میں ترقی بالکل نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی ترقی نہیں کرنے دیتے۔

تعلیم،

ساٹھ سال پہلے میں ہر بات جانتا تھا۔ اب میں کچھ نہیں جانتا۔ تعلیم ہماری اپنی لاعلمی کو بتدریج جاننے کا نام ہے۔

(ولیم ڈیورانٹ)

شارٹ کٹس،

ایک بادشاہ نے اپنے وزیروں سے کہا کہ وہ صدیوں کی دانش لکھ کر دیں تاکہ وہ اسے اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کروا دے۔ وزیر کئی جلدوں میں صدیوں کی دانش لکھ لائے۔

بادشاہ نے کہا "لوگ تو ان کا مطالعہ نہیں کر سکیں گے" اس نے انہیں ان جلدوں کا خلاصہ تیار کرنے کا حکم دیا۔

وزیروں نے کافی عرصہ محنت کر کے ایک جلد میں خلاصہ تیار کیا۔

بادشاہ نے اب بھی کہا کہ یہ بہت طویل ہے۔ وزیر ایک باب تیار کر لائے۔

بادشاہ نے پھر کہا "یہ بہت طویل ہے" یہاں تک کہ وزیر ایک صفحہ تیار کر کے لائے تو بادشاہ نے اسے بھی طویل قرار دے دیا۔ اور کہا کہ مختصر کرو۔

آخر وزیر ایک جملہ لے کر آئے۔ تب بادشاہ مطمئن ہوا۔ وہ جملہ تھا۔

"دنیا میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں تم جو کچھ دیتے ہو، وہی کچھ پاتے ہو، اگر تم کسی پروجیکٹ پر زیادہ محنت نہیں کرو گے تو اس سے کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔

توجہ طلب،

• کسی اچھے عمل سے دلی خوشی دینا ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔ (شیخ سعدیؒ)

• اگر چڑیوں میں اتحاد ہو جائے تو وہ شیر کی کھال اتار سکتی ہیں۔

• جاہلوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان کی دلیل مقابل کے آگے نہیں چلتی تو وہ لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ (شیخ سعدیؒ)

• اگر چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو اپنے بچوں کو اچھے اخلاق سکھاؤ۔

(شیخ سعدی)

• نادان ڈھول کی مانند ہوتا ہے۔ بلند آواز ہوتا ہے مگر اندر سے خالی۔ (شیخ سعدی)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

عالم،

شیخ سعدی علیہ الرحمہ اپنے اشعار میں فرماتے ہیں۔

ترجمہ: "عالم جو کہے، دل کے کانوں یعنی توجہ سے سنو، اگرچہ اس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو۔ مدعی جو یہ کہتا ہے کہ غافل غافل کو بیدار نہیں کر سکتا، یعنی نیکی اور خیر کی طرف توجہ نہیں دلا سکتا، سب غلط اور جھوٹ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ نصیحت حاصل کرے، اگرچہ دیوار پر لکھی ہو۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

کائنات،

یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے۔ حادثے میں اس قدر حسن نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حسن، حسن ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی ترتیب کے بکھر جانے کا نام ہے۔ باطنی کائنات دعاؤں کی کائنات ہے۔ (واصف علی واصف)

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

نیت کا اجر،

بنی اسرائیل کا ایک شخص ریت کے ایک تودے کے قریب سے گزرا۔ اس وقت قحط پڑ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"میرے پاس ریت کے اس تودے کے برابر گیہوں ہوتے تو میں فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دیتا۔"

اس زمانے کے رسول یا نبی پر وحی نازل ہوئی اور حکم ہوا۔

"اے نبی! اس شخص سے کہہ دو کہ تیرا صدقہ اللہ نے قبول کر لیا ہے کہ اگر تو نے صدقہ دیا ہوتا تو اتنا ہی ثواب تجھے ملتا۔"



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ثریا بلوچ ــــــ کوئٹہ
جو تم کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو چکے

رضوانہ شکیل راؤ ــــــ لودھراں
جس کو میں کی ہوا لگی
اسے پھر نہ دوا لگی نہ دعا لگی

یاسمین کنول ــــــ پسرور
دل سے رخصت ہوئی ہر اک امید
آج ہم غم زدوں کی عید ہوئی

نوال افضل گھمن ــــــ کراچی
چاند دیکھا ہے تو یاد آئی ہے تیری صورت
ہاتھ اٹھتے ہیں مگر حرفِ دعا یاد نہیں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ــــــ کراچی
عید کے خیال نے خوش تو کر دیا ہے لیکن
اب بھی سوچ کر تمہیں دل بہت اداس ہے

ایمان جلبانی ــــــ دریا خان
آیا ہے عزرائیل اٹھانے کے واسطے
اے اعتکافِ عشق عبادت تمام شد

شائستہ اکبر ــــــ گڈو کالونی
سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

ساجدہ شعیب ــــــ میانوالی
وہ جنگل کے پھولوں پہ کیوں مرتا ہے
اس کو اچھے لگتے ہیں ویرانے کیوں
محسن جب بھی چوٹ نئی کھا لیتا ہوں
دل کو یاد آتے ہیں یار پرانے کیوں

شازیہ گلزار ــــــ بھکر
جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اپنی
روٹھنا اس سے تو اوروں سے الجھتے رہنا

فائزہ بھٹی ــــــ پتوکی
تیری یاد کی خوشبو میرے دامن سے لپٹی ہے
بڑا اچھا سا لگتا ہے تمہیں ہی سوچتے رہنا

فوزیہ ثمر بٹ ــــــ گجرات
اپنے لیے بس ایک محبت ہی بہت ہے
ہم سے کوئی بھی غلطی ہو دوبارہ نہیں کرتے
جب تک وہ سلامت ہے عداوت کا مزا ہے
دشمن کو کبھی جان سے مارا نہیں کرتے

تحریم اکرم چوہدری ــــــ ملتان
آنچل تیری یادوں کا بھگو دیتی ہیں بارشیں
سوچوں پہ جمی گرد کو دھو دیتی ہیں بارشیں
ہنس ہنس کے سناتی ہیں جہاں بھر کے فسانے
پوچھوں تیرے بارے میں تو رو دیتی ہیں بارشیں

تہمینہ عمر ــــــ وہاڑی
شب و روز رہتی ہے تاریکی میرے آنگن میں
اب دیپ تو جلتے ہیں، اجالا نہیں کرتے
تو مانگ تو الفت میں کبھی جان بھی ہم سے
تیری تو کوئی بات ہم ٹالا نہیں کرتے

زارا ڈوگر ــــــ گوجرانوالہ
اس نے جب جب بھی مجھے دل سے پکارا محسن
میں نے تب تب یہ بتایا کہ تمہارا محسن
ہو گیا جب یہ یقین اب وہ نہیں آئے گا
آنسو اور غم نے دیا دل کو سہارا محسن

ثنا سلیم اعوان ــــــ گاؤں آخون باندی
آنکھوں کے لیے جشن کا پیغام تو آیا
تاخیر سے ہی چاند لبِ بام تو آیا
اس باغ میں اک پھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں میرا نام تو آیا





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت، عافیت اور سلامتی کے دعائیں۔
اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں، ہمارے پیارے وطن کو اپنوں اور غیروں کی سازش سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پہلا خط کراچی سے مہناز نعیم نے لکھا ہے

آپ کو نا قابل اشاعت تحریوں کے نام بتا دینا چاہئیں تاکہ لکھنے والی بہنیں اپنی تحریروں کے لیے شش و پنج کا شکار ہو کر دوسری جگہ نہ بھیجیں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر یہ اصول بنا لیجیے کہ رائٹرز اپنی کہانیاں دوسرے ڈائجسٹ میں بھیجنے سے پہلے آپ کو مطلع کر دیں تاکہ شائع شدہ کہانیاں آپ کے ڈائجسٹ میں شائع نہ ہوں۔
اس ماہ کا شعاع مجھے کچھ دیر سے ملا۔ ابھی پورا نہیں پڑھا۔ مگر سب سے بہترین مجھے عطیہ خالد کا "دل کے رشتے" لگا۔ دل کے نازک احساسات، پل پل بدلتے جذبات اور خود احتسابی کی کیفیت لیے ہوئی اس تحریر نے دل کو چھولیا۔ عطیہ خالد نے اس تحریر میں لفظ نہیں جذبے لکھے تھے۔ مجھے بے حد پسند آئی یہ تحریر۔
چند ماہ پہلے ایک افسانہ تھا جس میں لڑکی شادی سے پہلے بھی سلائی کر کے ماں اور بھائی کا خرچا پورا کرتی ہے اور شادی کے بعد بھی اس کو نکھٹو شوہر ملتا ہے۔ وہ افسانہ شاید شازیہ الطاف کا تھا۔ بہت ہی بہترین تھا۔
قرۃ العین خرم ہاشمی ہر بار نت نئے موضوع کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں اور ان کی قلم پر گرفت بھی مضبوط ہے۔
پیاری مہناز! آپ کی تجاویز اچھی ہیں۔ کرتے ہیں اس سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ۔ آپ کی اطلاع کا شکریہ۔ ویسے یہ بات ہمیں از خود معلوم ہو گئی تھی مگر دل آزاری کے خیال سے ہم اکثر باتوں کا ذکر نہیں کرتے۔ اور دو سال کی مدت تو بہت کم ہے۔ ہیری پوٹر کی مصنفہ نے تو تیس سال انتظار کیا تھا۔ کوشش کیا کریں کہ آپ کا خط 15 تاریخ تک ہمیں مل جائے۔ تاکہ ہم بھی آپ کے تبصرے سے فیض حاصل کریں۔

شمع غلام مصطفیٰ نے نامعلوم مقام سے لکھا ہے

بڑی دیر کر دی مہرباں آتے آتے۔ ناراضی اپنی جگہ لیکن محبت بھی بڑی ہے ان پرانی رائٹروں سے۔ سب سے پہلے ان کا ناولٹ پڑھا۔ "خواہشوں کی مسافت" دوسرا ناولٹ بھی کم نہ تھا۔ مجھے عالیہ بخاری کا دھیما انداز بیاں بڑا خوب صورت لگتا ہے۔ جو افسانہ دل کو چھو گیا وہ تھا "دل کے رشتے" عطیہ خالد نے بہت اچھا لکھا ہے۔
"قسمت" ایک ایسا افسانہ ہے جو معاشرے کی تلخ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ "ایک تھی ملکہ" یہ رشتوں کی بے حسی کو ظاہر کرنے والا افسانہ تھا۔ "ستاروں کا آنگن" قسمت اور پس آئینہ بس پسند آئے لیکن "بارش کے پار" بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ وجہ تو پتا نہیں شاید مرد میں اتنی وفا نہیں ہوتی کہ وہ پہلی محبت کو نہ بھول پائے۔ اور مکمل ناول میں آسیہ رزاقی کا ناول بس سو سو تھا، مجھے پتا نہیں چلتا کہ ان کی ہیروئین اتنی صابر کیوں ہوتی ہے۔
"شہرزاد" ایسا ناول ہے جو مجھے جکڑ لیتا ہے۔ پلیز یہ سلسلہ "جب تجھ سے ناتا" ختم کر دیں پہلے تو شادی کے بارے ایک آدھ خوشگوار خیال آتا تھا لیکن جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے اب تو خواب میں بھی نند اور ساس بال کھینچتی نظر آتی ہیں۔

"مسکراہٹیں" پڑھنے کے بعد یہ یاد آتا ہے' اچھا ہنسنا بھی تھا۔ میرا فیورٹ سلسلہ "خط آپ کے" ہے۔ اس سلسلے کی وجہ سے کئی قارئین سے دل کا رشتہ بن گیا۔ اچھا یاد آیا ایک قاری جو "نمرہ بٹ پتوکی" کی تھی اب کیوں نہیں لکھتیں۔

ج۔ پیاری شمع! بیٹھے بٹھائے ہم پر فیورٹ ازم کا الزام لگادیا۔ ہمارے لیے تو ہماری تمام قارئین محترم' محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ آئندہ ایسی بات کی نا تو ہماری ناراضی پکی ہے۔ رہی بات محبت کی تو مرد ہو یا عورت پہلی محبت کوئی بھی نہیں بھولتا اور نہ ہی وفا پر خواتین کی اجارہ داری ہے۔ وفا' ایثار' خلوص ان سب کا تعلق مزاج' ماحول اور تربیت سے ہوتا ہے۔ ہاں اگر قسمت اور حالات ہی موافق نہ ہوں تو کیا کیا جاسکتا ہے۔ آسیہ رزاقی کی ہیروئن اس لیے صابر ہوتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر عورت کو صبر ہی کرنا پڑتا ہے۔

ام صغریٰ نے وادی سون سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

چاند اپنے جوبن پر ہے' ہولے ہولے سرسراتی ہوئی ہوا پوری وادی میں چکراتی پھر رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی من چاہے پیا کے دامن کو چھو کر آئی ہو۔ اس وقت

میرے گھر کی بتی گل ہو چکی اور اب اندھیرے میں کچھ چاند کی روشنی اور کچھ برقی بتی کی روشنی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ساون کا مہینہ ہے اور چھاجوں مینہ برستا ہے۔ سرورق پر بنی دوشیزہ کے بجائے اس کے گلے کا ہار زیادہ بھایا۔ حمد و نعت کے بعد پیاری پیاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑھیں' دل بے چین کو اک سکون ملا۔ سمیرا حمید جب بھی لکھتی ہیں چاہے وہ کچھ بھی ہو بہت اچھا لکھتی ہیں اور میری وہ پسندیدہ رائٹر ہیں۔ جب تجھ سے ناتا' بہت خوب ہے' میرا بھی دل چاہتا ہے شرکت کرنے کا۔ مصطفیٰ قریشی صاحب ہمراہ بیگم ملاقات اچھی رہی پر نہایت مختصر تھی۔ شہرزاد بہت اچھا جارہا ہے۔ ناولٹ میں ثمرہ بخاری بازی لے گئیں۔

افسانوں میں نیر سلطانہ اور قرۃ العین سکندر کے افسانے اچھے لگے۔ عطیہ خالد کا دل کے رشتے بھی کافی بھایا۔ ناولوں میں (پیا من کی رت) بہت بہت اچھا تھا۔ لو جی اب ہمیں اجازت دیجیے۔ لگتا ہے وادی کے لوگوں کی دعائیں کچھ رنگ لے آئی ہیں۔ نہایت ہی کالی گھٹا جنوب سے چڑھتی آرہی ہے۔ تیز ہوا سے درخت جھوم رہے ہیں اور پہاڑ گرد میں چھپ گئے ہیں۔ ہمارے گیٹ پر نصب ہمارا جھنڈا ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہے۔ ڈر ہے کہیں زمین پر نہ آرہے۔

ج۔ پیاری ام صغریٰ! انتہائی دلفریب منظر کشی اور اس پر بے ساختہ اور جامع تبصرے نے تو سماں ہی باندھ دیا۔ بہت عمدہ۔ بہت خوب اور بہت شکریہ۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں۔

مقدس آصف' رائے ونڈ لاہور سے لکھتی ہیں

اس بار ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ سب سے پہلے حمد و نعت اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے ایمان تازہ کیا۔ شہرزاد اچھا جارہا ہے۔ انابیہ کے لیے دل بہت برا ہوا۔ اس بار شمارے کی جان "دل کے رشتے" لگا۔ پیا من کی رت' شکر ادا کیا کہ دو روٹھے ہوئے یار اور دل مل گئے۔ سنہری دھوپ کچھ خاص نہیں۔ دعا کو تو کٹھ پتلی بنادیا اس کے اپنوں نے جس پہ اسے بڑا اعتبار تھا اس کی ممانی نے اور عمر نے بہت برا کیا۔ اس کے ساتھ "یہی حقیقت ہے" بس ٹھیک تھا۔ باقی سارا رسالہ ہی زبردست تھا۔ اور سالگرہ کے موقع پر جو سمیرا حمید نے "یہ جو اوراق ہیں" لکھا زبردست۔

ج۔ پیاری مقدس! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ تعریف و تنقید مصنفین تک پہنچارہے ہیں۔

ثناء ذوالفقار نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

اگست کا ٹائٹل پسند آیا۔ حمد' نعت اور احادیث پڑھنے کے بعد سب سے پہلے "شہرزاد" پڑھا۔ صائمہ اکرم کی اسٹوری انٹرسٹنگ ہے۔ یہ قسط بھی اچھی رہی۔ اینڈ میں یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ شہوار' منال کو کیسے جانتی ہے۔ آسیہ رزاقی کا ناول "یہی حقیقت ہے" واقعی حقیقت پر مبنی تحریر تھی۔ سلویٰ سیف اللہ کا ناول "سنہری دھوپ" اس قسط میں دعا کے ساتھ بالکل اچھا نہیں ہوا۔ "خواہشوں کی مسافت" ثمرہ بخاری کی اچھی تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ "خوشبو بھری ساعتیں" ناولٹ اچھا تھا۔ اس شمارے کی سب سے بیسٹ تحریر ام طیفور کا ناول "پیا ملن کی

رت" تھی۔ ایک ہلکی پھلکی، منفرد اور دلچسپ تحریر تھی۔ فوزیہ پھوپھو کا کردار بہت مزے کا تھا اور ان کی انگلش بھی مزے کی تھی۔

افسانوں میں "قسمت" اور عطیہ خالد کا "دل کے رشتے" بیسٹ تھے۔ عطیہ خالد کا انداز تحریر بہت اچھا ہے۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" سلسلہ کافی مہینوں سے غائب تھا، اس شمارے میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ پلیز اسے ضرور شامل کیا کریں۔ "خط آپ کے" میں فوزیہ ثمریٹ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ بنت سحر کافی عرصے سے کیوں نہیں لکھ رہیں۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج۔ پیاری ثناء! درشہوار نے منابل کو اپنے پڑوسی ہادی کے گھر میں دیکھا تھا۔ لگتا ہے آپ نے غور سے نہیں پڑھا۔ بنت سحر کیوں نہیں لکھ رہیں، اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہیں۔ آپ کی طرح ہم بھی لاعلم ہیں۔

اقصیٰ طیب الرحمٰن گاؤں مونن ضلع ہری پور سے رقم طراز ہیں

سالگرہ نمبر، زیورات سے سجی حسین ساحرہ کے سرورق سے سجا موصول ہوا۔ اور پھر حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوئے۔ "یہ جو اوراق ہیں شعاع شعاع" سمیرا حمید کے تو کیا ہی کہنے، اتنا خوب صورت انداز بیان، زبردست۔

"مہ و سال آشنائی" سب کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن سیدہ نسبت زہرہ نے جو کچھ بھی کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔ زندگی واقعی تکلیف دہ سفر ہے۔ اس میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

پیا ملن کی رت، بہت اچھی تحریر تھی۔ میرے خیال سے اس کو قسطوں پر چلنا چاہیے تھا۔

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ لیکن "دل کے رشتے" تھوڑا سا ہی تھا، پر بہت اچھا تھا۔ "باتوں سے خوشبو آئے۔" اس سلسلے میں ہمیشہ ہی بہت خوشبو ہوتی ہے۔ غزلیں سب ہی اچھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں ساحرلدھیانوی کی غزل پڑھ کر ہنسی آگئی۔ شاید کسی لڑکی کے بارے میں تھی۔

اس کے علاوہ آپ سے درخواست ہے کہ بندھن میں جوان لوگوں کا انٹرویو دیا کریں۔ اور کنیز نبوی سے کہیں کہ "صنم سے صمد تک" جیسا نیا ناول لے کر کب آرہی ہیں۔ انتظار کے لیے ایک سال کا عرصہ کچھ کم تو نہیں ہوتا نا۔

ج۔ پیاری اقصیٰ! ساحرلدھیانوی کی نظم میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی کہ ہنسی آتی اور شاید نہیں یقیناً" کسی لڑکی کے بارے میں تھی۔ ہمارے اردو ادب کا آدھا شعری اثاثہ خاتون محبوب کے لب و رخسار، ساحر آنکھوں اور اس کی دلفریب مسکراہٹ پر ہی مشتمل ہے۔

فضہ سونیا بخاری، عاصمہ عباس بخاری، شالامار ٹاؤن لاہور سے شریک محفل ہیں

"شعاع" اور ہم آج سے اٹھارہ سال پہلے ایک ہوئے اور یہ ساتھ آج تک برقرار ہے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت کے بعد اپنا موسٹ فیورٹ ناول "خواب شیشے کا" پڑھا، صائمہ اکرم چوہدری کا "شہرزاد" اب تک کی سات اقساط پڑھ لی ہیں ہمیں درشہوار کا نٹ کھٹ سا انداز بھی بہت اچھا لگتا ہے۔

بندھن میں سینئر ایکٹر مصطفیٰ قریشی اور روبینہ قریشی کو پڑھ کر بہت اچھا لگا اور شکریہ شاہین آپا، افسانوں میں "دل کے رشتے" عطیہ خالد کا اور "قسمت" قرۃ العین سکندر دونوں کی بہت اچھی کاوش تھی۔ "باتوں سے خوشبو آئے" سے اس دفعہ دل اور دماغ دونوں معطر ہوئے۔ ہاں یاد آیا، نبیلہ عزیز کو بھی ہماری مبارکباد دے دیں (رقص بسمل کا اینڈ جو ہمیں پسند آیا تھا اس کے لیے)

ج۔ پیاری دوستوں! اتنی تعریفوں کے جواب میں سوائے شکریہ کے کیا کہیں۔ عالیہ بخاری اور ثمرہ بخاری کے ناول تو ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہم ان تک آپ کی فرمائش بھی پہنچا رہے ہیں۔

منزہ فیاض، عائشہ اقبال اور سدرہ رحمت گاؤں ڈھنگ شاہ ضلع قصور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ہمارے پاس شعاع کے شمارے 2001 سے لے کر سارے پڑے ہوئے ہیں۔ کسی کو دیتے نہیں ہیں چونکہ لوگ واپس جو نہیں کرتے۔ آپی کبھی کبھی شعاع بہت بوریت والا ہو جاتا ہے لیکن شکر ہے اس مہینے خوب رہا۔ "پیا ملن کی رت میں آپ نے ہمیں بہت رلایا اور ہنسایا ہے۔ شکریہ اتنا اچھا ناول لکھنے پہ۔ سب سے زیادہ خوشی عالیہ بخاری اور ثمرہ کے نام پڑھ کر ہوئی، ایک کہانی تھی

جس میں ہیروئن کی سہیلی کا نام خاور تھا اس کے خاوند کو غلط فہمی ہوتی ہے (نام کی) اس کے علاوہ ردیم تھا ایک ہیروئن کا نام۔ یہ دونوں ڈائجسٹ پلیز بتادیں کہ کب شائع ہوئے تھے۔

افسانوں میں عطیہ خالد نے بہت اچھا لکھا ہے۔ آسیہ رزاقی کے تو کیا کہنے یہ 'ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں جن کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف ہمارے لیے بہترین ہے۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے اچھا سلسلہ ہے۔ بہنوں کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ شوبز انڈسٹری کے علاوہ بھی ادبی شخصیات سے ہماری ملاقات کروائیں۔ جرگہ والا سلیم صافی' حامد میر اور یا مقبول جان' ہاشم ندیم کا فیملی انٹرویو کریں۔

مصنفین سے گزارش ہے کہ پیار محبت کے علاوہ کچھ اچھوتے اور منفرد موضوعات پر لکھیں۔ ہم بے زبانہ کی رائٹر سے لوڈ شیڈنگ اور بے روزگاری جبکہ گزشتہ سالوں میں کراچی کے جو حالات تھے اس پر کسی منجھی ہوئی رائٹر سے ناول لکھوائیں۔ مجھے سیاست دانوں کی اندر کی کہانیاں جاننے کا بہت شوق ہے۔

رفعت سراج' عمیرہ احمد' رخسانہ نگار' فائزہ' ماہا ملک' ساجدہ حبیب کو بازو سے پکڑ کر لے آئیں۔ شاید ایسے ہی آجائیں۔ موسم کے پکوان میں بڑے گوشت کی زیادہ ترکیبیں دیں اور ساری چیزوں کے نام اردو میں لکھا کریں مثلاً "سویا ساس" مسٹرڈ پاؤڈر' ووسٹر ساس' ہمیں کیا پتا یہ کیا چیزیں ہیں۔

ج۔ پیاری منزہ! آپ کو نہیں پتا تو دکان دار کو تو پتا ہے ناں۔ حسب ضرورت جو چیز مانگیں گی وہ "قیمتاً" دے دے گا۔ ان چیزوں کے یہ اصلی نام ہی ہیں۔ جن اچھوتے موضوعات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اگر ہماری کوئی رائٹر لکھنا چاہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں۔

تسمیہ رمضان.... لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل انتہائی خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے "شہرزاد" پڑھی۔ اس کہانی میں مجھے فاریہ کا کردار بہت اداس کردیتا ہے۔ پیا ملن کی رت میں بنٹے اور کبوتر کی دوستی بہت پسند آئی۔ نواب حسنین خان کے ڈائیلاگ۔ واللہ ہم کہہ رہے ہم کچھ کر بیٹھیں گے نے بہت ہنسایا۔ سنہری دھوپ میں دعا کے ساتھ کچھ مزید برا مت کریں۔ یہی حقیقت ہے۔ آسیہ رزاقی کا خوب صورت مکمل ناول میں یمنی اور حمنہ بہت پسند آئیں۔ خوشبو بھری ساعتیں میں ہامی کے کردار کی ہمارے خاندان میں دو خواتین موجود ہیں۔ دل کے رشتے ایک خاموش کردینے والی اور سوچنے والی تحریر ہے 'اپنی ماں جیسا پیار کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ خواہشوں کی مسافت شباب میں مجھے اپنی جھلک نظر آئی وہ سب کام اس سے کروائے جارہے تھے میں خود شوق سے کرتی ہوں۔ قسمت میں منزہ کا صبر بہت پسند آیا۔ غزلیں چاروں ہی زبردست تھیں۔ بارش کے پار' کاش بارشیں سب کے لیے خوشیاں لائیں۔

پیاری تسمیہ! زندگی پروردگار کی بڑی عظیم نعمت ہے۔ اسے کم ظرف لوگوں کی خاطر ختم کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ابھی آپ کی عمر صرف 22 سال ہے۔ خدا آپ کو طویل زندگی دے۔ شاہراہ حیات پر نہ جانے کتنی خوشیاں آپ کی منتظر ہیں۔ خود ترسی کی کیفیت سے باہر آئیں۔ آپ پڑھی لکھی ہیں' کہیں جاب کریں۔ پاپا اور چھوٹے بھائیوں کی خاطر خوشی خوشی جئیں۔ آپ کی مایوسی گھر کا ماحول بوجھل کردے گی۔ دنیا والوں کی پروا نہ کریں۔ خوش رہیں۔ گھر والوں کو خوش رکھیں۔ جو ہو گیا اس پر کڑھتے رہنے کے بجائے جو ہونے والا ہے 'اس کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دیں۔ زندگی صرف دعاؤں کے سہارے نہیں گزرتی۔ اپنے حصے کی خوشیاں خود تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رضوانہ شکیل راؤ.... لودھراں سے لکھتی ہیں

ماڈل گرل میک اپ اور ڈریس اچھا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں من کو روشن کر گئیں.... سمیرا حمید آپ واقعی تعریف کی مستحق ہیں۔ سمیرا آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ قلم 'کتاب' تفکر' قوم کی فلاح کے معتبر ذرائع ہیں ۔مہ و سال آشنائی میں سیدہ نسبت زہرا کی باتیں اچھی اور کھری لگیں۔ شہرزاد کی کہانی اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ "محبت کے بغیر رہا جاسکتا ہے۔ عزت کے بغیر نہیں۔" فارحہ کا جملہ اچھا تھا۔ سلویٰ سیف اللہ کا سنہری دھوپ متاثر کرنے میں ناکام۔ تجھ سے ناتا جوڑا ہے اچھا جارہا ہے۔ اجازت ہو تو اس سلسلے میں ہم بھی شرکت کرلیں؟ اشعار میں ہما فاروق کا شعر اچھا لگا۔ خط آپ کے میں کوثر خالد کی کمی محسوس ہوئی۔ فوزیہ ثمر بٹ۔ بھئی کمنٹس ملتے ہیں تو آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ

قارئین بہنیں آپ کو کتنا توجہ سے پڑھتی ہیں۔
بیڈ کمنٹس سے کیا دلبرداشتہ ہونا۔ بھئی آپ مسکراتی ہی اچھی لگتی ہیں۔
پیاری رضوانہ! اجازت کی کیا ضرورت' یہ تمام سلسلے بہنوں کی شمولیت کے لیے ہی شروع کیے گئے ہیں۔ فوزیہ کے لیے کمنٹس بیڈ نہیں تھے بالواسطہ فوزیہ کی تعریف تھی جس کو فوزیہ سمیت تمام بہنیں سمجھ نہ سکیں۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ہماری قارئین اتنی بھولی ہیں۔ آئندہ واضح لفظوں میں لکھیں گے۔ کوثر خالد اور دیگر مستقل خطوط لکھنے والی بہنوں کی کمی ہمیں بھی بہت محسوس ہو رہی ہے۔

ثوبیہ ارشد نے میاں چنوں سے لکھا ہے

"شہزاد" بہت زبردست رہا۔ صائمہ اکرم ویل ڈن' واقعی عورت کی عزت اس کے شوہر سے ہی ہے۔ ہمیشہ شادی وہیں کرواؤ جہاں پیار سے زیادہ عزت ملے۔ وری گڈ ایک اور ریکویسٹ بھی آپ سے۔ وہ یہ کہ صنم جنگ کا انٹرویو پلیز پلیز شائع کریں۔ آپی جی پلاؤ کی ریسپی بھی سکھادیں۔

ج۔ پیاری ثوبیہ! جہاں تک ہماری یادداشت ساتھ دے رہی ہے ہم نے آپ کا خط بمع اپنے جواب کے شائع کیا تو تھا غالباً" آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ ردی کی ٹوکری میں جانے سے پہلے ہر خط ہماری نظروں سے ضرور گزرتا ہے۔ اطمینان رکھیں ہم آپ لوگوں کے خیالات و آراء سے ضرور آگاہ ہوجاتے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر پلاؤ کی ترکیب شامل ہے۔
آپ کے والد ارشد صاحب کے لیے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

نوشابہ نزہت شمائلہ اور عائشہ نے جناح تاؤن خان پور سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

اس دفعہ شمارہ کچھ دیر سے ملا۔ ٹائٹل بہترین تھا۔ "پیارے نبی کی باتیں" پڑھنے کے بعد جب دیکھا کہ عفت جی کا "خواب شیشے کا" شامل نہیں تو مایوسی ہوئی' لیکن جب صائمہ اکرم کا "شہزاد" پڑھا تو بہت اچھا لگا اور ام طیفور کے ناول کے بارے میں کیا کہوں۔ میاں جی اور بے جی کی پنجابی اور فوزیہ پھوپھو کی انگریزی پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ (بھئی ہنس ہنس کے)۔ "سنہری دھوپ" بھی اچھا ناول ہے۔ آسیہ رزاقی کا "یہی حقیقت ہے" بہت اچھا ناول یمنی کا بے ساختہ بولنا کافی مزہ دے گیا۔ "خوابوں کی مسافت" میں شباب بے چارہ اپنی ہی شادی پہ کام کرتا رہا۔ عالیہ بخاری کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ افسانے بس ٹھیک تھے' لیکن "بارش کے پار" اچھا لگا۔ سمیرا حمید کا "یہ جو اوراق ہیں" بہت اچھا لگا۔ عمیرہ احمد سے درخواست ہے کہ وہ بھی پھر سے کوئی اچھا سا ناول لے کر آئیں اور آپی بندھن میں کرکٹر محمد عامر کا انٹرویو کریں۔

ج۔ نوشابہ' نزہت' شمائلہ اور عائشہ! آپ سب دوستوں کا شکریہ کہ آپ نے ہماری محفل کو رونق بخشی۔ عمیرہ احمد تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ ہماری بھی خواہش ہے کہ وہ شعاع کے لیے لکھیں۔

نادیہ ریاض اور ماریہ ریاض لکھتی ہیں

سرورق اچھا لگا۔ "شہزاد" اچھا جارہا ہے امید ہے بہترین ناول ثابت ہوگا۔ "خواب شیشے کا" نہ پاکر بے حد مایوسی ہوئی' مگر وجہ پڑھ کر چپکے ہو بیٹھے۔ "پیا ملن کی رت" واہ بھئی واہ! بہت خوب مزیدار۔ اس پر آشوب دور میں ایسا ناول بھی تو تحفہ ہے۔ یا اللہ! یہ "سنہری دھوپ" کتنا گھسا پٹا موضوع۔ خدارا اسے جلد از جلد ختم کریں۔ اگر یہ سلویٰ علی بٹ وہی ہیں جنہوں نے دل کے رستے دشوار بہت لکھا تھا تو مجھے یقین نہیں آئے گا۔ آسیہ رزاقی تو ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ ناولٹ بھی اچھے لگے اور افسانے تو سارے کے سارے اچھے تھے۔ "بارش کے پار" بہت اچھا لگا۔
راحت جبیں اگر نہیں لکھتیں تو ان کی کوئی پرانی کہانی ہی شائع کردیں۔ "خط آپ کے" بہترین سلسلہ ہے۔ تمام قارئین بہت پیارا بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ شعاع اور خواتین کی مصنفین تو دور قارئین جیسا بھی کوئی نہیں ہے۔ سمیرا حمید تو پرستان کی پری ہیں جن کے پاس مشک مشک الفاظ سے بھری بے حد خوبصورت ٹوکری ہے۔
"ورق ورق شعاع" میں تو ہمارے دل کی بات کہی انہوں نے۔ فرزانہ کھرل کہاں غائب تھیں اس دفعہ۔ "خوب صورت بنیے" میں ہاتھوں اور پیروں کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے کوئی ٹوٹکا بتائیں۔ پلیز۔ شاہین رشید سے ایک انٹرویو کی پرزور فرمائش ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو کریں پلیز اور نہیں تو کوئی پرانا ہی شائع کردیں یا پھر....

ان کی کسی کتاب پر تبصرہ ہی کردیں۔"
ج۔ پیاری نادیہ اور ماریہ! آپ کی معصوم خواہشیں ذرا ذرا کٹھن بھی ہیں۔ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی کو تو ضرور پورا کردیں۔
خواتین پر تبصرہ کے لیے آپ علیحدہ صفحہ استعمال کیا کریں۔

رخسانہ عبدالستار اینڈ انیبہ منیر گوجرانوالہ مغل چک سے لکھتی ہیں

تین اگست کو اپنا من پسند شعاع منگوایا تو اپنا خط نہ پا کر بہت افسوس ہوا۔ حمد و نعت بہت اچھی تھیں پیارے نبی کی پیاری باتیں میں حدیث بخاری کا حوالہ بڑا اچھا لگتا ہے۔ ناول دونوں ہی بہت اچھے جارہے ہیں۔ مکمل ناول میں "سنہری دھوپ" اچھا ہے۔ 6th سے میں نے شعاع کو اپنا دوست بنایا ہے۔ اب تو M.A.ECO کے پیپر دیے ہیں۔
ج۔ پیاری رخسانہ اور انیبہ! اتنا مختصر نامہ پڑھ کر یقین نہیں آرہا کہ یہ واقعی دو لڑکیوں نے مل کر لکھا ہے۔

ہماری یہ قاری بہن اپنا اور اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں

"شعاع" اور "خواتین ڈائجسٹ" سے دوستی پرانی نہیں قدیم ہے' جب سے "شعاع" کا آغاز ہوا ہے' تب سے باقاعدگی سے مطالعہ میں رہتا ہے' مگر ماہ نومبر اور دسمبر 2013ء کے شماروں نے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا ہے۔ نومبر میں مصباح علی کا "حاصل کشت و خون" اور دسمبر میں نعیمہ ناز کا "دو ٹکڑے" اسی تسلسل کی کہانی ہے۔ پاکستان بنانے کی جو قیمت ادا کی گئی ہے' اسے یاد رکھنا ہم سب قارئین کا فرض ہے اور ہمارے لکھاریوں کا فرض بھی۔
قابل اجمیری کی غزل نے بیتا دور یاد کرادیا۔ جب مشغلے اشعار اور غزلیں یاد کرنا ہوا کرتا تھا نئے برانڈ کی طرح' نئی غزل کس کو یاد ہے؟ کا فیشن ہوتا تھا۔ آپ کی ممنون ہوں کہ ادب کو اس دور میں زندہ رکھا ہے۔
ج۔ اوہ خدا! اتنی طویل دوستی میں صرف دو شمارے اس قابل ٹھہرے کہ آپ ہم سے مخاطب ہوئیں۔ بخدا جون ایلیا یاد آگئے۔

اب تک کیا ہے جو' رائیگاں گیا ہے وہ
اور کیا کیا جائے اور کیوں کیا جائے؟

ثریا کوثر ضلع گجرات تحصیل کھاریاں کے گاؤں جنڈانوالہ سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

میں عرصہ 28 سال سے آپ کے رسالوں کی خاموش قاری ہوں۔ کیا بتاؤں کہ ان رسالوں نے میری کس کس وقت میں رہنمائی کی ہے۔ جب نئی شادی ہوئی جب اتنے بڑے سسرال میں رہنا پڑا جب وہ کہتے تھے کہ ادھر سے نکلو' جا کر اپنا مکان بناؤ اور ہمارے وسائل نہیں تھے۔ ان کے ایسے رویے پر صبر کرنا کتنا مشکل تھا کہ کیا بتاؤں۔ یہ رسالے ہی تھے جنھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔
ج۔ محترمہ ثریا! ناتا جوڑا میں ضرور شرکت کریں اور اپنے تجربات میں ہمیں شریک کریں ہمیں خوشی ہوگی۔ یہ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ آپ کا اور ہمارا اتنا طویل ساتھ ہے۔ آئندہ آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔

فوزیہ ثمریٹ' ہانیہ عمران' آمنہ رئیس۔ گجرات

سرورق اچھا لگا۔ ماڈل کی آنکھیں کافی خوب صورت تھیں۔ فہرست میں عالیہ بخاری اور ثمرہ بخاری کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ نعت شریف' حمد باری تعالیٰ' دل کو چھو لینے والے الفاظ۔ سمیرا جی کے دل کے اوراق بھی اچھے تھے۔ اور سال میں سب نے اپنے کی خوب ترجمانی کی۔ بندھن بھی پرفیکٹ تھا۔
ام طیفور کا ناول کا اینڈ بھی دلچسپ انداز میں اختتام پذیر ہوا اور پھوپھو فوزی کی انگریزی ٹاک بھی مزیدار رہی۔ ہریات کے اینڈ پر بے بے کا منہ بھر کے درفٹے منہ کہنا بھی خوب لگا۔ "سنہری دھوپ" یہ تحریر بھی اچھی تھی۔ عالیہ بخاری اور ثمرہ جی دونوں کے ناولٹ اچھے تھے۔
جولائی کے شعاع میں راہی حمید کا خط شامل تھا جس میں انہوں نے یہ کہا کہ میں باسی روٹی کے ٹکڑے بیچ کر رسالے خریدتی ہوں۔ ان سے ایک چھوٹی سی بات کہنی تھی۔ ہر پل رب کائنات کا شکر ادا کیا کریں کہ رازق نے اتنا رزق تو دیا ہوا ہے کہ جو بچ جاتا ہے۔
ج۔ پیاری فوزیہ! جب سے اسکول اور کالج کا ساتھ چھوڑا ہے ہم نے بہانے بنانے بند کردیے ہیں۔ کبھی ہماری بات

پر یقین بھی کرلیا کریں ہم کوئی سیاست دان تھوڑی ہیں کہ آپ ہر وقت ہم سے بدگمان رہتی ہیں۔ تجھ سے ناناباری آنے پر لگے گا۔ (سچ' بہانہ نہیں) اور یہ جو بھینس کے متعلق آپ نے لکھا ہے' بھینس کو نہ بتا دینا۔ اگر اسے عقل آگئی تو ہم کیا کریں گے۔ پہلے ہی اتنا کم دودھ دیتی ہے اور آج کل تو واٹر بورڈ والوں نے بھی پانی کے ناغوں میں خوب اضافہ کر رکھا ہے۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" سے ہم نے تو یہ سبق سیکھا ہے کہ صرف دوسروں کے بارے میں ہی نہیں' اپنے بارے میں بھی زبان بند ہی رکھنی چاہیے۔

مہروش بلوچ' پری وش بلوچ اور دل وش بلوچ نے ضلع کوہلو بلوچستان سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

ہمارے ضلع سے آج تک کسی نے خط پوسٹ نہیں کروایا کیونکہ ہمارے ہاں خط پوسٹ کرنا بڑا مشکل کام ہے' لیکن کچھ لوگ مشکل میں راستہ بنانے والے ہوتے ہیں (ارے بھئی ہم اور کون؟) الحمدللہ ہمیں ڈائجسٹ پڑھنے اور منگوانے میں کوئی دشواری نہیں البتہ خط پوسٹ کرانے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ ڈائجسٹ ہمارے پورے ضلع میں صرف ایک ہی دکان پر دستیاب ہے جس سے پورا شہر مستفید ہوتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے ہمیں شعاع اور خواتین سے بہت انسیت ہوگئی ہے ایسے لگتا ہے کہ یہ ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ اور پلیز پلیز... نمرہ آپی شاہین آپا اور وسیم بادامی کا انٹرویو ضرور ضرور لیں۔ تمام مصنفین سے عرض کرتے ہیں کہ بلوچ قبیلے کی ایک کہانی ضرور لکھیں اتنا بتاسکتے ہیں کہ بلوچ بے حد سادہ' نیک دل' جذباتی اور پردیسیوں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ بلوچوں میں ایک بڑا قبیلہ (مری) Murri قبیلہ ہے۔ اگر اس کے بارے میں لکھا جائے تو زیادہ خوشی ہوگی۔

ج۔ پیاری مہروش بلوچ' پری وش بلوچ اور دل وش بلوچ! اپنے ناموں کے معنی بھی لکھ دیتیں کچھ ہمارے علم میں بھی اضافہ ہوتا۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ مشکل الفاظ پر اعراب لگائیں۔ آئندہ مزید دھیان دیں گے۔ آپ کی فرمائش تحریر کررہے ہیں' شاید کوئی مصنف پوری کردے۔

اسما گل نے مغل کوٹ مبارک سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

مجھے شعاع پڑھتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور آج کل ہم روشنیوں کے شہر کراچی میں آئے ہوئے ہیں' اب روشنیوں کا شہر کچرے سے بھرا ہے۔

ج ۔ پیاری اسما! کراچی کو کچرا دی بنانے میں جہاں حکام کی غفلت اور کام چوری شامل ہے۔ وہیں عوام کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ دوسروں پر تنقید کرنے کے بجائے اگر اصلاح کا عمل ہم اپنی ذات سے شروع کریں تو شاید مسائل پہاڑوں کی صورت اختیار نہ کریں۔ کیا کیا جائے آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ کراچی میں اب کام ہوتا نظر آرہا ہے۔ سڑکیں بھی بن رہی ہیں اور کچرے کے ڈھیر بھی صاف ہوچکے ہیں۔ اور بڑی تعداد میں کچرے کے لیے ڈبے بھی رکھوا دیے گئے ہیں۔

حمنی اقبال' فیض آباد سے لکھتی ہیں

شعاع کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں دل کو سکون بخشتی ہیں۔ افسانہ ہو یا ناولٹ یا کوئی مکمل ناول' ہر کہانی دل کو چھولینے والی "خواب شیشے کا" میں مجھے لگتا ہے مہر کا نکاح موحد کے ساتھ ہوا ہے اب آگے عفت سحر بہتر جانتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جو شعاع میں لکھتی ہوں۔ اور اگلے مہینے میرا ایک فنکشن ہے' دعا کریں کہ اچھے طریقے سے ہوجائے۔

ج ۔ پیاری حمنہ! آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ کا فنکشن کامیاب ہو اور بخیر و خوبی انجام پائے۔ (آمین)



دستک
دستک
دستک

شاہین رشید

سویرا ندیم

"جی کیا حال ہے آپ کا؟"

"الحمدللہ۔"

"کافی عرصے کے بعد آپ کو اسکرین پہ دیکھ رہے ہیں... کہاں تھیں؟"

"کہیں نہیں... اس انڈسٹری میں... کام کیا مگر کم۔ تواتر کے ساتھ نظر آؤ تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بہت کام کر رہی ہیں... کم نظر آؤ تو لوگ سوال پوچھتے ہیں۔"

"گزشتہ چند سالوں پہ نظر دوڑائیں اور آپ کے ڈرامے دیکھیں تو نعمان اعجاز صاحب کے ساتھ آپ نے زیادہ کام کیا۔ کوئی خاص وجہ؟"

"نعمان اعجاز نہ صرف بہت اچھے انسان ہیں، بلکہ بہت اچھے فنکار بھی ہیں اور ان کے ساتھ میں نے کافی کام کیا ہے... شاید ان کی اور میری کیمسٹری بہت اچھی ہے۔ ان سے دوستی کا رشتہ ہے، احترام کا رشتہ ہے... پھر لوگ بھی پسند کرتے ہیں تو مزہ آتا ہے ان کے ساتھ کام کر کے۔"

"آج کل آپ کا نعمان اعجاز صاحب کے ساتھ "لوٹ کے چلے آنا" دیکھ رہے ہیں... اپنے اس کردار کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"جی... بالکل... میں نے دیکھا ہے کہ شادی کے بعد عورت اپنی ازدواجی زندگی میں مست ہو جاتی ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت جو رب نے اسے دی ہوتی ہے وہ ماند پڑ جاتی ہے... لیکن جب زندگی میں کوئی بڑا موڑ آتا ہے جہاں اسے اپنا آپ منوانا ہوتا ہے تو پھر وہ اپنی ان صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے... تو یہ کردار بھی ایک ایسی ہی عورت کا ہے۔"

"یہ تو ڈراما ہے... کیا عورت کو اپنی صلاحیتوں کو برے وقت میں ہی استعمال کرنا چاہیے؟"

"بالکل بھی نہیں... یہی عورت کی غلطی ہے کہ وہ شادی کے بعد شوہر پر مکمل طور پر انحصار کرنے لگتی ہے۔ اس میں اگر کوئی صلاحیت ہے اور وہ تعلیم یافتہ ہے تو اپنی مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر کچھ نہ کچھ ضرور کرے۔ یہ کردار میں نے اس لیے بھی کیا کہ کافی عرصے کے بعد مجھے اپنی پسند کا رول ملا تھا۔"

"آپ ایک اچھی ڈائریکٹر بھی ہیں... اسے کر رہی ہیں یا چھوڑ دیا ہے؟"

"یہ کام جاری ہے، مگر تھوڑا سلو... آج کل بھی

ایک سیریل بنا رہی ہوں جسے لکھ بھی رہی ہوں اور ڈائریکٹ بھی خود کر رہی ہوں تھوڑا کام مکمل ہو جائے پھر اس کی تفصیلات سب کو بتاؤں گی۔"

"بہ حیثیت ڈائریکٹر کے کوئی سیریل چیلنج بنا آپ کے لیے؟"

"ہاں.... ایک ڈراما سیریز کی تھی "قربتوں کے سلسلے" یہ پی ٹی وی سے آن ایئر ہوئی تھی اور یہ 25 منٹ کی سیریز تھی اور اس میں ہر ہفتے ایک نئی کہانی پیش کی جاتی تھی.... تو یہ کام میرے لیے اس لیے چیلنج بنا کہ ہر ہفتے ایک نئی کہانی پیش کرنا تھوڑا مشکل تھا.... ویسے میں ہر کام چیلنج سمجھ کر ہی کرتی ہوں۔"

"پہلا سیریل کون سا تھا بہ حیثیت ڈائریکٹر کے؟"

"میں نے شروعات سیریل سے نہیں بلکہ ایک ٹیلی فلم "کل" سے شروع کی تھی اور یہ "جیو" سے ٹیلی کاسٹ ہوئی تھی۔ اسے میں نے لکھا بھی خود تھا.... پروڈیوسر بھی میں تھی اور ڈائریکٹر تو تھی ہی میں اور مزے کی بات یہ کہ پرفارم بھی کیا تھا۔"

"بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے اپنا بہترین ڈراما کسے کہیں گی؟"

"یہ سوال بہت مشکل ہوتا ہے سب کے لیے.... لیکن میرے لیے نہیں کیونکہ کچھ ڈراما سیریل ایسے ہوتے ہیں جو ذاتی طور پر بھی بہت پسند آتے ہیں آرٹسٹ کو تو مجھے "قید تنہائی" اور "بڑی آپا" بہت پسند ہیں۔ "ساون" بھی بہت اچھا تھا اور اسے بھی اپنے بہترین ڈراموں میں شمار کروں گی۔"

"ڈرامے کیے، تھیٹر کیا، ڈائریکشن کی.... فلم کی آپ نے؟"

"ایک فلم "گڈ مارننگ کراچی" کی تھی.... کافی مختصر رول تھا میرا.... آفرز ہوتی ہیں مگر کردار میری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا تو پھر کیا فائدہ.... صرف نام تو بنوانا نہیں کہ سویرا نے اتنی فلمیں کی ہیں۔"

"آپ کے خیال میں.... بلکہ آپ نے ابھی ذکر کیا "گڈ مارننگ کراچی" کا تو گڈ مارننگ سے یاد آیا کہ کبھی میزبانی کی آپ نے گڈ مارننگ شو کی؟"

"جی بالکل.... مارننگ شو کی میزبانی کی ہے اور مجھے بہت مزہ آتا تھا کیونکہ ہر روز نت نئے مہمانوں کے ساتھ اور باصلاحیت مہمانوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا.... اور میرا مارننگ شو دیگر مارننگ شو سے بہت مختلف ہوتا تھا.... اگر ویسا شو کرنے کو ملے تو ضرور کروں گی۔"

"اور میرا جو سوال ادھورا رہ گیا تھا وہ یہ کہ ڈائریکشن کر کے زیادہ ایزی فیل کیا یا اداکاری کر کے یا تھیٹر کر کے؟"

"سچ پوچھیں تو ڈائریکشن مشکل اور توجہ طلب کام ہے کیونکہ ڈائریکشن میں آپ کو صرف فنکاروں کو ہی ہدایات نہیں دینی ہوتی، بلکہ لائیٹنگ، کیمرہ ورک، میوزک، ایڈیٹنگ، کونٹینیٹ، ساؤنڈ ایفکٹ ہر چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے تب ایک اچھی چیز ناظرین کو دیکھنے کو ملتی ہے.... اور ساری باریکیاں سوچنا ہمارا کام ہے۔ فنکار کا کام تو صرف اپنے کردار کو پرفارم کرنا ہے.... تو اس لحاظ سے دیکھیں تو ڈائریکشن بہت مشکل کام ہے۔"

"کتنے سال ہو گئے اس دشت کی سیاحی میں؟"

"تقریباً پندرہ سال ہو گئے ہیں اور اس عرصے میں کافی کام کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے ہر کام کو ناظرین نے سراہا ہے اور کوئی مجھ سے پوچھے کہ کتنے سیریلز، کتنی ٹیلی فلمز اور تھیٹر کر چکی ہیں تو سچ پوچھیں مجھے بالکل بھی یاد نہیں ہے.... اس انڈسٹری میں آ کر، کام کر کے میں نے سیکھا بہت ہے۔"

"کبھی کراچی کبھی لاہور.... کام کی وجہ سے؟"

"جی.... کام کی وجہ سے اور کام نہ بھی ہو تو آنا جانا لگا رہتا ہے کیونکہ میرا ننھیال کراچی میں ہے اور ددھیال لاہور میں ہے.... اور اب میرا میکہ لاہور میں اور سسرال کراچی میں ہے۔ تو اس لیے بہت زیادہ آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"پروفیشنل ماحول کہاں کا ہے کراچی یا لاہور؟"

"مجھے تو کراچی کا ماحول پروفیشنل لگتا ہے اور لاہور کا بھی ہے مگر اتنا نہیں جتنا کراچی کا ہے۔"

"بچے' شوہر' سسرال... اور ٹی وی کی اور ڈائریکشن کی مصروفیات گھر ڈسٹرب ہوتا ہے؟"

"میں اپنے کام اور اپنے گھر میں بہت توازن رکھتی ہوں۔ کیونکہ بچوں کی اچھی پرورش کرنا' ان کی دیکھ بھال کرنا' ان کی تعلیم کا خیال رکھنا یہ سب ماں باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے... تو اللہ کا شکر ہے سب کچھ توازن کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"شکریہ سویرا ٹائم دینے کا۔"

یاسر نواز

"کیا حال ہے جی؟"

"آپ سنائیں۔"

"کیا ڈراما ڈائریکشن کو خیرباد کہہ دیا ہے؟"

"نہیں... کس نے کہا آپ سے۔ چھوڑا نہیں گیپ دیا ہے۔"

"بھئی... آپ فلموں میں جو مصروف رہنے لگے ہیں؟"

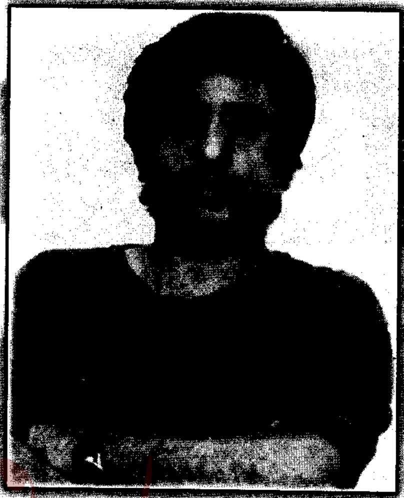
"دیکھیں جی... ہر انسان کی خواہش ہے کہ وہ آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے... پہلے اداکاری' پھر ڈراما ڈائریکشن اور اب فلمیں۔ تو آگے تو بڑھنا چاہیے نا۔"

"اور ماشاء اللہ آپ فلموں کی ڈائریکشن میں بھی بہت کامیاب ہیں؟"

"بس... یہ اللہ کا کرم اور آپ سب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ بہت زمانے سے میری خواہش تھی کہ میں فلمیں کروں... اور اللہ نے میری اس خواہش کو پورا کیا... اب دو تین سال ڈراما نہیں کرنا بلکہ اپنی ساری توجہ میں نے فلموں پر مرکوز کرنی ہے... اور اگر مجھے اچھا رسپانس ملا تو پھر مکمل طور پر فلموں کی طرف آجاؤں گا۔"

"باہر سے آفر آئی؟"

"فی الحال تو مجھے صرف پاکستان کے لیے کام کرنا ہے۔"



"کام کون سا آسان ہے؟ ڈائریکشن ڈراموں کی یا فلموں کی یا پھر اداکاری؟"

"جو کام دل سے نہ کیا جائے وہ مشکل ہی ہوتا ہے اور چونکہ میں ہر کام بہت دل سے کرتا ہوں' محنت کے ساتھ کرتا ہوں' اس لیے میرے لیے سب کام آسان ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شوق کا فیکٹر بہت ضروری ہے۔۔۔ شوق و لگن سب کام کو آسان بنا دیتے ہیں۔"

"پیسہ کس میں ہے فلم میں یا ڈرامے میں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ پیسہ دونوں میں ہے۔ بشرطیکہ کامیاب ہو۔ فلم کا بزنس ایک رسکی بزنس ہے۔ کامیاب ہو جائے تو وارے نیارے ورنہ۔۔۔"

"اس کام کے لیے ڈگری ضروری ہے یا تجربہ؟"

"میرے خیال میں اس کام کے لیے خداداد صلاحیت کا ہونا بہت ضروری ہے اور مجھ میں اللہ نے یہ صلاحیت ڈالی اور جو کمی تھی وہ والد کے ذریعے پوری ہوئی۔۔۔ تو تجربہ کام کرنے سے آتا ہے۔ جتنا زیادہ کام اتنا زیادہ تجربہ۔"

"کیا فلم کے لیے اداکار کچھ اور اور ٹی وی کے لیے کچھ اور ہونے چاہئیں؟"

"میرا تو یہی خیال ہے کہ دونوں میڈیا کے لیے الگ الگ اداکار ہونے چاہئیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کو فلم ڈراما نہ لگے بلکہ فلم ہی لگے۔ اب وہ فنکار جو ہر وقت ٹی وی پہ نظر آتے ہیں وہی اگر فلم میں بھی نظر آئیں گے تو لوگ کیسے دلچسپی لے سکتے ہیں۔۔۔ اس لیے میں نئے چہروں کو لینے کا قائل ہوں۔"

"عموماً" ڈراموں میں کام کرنے کے بعد اگلا قدم فلم کی طرف ہوتا ہے۔۔۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ایک جیسے چہرے ہو جاتے ہیں؟"

"میری اپنی سوچ ہے۔ بے شک ڈراموں کے بعد فلموں میں آنا ترقی کا اگلا قدم ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ فلم کے لیے الگ فنکار ہونے چاہئیں۔"

"اس میڈیا میں پرچی کتنا کام آتی ہے؟"

"میرے خیال سے ایک بار ٹیلینٹ کا ہونا بہت ضروری ہے اور جس میں ٹیلنٹ ہو گا وہ اپنی جگہ خود بنا لے گا۔۔۔ بے شک میں اس فیلڈ میں اپنے والد کی وجہ سے آیا مگر کام میرا ٹیلینٹ ہی آیا۔ اس فیلڈ میں وہ ہی لوگ آگے بڑھ سکتے ہیں جن میں شوق اور صلاحیت ہو اور ماشاء اللہ ہماری ڈراما انڈسٹری بہت گروم کر رہی ہے اور بہت اچھے اور بہت باصلاحیت لوگ آگے آ رہے ہیں۔"

چلیں جی اجازت دیں۔۔۔ پھر بات کریں گے۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	میشاء مغل' زابیل فضل
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

امۃ الصبور



تُوزکِ جہانگیری سے

جہانگیر رقم طراز ہے۔
سلطان نصیر الدّین اپنے مزاج کی گرمی دور کرنے کے لیے بسا اوقات پانی میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ ایک گہرے حوض میں ڈوبنے لگا۔ چند خادموں نے اسے بچا لیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے ایک خادم کے ہاتھ قطع کرا دیے۔ اس خادم نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکالا تھا۔ سلطان نے اسے سوئے ادب سمجھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ ڈوبنے لگا تو کسی نے پانی سے باہر نہیں نکالا۔ وہ ڈوب کے مرگیا۔
اس کی موت کے ایک سو دس برس بعد ہم نے اس کی گلی سڑی نعش کو جلا دینے کا حکم دیا پھر سوچا کہ اس ناپاک نعش کو جلا کر آگ کی لطافت کیوں کم کی جائے۔
(فہدیہ بشیر۔ کاموں ہلی)

دور کا شاگرد

افلاطون جس جگہ شہزادگان اور امراء کے لڑکوں کو درس دیتا تھا۔ وہ اکاڈمی کہلاتی تھی۔ اس اکاڈمی کے لیے افلاطون کو ایک لڑکے کی ضرورت پیش آئی۔ جو اس کے شریکِ درس شہزادوں اور امیرزادوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے سکے۔ اس کام کے لیے ایک لڑکا رکھ لیا گیا۔ چونکہ افلاطون کی درس گاہ میں کوئی معمولی لڑکا جگہ نہ پا سکتا تھا۔ اس لیے جب وہ درس دینے کے لیے کھڑا ہوتا تو اس لڑکے کو اکاڈمی سے باہر جانا پڑتا۔ اور دروازے اندر سے بند کر لیے جاتے۔ پھر یہ لڑکا دروازے سے باہر سیڑھیوں پر کان لگا کر بیٹھ جاتا اور پوری توجہ سے افلاطون کا درس سنتا رہتا۔ درس کی تکمیل کے بعد ایک شان دار تقریب ہوتی۔ اس میں اس دور کے مشہور عالموں اور فاضلوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی اور یہیں ایک طرف طلبا کے نگران اور سرپرست موجود ہوتے۔ لڑکوں کا امتحان زبانی لیا جاتا۔ لڑکوں کو ایک موضوع دے دیا جاتا جس پر انہیں گھنٹوں زبانی تقریریں کرنا پڑتیں۔
ایک دفعہ ایسی ہی ایک تقریب منعقد ہوئی اور افلاطون نے اپنے شاگردوں کو علم کی فضیلت پر بولنے کی دعوت دی۔ شہزادے اور امیرزادے باری باری آتے اور کچھ دیر تقریر کرکے ہجوم سے مرعوب ہو کر چپ ہو جاتے۔ افلاطون بہت پریشان ہوا۔ کیونکہ اس طرح اس پر یہ الزام عائد ہوتا تھا کہ اس کی تدریس میں شاید محنت کی کمی رہی ہے۔ افلاطون کی پریشانی بھانپ کر پانی پلانے والا لڑکا آگے بڑھا اور اس نے درخواست کی کہ مجھے اس موضوع پر تقریر کرنے کی اجازت دی جائے۔
افلاطون نے حیرت اور لاپروائی کی ملی جلی کیفیت میں یہ کہہ کر اس کی درخواست مسترد کردی کہ ہم نے تمہیں درس نہیں دیا۔ اس لیے تمہیں تقریر کرنے کا موقع کیسے دیا جا سکتا ہے۔
لڑکے نے افلاطون کو پوری تقریر سننے کی تفصیل سنا دی اور کہا۔ ”میں نے آپ کی ساری تقریریں سنی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں اکاڈمی سے باہر دروازے کی سیڑھیوں پر ہوا کرتا تھا۔“
جب افلاطون اپنے شاگردوں سے مایوس ہو گیا تو اس نے خدمت گار لڑکے کو حاضرین کے سامنے کھڑا کر دیا اور اس کا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”میں اس لڑکے کی تقریر کی ذمہ داری نہیں لے سکتا لیکن یہ کہتا ہے کہ اس نے میری ساری تقریریں سنی ہیں۔ اس کی درخواست ہے کہ میں اسے تقریر کی اجازت دوں، شاید اسے یقین ہے کہ یہ اس موضوع پر تقریر کر سکتا

ہے۔"

اس کے بعد اس نے لڑکے کو تقریر کرنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے نے تقریر شروع کی اور کئی گھنٹے علم کی فضیلت پر بولتا رہا۔ افلاطون کا دل بڑھ گیا اور مجمع لڑکے کی قوت گویائی اور علم و فضل پر حیران رہ گیا۔ جب وہ تقریر ختم کر چکا تو افلاطون نے حاضرین محفل سے کہا۔

"حاضرین نے اس لڑکے کی تقریر سے اس کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میری تدریس اور محنت میں کوئی خامی نہ تھی بلکہ میرے شاگردوں میں جوہر قابل کی کمی تھی۔ ان میں علم ہضم کرنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ لیکن جس میں یہ خوبیاں موجود تھیں، اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے، جو میں اپنے شاگردوں کو دینا چاہتا تھا۔"

تقریب کے خاتمے پر افلاطون نے اس خدمت گار لڑکے سے دریافت کیا۔ "کیا تم مجھ سے مزید درس لینا چاہتے ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میرا شوق آپ پر ظاہر ہو چکا ہے۔ اب سوال کی کوئی گنجائش نہیں۔"

اس کے بعد افلاطون نے اپنے خدمت گار شاگرد پر بہت زیادہ توجہ صرف کی۔ بعد میں یہ شاگرد تاریخ عالم میں "ارسطو" کے نام سے عالمی شہرت کا مستحق قرار پایا۔

ماریہ نصر اللہ۔ نواں پنڈ

سموال کا عہد

امراء القیس مشہور عرب شاعر تھا جو جاہلیت کے دور میں گزرا ہے۔ اسے جب قیصر روم کے دربار میں طلب کیا گیا تو جاتے وقت وہ اپنی زرہ اور اسلحہ اور بہت سامان سموال کے پاس رکھ گیا۔ جب امراء القیس اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو کندہ کے بادشاہ نے جو امراء القیس کا بدترین دشمن تھا، سموال سے امانت رکھی ہوئی تمام چیزیں ایک فرمان کے ذریعے سے طلب کیں۔

سموال نے جواب دیا۔

"امراء القیس کی امانت یا تو میں اس کی بیٹی کو لوٹا دوں گا یا دوسرے وارثوں کو، بادشاہ کو نہیں سونپ سکتا، اس لیے کہ وہ مستحق نہیں ہے۔"

بادشاہ نے پھر اصرار کیا، لیکن اس مرتبہ بھی سموال نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔"

یہ سن کر کندہ کا بادشاہ بہت ناراض ہوا اور لشکر لے کر سموال پر چڑھ دوڑا۔ سموال اپنے قلعے میں بند ہو گیا۔ بادشاہ کے لشکر نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اتفاق سے سموال کا لڑکا قلعے سے باہر رہ گیا تھا۔ کندہ کے بادشاہ نے اسے گرفتار کر لیا اور سموال کو آواز دی۔ آواز سن کر سموال قلعہ کی برجی پر چڑھا تو بادشاہ نے اس سے کہا۔

"میں نے تمہارے لڑکے کو گرفتار کر لیا ہے، اگر تم اپنے لڑکے کی سلامتی چاہتے ہو تو فوراً امراء القیس کا سب سامان میرے حوالے کر دو، ورنہ اس لڑکے کو تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کر دوں گا۔"

سموال نے جواب دیا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں امراء القیس سے دھوکا نہیں کر سکتا۔ رہا میرے لڑکے کا معاملہ، تو جو تیرا جی چاہے کر۔"

یہ سن کر بادشاہ کا غصہ بہت زیادہ بھڑک اٹھا۔ اس نے اسی وقت قلعے کی دیوار کے نیچے سموال کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ سموال یہ ہولناک منظر دیکھتا رہا، مگر اس نے اف بھی نہ کی۔ بیٹے کی جان بچانے کے لیے وہ امانت میں خیانت پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ صبر و شکر کے ساتھ اپنے بیٹے کا قتل دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد امراء القیس کے وارث آئے تو سموال نے اس کی ایک ایک چیز ان کے حوالے کر دی۔

تاریخ عرب میں سموال کا نام "پاس عہد" کے سلسلے میں ضرب المثل کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔



جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

آرزو گلالئی

زندگی بہت خوب صورت ہے اور جب زندگی میں کسی مخلص خوب صورت اور مشفق ساتھی سے ناتا جڑ جائے تو یہی زندگی خوب صورت ترین بن جاتی ہے۔ اس سروے میں اکثریت ان لوگوں کی شامل رہی ہے جن پر سسرال میں ظلم ہوا۔ بہت کم خواتین نے سسرال سے متعلق متوازن جوابات دیے۔ میری زندگی کی کہانی شاید لوگوں کو فرضی لگے لیکن میں حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔

س - شادی سے پہلے کے مشاغل؟

ج - شادی سے پہلے امی نے امور خانہ داری سکھائی گھر میں بڑی تھی تو گھر کا سارا کام میں کرتی تھی۔ سلائی کڑھائی کا شوق تھا تو ایک دست کاری سینٹر میں داخلہ لے کر سلائی کڑھائی سیکھی۔

س - شادی کب ہوئی؟

ج - شادی یکم اپریل 2006 کو ہوئی اور میں اپنے تایا کے گھر بیاہ کر آئی۔

س - شادی کے لیے قربانی؟

ج - شادی کے لیے کوئی خاص قربانی نہیں دی۔ میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی بعد میں پڑھنے کا شوق ہوا لیکن بچوں کی پیدائش اور گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ ویسے راز کی بات بتاؤں مجھے نیند بہت آتی تھی اور اب بھی آتی ہے۔ بس نیند کی قربانی دینی پڑی۔ (ہاہاہا) اس پر ان کی طرف سے ڈانٹ پڑتی ہے۔

س - رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا؟

ج - کوئی خاص رسم نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہماری شادی سے چھ مہینے قبل میرے چھوٹے دیور کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اس لیے شادی سادگی سے ہوئی۔ زلف کسائی کی رسم ہوئی تھی۔ اس رسم میں دولہا دلہن کی چوٹی کے تھوڑے سے بال کاٹتا ہے۔

س - شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج - شوہر نے دیکھ کر کہا تھا "شکر ہے کہ ہمارا ملن ہو گیا۔ تم بہت حسین ہو۔" وہ بہت شریر، رومانٹک اور تھوڑے سے غصیلے ہیں۔

س - شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج - دیکھیں شادی کے بعد زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آتی ہیں۔ زندگی کی ساری روٹین تبدیل ہو جاتی ہے۔ بھرے پرے خاندان سے دوسرے بھرے پرے خاندان میں گئی تو ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ گھر کی بڑی بہو ہوں تو اس حیثیت سے بھی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ خاندان، پاس پڑوس میں خوشی غمی کی تقریبات میں شرکت کرنا پڑی۔

س - کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج - تائی (ساس) بہت ایکٹو خاتون ہیں۔ دو مہینے تک کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ بننے سنورنے کا حکم تھا کہ دلہناپے کو انجوائے کرو۔ تیسرے مہینے انہیں ٹائیفائڈ ہو گیا تو ہم دونوں بہوؤں کو کچن میں لے گئیں اور کہا کہ اب سب کچھ تم دونوں کو سنبھالنا ہے۔ میری دیورانی میری ساس کی بھتیجی ہیں اور عمر میں مجھ سے بڑی بھی ہیں اس لیے میں ہمیشہ وہ کام کرتی ہوں جو وہ کرنا پسند نہیں کرتیں۔

س - میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج - جی! کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ یہ لوگ نمک اور مرچ کم کھاتے ہیں جبکہ میکے میں مرچ وغیرہ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔

س - شادی میں اپنی مرضی کس حد تک تھی؟



ج ۔ پیدائش کے دن سے میں اپنے تایا زاد سے منسوب تھی۔ یہ بات میری امی اور تائی نے طے کی تھی۔ جب ہوش سنبھالا تو ان کا نام سنا' انہیں دیکھا' ان کی باتیں سنیں تو پھر دل تھوڑا بے ایمان ہوا کیونکہ میری سب کزنز کہتی تھیں کہ وہ (میرے شوہر) آئیڈیل بندے ہیں۔ انہیں نظرانداز کرنا یا ٹھکرانا ممکن نہیں تھا۔ منگنی سے پہلے اور بعد میں کوئی ملاقات نہیں ہوئی بس خاندان کی خوشی یا غمی میں ٹکراؤ ہو جاتا تھا۔ شادی کے بعد ان کی خوبیاں پتا چلیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اتنا اچھا' مخلص اور شفیق شوہر ملا۔ سسرال میں بھی سب ہی پیار کرنے والے ہیں۔ مجھے ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

س ۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف، تنقید ہوئی؟

ج ۔ میں تھوڑی کم گو ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ سب سے اچھے طریقے سے پیش آتی ہوں تو لازمی بات ہے تعریف تو ملنی ہی ہے ۔ میری تائی (ساس) غصے کی تیز ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں۔ غلط بات کرنے والے کے منہ پر اس کی غلطی بیان کر دیتی ہیں۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا' وہ حق بات کہنے سے نہیں گھبراتیں۔ میں نے اپنے دیگر رشتہ داروں سے سنا ہے کہ وہ میری تعریفیں کرتی ہیں۔ میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔

س ۔ جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟

ج ۔ جوائنٹ فیملی پسند کرتی ہوں کیونکہ مشکل اوقات میں سارا خاندان آپ کے پاس ہوتا ہے۔ بس دل میں جگہ ہونی چاہیے۔ بچوں کو دادا' دادی' چچا چچی اور پھوپھو کا پیار ملتا ہے اور بچے رشتے نبھانا جان لیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے' کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اگر دلوں میں جگہ نہ ہو تو رشتے قائم رکھنے کے لیے علیحدہ ہونا چاہیے۔

س ۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج ۔ کسی خاتون کی زندگی میں ماں بننے کا عمل اور مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ میری سسرال میں اس مرحلے پر میرا بہت خیال رکھا گیا اور یہ رویہ میرے چاروں بچوں کی پیدائش تک برقرار رہا۔ میرے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ باقاعدہ چیک اپ کروایا جاتا تھا۔ کھانے پینے کا خاص خیال رکھا گیا۔

س ۔ سسرال میں مقام؟

ج ۔ مجھے سسرال میں وہ مقام ملا جو میرا حق تھا۔ میری ساس اور نندیں مجھ سے صلاح مشورہ کرتی ہیں۔ دونوں شادی شدہ نندیں مجھ سے ہر بات شیئر کرتی ہیں۔ میری دیورانی' ساس کی بھتیجی بھی ہیں اور تیز مزاج والی بھی تو سسرال والے بدنامی کے خوف سے اس سے دب کے رہتے ہیں۔ جبکہ مجھ سے سب دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔

س ۔ شوہر سے تعلقات؟

ج ۔ شوہر سے مثالی تعلقات ہیں۔ شادی سے پہلے ان سے ڈر لگتا تھا' اب بھی لگتا ہے لیکن میں وہ کام ہی نہیں کرتی جس سے انہیں غصہ آئے۔ عمروں میں نو برس کا فرق ہے۔ وہ مجھے ابتدا سے ہر مسئلے پر گائیڈ کرتے آئے ہیں۔ بیس سال کی تھی کہ شادی ہوگئی۔ شوہر کے پیار' اعتماد اور رہنمائی نے بھی سسرال میں مقام دلانے میں معاونت کی۔ میں ایک پُرسکون' خوب صورت اور مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔

زندگی نشیب و فراز کا نام ہے۔ آدھا گلاس خالی ہے کے بجائے آدھا گلاس بھرا ہوا ہے کے فلسفے پر یقین رکھیں۔ کمی ہر جگہ ہوتی ہے۔ خامی ہر کسی میں ہوتی ہے۔ بات اس کمی اور خامی کی وجہ جاننے میں ہے کہ اس کی وجہ جان کر اس کمی اور خامی کو دور کیا جا سکے۔ کچھ لو کچھ دو کے اصول سے زندگی کے سفر کو آسان اور خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ میرے شوہر ایک مثالی انسان ہیں۔ سب خاندان والے ہمارے کپل کی تعریف کرتے ہیں۔

شادی شدہ بہنوں سے گزارش ہے کہ ہمیشہ پوزیٹو سوچیں اور شوہر کے دل میں اپنا مقام بنائیں۔ تب ہی سسرال میں آپ کی عزت ہوگی۔ سب قارئین بہنوں سے التماس ہے کہ میری پرسکون زندگی کے لیے دعا کریں اور میری دعا ہے کہ اللہ سب بہنوں کا نصیب اچھا کرے اور انہیں ڈھیر ساری خوشیاں دیں۔ آمین۔

✡

واصفہ سہیل

آپ جانیے



مستقبل

پاکستان وومن کرکٹ ٹیم وومنز ورلڈ کپ میں جس بدترین شکست کا شکار ہوئی ہے' اسے شرم ناک ہی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ انہوں نے اس میں ایک بھی میچ نہیں جیتا۔ خواتین کی ٹیم کے کوچ صبیح اظہر نے کپتان ثنا میر کو اس سب کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

صبیح اظہر نے کہا ہے کہ ثنا میر انتہائی انا پرست ہیں اور صرف اپنا مفاد سوچتی ہیں۔ وہ اپنی خامیاں ماننے پر تیار نہیں (تو کوچ صاحب آپ کیا کر رہے ہیں؟) وہ اکثر ایسے موقع پر بولنگ کرانے آجاتی ہیں جب ان سے بہتر کوئی اور لڑکی بولنگ کرا سکتی ہے۔ مگر کپتان ثنا میر یہ چاہتیں ہی نہیں کہ کوئی اور لڑکی ان سے زیادہ وکٹیں لے اور اس کا ریکارڈ بنے۔ صبیح اظہر کے نزدیک ٹیم منیجر عائشہ اشعر بھی شریک جرم ہیں کیوں کہ وہ کپتان ثنا میر اور سینئر کھلاڑیوں جویریہ خان اور نین عابدی پر ہی مہربان ہیں۔ جونیئر کھلاڑیوں سے انتہائی سرد مہری کا رویہ رکھتی ہیں اور انہیں ہر وقت تنقید کا نشانہ بناتی رہتی ہیں جس سے جونیئر کھلاڑیوں میں اعتماد کی کمی ہو رہی ہے۔ جب تک عائشہ اشعر اور ثنا میر ٹیم میں ہیں' وومن کرکٹ میں کوئی بہتری نہیں آسکتی۔

مصروفیت

پچھلے دنوں خبر تھی کہ میرا نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ (ارے جناب میرا تو کچھ بھی کر سکتی ہیں اور سیاست تو ....؟) لیکن میرا نے سیاست میں حصہ لینے کی تردید کر دی ہے (شاید یہ بھی خبروں میں رہنے کا طریقہ تھا) میرا نے واضح طور پر کہا کہ ان کا سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ صرف افواہ تھی (افواہ ایسے ہی تو نہیں اڑتی) میرا آج کل شوبز سے بھی دور ہیں' نہ کوئی فلم کر رہی ہیں۔ (نہ کوئی فلم مل رہی ہے) اور تو اور ان کے رویے کی وجہ سے ٹی وی ڈراموں میں بھی ان کو نہیں لیا جا رہا۔ (حالاں کہ مزاحیہ ڈرامے تو کر ہی سکتی ہیں میرا) ویسے کہنے والے کہتے ہیں کہ میرا اگر سیاست میں ہی آجائیں تو کچھ مصروفیت ہو جائے گی۔ (کس کی بھئی....؟)

اعزاز

فخر عالم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں' ان کی ایک وجہ شہرت ——— جنرل رانی کا نواسا ہونا بھی ہے۔ ان کا بھنگڑا پا ؤ سن کر آج بھی بھنگڑے ڈالے جاتے ہیں۔ فخر عالم نے ٹی وی پر ہدایت کاری سنسر بورڈ کی چیئرمین شپ کے بعد جہاز (بھئی ہوائی جہاز) اڑانے کا لائسنس امریکا سے حاصل کیا۔ فخر عالم کافی عرصے سے امریکا میں مقیم ہیں۔ اور آن لائن بزنس کر

رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں فخر عالم کو دنیا کی مقبول ترین ٹیکنالوجی کمپنی "گوگل" کی جانب سے بطور مہمان مدعو کیا گیا (لیکن کیوں... بھئی مدعو) جہاں انہوں نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ (کس سے پوچھ کر؟)

فخر عالم اس بارے میں کہتے ہیں کہ "میرے لیے یہ بڑے ہی اعزاز کی بات ہے اور میں بے پناہ خوش ہوں کہ امریکی ریاست کیلی فورنیا میں گوگل ہیڈ کوارٹر میں مجھے آرٹ' ٹیکنالوجی' طیاروں (کس کے؟) اور پاکستان کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملا۔" (کہیں یہ باتیں شرمین عبید کی فلموں کی طرح تو نہیں تھیں۔)

ویسے فخر عالم پہلے پاکستانی ہیں جسے گوگل نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں بطور مہمان گفتگو کے لیے مدعو کیا۔ (یعنی پورے پاکستان میں ان کے علاوہ کوئی اور... بھئی اس قابل ہی نہ تھا کیا...؟)

ایوارڈ

زرمینا خان کو برطانیہ میں ایوارڈ ملا (کس سلسلے میں؟) اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "یہ ایوارڈ تمام لڑکیوں کے لیے ہے (کیوں؟) برطانیہ میں مجھے میرے مختلف کاموں کی وجہ سے لندن میں با اختیار خاتون کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ (ہمارے یہاں اسے بے لگام کہتے ہیں۔) میں یہ ایوارڈ اپنے والدین' بہن بھائیوں اور تمام چاہنے والوں کے نام کرتی ہوں (ویسے یہ تو ہے کہ والدین اور بہن بھائیوں کی برداشت کے نام ہونا چاہیے۔)

مسکہ

مایا علی "فلم طیفہ ان ٹربل" میں کام کر رہی ہیں۔ یہ خبر تو اب ہو گئی پرانی' پرانی خبر تو یہ بھی ہے کہ مایا علی فلم کے ہدایت کار احسن رحیم سے بہت متاثر ہیں۔ (بھئی پہلی فلم ہے ناں تو...؟) اس میں تو کوئی شک نہیں کہ احسن رحیم ایک باصلاحیت ہدایت کار ہیں ــــــــ ان کے بنائے میوزک وڈیوز اور ٹی وی اشتہارات اس کی مثال ہیں۔ لیکن مایا علی کہتی ہیں۔ "سر احسن رحیم آپ سے اداکاری کروا سکتے ہیں (تو باقی ہدایت کار کیا؟

ـــ یہ آپ کو ہنسا سکتے ہیں (کیوں؟) یہ آپ کو ایسے جادوئی انداز میں پیش کر سکتے ہیں جیسا کہ پہلے کبھی نہ کیا گیا۔ (فلم ابھی آئی نہیں مایا!) بہت ساری صلاحیتوں کے حامل صرف ایک انسان سر احسن رحیم ہیں۔" (لگتا ہے مایا! تم نے اور کام نہیں کرنا یا...؟)

خوشی

لیجیے جناب اریج فاطمہ بھی پیا کو پیاری ہو گئیں۔ جی ہاں اریج فاطمہ نے اپنے دوست (پکے والے دوست) سے منگنی کر لی ہے۔ اریج فاطمہ نے اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اس سلسلے میں وہ ابھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہتیں' لیکن جلد ہی اس بارے میں اپنے مداحوں کو آگاہ کریں گی۔" (اریج احتیاط بہت اچھی بات ہے مگر...) ہم اس بارے میں اپنی قارئین کو بتاتے ہیں کہ ان کے منگیتر کا تعلق شوبز سے نہیں ہے۔ اور اریج اس منگنی سے بہت خوش ہیں۔ (ہم دعاگو ہیں اریج آپ کی خوشیوں کے لیے۔) شاید وہ اسی سال شادی بھی کر لیں۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ نواز شریف کو سیاست سے نکال باہر کرنے سے اس ملک پر کوئی آفت نازل نہیں ہو گی لیکن قانون کے محافظوں کی غیر جانب داری پر متزلزل ہونے والے اعتماد سے آفت ضرور آئے گی۔ (بابر ستار)

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں حکمرانی کرنے کے لیے اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ بہت ضروری ہے ورنہ آپ کے خلاف کوئی بھی تحریک کسی بھی وقت شروع کی جا سکتی ہے یا ریفرنس کے ذریعے آپ کا راستہ روکا جا سکتا ہے (افتخار احمد۔ عوام کی عدالت)

☆ ہماری عدلیہ آج تک کسی مافیا کو سزا نہیں دے سکی۔ چاہے وہ لینڈ مافیا ہو یا کوئی اور ان کا بس صرف سیاست دانوں پر ہی چلتا ہے۔ (عاصمہ جہانگیر)

☆ شاعر کو اشعار میں اور سیاست دان کو جلسے میں جو کچھ کہنے پر معاف کیا جاتا ہے' وہ ہما شما سادہ نثر میں لکھیں تو لوگ سنگسار کر دیں۔

(وقائع نگار خصوصی۔ امت)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کلیجی

اشیاء:

کلیجی	آدھا کلو
گھی یا تیل	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
کُٹی مرچ	ایک چمچہ
ہری مرچیں	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چمچہ چائے کا
کُٹا ہوا دھنیا	ایک چمچہ
پیاز	دو عدد
دھنیا پودینہ	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:

دو عدد پیاز باریک کاٹ کر تیل یا گھی میں تل لیں۔ پھر اس میں تمام مسالے ڈال کر بھون لیں تھوڑا سا پانی بھی ڈال دیں۔ ہری مرچیں موٹی موٹی کوٹ کر دہی میں شامل کر کے کلیجی کے ساتھ مسالے میں ڈال کر آدھا کپ پانی شامل کر کے ڈھک دیں۔ کلیجی گل جائے تو اسے اچھی طرح بھون لیں۔ گھی، تیل اوپر آجائے تو اتار کر ڈش میں نکال لیں اور ہرا دھنیا، پودینہ ہری مرچیں اور ادرک باریک کاٹ کر اوپر سے ڈال دیں مزے دار کلیجی تیار ہے۔

چٹپٹی چانپ

ضروری اشیاء:

بکرے کی چانپ	چھ سے آٹھ عدد
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسب ضرورت

ترکیب:

چانپ کو ہلکا ہلکا کوٹ کر دھو کر پانی خشک کر لیں۔ ایک کھلے منہ کی پتیلی میں سرکہ، دہی، سویا ساس، نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔ اس کے بعد خشک کی ہوئی چانپ اس میں ڈال کر دو گھنٹے فریج میں رکھیں۔ اب اسے ہلکی آنچ پر پکائیں اور پانی خشک کر لیں۔ اس کے بعد اس میں تیل ڈال کر احتیاط سے چمچہ چلائیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو ڈش میں نکال کر باریک کٹے ہوئے دھنیے اور ہری مرچ سے سجاوٹ کریں، لذیذ چٹپٹی چانپ تیار ہے گرم گرم پیش کریں۔

بیف بریانی

ضروری اشیاء:

گائے کر گوشت	ایک کلو
پیاز	دو عدد (بڑی)
لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ
دہی	ایک کپ

آلو بخارے	پانچ عدد
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
جائفل' جاوتری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
الائچی پاؤڈر	ایک چوتھائی چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
پودینہ' ہری مرچیں	حسب ضرورت

چاول کے لیے :

سیلا چاول	تین پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پودینے کے پتے	آٹھ عدد
کیوڑا	چند قطرے

ترکیب :

ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے باریک کٹی پیاز لال کریں۔ اس میں گوشت' نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' لہسن' ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں اور ایک کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ گوشت بھون لیں۔ دہی میں آلو بخارے' زردہ رنگ' جائفل' جاوتری پاؤڈر' الائچی پاؤڈر' گرم مسالا پاؤڈر مکس کرلیں۔ چاول میں نمک' ثابت گرم مسالا' پودینہ ڈال کر ابال لیں۔ گوشت گل جائے تو دہی کا **مکسچر**' ہری مرچیں اور پودینہ گوشت پر ڈالیں اوپر سے چاول کی تہ لگائیں کیوڑا چھڑک کر دم پر رکھیں بریانی دم ہو جائے تو مکس کرکے ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

بیف مسالا پسندے

ضروری اشیاء :

بیف بغیر ہڈی	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
دہی	آدھا کپ
ثابت کالی مرچیں	آٹھ سے دس عدد
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	چار سے پانچ عدد
چھوٹی الائچی	چار سے پانچ عدد
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

گوشت کے پسندے بنوالیں۔ ساس پین میں تیل گرم کرکے لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں خوشبو آنے لگے تو باریک کٹی پیاز اور گوشت شامل کرکے مزید پانچ منٹ تک پکائیں۔ دہی پھینٹ لیں اور اس میں کالی مرچیں' ثابت دھنیا' لونگ' چھوٹی الائچی' لال مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر ڈھک کر گوشت میں شامل کردیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں' گوشت گل جائے تو سرونگ ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

بیف اسٹکس

ضروری اشیاء :

بیف (انڈر کٹ)	آدھا کلو
سویا ساس	تین چوتھائی کپ
لال مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	چھ کھانے کے چمچے
شملہ مرچ	چار سے چھ عدد
پیاز	دو عدد (بڑی)
تیل	تلنے کے لیے
اسٹک	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں اور اس میں سویا ساس' لال مرچ پاؤڈر' کالی مرچ پاؤڈر' نمک اور کارن فلور مکس کردیں۔ اس کو 3-2 گھنٹے کے لیے میرینیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز اور شملہ مرچ کو چوکور کاٹ لیں ایک اسٹک لیں۔ اس میں پہلے

شملہ مرچ' اس کے بعد پیاز اور آخر میں گوشت کا ٹکڑا پرولیں۔ اسی طرح دوسٹکس اور لگائیں' ساری اسٹکس یونہی بنائیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ اسٹکس کو ڈیپ فرائی کرلیں۔ کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

لاہوری برفی

ضروری اشیاء :

مکھن	آدھا کپ
بیسن	ایک کپ
سوجی	ایک چوتھائی کپ
چینی	ایک کپ
الائچی	چار عدد
بادام پستہ	حسب ضرورت
کیوڑا	چند قطرے

ترکیب :

کسی برتن میں مکھن کو پگھلالیں اور بیسن' سوجی ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں۔ چینی اور الائچی کو باریک پیس لیں۔

اس میں چینی' الائچی ڈال کر بھونیں تھوڑا کلر آجائے تو کیوڑا مکس کریں کسی ڈش یا ٹرے میں گھی لگا کر بیسن کا آمیزہ ڈال کر ہلکے ہاتھ سے دبادیں اور کٹے پستے بادام چھڑک دیں۔

تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو برفی کی شیپ میں کاٹ لیں۔

چکن شاشلک

مرغی کا گوشت (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
(بوٹیاں بنالیں)	
سویا ساس	ایک چوتھائی کپ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
شملہ مرچ	تین سے چار عدد
(بیج نکال کر چوکور ٹکڑے کاٹ لیں)	
پیاز	دو عدد
(درمیان سے کاٹ کر پرت الگ الگ کرلیں)	
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	دو سے تین عدد
(بیج نکال کر چوکور ٹکڑے کرلیں)	
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

ایک بڑے پیالے میں چکن' سویا ساس' سفید سرکہ' مسٹرڈ پیسٹ' سیاہ مرچ پاؤڈر اور نمک ملا کر آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کرکے بوٹیاں' شملہ مرچ' ٹماٹر اور پیاز کو اسٹک میں لگا کر ہلکے گھی میں فرائی کرلیں۔ مزے دار چکن شاشلک ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پلیٹ میں نکال کر کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

فرائیڈ چکن بروسٹ

ضروری اشیاء :

چکن	آدھا کلو
چکن بروسٹ مسالا	چار کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

چکن دیگچی میں ڈال کر ڈھک کر بغیر پانی کے ہلکی آنچ پر پکائیں' اس کا پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ چکن کو بروسٹ مسالے میں اچھی طرح ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کرکے چکن ڈال کر تل لیں' سنہری ہو جائے تو ڈش میں ٹشو پیپر پر نکال کر کیچپ اور رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

☆



ہمارے ملک میں بھی میک اپ کی بہتیری چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ باہر کے ممالک سے آئی ہوئی بے شمار .... چیزیں خواتین منہ مانگے داموں خریدتی ہیں۔ مگر ان میں سے کچھ موافق آتی ہیں اور کچھ جلد میں الرجی پیدا کر دیتی ہیں۔ تو بہتر ہے کہ قدرتی چیزوں سے جلد کو صاف اور تروتازہ کیا جائے۔ جس میں کسی قسم کی بھی الرجی یا جلدی تکلیف ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کے استعمال سے آپ خود محسوس کریں گی کہ آپ کی جلد کا رنگ نکھرتا جا رہا ہے اور اس میں شادابی آگئی ہے۔

جلد کی چکناہٹ

مرطوب موسم میں جلد کے اندر بعض غدود اپنی .... رطوبت زیادہ مقدار میں خارج کرنے لگتے ہیں۔ اور جلد چکنی ہو جاتی ہے۔ دن میں کئی بار منہ دھوئیں مگر چہرہ عجیب قسم کا چکنا چکنا رہتا ہے۔ اور بھدا معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کے لیے ایک آسان سا علاج کیجیے۔

ٹماٹر	ایک عدد
لیموں کے قطرے	تین عدد
پودینے کا رس	ایک قطرہ

ٹماٹر کاٹ لیں اور اس پر لیموں اور پودینے کے قطرے ڈال کر آہستہ آہستہ چہرے پر اس کا رس ملیں۔ رس ملتے وقت آپ ہاتھ کو نیچے کی جانب لا کر مالش نہ کریں' بلکہ ہاتھ کو پیشانی کے رخ پر رکھیں۔ پندرہ منٹ بعد آپ سادے پانی سے منہ دھولیں۔ آپ کو خود تازگی کا اثر محسوس ہو گا۔ ٹماٹر کی مالش آپ کی جلد کے لیے ایک بہترین ٹانک ہے۔

سنگترے کا چھلکا' جلد کا نکھار

چہرے کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے سنگترے اور کینو کا چھلکا از حد مفید ہے۔ آپ سکھا کر پیس لیں اور تھوڑے سے گلاب کے عرق میں بھگو کر چہرے پر لیپ کریں۔ ایک ماہ کے متواتر استعمال سے رنگ گورا ہو گا۔ اور چہرے پر روز بروز نکھار آتا جائے گا۔

پیلا چہرہ بدرنگ بال

میتھی کا جوشاندہ پکالیں۔ چہرے اور بالوں کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ چہرے کا رنگ پیلاہٹ لیے ہو تو اس کے ملنے سے گلابی پن آجاتا ہے۔ بال بڑھتے ہیں اور ان کی چمک میں اضافہ ہوتا ہے۔ پودینہ کی پتیاں جلد کا رنگ نکھارتی ہیں۔ آپ ان کو سلاد کے ساتھ کھائیں۔ یا پیس کر چٹنی کی طرح استعمال کریں۔ اپنی غذا میں پودینہ ضرور شامل کریں۔ اس کا شربت بنا کر پئیں۔ رنگ نکھر جائے گا۔ اس کا رس جلد صاف کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس بوٹی کی تازی پتیاں توڑیے اور آدھے کپ پانی میں ایک جوش دے کر ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر چہرے پر لیپ کریں' دن بھر آپ کی جلد شگفتہ اور ملائم رہے گی۔ آپ پودینے کی پتیوں کو جوش دے کر فریج میں یا برف میں بھی رکھ سکتی ہیں' دن بھر میں کئی دفعہ چہرے پر لیپ کریں۔ رنگ صاف ہو جائے گا۔

آڑو کی کریم

اس طرح آپ پکے ہوئے آڑو کی کریم بنا کر لگا سکتی ہیں۔ آپ کے چہرے میں سرخی اور سپیدی کا حسین امتزاج پیدا ہو سکتا ہے۔ دودھ کی بالائی ایک چمچ' پکا ہوا چھوٹا آڑو ایک عدد' بادام دو عدد' شہد پانچ قطرے ان سب کو خوب حل کر لیں اور چہرے پر آدھ گھنٹے کے لیے لگائیں۔ آپ اپنی جلد میں ایک خاص اثر محسوس کریں گی۔ بازاری لوشن سے آپ کی جلد قدرتی صلاحیت اور حسن سے محروم ہوتی جاتی ہے اور ان تمام چیزوں کے لیپ سے جلد میں ملائمت اور دل کشی پیدا ہوتی ہے۔